DUE DATE

Cl. No. ___ *Acc. No.* ___

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت ۱ روپیہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچروپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (عہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) | فہرست مضامین جنوری ۱۹۳۷ء | شمار (۱)

اصحاب کہف

پانچ ایکٹ کا حُزنیہ ڈراما

یہ ڈراما ایک مصری انشا پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" سے اخذ و اقتباس کیا گیا ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے یہ ظاہر کیا ہے کہ "اصحاب کہف" کے متعلق جو روایت مذہبی صحایف میں پائی جاتی ہے وہ حقیقت نہیں ہے بلکہ صرف بیان و تمثیل ہے اور دنیا کی بعض صنم پرست اقوام کے اصنامی لٹریچر میں بھی اس قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ موضوع محبت پر مصنف نے جس بلند تخیل کو صرف کیا ہے وہ مصنف کی بالکل ذاتی چیز ہے اور اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

یہ کتاب حاجی شیخ نبی احمد صاحب (بریلوی) کا ہدیہ تھا جو زیارت حرمین سے واپس آنے کے بعد انھوں نے مجھے مرحمت فرمایا تھا۔۔۔ حاجی صاحب شکریہ قبول فرمائیں۔۔

نیاز

ڈراما اصحاب کہف

پہلا ایکٹ

(رقیم کا غار، جس کی تاریکی میں سوائے دو انسانی سایوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں اُکڑو بیٹھے ہوئے ہیں اور پاس ہی ایک کتا اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے)

مشلینا:— مرنوش، مرنوش!

مرنوش:— ہائیں، تم جاگ گئے، کیا کہتے ہو؟

مشلینا:— تم ہو کہاں؟ تمھاری آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن تم نظر نہیں آتے — آہ، میری پیٹھ بہت دُکھ رہی ہے۔

مرنوش:— میری پسلیاں خود پھوڑا ہو کر رہ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے برسوں سوتے ہوئے گزر گئے ہیں۔

مشلینا:— چرواہا کہاں ہے؟ — وہی ہمارا تیسرا ساتھی

مرنوش:— اس کے کتے کا سایہ تو نظر آ رہا ہے۔

مشلینا:— مگر وہ خود کہاں ہے؟

مرنوش:— شاید غار کے دہانہ پر چرواہوں کی طرح طلوعِ آفتاب کو دیکھ رہا ہوگا

مشلینا:— آہ، میری پیٹھ بہت دُکھ رہی ہے — اے مرنوش ہم یہاں کب سے ہیں

مرنوش:— اونہہ، ہوگا — تم اور اپنے سوالوں سے میرا سینہ پکائے دے رہے ہو

مشلینا:— اور تمھیں میرے سینہ کی خبر نہیں کہ اسکا کیا حال ہے۔ اے مرنوش، سچ بتا ہم یہاں کب سے ہیں؟

مرنوش:۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو دن ہوئے ہوں گے
مشلینا:۔ یہ تمھیں کیونکر معلوم ہوا؟
مرنوش:۔ کیونکر معلوم ہوا۔ اتو کیا اس سے زیادہ کوئی سو بھی سکتا ہے؟
مشلینا:۔ سچ کہتے ہو (خاموش ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی دیر بعد گھبرا کر) میں تو اب یہاں سے باہر نکلتا ہوں۔
مرنوش:۔ اور جاؤ گے کہاں؟
مشلینا:۔ کہاں؟ خوب، تو کیا تمھارا ارادہ ایک رات اور یہاں رہنے کا ہے۔
مرنوش:۔ ایک رات، دو رات، تین رات۔ اور اس سے زیادہ جب تک دقیانوس کی طرف سے ہم کو اپنی جان کا اطمینان نہ ہو جائے۔
مشلینا:۔ مجھ سے تو اب یہاں نہیں ٹھہرا جاتا۔
مرنوش:۔ اور مجھ سے ٹھہرا جاتا ہے، جو اپنے بیوی بچوں پر دم دیتا ہے۔
مشلینا:۔ بیشک، ان کے لئے تمھیں اپنی زندگی عزیز ہونا چاہئے۔
مرنوش:۔ اور تم۔؟ ۔ کیا تمھیں کسی کے خاطر جینے کی تمنا نہیں ہے
مشلینا:۔ آہ، یہی وہ چیز ہے جو مجھے یہاں اب ایک لمحہ نہیں ٹھہرنے دیتی، اور اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ چلو،
مرنوش:۔ مشلینا، کچھ پاگل ہو گئے ہو؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ سولی ابھی تک جوں کی توں قائم ہے۔

(ایک اور سایہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے)

مشلینا:۔ یہ کون ہے
آنے والا:۔ اے آقا، میں ہوں، چرواہا
مشلینا:۔ تم کہاں تھے؟
چرواہا:۔ تھا کہاں، دروازہ سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہا تھا مگر وہ ملا ہی نہیں،
مشلینا:۔ آؤ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ جب سے تم ہمیں یہاں غار میں لائے ہو، تم نے ہم سے کوئی بات ہی نہیں کی اس کا کیا سبب ہے؟
مرنوش:۔ اے چرواہے، تیرا نام کیا ہے؟
چرواہا:۔ اے آقا میرا نام یملیخا ہے
مشلینا:۔ تم کیوں ہمیشہ آقا کے لفظ سے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہو
یملیخا:۔ سلطنت کے وزیروں کو اور کس لفظ سے مخاطب کروں۔

مرنوش :۔ (حیرت سے) تم سے کس نے کہا کہ ہم لوگ وزیر ہیں
یملیخا :۔ کیا حکومت کے وزیروں کو بھی کوئی نہیں پہچان سکتا
مشلینا :۔ اس سے پہلے تم نے ہمیں کبھی دیکھا تھا ؟
یملیخا :۔ بارہا۔
مرنوش :۔ کہاں ؟
یملیخا :۔ شہر طرطوس میں اور اس میدان میں جہاں درندوں کی لڑائی کا کھیل ہوتا ہے، آپ دونوں بادشاہ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ اشارہ سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو یہ مشلینا ہے اور وہ مرنوش
مشلینا :۔ کیا تم نے ہم کو اس وقت پہچان لیا تھا جب ہم تم سے کوئی پناہ کی جگہ پوچھ رہے تھے۔
یملیخا :۔ نہیں، پہلے تو مجھے اس کا علم نہیں ہوا، لیکن جب میں نے آپ میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اے مرنوش جلدی جلدی بھاگ چلو وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں" تو میں سمجھ گیا کہ آپ لوگ کون ہیں اور میں اپنی بھیڑ بکریاں چھوڑ کر آپ کو اس غار میں لے آیا
مشلینا :۔ "افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے تم کو اپنی بھیڑ بکریاں چھوڑنا پڑیں"
یملیخا :۔ "نہیں، کوئی فکر کی بات نہیں، وہ مزہ سے چر رہی ہوں گی اور انکو کسی نے نہ چھیڑا ہوگا کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کسی مسیحی کی ہیں،
مرنوش :۔ تو کیا تم بھی اپنا دین چھپائے ہوئے ہو
یملیخا :۔ "ہاں، اے آقا
مشلینا :۔ یملیخا، یہ آقا کا لفظ میرے کانوں کو بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب مسیحی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ آقا و غلام کیسا،
مرنوش :۔ یملیخا، کیا تمہارے بیوی بچے بھی ہیں ؟
یملیخا :۔ سوائے قطمیر کے میرا کوئی نہیں
مشلینا :۔ "قطمیر، کون ؟
یملیخا :۔ (کتے کی طرف اشارہ کر کے)۔ یہ ۔۔ (کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد) میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں
مشلینا :۔ ہاں، ہاں پوچھو، ڈرو نہیں،
یملیخا :۔ "میں نے جب آپ لوگوں کو قتلگاہ سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو مجھے تعجب ضرور ہوا، لیکن گھبراہٹ

میں پوچھنے کا موقعہ ہی نہ ملا اور جب یہاں غار میں پہونچے تو سب کے سب دفعتًہ ایسا سوئے ایسا سوئے کہ ـــــ"

مشلینا:ـــ ہاں تو تمھیں حیرت کس بات پر ہوئی

یلیخا:ـــ اس بات پر کہ دقیانوس مسیحیت کا اتنا بڑا دشمن اور اُسے یہ بھی خبر نہیں کہ اسکے دونوں وزیر مسیحی ہیں

مرنوش:ـــ اس سے زیادہ حیرت تمھیں اس بات پر ہونی چاہئے کہ اسکی بیٹی بھی مسیحی ہے اور وہ اس سے بے خبر ہے۔

یلیخا:ـــ (تعجب سے)۔ اس کی بیٹی، شاہزادی پریسکا ـــ !

مشلینا:ـــ (ملامت وعتاب کی آواز سے)۔ مرنوشس !

مرنوش:ـــ اونہہ، یلیخا سے کہنے میں کیا حرج ہے

یلیخا:ـــ اے آقا، معاف فرمائیے، میں یہ پوچھتا ہوں کہ بادشاہ پر آخر یہ راز کھلا کیونکر ؟

مرنوش:ـــ اے مشلینا، یہ بات اب تمھیں بتاؤ،

مشلینا:ـــ مجھ سے تو اب یہاں نہیں ٹھہرا جاتا

مرنوش:ـــ اور مجھ سے ٹھہرا جائے گا جو صرف تمھاری حماقت سے اس مصیبت میں مبتلا ہوا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ شاہزادی کے نام خط لکھو اور بغیر تحقیق کئے ہوئے ایک ایسی خادمہ کے ذریعہ سے پہونچاؤ جو بادشاہ کی جاسوس تھی۔ جس طرح پہلے ایک بار تم نے اس کو طلائی صلیب کا تحفہ دیا تھا، اسی طرح یہ خط بھی موقعہ نکال کر خود ہی دیتے۔ اگر تم صلوٰۃ صبح[1] ادا کرنے کو جارہے تھے تو اسکی اطلاع دینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور اگر تھی بھی تو اس تحریر میں میرا ذکر تم نے کیوں کیا ؟

مشلینا:ـــ بیشک، غلطی ہوئی۔ اور اگر میں یہ نہ لکھتا تو ـــ"

مرنوش:ـــ مجھ پر کیوں یہ مصیبت آتی اور کیوں اپنی بیوی بچے چھوڑ کر یہاں غار میں چھپنا پڑتا۔

یلیخا:ـــ اے آقا، کیا آپ کے اہل وعیال خطرہ میں ہیں

مرنوش:ـــ نہیں خطرہ تو کوئی نہیں، کیونکہ اول تو ان کا قیام ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو پتہ چل ہی نہیں سکتا، علاوہ اس کے اُن کے مسیحی ہونے کا بھی کسی کو علم نہیں ہے

یلیخا:ـــ شکر ہے،

مرنوش:ـــ "شکر ؟ یہ نہیں کہتے کہ انتہائی بدنصیبی تھی کہ ہمارا راز بادشاہ پر ظاہر ہوگیا اور دو دن نہ گزرے تھے کہ اس نے مسیحیوں کے قتل عام کا حکم دیدیا

---

[1] ایسٹر کی عبادت

یلیخا:۔ غضب کا غصہ تھا

مرنوش:۔ سنتے ہیں کہ جسوقت وہ تحریر بادشاہ کی نگاہ سے گزری تو وہ اس کو پڑھ کر آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دیا کہ بھوکے شیروں کے پنجرے لائے جائیں۔ مگر وہ تو کہئے پریکا نے ہم کو اطلاع دیدی اور ہم جان بچا کر نکل آئے ۔ ورنہ ۔"

یلیخا:۔ شکر ہے مسیح نے آپ کو اس مصیبت سے نجات دلائی"

مرنوش:۔ ہاں نجات تو ملی مگر ایسی نجات کس کام کی کہ میں یہاں اور میرے بیوی بچے وہاں

یلیخا:۔ آپ کو اپنے اہل وعیال سے بڑی محبت ہے،

مرنوش:۔ محبت! میں جیتا ہی اُن کے لئے ہوں،

یلیخا:۔ صبر کیجئے، خدا کی رحمت قریب ہے،

مرنوش:۔ ہاں، اتنی ہی قریب ہے جتنا آسمان زمین سے

یلیخا:۔ اللہ کے ساتھ تمسخر نہ کیجئے

مرنوش:۔ اس میں اللہ کا کیا ہیچ۔ یہ مصیبت تو خود ہم نے اپنے ہاتھوں مول لی ہے۔

یلیخا:۔ اے آقا، جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے

مرنوش:۔ ہوتا ہوگا، مگر یہ بات تو خالص ہماری حماقت سے ہوئی ہے

یلیخا:۔ توبہ توبہ کیجئے، ایک مسیحی کی زبان سے ایسے کلمے مناسب نہیں

(مشلینا کراہ کے اُٹھنا چاہتا ہے)

مرنوش:۔ کہاں کا ارادہ کیا؟

مشلینا:۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے اس کی تلافی کے لئے جاتا ہوں

مرنوش:۔ "وہ کیونکر؟"

مشلینا:۔ بادشاہ کے پاس جاکر کہوں گا کہ خط کے اندر مرنوش کا نام لکھنے میں میں نے غلطی کی ہے اور جو کچھ خطا ہے میری ہے،

مرنوش:۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اپنی محبوبہ کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو

مشلینا:۔ (آہ سرد بھر کر) مرنوش میں تمھیں اسقدر سنگدل نہیں جانتا تھا۔ یا اللہ اب میں کیا کروں،

یلیخا:۔ صبر کیجئے اور مسیح پر بھروسہ کرکے خاموش بیٹھ جائیے

مشلینا:۔ مسیح کو کیا خبر کہ یہاں دل پر کیا گزر رہی ہے،

یلیخا:۔ توبہ، توبہ، آپ کو اس میں شک ہے کہ مسیح سب حال سے خبردار ہے، مجھے تو یقین ہے کہ وہ ضرور اس مصیبت کو دور کرے گا۔

مشلینا:۔ "کب"

یلیخا:۔ کب؟ اس سوال کا ہم کو کیا حق حاصل ہے، ہمارا کام صرف اعتقاد و اعتماد ہے

مشلینا:۔ اے یلیخا، مجھے تیرے ایمان پر حیرت ہے۔ کیا تو مسیحی پیدا ہوا تھا یا بڑے ہونے کے بعد یہ دین اختیار کیا۔

یلیخا:۔ میں مسیحی پیدا ہوا تھا، لیکن سچا ایمان اسوقت لایا جب طرسوس کی شہر پناہ کے نیچے میں نے ایک راہب کی گفتگو سنی،

مشلینا:۔ کونسا راہب؟

یلیخا:۔ پانچ سال اُس طرف کی بات ہے۔ میری عمر ۲۰ سال کی تھی اور دنیا میں سوائے بھیڑیں چرانے کے مجھے کوئی خبر نہ تھی، میں مسیحی ضرور تھا لیکن صرف اس لئے کہ مسیحی خاندان میں پیدا ہوا تھا خود کوئی شعور نہ رکھتا تھا۔ ایک دن میں طرسوس گیا تو دیکھا کہ ایک راہب شہر پناہ سے باہر پوشیدہ طور پر چند آدمیوں سے گفتگو کر رہا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اسکی باتیں سُنکر میرا کیا عالم ہوا میرے دل نے کیا محسوس کیا اور میری آنکھوں نے کیا دیکھا

مشلینا:۔ راہب نے کیا کہا؟

یلیخا:۔ یہ تو مجھے کچھ یاد نہیں، لیکن جو کیفیت میری ہوئی اس کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جسوقت میں غروبِ آفتاب کے وقت پہاڑ سے نیچے اُتر رہا تھا تو تمام وادی نور سے لبریز نظر آرہی تھی، میں رات بھر سوچتا رہا کہ یہ حُسن اس سے قبل میں نے کہاں دیکھا تھا۔ لڑکپن میں، خواب میں؟ پیدا ہونے سے پہلے؟۔ صبح کے وقت دفعتہً خیال ہوا کہ یہ حُسن تو ہمیشہ سے موجود ہے، آفرینش کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے، اور اب سوائے اس احساس کے یہ بھی یاد نہیں کہ راہب نے کیا کہا تھا۔

مشلینا:۔ مرنوشش، سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرنوش:۔ ہاں سن رہا ہوں

مشلینا:۔ بولو، تمھارا کیا خیال ہے

مرنوش:۔ بولوں کیا، یونہی واہی تباہی بک رہا ہے

مشلینا:۔ ہاں تمھاری سمجھ میں تو سوائے اسکے کوئی بات آ ہی نہیں سکتی کہ تم تمام رات اپنی بیوی سے جدا رہے

مرنوش:۔ (طعن کے ساتھ) اور تم کیا سمجھے۔

مشلینا:۔ یہ کہ ہم دونوں خدا سے دور ہیں اور غیر خدا میں مشغول،

مرنوش:۔ لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟

یملیخا:۔ (کانپ کر) اللہ آپ پر رحم کرے ۔۔ (آگے کی طرف بڑھتا ہے)

مرنوش:۔ یملیخا، کہاں کا ارادہ ہے؟

یملیخا:۔ شہر جا رہا ہوں، ابھی کچھ کچھ اندھیرا ہے، کوئی چیز کھانے کی لے آؤں،

مرنوش:۔ لیکن تمھارے پاس دام بھی ہیں۔ ٹھہرو (اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے) کل کچھ سکّے میری جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ (رُک کر) ہاں، ہیں، یہ لو۔

(یملیخا سکّے لیکر چلا جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد)

مرنوش:۔ (دفعتہً گھبرا کر) کیا یملیخا چلا گیا؟

مشلینا:۔ کیوں خیر تو ہے، کیا کام یاد آیا؟

مرنوش:۔ کچھ نہیں، میں نے سوچا کہ وہ اُدھر ہی سے میرے بیوی بچوں کو بھی دیکھتا آتا

مشلینا:۔ مگر اُسے تمھارے مکان کا پتہ کیا معلوم، میں چلا جاؤں؟

مرنوش:۔ تم جاؤگے تو پھر کوئی حماقت کر بیٹھوگے اور کوئی دوسری مصیبت نازل ہو جائے گی۔

مشلینا:۔ نہیں، تم کوئی اندیشہ نہ کرو،

مرنوش:۔ یہ ممکن نہیں کہ تم یہاں سے نکلکر اُس کو دیکھنے نہ جاؤ،

مشلینا:۔ پھر اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ وہ بھی میری منتظر ہوگی۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ چلتے وقت اسنے کہا تھا کہ تیسرے دن صبح کو میں محل کے جھروکہ میں بیٹھکر تمھارا انتظار کروں گی،

مرنوش:۔ تو کیا تین دن گزر گئے ہیں۔

مشلینا:۔ نہیں گزرے تو کیا ہوا۔ حالات معلوم کرنے میں کیا حرج ہے۔

مرنوش:۔ اور تمھیں کسی نے پہچان لیا تو ۔۔؟

(دفعتہً ایک آواز غار کے باہر سے سُنائی دیتی ہے)

مشلینا:۔ (کانوں پر ہاتھ رکھکر) یہ کیسی آواز ہے۔

آواز:۔ "اے وزیرو"

مرنوش:۔ کون ہے۔

آواز :- میں ہوں یملیخا

مرنوش :- یہ تو چیخ کیوں رہا ہے؟

یملیخا :- آپ لوگ غار کی تاریکی میں صبح کے منتظر ہیں اور یہاں دوپہر ہونے کو آئی ہے

مرنوش :- کھانا بھی لایا یا نہیں؟

یملیخا :- اب میں کیا بتاؤں کہ راستہ میں کیا ہوا؟

مرنوش :- جلدی بتا، کیا بات ہے؟

یملیخا :- "میں غار سے باہر نکل کر دو قدم چلا ہوں گا کہ ایک سوار نظر پڑا جو عجیب قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور شکاری معلوم ہوتا تھا، میں نے اس کو سکہ دیا اور کہا کہ کوئی شکار ہو تو مجھے بھی دیدو۔ اسنے سکہ لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ حیران ہوگیا اور بولا کہ یہ دقیانوس کے وقت کا سکہ کہاں سے آگیا، یہ تو نہایت پرانا سکہ ہے، کیا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا ہے۔" میں سمجھا کہ اس کا داغ خراب ہوگیا ہے اور ڈر کے مارے یہاں بھاگ آیا۔

مرنوش :- بیشک اس کا داغ خراب ہے۔

مشلینا :- (نہایت ہی سنجیدگی سے) اے مرنوش، ایسا نہ کہو

مرنوش :- کیوں، کیا اس میں بھی کوئی شک ہے؟

مشلینا :- ہاں شک ہے

مرنوش :- کس بات کا؟

مشلینا :- اس بات کا کہ ہم کب سے یہاں غار میں چھپے ہوئے ہیں۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ جب ہم یہاں آئے تھے تو سر منڈا ہوا تھا، چہرہ صاف تھا اور اب دیکھو کہ داڑھی اور سر کے بالوں کا کیا حال ہے، ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب میں نے سر کھجایا تو مجھے خیال ہوا کہ اتنے بال کہاں سے آگئے،

یملیخا :- ہاں جسوقت میں نے اس سوار کو سکہ دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنے ناخنوں کو دیکھا کہ وہ حد سے زیادہ بڑھے ہیں۔ یہاں اندھیرے میں کچھ پتا چلتا ہی نہیں کہ کسی کا کیا حال ہے۔

مشلینا :- یقیناً ایک ہفتہ ضرور یہاں آئے ہوئے ہوگیا ہوگا۔ حیرت ہے کہ ہمیں اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا،

مرنوش :- (اپنا سر چھوتے ہوئے) سچ کہتے ہو، میں بھی جب یہاں آیا تھا تو میرا سر صاف تھا لیکن اب تو اُفوہ، سر جنگل ہو کر رہ گیا ہے، اور داڑھی تو بالکل پادریوں کی سی ہو گئی ہے،

یملیخا :- میں سمجھتا ہوں کہ ایک مہینہ سے کم زمانہ نہیں ہوا۔

مرنوش :- (تعجب سے) ایک مہینہ! اور اتنی مدت تک ہم رہے کہاں؟

یلیخا :- "سوتے رہے"

مرنوش :- "کیوں بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہے ہو"

یلیخا :- اس میں بیوقوفی کی کیا بات ہے، جب میں چھوٹا تھا تو میں نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ایک مسیحی چرواہا سیلاب سے بچکر ایک غار میں چھپا اور ایک مہینہ تک وہاں پڑا سوتا رہا، جب سیلاب ختم ہو گیا تو وہ صحیح و سالم باہر نکلا اور اس کو بالکل پتہ نہیں چلا کہ وہ کب تک سوتا رہا،

مرنوش :- یہ بڑھیوں کے قصے کہانیاں ہیں،

یلیخا :- مجھے تو اس پر بالکل یقین ہے، خدا اور مسیح اگر چاہیں تو یہ کیا، اس سے بھی زیادہ ممکن ہے۔

مرنوش :- (تمسخر کے ساتھ) شکر ہے کہ یلیخا تم ہمارے ساتھ تھے ورنہ خدا اور مسیح کیوں ہمارے لئے یہ معجزہ دکھاتے۔

(ناگہاں غار سے باہر شور و غل کی آواز آتی ہے)

مرنوش :- "یہ کیا ہے"

یلیخا :- "یہ تو آدمیوں کا شور و غل معلوم ہوتا ہے۔

مرنوش :- "چلو قصہ ختم ہو گیا، اس سوار نے ضرور اس کی اطلاع دقیانوس کو کر دی ہے اور اب اس نے ہمارے گرفتار کرنے کے لئے سپاہی بھیجے ہیں۔

(آوازیں قریب تر آتی جاتی ہیں)

لوگ :- (باہر سے) اے خزانہ والو، اے دفینہ پانے والو، باہر نکلو، ڈرو نہیں۔

مرنوش :- (آہستہ آہستہ) خزانہ؟ خزانہ کیسا؟ یہ کہہ کیا رہے ہیں؟

لوگ :- (غار کے دروازہ کے قریب پہونچکر) یہ ہے غار کا دروازہ، چلو اندر چلیں،

بعض آوازیں :- "مگر اندر تو بہت اندھیرا ہے"

کچھ اور آوازیں :- "مشعلیں روشن کرو"

(تھوڑی دیر کے بعد غار کے اندر روشنی سی آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پھر چند آدمی ہاتھوں میں مشعل لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں، لیکن جونہی ان لوگوں پر نگاہ پڑتی ہے گھبرا کر چیخ اٹھتے ہیں اور الٹے پاؤں واپس جاتے ہیں)

آوازیں :- "بھوت ہیں، بھوت، بھاگو یہاں سے،

(سب آدمی مشعلیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور یہ تینوں بُت کی طرح ساکت و جامد اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہیں کہ کیا واقعی ہم مر چکے ہیں اور کیا واقعی ہم بھوت ہو گئے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

(قصر شاہی کا کمرہ۔ شاہزادی پریسکا کنیزوں کے درمیان کھڑی ہے اور ہاتھ میں ایک کتاب لئے ہوئے ہے)

پریسکا:— غالیاس کہاں ہے، آج صبح سے اس کا پتہ نہیں،
(آتالیق)

(غالیاس نمودار ہوتا ہے، بہت گھبرایا ہوا جلدی جلدی آرہا ہے — یہ نہایت ضعیف العمر شخص ہے اور تمام بال سفید ہیں)

غالیاس:— (ہانپتے ہوئے) اے شاہزادی میں حاضر ہوگیا ہوں

پریسکا:— غالیاس، تم اسقدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو، پسینے پسینے ہو رہے ہو، کیا بات ہے، خیر تو ہے؟

غالیاس:— اے شاہزادی میں شہر میں تھا۔ اور — اور —

شاہزادی:— اور — کیا، شہر میں کوئی نئی بات دیکھی۔ بادشاہ سلامت دیر سے تمھیں یاد کر رہے ہیں۔

غالیاس:— (جاتے ہوئے) کیا بادشاہ نے مجھے طلب کیا تھا؟

پریسکا:— ذرا ٹھہرو — تم دیکھتے ہو میرے ہاتھ میں کیا ہے، یہ تعبیر نامہ ہے۔ اے غالیاس، رات میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔

غالیاس:— اے شاہزادی خیر ہو، وہ خواب کیا ہے؟

پریسکا:— میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں زندہ دفن کر دی گئی ہوں

غالیاس:— (کچھ سوچکر) یا خدا، اس خواب کا تعلق اس واقعہ سے تو نہیں جو آج شہر میں مشہور ہے۔

پریسکا:— وہ کیا واقعہ ہے؟

غالیاس:— یہ کہ شاہ دقیانوس کے زمانہ کا خزانہ وادی رقیم کے غار میں مدفون ہے

پریسکا:— (سوچکر) — دقیانوس!

غالیاس:— ہاں، دقیانوس، اے شاہزادی میں نے تاریخ قدیم کے سلسلہ میں آپ کو اس بادشاہ کا حال سنایا ہے

پریسکا:— ہاں، ہاں مجھے یاد آگیا، وہی نا جس کی بیٹی کے نام پر میرا نام رکھا گیا ہے۔

غالیاس:— بالکل ٹھیک، یہ وہی دقیانوس ہے جس کی لڑکی کی نسبت کاہنوں نے یہ بتایا تھا کہ آپ بالکل اسی کی صورت لیکر پیدا ہوئی ہیں اور اسی لئے آپ کا نام بھی وہی رکھا گیا جو اس کا تھا۔

پرسیکا :- کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ کاہنوں نے یہ بات سچ کہی تھی، کیا میں واقعی اس کی ہمشکل ہوں غالیاس میرا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنی ہمشکل شاہزادی کا حال معلوم کر دوں، لیکن تم کچھ تفصیل سے بتاتے ہی نہیں

غالیاس :- اے شاہزادی، مجھے جو کچھ معلوم تھا، عرض کر چکا ہوں کہ وہ مسیح کی معتقد تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب مسیح کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنا مذہب اپنے باپ سے پوشیدہ رکھا اور ہمیشہ راہبہ کی زندگی بسر کی، اس نے شادی بھی نہیں کی اور پچاس سال کی عمر میں مر گئی

پرسیکا :- میں نے سنا ہے کہ جب اس سے شادی کے لئے اصرار کیا جاتا تھا تو وہ کہتی تھی کہ میں ایک پاک عہد کی پابند ہوں اور اس کو نہیں توڑ سکتی کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ عہد اس نے کس سے کیا تھا؟

غالیاس :- اے شاہزادی یہ عہد اس نے اللہ سے کیا تھا

پرسیکا :- نہیں میں سمجھتی ہوں کہ یہ عہد اس نے اپنے کسی محبوب سے کیا تھا،

غالیاس :- (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) استغفر اللہ، کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ اس نے غیر اللہ سے عہد کیا ہو،

پرسیکا :- کیوں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کیا عورت سوائے اللہ کے کسی سے مانوس ہی نہیں ہو سکتی اے غالیاس، تجھے عورت کے دل کا حال کیا معلوم۔

غالیاس :- نہیں شاہزادی، مجھے اس کے سارے حال کی اطلاع ہے

پرسیکا :- ہاں، ایک ضعیف شخص کی اطلاع ایسی ہی ہوا کرتی ہے

غالیاس :- کل ہی میں نے ایک قدیم نسخہ میں پڑھا ہے کہ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ "میں روز انتظار کرتی ہوں اور برابر اسی طرح منتظر رہوں گی جب تک وہ واپس نہ آجائے۔

پرسیکا :- یہ کس کا انتظار تھا، کس کی واپسی کی تمنا تھی؟

غالیاس :- مسیح کی واپسی کا انتظار تھا، اُن کے آسمان سے واپس آنے کی تمنا تھی۔

پرسیکا :- تو وہ واقعی بڑی سچی راہبہ تھی

غالیاس :- اس میں کیا شک ہے، اے شاہزادی

پرسیکا :- کیا یہ صحیح ہے کہ جو طلائی صلیب میری گردن میں پڑی ہوئی ہے یہ اُسی کی تھی؟

غالیاس :- بالکل صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ مسیح نے اس کی گردن میں صلیب پہنائی، صبح کو جب بیدار ہوئی تو صلیب موجود تھی اور پھر مرتے وقت تک اپنے پاس سے اس نے جدا نہیں کی۔

پرسیکا :— کیا اس نے اسی کمرہ میں انتقال کیا تھا؟

غالیاس :— ہاں، وہ ہمیشہ اسی کمرہ میں تنہا رہا کرتی تھی، اور یہیں اب سے ۲۰۰ سال قبل اس نے جان دی۔

پرسیکا :— وہ کیوں اس حصۂ مکان کو اتنا زیادہ پسند کرتی تھی؟

غالیاس :— اے شاہزادی اس کا حال اب کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

پرسیکا :— (کچھ دیر سکوت کے بعد) معلوم نہیں میں کیوں اس شہزادی کا حال معلوم کرنے کے لئے اس قدر بیتاب ہوں۔

غالیاس :— اے شہزادی کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا رجحان بھی ویسا ہی ہو جائے اور کاہنوں کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہے

پرسیکا :— میں اور راہبہ کی زندگی - سب کچھ ممکن ہے سوائے اس کے ؟

(باہر سے ایک آواز "غالیاس، غالیاس" پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

غالیاس :— (گھبرا کر) بادشاہ یاد فرما رہے ہیں

بادشاہ :— (اندر داخل ہوتے ہوئے) اے غالیاس تم نے بھی کچھ سنا ہے

غالیاس :— ہاں، اے آقا، میں نے بھی دفینہ کی خبر سنی ہے

بادشاہ :— صرف دفینہ نہیں بلکہ بھوتوں کی بھی

غالیاس اور پرسیکا۔ (دونوں ایک ساتھ گھبرا کر) — بھوت !

بادشاہ :— کیا تم لوگوں کے ساتھ غار تک نہیں گئے، کہاں تھے ؟

غالیاس :— میں لوگوں سے ساتھ شکاری کا بیان سن رہا تھا اور غار کی طرف جانے ہی والا تھا کہ شہزادی کے درس کا خیال آ گیا

بادشاہ :— وہ شکاری واپس آیا ہے اور عجیب عجیب باتیں بیان کرتا ہے کہتا ہے کہ غار کے اندر تین انسان عجیب و غریب ہیئت کے ہیں اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہے

غالیاس :— (سوچتا ہوا) کیا یہ وہی لوگ تو نہیں ہیں ؟

بادشاہ :— کون لوگ؟

غالیاس :— اے آقا، وہی تین جن کا چوتھا کتا ہے

بادشاہ :— اے غالیاس وہ کون ہیں صاف صاف کہو؟

غالیاس :— (آپ ہی آپ حد درجہ عالم تاثر میں) ہاں، ہاں وہی تین جن کا چوتھا رفیق کتا ہے

پریسکا :۔ اے غالیاس وہ کون ہیں ؟

غالیاس :۔ اے شہزادی کیا میں نے آپ سے تاریخ شہداء کا ذکر کرتے ہوئے نہیں بتایا تھا کہ اشراف روم میں سے بعض نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا اور دقیانوس کے خوف سے وہ بھاگ گئے تھے اس کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔ میں نے قدیم کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دن وہ پھر ظاہر ہوں گے اور ۔۔۔

بادشاہ :۔ یہی اس بڈھے کا بھی بیان ہے جو لوگوں کے ساتھ غار تک گیا تھا

پریسکا :۔ (ڈر اور شوق کے جذبہ کے ساتھ) اس نے کیا کہا ابا جان ؟

بادشاہ :۔ "یہی کہ وہ بھوت نہیں ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ دقیانوس کے زمانہ میں دو سردار دین مسیحی اختیار کرکے چلے گئے تھے، پھر ایک چرواہا معہ اپنے کتے کے ان سے ملگیا اور یہ کہ وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں"

پریسکا :۔ لیکن تعجب ہے کہ ہمارے زمانہ کے لوگوں نے اس کو بالکل فراموش کر دیا تھا،

غالیاس :۔ ہاں، اے شاہزادی، اولیاء اللہ اسی زمانہ میں ظہور کرتے ہیں جب اُن کو بھلا دیا جاتا ہے۔

بادشاہ :۔ اے غالیاس، کیا تجھے یقین ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں،

غالیاس :۔ مجھے بالکل یقین ہے اور اے آقا آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئیے کہ وہ آپ کے عہد میں ظاہر ہوئے

بادشاہ :۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں

غالیاس :۔ یقیناً صحیح ہے اور یہ وہی اولیاء کرام ہیں جن کا نام راہبوں کی کتابوں میں مرنوش، مشلینا، یملیخا اور کتے کا نام قطمیر درج ہے۔

پریسکا :۔ اے غالیاس، مجھے ابتک یقین نہیں آیا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے

غالیاس :۔ جسوقت شکاری نے مجھ سے اس عجیب وغریب آدمی اور عہد دقیانوس کے سکّہ کا ذکر کیا، مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا لیکن جب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ غار میں ایک نہیں بلکہ تین آدمی ہیں اور کتا بھی ان کے ساتھ ہے تو مجھے بالکل یقین آگیا کیونکہ تاریخ کی کتابوں میں یہی لکھا ہے اور اب شک کی کوئی گنجایش نہیں"

پریسکا :۔ لیکن وہ اتنے زمانہ تک زندہ کیونکر رہے ؟

بادشاہ :۔ بیشک ۳۰۰ سال تک غار کے اندر زندہ رہنا سخت حیرتناک امر ہے۔

غالیاس :۔ اے آقا اس میں حیرت کی کیا بات ہے، ہندوستان کی قدیم کتابوں سے بھی ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔

بادشاہ :۔ وہ کیا ؟

غالیاس :۔ جاپان کی مذہبی کتابوں میں تحریر ہے کہ میکاڈو یوریاکو کے اکیسویں سال حکومت میں ایک نوجوان شکاری اوراشیما جو شہر یوشاکا رہنے والا تھا اپنی کشتی میں شکار کے لئے نکلا اور پھر نہ واپس آیا، نہ اسکا کوئی حال معلوم ہوسکا۔ اس نے چارسو سال کے بعد میکاڈو جونجوا کے زمانہ میں وہ پھر ظاہر ہوا،

پریسکا :۔ یہ نوجوان چار صدی تک کہاں رہا

غالیاس :۔ مجھے اس سے زیادہ اور کوئی حال معلوم نہیں

پریسکا :۔ اے غالیاس، تیرا ہر علم ناقص ہے اور تو جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل سطحی ہوتا ہے

غالیاس :۔ اے شاہزادی، بات یہ ہے کہ آپ کی ذہانت کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتی ورنہ جو کچھ میں نے کہا اس کے سمجھ میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں

بادشاہ :۔ کیا واقعی اور ملکوں میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں

غالیاس :۔ اے آقا کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اس نوع کی روایات نہ پائی جاتی ہوں اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے

بادشاہ :۔ پھر انتظار کیا ہے، تم جاکر ان کو یہاں کیوں نہیں لے آتے ؟

(باہر سے ہنگامہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

بادشاہ :۔ غالیاس، جاؤ دیکھو یہ کیسا شور ہے،

پریسکا :۔ اباجان، کیا یہ لوگ واقعی انسان ہیں

بادشاہ :۔ بیٹی، ڈرو نہیں، یہ واقعی انسان ہیں

(غالیاس گھبرایا ہوا واپس آتا ہے)

غالیاس :۔ "وہی ہیں وہی"

بادشاہ :۔ کون ؟

غالیاس :۔ وہی اصحاب کہف

(پریسکا کے منہ سے ہلکی چیخ کی آواز نکل جاتی ہے)

بادشاہ :۔ (گھبراکر) وہ یہاں کیونکر آگئے ؟

غالیاس :۔ لوگ انھیں پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں اور اب شاید قصر کے اندر پہونچ گئے ہوں گے،

پریسکا :۔ (ڈرتی ہوئی، غالیاس، او غالیاس، ادھر آ، میرے پاس آکر کھڑا ہو جا، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

غالیاس :— (جوش کے ساتھ بادشاہ سے) اے آقا، چلئے ہم سب ان کا استقبال کریں

بادشاہ :— (کچھ سوچتا ہوا) ہاں آؤ چلیں

پریسکا :— اباجان آپ نہ جائیے، آپ کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے کوئی خوف ہے۔

بادشاہ :— مجھے ؟

پریسکا :— ہاں، اباجان، آپ کو، میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ آپ ڈر رہے ہیں

غالیاس :— اے شہزادی، ہمارا بادشاہ مومن و دیندار ہے، اسے کیا خوف ہو سکتا ہے۔

بادشاہ :— ٹھیک ہے اے غالیاس بالکل ٹھیک ہے،

(ہنگامہ کی آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے)

غالیاس یہ کیا ہے

غالیاس :— وہی ہیں، آیئے جلدی قدم بڑھاکر انھیں لے آئیں

پریسکا :— (غالیاس کا ہاتھ پکڑ کر) نہیں غالیاس، تم نہ جاؤ میں تنہا نہیں رہ سکتی

(باہر سے مشلینا کی آواز کانوں میں آتی ہے)

مشلینا :— اے یملیخا، یہاں تو سب وہی ہے جو ہم کل چھوڑ گئے تھے۔ کوئی چیز بدلی ہی نہیں،

مرنوش :— واقعی، یہ کمرہ تو بالکل جوں کا توں ویسا ہی ہے

(تینوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں اس حال میں کہ سر کے بال
کھلے ہوئے پریشان ہیں، داڑھیاں سینوں پر لٹک رہی ہیں قدیم
وضع کے کپڑے جسم پر ہیں اور لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں
پریسکا ان کو دیکھتے ہی چیخ اٹھتی ہے اور غالیاس کا دامن پکڑ لیتی ہے)

مشلینا :— (بے اختیارانہ انداز سے) آہ، اے پریسکا،

پریسکا :— (انتہائی اضطراب کے ساتھ غالیاس سے) اے غالیاس تو نے سنا یہ تو مجھے جانتا ہے میرا نام لیکر پکارتا ہے

غالیاس :— ہاں، ہاں کیوں نہیں، یہ لوگ ولی ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔

(شکاری آگے بڑھکر بادشاہ سے مخاطب ہوتا ہے)

شکاری :— اے آقا، ہم لوگ ان کو غار سے یہاں لائے ہیں تاکہ بادشاہ خود اُن کے باب میں کوئی فیصلہ کرے

مرنوش :— (مشلینا کے کان میں) معلوم ہوتا ہے دقیانوس کا خلیفہ یہی ہے،

(مشلینا جو سوائے شاہزادی کے اور تمام دنیا کو محو کئے ہوئے ہو
پھر پریسکا کا نام لیکر پکار اٹھتا ہے)

پریسکا :- اے غالیاس، خدا کے لئے مجھے یہاں سے نکال۔ یہ شخص تو مجھے بری طرح گھور رہا ہے

(پریسکا جلدی سے دروازہ کھولکر اندر چلی جاتی ہے اور مشلینا اسکی طرف دیکھتا رہتا ہے گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے)

بادشاہ :- (آگے بڑھکر) اے مقدس بزرگو میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جو تمنا اس سے قبل میرے آباؤ اجداد کے زمانہ میں پوری نہ ہوسکتی تھی وہ آج میرے زمانہ میں پوری ہو رہی ہے۔

یملیخا :- (بادشاہ کی طرف اشارہ کرکے مرنوش سے) ذرا اس کا لباس تو دیکھو، یہ ہم کس ملک میں آ گئے ہیں

بادشاہ :- بیشک یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ آپ میرے آباؤ اجداد کے زمانہ میں ظاہر نہیں ہوئے حالانکہ وہ بھی مسیحی تھے اور میں بھی مسیح کا ماننے والا ہوں۔

یملیخا :- (خوش ہوکر مرنوش سے) تو مسیحی ہے،

مرنوش :- (اس کو خاموش کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مسیحی نہیں تو کیا کوئی اور ہے۔

بادشاہ :- (شکاری سے) اے شکاری میں تجھے انعام دوں گا کہ تو نے ان بزرگوں کی آرامگاہ کا پتہ چلایا۔

مرنوش :- (آپ ہی آپ) کیا یہ بادشاہ دیوانہ ہوگیا ہے

بادشاہ :- اے مقدس بزرگو یہ قصر آپ کا گھر ہے اور ہم لوگ سب آپ کے خادم، کوئی حکم دیجئے تاکہ ہم اس کی تعمیل کریں۔

مرنوش :- خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک ہی دن میں دقیانوس کو ہلاک کرکے اس کا جانشین ایسے دیندار و نیک دل شخص کو بنایا۔ اے بادشاہ میں ضرور یہاں قیام کرتا لیکن میرے اہل و عیال منتظر ہونگے اس لئے مجبور ہوں اور جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یملیخا :- میں بھی نہیں ٹھہر سکتا معلوم نہیں میری بھیڑوں کا گلہ کس حال میں ہوگا۔

بادشاہ :- (گھبرا کر) غالیاس - غالیاس -

مرنوش :- نہیں اس کی ضرورت نہیں، میں اپنے گھر کا راستہ اچھی طرح جانتا ہوں، خود چلا جاؤں گا۔

(مرنوش اور یملیخا دونوں یکے بعد دیگرے باہر چلے جاتے ہیں)

مشلینا :- اے بادشاہ میں اپنے حجرہ میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کپڑے بدلوں گا، بال درست کرونگا اور نہاؤنگا

تاکہ شاہزادی مجھ سے نفرت نہ کرے۔

بادشاہ :- (گھبرایا ہوا) غالیاس، غالیاس

مشلینا :- نہیں اس کی حاجت نہیں، مجھے اپنا حجرہ معلوم ہے

بادشاہ :- (دروازہ کے پاس جاکر) غالیاس

غالیاس :- (باہر سے) حاضر ہوا اے آقا (سامنے آکر) کیا حکم ہوتا ہے۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) یہ اصحاب کہف کہاں چلے گئے

(بادشاہ اشارہ سے لوگوں کو چلے جانے کا حکم دیتا ہے اور سب چلے جاتے ہیں)

بادشاہ :- اے غالیاس، یہ اصحاب کہف کیا سب پاگل ہیں ؟

غالیاس :- توبہ، توبہ، اے آقا یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ آخر چلے کہاں گئے۔

بادشاہ :- ایک اپنے گھر گیا، دوسرا اپنی بھیڑوں کو دیکھنے چلا گیا اور تیسرا بننے سنورنے کیلئے حجرہ میں داخل ہو گیا

(کمرہ سے باہر چیخ پکار کی آواز آتی ہے)

غالیاس :- "یہ کیا ہے"

(مرنوش پھر اندر داخل ہوتا ہے)

مرنوش :- اے بادشاہ مجھے ایک بات کہنا ہے وہ یہ کہ جب میں اپنے اہل و عیال کے پاس جاؤں گا تو کوئی تحفہ لیجانا ضروری ہے۔ میرے پاس کچھ سکے ضرور موجود ہیں لیکن وہ دقیانوس کے وقت کے ہیں اور تمہاری حکومت میں ان کا چلن باقی نہیں رہا، اس لئے سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں ؟

(بادشاہ حیرت سے اسے دیکھتا ہے)

مرنوش :- اے بادشاہ تم نے اچھا کیا کہ دقیانوس کے زمانہ کی ہر چیز بدل دی تاکہ ایک کافر و دیندار بادشاہ کے زمانہ میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک ہی ہفتہ میں لباس بھی بالکل بدل گیا، مکان کی حالت بھی اور ہو گئی، راستے بھی وہ نہ رہے اور شہر کا شہر دوسرا ہو گیا۔

بادشاہ :- (دروازہ کی طرف دیکھ کر) غالیاس، اے غالیاس۔

غالیاس :- (باہر سے، حاضر ہوا۔ (غالیاس داخل ہوتا ہے)

بادشاہ :- (مرنوش کی طرف اشارہ کرکے) دیکھو یہ کیا کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں

غالیاس :- (مرنوش کی طرف جھک کر) اے قدیس بزرگ آپ کو خبر نہیں کہ کتنی صدیاں آپ کے انتظار میں گزر چکی ہیں اور حقیقتاً یہ ہمارے بادشاہ کی خوش بختی ہے کہ آپ نے اس عہد میں ظہور فرمایا۔

مرنوش :- (آپ ہی آپ) یہ شخص پاگل تو نہیں ہوگیا۔

بادشاہ :- (غالیاس سے) یہ تو میں سب کہہ چکا ہوں۔ اب یہ دریافت کرو کہ آیندہ کیا ارادہ ہے۔

غالیاس :- ارادہ ؟ سوائے خدا کی عبادت اور گوشہ نشینی کے اور کیا ارادہ ان کا ہوسکتا ہے۔ مہمانخانہ میں ان کو ٹھہرایئے اور خدام کو ان کی خدمت پر امور کرکے ان کے احکام کی تعمیل کا اہتمام کیجئے۔

(مرنوش سے) اے قدیس محترم، آیئے تشریف لایئے۔

مرنوش :- (بغیر حرکت کئے ہوئے) کہاں ؟

غالیاس :- اپنی عبادتگاہ میں۔ (ہاتھ پکڑ کر لیجانا چاہتا ہے)

مرنوش :- (غصہ سے ہاتھ چھڑا کر بادشاہ سے) میں پوچھتا ہوں کہ مجھ پر اس دیوانہ کو کیوں مسلط کیا گیا ہے، میں تو اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور اسی کی اجازت چاہتا ہوں

بادشاہ :- (غالیاس) ۔ سنا تم نے یہ کیا کہہ رہے ہیں

غالیاس :- ہاں، ہاں میں جانتا ہوں آپ کا گھر کہاں ہے، آپ چلے جایئے گا۔ لیکن کچھ دیر تو ہم لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفید ہونے دیجئے۔

مرنوش :- (حیرت سے) کیا تم میرا گھر جانتے ہو ؟

غالیاس :- میں اور آپ کا مکان نہ جانوں

مرنوش :- میں نے تو سوائے چند خاص آدمیوں کے کسی اور کو بتایا ہی نہیں

غالیاس :- اے قدیس محترم، تو کیا میں ان مخصوص لوگوں میں سے نہیں ہوں، آپ کی یاد میں میرے بال تک سفید ہوگئے۔

مرنوش :- میں نے تو تمھیں آج سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں

غالیاس :- میں تو آپ کو روز خواب میں دیکھتا تھا اور جانتا تھا کہ آپ کا مسکن کہاں ہے

مرنوش :- بالکل غلط ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تمھیں کس کس نے میرے مسکن کا پتہ دیا ؟

غالیاس :- میرے ایمان نے

مرنوش :- خیر وہ تمھارے ایمان نے بتایا ہو یا کسی اور چیز نے، مجھے بتاؤ کہ میرا گھر کہاں ہے اور کس سمت میں ہے ؟

غالیاس :- (اوپر کی طرف گردن اٹھاکر) آسمان میں

مرنوش :- (بادشاہ سے) میں نہ کہتا تھا کہ یہ شخص دیوانہ ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے

بادشاہ :۔ (غالیاس سے) تم ٹھہرو، میں جاتا ہوں
غالیاس :۔ (گھبراکر) اے مولا، تو کیا آپ مجھے یہاں تنہا چھوڑے جاتے ہیں۔
(بادشاہ جانے لگتا ہے لیکن دفعتہً یلیخا کے اندر آجانے سے رک جاتا ہے)
یلیخا :۔ (بادشاہ اور غالیاس کی طرف اشارہ کرکے۔ مرنوش سے) یہ آپ بھی کن لوگوں سے باتیں کر رہی ہیں؟
(بادشاہ اور غالیاس خوفزدہ دروازہ کھولکر نکل جاتے ہیں)
مرنوش :۔ یلیخا، کیا بات ہے!
یلیخا :۔ کچھ نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آیئے غار میں واپس چلیں۔ یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔
مرنوش :۔ کیوں؟
یلیخا یہ دنیا ہی کچھ اور ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ کہاں آگیا۔
مرنوش :۔ میں سمجھا نہیں، صاف صاف کہو
یلیخا :۔ یہ بتایئے کہ ہم لوگ غار میں کتنے دن رہے،
مرنوش :۔ یہی کوئی ہفتہ عشرہ
یلیخا :۔ اے مرنوش، ہم لوگ سب مر چکے ہیں، پورے تین سو سال مرے ہوئے ہو چکے ہیں اور یہ ہم نہیں ہیں بلکہ ہمارے بھوت ہیں جو چل پھر رہے ہیں،
مرنوش :۔ یلیخا، کیا تو کچھ پی گیا ہے؟
یلیخا :۔ میں پی وی کچھ نہیں گیا ہوں، ذرا باہر شہر میں نکل کے تو دیکھئے کہ کیا رنگ ہے، وہاں پہونچکر سب سمجھ میں آجائے گا۔
مرنوش :۔ کیا؟
یلیخا :۔ یہی کہ اب اس شہر میں ہم ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔
مرنوش :۔ کیوں، کیا یہاں انسان آباد نہیں ہیں، کیا، روم روم نہیں رہا آخر بات کیا ہے؟
یلیخا :۔ انسان تو ہیں لیکن نہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں نہ ہم ان کی
مرنوش :۔ اچھا تو ان سے بات نہ کر اور اپنے گھر میں جاکر بیٹھ رہ۔ تیرے اہل و عیال تو ہیں نا؟
یلیخا :۔ اب تین سو سال کے بعد اہل و عیال کہاں
مرنوش :۔ اے شقی، یہ تو کیا کہہ رہا ہے،
یلیخا :۔ تنہا میں ہی شقی نہیں، ہم تینوں شقی ہیں اور غریب قطمیر بھی ہمارے ساتھ شقی ہوگیا ہے۔ اب سوائے

غار سے اور کہیں ہم لوگوں کا ٹھکانا نہیں۔ میں اگر یہاں رہا بھی تو فوراً مر جاؤں گا۔

مرنوش :۔ کیا تو پاگل ہوگیا ہے ؟

یملیخا :۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ تو غار لوٹ چلئے۔ وہی ہماری کھوئی ہوئی دنیا ہے اور وہیں ہمارا ٹھکانا۔

مرنوش :۔ کیا کوئی انسان باور کر سکتا ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ تیری نظریں دھوکا کھاتی ہیں، دھوکا!"

یملیخا :۔ خود باہر نکل کر دیکھئے تو معلوم ہو کہ میری نظر دھوکا کھا رہی ہے یا ساری دنیا کی۔ لوگوں کے لباس بدل گئے، مکان کی صورتیں اور ہوگئیں، شہر کچھ کا کچھ ہوگیا

(مشلینا داخل ہوتا ہے جس کی داڑھی مونچھ صاف ہے اور نئے قسم کا لباس پہنے ہوئے ہے)

دیکھو، آجکل کے لوگوں میں سے یہ بھی ایک ہے۔

مرنوش :۔ (مشلینا سے) تم کون ہو۔

مشلینا :۔ (مسکراتا ہوا) میں ہوں، مشلینا، تم نے پہچانا نہیں ؟

مرنوش :۔ یہ تم بدل کیسے گئے

مشلینا :۔ میں نے استرا طلب کر کے داڑھی مونچھ صاف کی، کپڑے منگا کر پہنے لیکن یہ بھی تمھیں معلوم ہے کہ ہم لوگ غار میں کتنے دن رہے

مرنوش :۔ یملیخا کہتا ہے کہ تین سو سال سے زاید زمانہ گزرا۔

مشلینا :۔ ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں، جب تک پریسکا زندہ ہے، میں وہی ہوں اور زمانہ وہی۔

مرنوش :۔ تو یوں کہو کہ یہ تمام بناؤ سنگھار اس لئے تھا۔ میں بھی اسی طرح بن سنور کر اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤں گا۔

مشلینا :۔ اور یملیخا بھی ؟

یملیخا :۔ اے نوجوانو، مجھے تو تم میرے حال پر چھوڑ دو۔ تین سو سال کے بڈھے پر رحم کرو۔

مرنوش :۔ یملیخا کو چھوڑ دو اس کا کون ہے جس کے لئے وہ بنے سنورے گا۔

(یملیخا چلا جاتا ہے اور مشلینا و مرنوش اسے دیکھتے رہتے ہیں)

تیسرا ایکٹ

(قصرِ شاہی کا کمرہ ہے اور وقت رات کا۔ روشنی سے مکان جگمگا رہا ہے
اور مشلینا بیتابانہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ غالیاس نمودار ہوتا ہے)

مشلینا :۔ (غالیاس کی طرف بڑھتے ہوئے)۔ شاہزادی کہاں ہے؟

غالیاس :۔ اے قدیس،

مشلینا :۔ کیا تو نے سُنا نہیں جو میں نے کہا؟

غالیاس :۔ ہاں، سُنا

مشلینا :۔ پھر تو نے کیا جواب دیا؟

غالیاس :۔ کچھ نہیں، اے قدیس

مشلینا :۔ کچھ نہیں! کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں شاہزادی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور آج رات کو اس سے ملنا ضروری ہے، چاہے کچھ ہو۔

غالیاس :۔ اے قدیس،

مشلینا :۔ قدیس، قدیس بکے چلا جاتا ہے اور میری بات کا جواب نہیں دیتا، میں پوچھتا ہوں شاہزادی کہاں ہے، تو کہتا ہے۔ قدیس۔ خبردار جو اب مجھے قدیس کہا۔ میں قدیس نہیں ہوں۔

غالیاس :۔ ہاں، اے قدیس

مشلینا :۔ پھر وہی۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ تو یہاں قصر میں کرتا کیا ہے؟

غالیاس :۔ شاہزادی کا اتالیق ہوں

مشلینا :۔ اتالیق، شاہزادی کا اتالیق! میں نے تو سوائے آج کے تجھے قصر میں کبھی دیکھا نہیں

غالیاس :۔ اے قدیس، میں، میں۔

مشلینا :۔ پھر وہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ شاہزادی کہاں ہے اور تو پاگلوں کی طرح ایک ہی بات رٹتا چلا جا رہا ہے۔ چل دور ہو یہاں سے۔

(غالیاس جانے لگتا ہے اور مشلینا اس کو روک کر کہتا ہے)

مرقش کی بھی کچھ خبر لی یا نہیں۔ کل سے وہ گھر گیا ہوا ہے اور اب تک لوٹا نہیں۔

غالیاس :۔ اسے قدیس، مجھے نہیں معلوم

مشلینا :۔ اور وہ غلام جو اس کے ساتھ ہدایا لیکر گیا تھا وہ بھی لوٹا یا نہیں ؟

غالیاس :۔ اے قدیس، مجھے معلوم نہیں

مشلینا :۔ ہاں، تجھے کیا معلوم، جاہل کہیں کا کمبخت تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے

غالیاس :۔ کون، وہ، اے قدیس !

مشلینا :۔ شاہزادی اور کون ؟

غالیاس :۔ بادشاہ کے پاس ہے

مشلینا :۔ ایسے ناوقت بادشاہ کے پاس اس کا کیا کام ؟

غالیاس :۔ بادشاہ رات کو کبھی کبھی اس کو بلا لیتا ہے تاکہ وہ اسے کچھ پڑھکر سُنائے

مشلینا :۔ خوابگاہ میں ؟ کیا یہی عہد مقدس ہے

غالیاس :۔ بیشک شاہزادی مسیحی مذہب رکھتی ہے اور عہد مقدس کی پابند ہے

مشلینا :۔ یہ تجھے کیونکر معلوم ہوا۔ کیا اس نے تجھ سے کبھی کچھ ذکر کیا تھا

غالیاس :۔ ہاں

مشلینا :۔ (غالیاس کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ، تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ مجھ سے چھپاؤ نہیں، صاف صاف بتاؤ کہ بادشاہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں۔

غالیاس :۔ اسے قدیس، بادشاہ بڑا دیندار مسیحی ہے

مشلینا :۔ تو کیا یہ دقیانوس کے خاندان کا نہیں ہے،

غالیاس :۔ بت پرست دقیانوس کا خاندان اور ہمارا بادشاہ ! توبہ، توبہ۔ یہ آپ نے کیا خیال فرمایا،

مشلینا :۔ ہاں، بیشک یہ بادشاہ، دقیانوس کے خاندان کا نہیں ہو سکتا، کیونکہ میں نے بھی اس سے قبل اُسے کبھی نہیں دیکھا لیکن حیرت یہ ہے کہ دو دن کے اندر مسیحی افواج آئیں بھی، دقیانوس کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ دیا اور ان کا سردار شاہزادی پر ایکا یک قابض بھی ہو گیا یہاں تک کہ وہ رات کو اپنی خوابگاہ میں اسے بلا کر افسانے سنتا ہے۔ لیکن اسے غالیاس کیا تم کہہ سکتے ہو کہ وہ مجبوراً اسکے پاس جاتی ہے یا اپنی خوشی سے، کیا اس نے اپنا عہد توڑ دیا ؟

غالیاس :۔ اسے قدیس، وہ اپنے عہد پر اسی طرح قائم ہے جس طرح اس کی وادی پابند تھی۔ کاہن سے پوچھو اگر وہ زندہ ہو کہ وہ ہر صورت و شکل و مزاج و طبیعت الغرض ہر چیز میں بالکل اپنی پروادی پر گئی ہے۔

مشلینا :۔ پردادی ؟ کونسی پردادی ؟
غالیاس :۔ پریسیکا
مشلینا :۔ یہ آخر تو بک کیا رہا ہے، کچھ دماغ خراب ہوگیا ہے، یا شراب پی لی ہے
غالیاس :۔ اے قدیس، میں جو کچھ کہتا ہوں، سچ کہتا ہوں۔ کاہن نے اس کی پیدائش کے دن یہی کہا تھا
مشلینا :۔ اچھا اب تم جاؤ، میرا دماغ خراب نہ کرو،

(غالیاس جانے لگتا ہے۔ لیکن مشلینا اسے پھر روکتا ہے)

اے بڈھے، ادھر سُن، کیا شاہزادی بادشاہ کے پاس سے لوٹ کر اپنے کمرہ میں جائیگی یا نہیں،

غالیاس :۔ ہاں، جائے گی
مشلینا :۔ اور وہ اسی کمرہ سے گزرے گی
غالیاس :۔ ہاں، اے قدیس،
مشلینا :۔ اچھا تو اب تم جاؤ، تمھاری ضرورت نہیں۔ میں اس کا یہیں انتظار کروں گا:

(دفعتہً ایک آواز باہر سے آتی ہے)

مرنوش :۔ (باہر سے) مشلینا۔ مش — لی — نا،
مشلینا :۔ (آپ ہی آپ) مجھے کون پکارتا ہے،
مرنوش :۔ (اندر آتے ہوئے) مشلینا،
مشلینا :۔ "مرنوش"

(مرنوش داڑھی مونچھ صاف کئے ہوئے نئے لباس میں کراہتا ہوا نمودار ہوتا ہے)

یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے
مرنوش :۔ (روتے ہوئے) میرا لڑکا مرگیا
مشلینا :۔ "کب"

(مرنوش زار زار رونے لگتا ہے)

مشلینا :۔ مرنوش رو نہیں، صبر کرو، تمھاری بیوی موجود ہے تو اور اولاد ہوجائے گی
مرنوش :۔ (دھاڑیں مارتے ہوئے) وہ بھی مرگئی،
مشلینا :۔ (حیرت سے) ارے۔ کیا ان سب کو کسی نے قتل کردیا۔ گھر میں کسی سے کچھ پتہ چلا یا نہیں۔

مرنوش :- گھر کہاں ؟ جہاں گھر تھا وہاں اب ایک بازار آباد ہے
مشلینا :- یہ تمام حال تمھیں معلوم کیسے ہوا ؟
مرنوش :- وہیں بازار میں ایک نہایت ضعیف العمر شخص ہے اسی سے پتہ چلا
مشلینا :- کیا یہ تمام سانحے اس کے سامنے ہوئے ہیں
مرنوش :- نہیں۔ یہ بات نہیں، بلکہ جب میں نے اپنے بیٹے کا نام بتایا تو اس نے کہا کہ ہاں میرے اجداد میں سے ایک شخص ضرور اس نام کا تھا، لیکن جب رومی فوجیں یہاں فاتحانہ داخل ہوئیں تو اس وقت اس کا انتقال ہوگیا۔
مشلینا :- تو کیا تمھارا ابھی خیال وہی ہے جو کل یلیخا نے ظاہر کیا تھا کہ ہم صدیوں تک سوتے رہے ہیں۔
مرنوش :- اب اس میں شک کی گنجائش بھی کیا ہے،
مشلینا :- افسوس ہے تمھارا دماغ بھی یلیخا کی طرح خراب ہوگیا ہے،
مرنوش :- ہاں ہوگیا ہوگا، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے لئے اب اس نئی دنیا میں کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ آؤ مشلینا چلیں، یہاں زندگی بسر کرنا دشوار ہے۔
مشلینا :- تم بیوقوف ہو۔ مانا کہ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ لیکن ابھی تو تم جوان ہو، میں بھی جوان ہوں۔ جب تک احساس نہ بدلے، زمانہ نہیں بدلتا۔ آؤ اس نئی دنیا میں اک نئی زندگی پھر شروع کریں،
مرنوش :- نئی زندگی ! آہ، وہ زندگی جو ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے بالکل بیکار ہے۔ عدم محض ہے ہم لوگ زمانۂ حال کی چیز نہیں ہیں بلکہ ماضی کی ملکیت ہیں اور ہم کو اسی طرف لوٹ جانا ہے اے مشلینا الوداع (مرنوش باہر جاتا ہے اور مشلینا متفکرانہ حالت میں کھڑا ہوا ہے کہ پریسکا اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے)

پریسکا :- (گھبرا کر) ہائیں، یہ کون ہے ؟
مشلینا :- (آگے بڑھتے ہوئے) اے پریسکا آخر کار تم آ ہی گئیں۔
(پریسکا مبہوت کھڑی ہوئی ہے)
میں تو بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن تم ایسی بھیانک کیوں دیکھ رہی ہو، بولو، پریسکا بولو
پریسکا :- (خوفزدہ آواز سے) اے قدیس،
مشلینا :- میں قدیس تو نہیں ہوں
پریسکا :- کیا تم وہ ڈراؤنی صورت والے قدیس نہیں ہو جس کو میں نے کل دیکھا تھا۔

مشلینا :- ہاں وہی ہوں،

پریسکا :- مگر آج تو تم بالکل بدل گئے، بڑھے سے جوان ہو گئے

مشلینا :- مگر پھر بھی تم نے مجھے نہیں پہچانا، حالانکہ میں تمھیں پہچانتا ہوں،

پریسکا :- تم مجھے پہچانتے ہو۔ حیرت ہے۔ تم کون ہو،

مشلینا :- اے پریسکا، تو کیوں اس عورت کی طرح کر رہی ہے جو بیوفائی کرتی ہے اور سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ تو نے محبت کی خیانت کی ہو، لیکن میں یقین کرنے کے لئے طیار نہیں۔

پریسکا :- یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھ سے آج تک کسی نے ایسی باتیں نہیں کیں،

مشلینا :- تو کیا واقعی تم اپنا عہد واپس لینا چاہتی ہو

پریسکا :- عہد! واپس!! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

مشلینا :- کیا تم نے یہ عہد نہ کیا تھا کہ سوائے میرے کسی اور سے شادی نہ کرو گی۔

پریسکا :- (حیرانی سے) اب مجھے بھی یقین آگیا کہ واقعی تم پاگل ہو

مشلینا :- (خشونت کے ساتھ) بیشک پاگل ہوں، لیکن پاگل ہونا خاین و بیوفا ہونے سے بہتر ہے۔

پریسکا :- تو میں بیوفا ہوں، میں نے خیانت کی ہے! بتاؤ کیا بیوفائی میں نے کی ہے میں کس خیانت کی مجرم ہوں،

مشلینا :- پریسکا! کیا تو پریسکا نہیں ہے؟

پریسکا :- ان فضول باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں نے کیا خیانت و بیوفائی کی ہے،

مشلینا :- جانے دو، تفریح ہو چکی (آگے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) آؤ ادھر میرے پاس آؤ"

پریسکا :- (پیچھے ہٹتے ہوئے) کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، الگ ہٹ کے بات کرو، یہ کیا تمیز ہے؟

مشلینا :- پریسکا یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ شرم و حیا تمھاری کیا ہو گئی، وہ تمھاری ملکوتی آواز کی نرمی کہاں چلی گئی؟ وہ عہد محبت جو تم نے مجھ سے کیا تھا کیوں بھول گئیں۔

پریسکا :- پھر وہی دیوانگی کی باتیں شروع کر دیں،

مشلینا :- اچھا اگر تم نے عہد شکنی نہیں کی تو بتاؤ تم ابھی کس کے پاس تھیں

پریسکا :- اپنے باپ کے پاس اور کس کے پاس؟

مشلینا :- پریسکا، نہیں میرا مدعا یہ دریافت کرنا ہے کہ رات کو تم جس کے کمرے میں کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں وہ کون ہے!

پرسکا :— میرا باپ ہے - اور جب تک میں کچھ پڑھکر اسے سناتی نہیں اسے نیند نہیں آتی
مشلینا :— تو کیا یہ دقیانوس نہیں ہے
پرسکا :— دقیانوس کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہوگئے، میں اس کی بیٹی کیونکر ہوسکتی ہوں -

(تھوڑے تامل کے بعد دفعتہً بلند آواز سے)

اچھا اب میں سمجھی کہ تم کس خبط میں مبتلا ہو،

مشلینا :— کیا. جلدی بتاؤ تم کیا سمجھیں؟
پرسکا :— تم جس پرسکا کا خواب دیکھ رہے ہو وہ میں نہیں ہوں، کوئی اور تھی،
مشلینا :— یہ کیا؟
پرسکا :— وہ یہ کہ تمہاری عمر ۳۰۰ سال کی ہے اور اتنی مدت تک تم غار میں سوتے رہے - وہ پرسکا جس کا خیال تم دل میں لئے ہوئے ہو، دقیانوس بت پرست کی بیٹی تھی جس نے دین مسیحی اختیار کرلیا تھا،
مشلینا :— اور صرف میری وجہ سے
پرسکا :— ہاں، میرا اتالیق ثالیاس یہی کہتا ہے (اپنی گردن کی طلائی صلیب چھوتے ہوئے) یہ صلیب خواب میں آکر مسیح نے اس کو دی تھی
مشلینا :— اے پرسکا، یہ صلیب میں نے ہی تجھکو دی تھی، کیا تجھے یاد نہیں
پرسکا :— (مسکراتے ہوئے) اے مقدس راہب، تیری پرسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہو گئے.
مشلینا :— (حیرت سے) پرسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہوگئے — یہ میں کیا سن رہا ہوں،
پرسکا :— لیکن تم کو خوش ہونا چاہئے کہ وہ آخر وقت تک اپنے عہد پر قایم رہی اور اسی کمرہ میں اس نے اپنی جان دی - کیا تم دونوں یہیں ملا کرتے تھے؟
مشلینا :— ہاں، ہاں، یہی کمرہ ہے اور یہی جگہ جہاں ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنا دکھ درد کہا کرتے تھے -
پرسکا :— تو جاؤ اور اس پر آنسو بہاؤ، کیونکہ اب وہ نہیں ہے، (جانے لگتی ہے)
مشلینا :— (پرسکا کا دامن پکڑ کر) اے پرسکا، خدا کے لئے میرے پاس سے نہ جاؤ
پرسکا :— (دامن جھٹک کر) میں نے ابھی تم سے کہا نہیں کہ میں وہ پرسکا نہیں ہوں؟
مشلینا :— میں کیسے مان لوں کہ تم وہ پرسکا نہیں ہو، وہی نام، وہی صورت و شکل، وہی عمر اور وہی..."

پریسکا :- تم کو معلوم نہیں کہ جس وقت میں پیدا ہوئی تو کاہن نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ میری صورت بالکل دقیانوس کی بیٹی کی سی ہے اور اس لئے میرا نام پریسکا رکھ دیا گیا، تم یہاں سے جاؤ، تمھاری پریسکا یہاں نہیں ہے، (پریسکا واپس جانے لگتی ہے)

مشلینا :- (تنہا) یا اللہ، یہ وہ پریسکا نہیں ہے تو پھر کون ہے۔ کیا میں سو رہا ہوں، کوئی خواب دیکھ رہا ہوں کیا میں واقعی غار میں ۳۰۰ سال تک سوتا رہا۔ اے مرنوش تم کہاں ہو، اے یملیخا جواب دے۔ میں بھی تمھارے پاس آتا ہوں۔ تم نے سچ کہا تھا کہ ہمارا اس زمانہ سے کوئی واسطہ نہیں، ہم اسوقت زندہ رہنے کے اہل نہیں، اچھا تو میں آتا ہوں، گھبراؤ نہیں،

(چلا جاتا ہے اور غالیاس اندر داخل ہوتے ہوئے پریسکا سے ملتا ہے)

غالیاس :- (پریسکا سے) قدیس کہاں ہیں!

پریسکا :- گئے،

غالیاس :- اے شاہزادی اب اپنے کمرہ میں تشریف لیجائیے بہت دیر ہو گئی ہے،

پریسکا :- نہیں آج میں سونا نہیں چاہتی،

غالیاس :- یہ آپ یہاں کب اور کیونکر چلی آئیں، اتفاق سے میری آنکھ جھپک کر کھلی تو میں نے آپ کو نہ پایا۔

پریسکا :- غالیاس

غالیاس :- شاہزادی کیا ارشاد ہے

پریسکا :- غالیاس!

غالیاس :- کیا حکم ہے اے شاہزادی، فرمایئے

پریسکا :- نہیں کچھ نہیں، تم جاؤ سو جاؤ

غالیاس :- اور آپ یہاں تنہا رہیں گی

پریسکا :- ہاں

غالیاس :- اے شاہزادی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے خیر تو ہے، میں نے تو اس حال میں آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟

پریسکا :- کیا میں تم سے ایک راز کی بات کہوں، سنو گے

غالیاس :- کیوں نہیں اے شاہزادی

پریسکا :- تو سنو کہ میں نے اسے پا لیا اور پھر چشم زدن میں ہاتھ سے کھو دیا

غالیاس :- اے شاہزادی کیا پا لیا؟

پرلیسکا :- پالیا نہیں۔ کھو دیا اور ہمیشہ کے لئے۔ ہاں، مجھے کھو دینا چاہئے۔

غالیاس :- اے شاہزادی کچھ تو کہئے کہ آپ نے کیا چیز پائی تھی؟

پرلیسکا :- اپنے خواب کی تعبیر

غالیاس :- خواب، ہاں مجھے یاد آگیا کہ آپ نے ایک ڈراؤنے خواب کا ذکر کل مجھ سے کیا تھا، لیکن اے شاہزادی، خواب اور وہ بھی جوانی کے خواب قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے، آپ کیوں اتنی پریشان ہیں

پرلیسکا :- (حسرت کے لہجہ میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) جوانی کے خواب ! قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے اے غالیاس تو نے سچ کہا،

غالیاس :- آپ نے یہی خواب دیکھا تھا نا کہ خدا نخواستہ، دشمنوں کو کسی نے زندہ دفن کر دیا ہے۔

پرلیسکا :- ہاں کل یہی خواب دیکھا تھا اور آج اس کی تصدیق بھی ہوگئی

غالیاس :- (گھبرا کر) یہ کیا، میں بالکل نہیں سمجھا اے شاہزادی

پرلیسکا :- کچھ نہیں، تم جاؤ،

غالیاس :- یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، آپ تو بالکل انھیں قدیسوں کی سی گفتگو کر رہی ہیں

پرلیسکا :- اے غالیاس تم کیوں اُن کی توہین کرتے ہو،

غالیاس :- حاشا، یہ آپ نے کیا فرمایا، میں اور قدیسوں کی توہین ! میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ قدیسوں کے لئے بہتر جگہ آسمان ہے نہ یہ کہ وہ زمین پر اُتر آئیں

پرلیسکا :- ہاں وہ زمین پر اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ آسمان پر لیجائیں

غالیاس :- یہ بڑی سعادت ہے اگر کسی کو نصیب ہو جائے

پرلیسکا :- بیشک یہ بڑی سعادت ہے لیکن اس خواہش کا پورا ہونا بہت دشوار،

غالیاس :- لیکن اے شاہزادی، کسی کو معلوم ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا کاہن نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ پرلیسکا سے بہت زیادہ مشابہ ہیں، پھر کیا یہ مشابہت بغیر کسی سبب کے ہو سکتی ہے

پرلیسکا :- میں نہیں سمجھی اس سے تمھارا کیا مطلب ہے

غالیاس :- اے شاہزادی میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان قدیسوں کی نائب و خلیفہ ہوں گی

پرلیسکا :- خلیفہ ! اُن کی نائب و خلیفہ، اے غالیاس تو پاگل تو نہیں ہوگیا ہے۔ میں اس مصیبت سے موت کو ترجیح دوں گی

غالیاس :- مصیبت، یہ آپ کیا فرماتی ہیں، توبہ کیجئے، توبہ !

پریسکا :- غالیاس، تم بیوقوف ہو، بالکل نہیں سمجھتے، تمھیں کیا معلوم کہ اس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں اور میرے دل کا کیا حال ہے۔ (رونے لگتی ہے)

غالیاس :- اے شاہزادی خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ اس نے کیا کہا اور آپ کیوں رو رہی ہیں؟

پریسکا :- اس نے کہا کہ دقیانوس کی بیٹی پریسکا وفادار تھی اور میں نہیں ہوں، اس کی آواز میں ملکوتی نرمی تھی اور میری آواز میں نہیں ہے، وہ حیا اور غیرت والی تھی اور میں ایسی نہیں ہوں۔

غالیاس :- اے شاہزادی کیا یہ قدیس اُس سے واقف ہے

پریسکا :- (غضبناک ہوکر) عجیب احمق ہو، یہ قدیس اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے۔ اسی قدیس نے اس کو یہ طلائی صلیب دی تھی اور وہ آخر وقت تک اس کا انتظار کرتی رہی

غالیاس :- مشلینیا قدیس بہت عجیب و غریب انسان ہے۔

پریسکا :- ہاں، مشلینیا، یہ خوبصورت نوجوان میری پردادی پریسکا کا منگیتر ہے اور اب بھی اس کی محبت کا وہی عالم ہے۔ اچھا اب تم جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو

غالیاس :- ٹھیک ہے "کتاب راہبین" میں لکھا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی زمانہ میں پائے جاتے تھے،

پریسکا :- (بگڑکر) میں نے تم سے کہا نہیں کہ چلے جاؤ

(غالیاس چلا جاتا ہے، پریسکا ایک ستون پر سر رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مشلینیا پھر داخل ہوتا ہے)

پریسکا :- (گھبرا کر) ہائیں، تم پھر لوٹ آئے، میں نے تم سے کہا نہیں کہ وہ پریسکا نہیں ہوں

مشلینیا :- (نہایت سنجیدگی سے) میں جانتا ہوں

پریسکا :- پھر کیوں واپس آئے

مشلینیا :- میں اس جگہ سے دور نہیں رہ سکتا

پریسکا :- اس لئے کہ اس کی یادگار چیزیں تمھیں یہاں نظر آتی ہیں

مشلینیا :- کسکی

پریسکا :- جس سے تم محبت کرتے تھے

مشلینیا :- مگر وہ مری کب ہے

پریسکا :- یہ کیا،

مشلینیا :- مرا تو میں ہوں

پرسیکا :— (ڈرکر) یہ تم مجھے کس طرح دیکھ رہے ہو کیا تم اس کی تمثال و شبیہ سمجھکر میرے پاس رہنا چاہتے ہو میں کبھی اس کو گوارا نہ کروں گی

مشلینا :— کاش تم تمثال ہوتیں۔ مگر تم تو زندہ ہو

پرسیکا :— جاؤ، جاؤ، مجھ سے دور رہو، میرا دل اُلٹا جاتا ہے،

مشلینا :— ڈرو نہیں، میں جانتا ہوں کہ میرے تمہارے درمیان ۳۰۰ سال کا فاصلہ حایل ہے۔

پرسیکا :— اے قدیس میں خوب سمجھتی ہوں کہ تم میری شخصیت کو اُس کی شخصیت سے ملانا چاہتے ہو، تم مجھے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو میرے اندر دیکھ رہے ہو تمہارے نزدیک وہ نہیں مری ہے بلکہ میں مر گئی ہوں، جاؤ یہاں سے نکل جاؤ، میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔

مشلینا :— پرسیکا — پرسیکا!

پرسیکا :— تم میرا نام اس طرح نہ لو جس طرح اس کا لیا کرتے تھے، مجھ سے تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے،

مشلینا :— نہیں، بیشک نہیں ہے،

پرسیکا :— پھر کیوں واپس آئے اور یہاں ٹھہرنے سے کیا فایدہ

مشلینا :— بیشک، کوئی فایدہ نہیں۔ (محبت آمیز عمیق نگاہوں سے پرسیکا کو دیکھتا ہے)

پرسیکا :— مجھے کیوں اس طرح گھور رہے ہو، ایسی نگاہوں سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو جبکہ میرے تمہارے درمیان کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مشلینا :— بیشک نہیں ہے، ۳۰۰ سال کا فاصلہ بہت ہوتا ہے۔ بڑا فرق ہے۔

پرسیکا :— یہ فرق ۳۰۰ سال ہی کا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ہے کہ تمہاری پرسیکا کی آواز میں ملکوتی نرمی تھی اور مجھ میں نہیں ہے، وہ عمیق قلب رکھتی تھی اور میں نہیں رکھتی، وہ غیرت و حیا والی تھی اور میں نہیں ہوں۔ تم اسی زمانہ میں اسی کے پاس واپس جاؤ، اب اس زمانہ میں یہ ساری چیزیں تمھیں نہیں مل سکتیں۔

مشلینا :— پرسیکا — !

پرسیکا :— میں نے ابھی تم سے کہا کہ مجھے اس طرح نہ پکارو، مجھے اس نام سے نفرت ہے

مشلینا :— لیکن یہ تو تمہارا ہی نام ہے

پرسیکا :— یہ بھی میری بدقسمتی ہے، کاش یہ نام کچھ اور ہوتا اور میری صورت کچھ اور ہوتی۔

مشلینا :— اگر ایسا ہوتا تو پھر میں تمھیں کہاں سے پاتا اور میرا بھی وہی حشر ہوتا جو مرنوش اور یملیخا کا ہوا۔

پرلیسکا :— پھر تم نے وہی کہا، یہ کہو کہ تم نے اس کو پایا، مجھے نہیں،

مشلینا :— ہاں، سچ کہتی ہو، اسی کو پایا (پرلیسکا رونے لگتی ہے)

مشلینا :— ہائیں، تم رو رہی ہو، میں نے تو تمھیں روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا،

پرلیسکا :— بیشک نہ دیکھا ہوگا، کیونکہ فرشتے نہیں روتے، وہ اتنے نازک ہوتے ہیں کہ رونا برداشت نہیں کر سکتے، آنسو کا ایک قطرہ ان کی لطیف ساخت کو مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔

مشلینا :— پھر تم کیوں روئیں

پرلیسکا :— (آنسو پونچھتے ہوئے) میں تو نہیں روئی

مشلینا :— اور یہ آنسو کیسے نکلے

پرلیسکا :— تمھاری بینائی زایل ہوگئی ہے

مشلینا :— سچ ہے، میں اندھا ہوں، لیکن تاریکی سے نہیں، روشنی کی زیادتی سے۔ میری بینائی نور کی کثرت سے زایل ہوئی ہے اور میرے سامنے اب آثار و حقایق کوئی چیز نہیں ہیں۔ ۲۰۰ سال کا زمانہ مجھے صرف ایک لمحہ نظر آتا ہے، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ تمھارے سامنے ہوں، میرا دل کتنا مسرور ہے کہ تم میرے سامنے ہو۔

پرلیسکا :— (جاتے ہوئے) اچھا تو تم یہاں رہو، میں جاتی ہوں۔

مشلینا :— اور میں ؟

پرلیسکا :— یہ میں کیا جانوں، مجھے اس سے کیا واسطہ

مشلینا :— ابھی نہ جا، اے پرلیسکا رحم کر، اتنی جلدی نہ کر

پرلیسکا :— آخر تمھارا ارادہ کیا ہے، تم چاہتے کیا ہو ؟ کیا تمھارے آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مشلینا :— ہاں، یہ پردے میں اٹھانا نہیں چاہتا، کیونکہ ایسا کرنا موت کو بلانا ہے، پھر تم کیا چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں۔

پرلیسکا :— اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو یقیناً میں ساوی دنیا میں اسکی روح سے ملنے کی کوشش کرتی۔

مشلینا :— میں اب بھی اسی ساوی دنیا میں ہوں اور تیرے ساتھ ہوں۔

(پرلیسکا بگڑ کر جانے لگتی ہے)

مشلینا :— پرلیسکا، خدا کے لئے مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں جہنم میں گر جاؤں گا

پرلیسکا :— (اپنی گردن سے طلائی صلیب نکال کر) لو یہ میں تمکو ایک چیز دیتی ہوں جو جہنم میں گرنے سے باز رکھے گی۔

مشلینا :— ہاں، یہی وہ صلیب ہے جو میں نے تجھے تحفتاً دی تھی۔

پریسکا :- (صلیب آگے بڑھاتے ہوئے) بلکہ میں بھی وہی ہوں جسکو یہ تحفہ دیا گیا تھا، لیکن اب میں اسے واپس کرتی ہوں

مشلینا :- یہ چیز تو تمھاری ہے

پریسکا :- ہوگی، لیکن میں اسے نہیں رکھ سکتی، اب یہ میرے جسم کو افعی کی طرح ڈستی ہے،
(اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
کیا یہ ہات وہ نہیں ہیں جنھوں نے ۳۰۰ سال قبل اس صلیب کو اس کے گلے میں ڈالا تھا

مشلینا :- (حیرت سے) ۳۰۰ سال

پریسکا :- اور کیا یہ وہ بانہیں نہیں ہیں جو اس کی نازک کمر میں حمایل ہوئی تھیں

مشلینا :- پریسکا یہ تم کیا کہہ رہی ہو

پریسکا :- اور کیا یہ وہ لب نہیں ہیں جو ——— ؟

مشلینا :- چپ رہو، خدا کے لئے چپ رہو

پریسکا :- اے میری پردادی کے منگیتر! کیوں ڈرتے ہو، خوف کی کیا بات ہے

مشلینا :- میں اب یہ باتیں نہیں سن سکتا،

پریسکا :- لیکن انھیں ہاتھوں سے تم میرے جسم کو چھونا ضرور چاہتے ہو۔ (اپنے جسم کی طرف اشارہ کرکے)
اے میری پردادی کے محبوب کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ جسم جس کے چھونے کے لئے تم اتنے بیتاب ہو اس کی کیا عمر ہے؟ اس پر ابھی صرف بیس بہاریں گزری ہیں

مشلینا :- (آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے) پریسکا، چپ رہو، یہ تم کیا کہہ رہی ہو

پریسکا :- یہ میں وہ کہہ رہی ہوں جس کا اس جسمانی و مادی دنیا میں کہنا ضروری ہے اور جس کے تلخ احساس کا انسان کو ہر وقت منتظر رہنا چاہئے

مشلینا :- بیشک سچ ہے اے پریسکا، مرنوش اور یلیخا نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم لوگ صرف زمانۂ ماضی کی ملکیت ہیں اور ہمارا حصہ اب اس دنیا میں کوئی نہیں، اچھا رخصت ——— خدا حافظ

(مشلینا آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ باہر جانے لگتا ہے،
پریسکا حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے اور جب وہ
چلا جاتا ہے تو آہستہ سے خود بھی "خدا حافظ" کہتی ہے)

چوتھا ایکٹ

(رقیم کا غار۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ یملیخا اور مرنوش مردوں کی طرح خاموش لیٹے ہوئے ہیں اور کتا بھی انھیں کے پاس بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ہر طرف گہرا سکون ہے۔)

مشلینا :۔ (کمزور آواز سے) مرنوش۔ (کوئی جواب نہیں ملتا) یملیخا، (کوئی جواب نہیں) میں موت کے آثار محسوس کر رہا ہوں (پھر کوئی جواب نہیں)۔ اے مرنوش، ہم کہاں ہیں؟ غار میں ہیں، کیا اب کبھی اسکو نہ چھوڑیں گے، اے مرنوش ہم کتنے دن یہاں رہے۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو دن (کوئی جواب نہیں) اے یملیخا وہ کھانا کہاں ہے جو تو لینے گیا تھا، مجھے بھوک لگی ہے میں مرا جا رہا ہوں (کوئی جواب نہیں)۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ ہم بہت سو لئے۔ اے نامعقولو اب اٹھوگے بھی یا نہیں۔ (مرنوش کو پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے)

مرنوش :۔ (نہایت کمزور آواز سے) اونہہ، یہ کون ہے؟

مشلینا :۔ میں ہوں مشلینا

مرنوش :۔ مجھے چھوڑ دو ہاتھ نہ لگاؤ، آہ — آہ،

مشلینا :۔ کیوں کیا ہوا، بیمار ہو، کراہتے کیوں ہو؟ سنو تو سہی میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے؟

مرنوش :۔ کیا؟

مشلینا :۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ عجیب و غریب وضع کے غار کے اندر داخل ہوئے اور ہمیں قصر شاہی تک لیگئے وہاں پہونچکر ہم نے ہر چیز بدلی ہوئی پائی۔ میں نے وہاں پریسکا، اپنی پریسکا کو بھی دیکھا لیکن اسنے مجھے پہچانا نہیں، وہ کہتی ہے کہ پریسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال کا زمانہ گزر گیا۔ گویا ہم اتنی مدت تک سوتے ہی رہے۔

مرنوش :۔ تم اسے خواب کہتے ہو؟ بیوقوف یہ حقیقت ہے۔

مشلینا :۔ بیوقوف تم ہو جو اسے حقیقت کہتے ہو، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ۳۰۰ سال تک سوتے رہنے کے بعد بھی جب اٹھوں تو اپنی پریسکا کو زندہ دیکھوں

مرنوش :۔ ہاں میں نے بھی ایسا ہی ایک خواب دیکھا ہے۔

مشلینا :- وہ کیا؟

مرنوش :- وہ یہ کہ میں بھی اپنے مکان پر پہونچا اور دیکھا کہ جہاں میرا گھر تھا اب وہاں بازار آباد ہے، اور ۳۰۰ سال ہوئے کہ میرا بیٹا ۶۰ سال کی عمر تک پہونچکر مر گیا۔ چنانچہ ان آنکھوں سے میں نے خود اس کی قبر دیکھی

مشلینا :- تمہارا بیٹا ۶۰ سال کا ہوکر مرا اور تم ابھی پچاس ہی سال کے ہو۔ یہ خواب نہیں تو کیا حقیقت ہے اچھا یملیخا سے پوچھو۔ یملیخا۔ اے یملیخا

یملیخا :- (کمزور آواز سے) یہ کون ہے جو مجھے [illegible] رہا ہے

مشلینا :- یملیخا، جاگو، ہم غار میں ہیں اور اب جاگ گئے ہیں

یملیخا :- کیوں، کیا کہتے ہو۔ اب ہم جاگ کر کیا کریں۔ [illegible] دیکھ چکے ہیں اس کے بعد اب زندہ رہنا بیکار ہے

مرنوش :- تم نے بھی کچھ دیکھا ہے، بتاؤ کیا دیکھا

یملیخا :- اب کیا بتاؤں، شہر طرسوس بدل گیا، ساری دنیا بدل گئی، نہ میں وہ رہا نہ میرا کتا قطمیر اب وہ کتا رہا

مشلینا :- عجیب بات ہے،

مرنوش :- کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ہم تینوں ایک ہی قسم کا خواب دیکھیں۔ اے عقلمند یہ سب حقیقت ہے۔ یملیخا واقعی غار سے باہر گئے تھے اور پھر وہاں سے یہاں غار میں مرنے کے لئے واپس آگئے یا تم کیا اب بھی کہتے ہو کہ یہ سب خواب تھا

مشلینا :- ہاں اگر وہ خواب نہیں تھا تو جو کچھ اس وقت دیکھ رہے ہیں وہ خواب ہے۔

مرنوش :- [illegible] یہ خواب نہیں ہے، خواب تو وہ تھا جس [illegible] پورے ۳۰۰ سال ہم نے بسر کردئے۔

مشلینا :- [illegible] کہ یہ خواب تھا ورنہ اتنا زمانہ [illegible] کو [illegible] بغیر کیونکر بسر ہوتا

(دفعتاً یملیخا کے کراہنے کی آواز آتی ہے)

مرنوش :- یملیخا یہ کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔

مشلینا :- کیا کچھ بیمار ہو؟

یملیخا :- (کراہتے ہوئے) اے یا اللہ رحم کر

(دونوں اسے پکڑکر اٹھاتے ہیں لیکن وہ پھر گر پڑتا ہے)

مشلینا :- "یملیخا۔ یملیخا"

یملیخا :- [illegible] اب مر رہا ہوں لیکن تم لوگ گواہ رہنا میں دین عیسیٰ پر مر رہا ہوں۔ (تھوڑی دیر کے بعد)

مرنوش :— یملیخا، (کوئی جواب نہیں)

مشلینا :— (یملیخا کے جسم کو جنبش دیکر) یملیخا — (کوئی جواب نہیں)

مرنوش :— غریب مر گیا۔ ذرا اس کے منہ پر چادر ڈال دو۔

مشلینا :— چادر، چادر کہاں ہے؟

مرنوش :— میرے کپڑوں میں ڈھونڈھو

(مشلینا ادھر ادھر ٹٹول کر ایک چادر اٹھاتا ہے)

مشلینا :— ارے چادر گل گئی - یہ کیونکر ممکن ہے۔

مرنوش :— اے مشلینا، یہ کپڑے ہمارے تو پھٹ کے۔ بالشت کے ہیں

مشلینا :— سچ کہتے ہو اے مرنوش

مرنوش :— پھر بولو اب کیا کہتے ہو۔ اب بھی تمہیں شک ہے؟

مشلینا :— کس بات کا

مرنوش :— یہ کہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔

مشلینا :— (سہما ہوا) حقیقت! حقیقت!!

مرنوش :— تم اسی خواب و حقیقت کی فکر میں مبتلا رہو۔ مجھے تو اب موت کا کوئی ڈر نہیں رہا کیونکہ میرا دل پہلے ہی مر چکا ہے۔ تم مجھے دھوکا دے سکتے ہو کہ یہ حقیقت نہیں خواب ہے، عقل بھی دھوکا دے سکتی ہے کہ یہ سب کچھ خواب ہے، لیکن میرا دل مجھے کیونکر دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ مر چکا ہے، ایک حقیقی موت اس پر طاری ہو چکی ہے اور اب میں بھی مرنا چاہتا ہوں،

مشلینا :— مرنوش، تمہاری مرضی، لیکن میرا دل تو ابھی تک زندہ ہے اور اس لئے میں مرنے کے لئے تیار نہیں۔

مرنوش :— سچ ہے دل جب تک زندہ ہے، تمنائیں بھی ہیں، امیدیں کے خواب بھی ہیں۔ لیکن اے مشلینا سچ بتاؤ، تم اب کس تمنا کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو۔

مشلینا :— تمنا تو کوئی نہیں ہے، لیکن اے مرنوش میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کسی سے محبت ہے اور صرف محبت کرنے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں،

مرنوش :— مشلینا، تم پاگل ہو گئے، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے،

مشلینا :— ہوگا، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں جوان ہوں، میرا دل جوان ہے۔ زندہ ہے، پھر میں کیونکر اپنے دل اور اپنے آپ کو زندہ دفن کر دوں جبکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چیز حائل بھی نہیں ہے۔

مرنوش :۔ خدا سے اور اس کے درمیان سب سے بڑی دیوار حائل ہے جسے زمانہ کہتے ہیں اور زمانہ کا مقابلہ ممکن نہیں۔ میں نے زمانہ کا مقابلہ اپنے شباب سے کیا لیکن زمانہ نے عین شباب ہی کے عالم میں اسے ہلاک کر کے رکھدیا۔ مشلینا، تم کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم اب مر گئے ہو۔ (سکوت)

مشلینا :۔ آپ ہی آپ (آہستہ آہستہ) زمانہ ۔۔ زمانہ !

مرنوش :۔ (نہایت دھیمی آواز سے) مشلینا اچھا، میں مر رہا ہوں، میرا سر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آہ غریب ملیخا مر گیا اور حقیقت کے علم سے بے خبر رکھا گیا۔ لیکن میں نے اس کو کبھی ایسا نہیں سمجھا۔

مشلینا :۔ مرنوش، یہ تم کیا کہہ رہے ہو

مرنوش :۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم زمانہ کا خواب ہیں اور جیسے خواب کی طرح مٹ جاتا ہے۔

مشلینا :۔ مٹ جاتا ہے! بالکل مٹ جاتا ہے؟ ہمارا کوئی نشان باقی رہنے والا نہیں ،

مرنوش :۔ رہنے والا ہے مگر صرف تاریخ کی کتابوں میں ،

مشلینا :۔ تو کیا ہماری حیات اُخروی کوئی چیز نہیں

مرنوش :۔ کوئی چیز نہیں

مشلینا :۔ تو کیا تم "بعث بعد الموت" کے قایل نہیں ہو

مرنوش :۔ احمق "بعث بعد الموت" کا حال تم ابھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ چکے

مشلینا :۔ توبہ کرو، توبہ، تم مسیحی ہو، اور اپنا ایمان کیوں چھوڑے دیتے ہو

مرنوش :۔ الٰہ میں سب کچھ چھوڑ کر مرنا چاہتا ہوں۔ ایمان، عقیدہ، احساس، افکار سب سے علٰحدہ ہو کر جان دینا پسند کرتا ہوں۔ مشلینا لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں اب جا رہا ہوں

مشلینا :۔ لاحول ولا۔ میں ایک کافر و بُت پرست کے ہاتھ میں ہاتھ دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

(مرنوش اسکی طرف آخری نگاہ ڈالتا ہے اور مر جاتا ہے)

پانچواں ایکٹ

(غار کی طرف پریسکا اور غالیاس دونوں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں، اور قریب آکر دونوں ٹھہر جاتے ہیں)

پریسکا :— (گھبرا کر) غالیاس، کچھ تم نے سنا

غالیاس :— نہیں، میں نے تو کچھ نہیں سنا، شاہزادی

پریسکا :— اوہو، تمھارے کان بھی اب کام نہیں دیتے۔ کیا غار کے اندر سے تمھیں کراہ کی آواز نہیں آئی وہ دیکھو پھر آئی!

غالیاس :— شہزادی، ایک مہینہ ہو گیا کہ یہ لوگ غار کے اندر بے آب و دانہ پڑے ہوئے ہیں، اب آواز کیسی؟

پریسکا :— نہیں میں نے ضرور غرغراہٹ کی سی آواز سنی ہے، جیسے کوئی شخص دم توڑ رہا ہو

غالیاس :— نہیں شاہزادی یہ ہمارے قدموں کی آواز ہوگی

پریسکا :— کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو کچھ میں کہوں گی اس پر عمل کروگے

غالیاس :— بیشک میں نے کہا تھا اور میں تعمیل کے لئے حاضر ہوں

پریسکا :— اچھا تو چلو میرے ساتھ غار کے اندر۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ آواز کس کی ہے

غالیاس :— لیکن اے شاہزادی آج عید کا دن ہے اور بادشاہ آپ کو ضرور یاد کریں گے

پریسکا :— میں بیماری کا بہانہ کر آئی ہوں اور بادشاہ مجھے طلب نہیں کرے گا۔

(غار کے اندر سے ایک آواز آتی ہے)

پریسکا :— غالیاس، تم نے سنا، پھر وہی آواز آئی

(پریسکا آگے بڑھتی ہے۔ غالیاس اس کا دامن پکڑتا ہے، اور وہ جھٹکا دیکر آگے قدم بڑھاتی ہے — پھر آواز آتی ہے جیسے کوئی "پریسکا" "پریسکا" کہکر پکار رہا ہے)

پریسکا :— کیا تم زندہ ہو، مشلینا بولو کیا تم زندہ ہو — اے غالیاس جلدی جاؤ اور پانی یا دودھ جو کچھ ملے فوراً لاؤ

(غالیاس باہر جاتا ہے)

مشلینا :— اے پریسکا اب یہ سب بیکار ہے

پریسکا :— یکا نہیں ہے، میں تمھیں مرنے نہ دوں گی، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اے مشلینا تمھیں زندہ رہنا ہوگا اپنے لئے نہیں تو میرے لئے۔

مشلینا :— لیکن زمانہ میرے تمھارے درمیان حایل ہے

پریسکا :— زمانہ! زمانہ کیسا؟ دل زمانہ سے زیادہ قوی چیز ہے۔

مشلینا :— آہ، کیا یہ میں کوئی دوسرا دلچسپ خواب دیکھ رہا ہوں،

پریسکا :— یہ خواب نہیں حقیقت ہے، اُٹھو جلدی اُٹھو، میں پریسکا ہوں اور ممکن ہے کہ تمھاری پریسکا ہوں۔

مشلینا :— یہ میں کیا سن رہا ہوں

پریسکا :— مشلینا، اُٹھو، جلدی اُٹھو،

(مشلینا اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر گر پڑتا ہے۔ پریسکا آگے بڑھ کر اس کا سینہ اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے)

پریسکا :— (اسے جو یکا کر مشلینا کے چہرہ کو دیکھتے ہوئے) مشلینا، تیری محبت کا زمانہ ہو... کا زمانہ گزر چکا ہو اور لا انتہا تک اس محبت کو قایم رہنا ہے، اٹھو، اٹھو، ... سکتے تو ... سے کہو، مجھے معلوم تو ہو کہ جو کچھ میں کہتی ہوں اس کا تمھیں یقین ہے

(مشلینا کے منھ سے ایک کراہ کی آواز پیدا ہوتی ہے)

پریسکا :— (غور سے اس کے چہرہ کو دیکھتے ہوئے) افسوس وقت گزر گیا۔ اچھا اے مشلینا، اب سو، آرام کرو، انتظار کی گھڑیاں بہت سخت ہوتی ہیں، لیکن میں انھیں خوشی سے کاٹ دوں گی کیونکہ اب مجھے تم سے جس دنیا میں ملنا ہے وہ وقت و زمانہ کی دسترس سے دور ہے،

(پریسکا مشلینا کا سر آہستہ سے زمین پر رکھ دیتی ہے اور خاموش ایک کونہ میں کھڑی ہوکر رونے لگتی ہے — غالیاس گھبرایا ہوا ایک برتن ہاتھ میں لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

غالیاس :— اے شہزادی یہ تھوڑا سا دودھ ملگیا ہے — (پریسکا کو روتے ہوئے دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے) ہائیں، یہ کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو، (پریسکا کوئی جواب نہیں دیتی)

غالیاس :— (مشلینا کی لاش کو دیکھ کر) افسوس، جو ہونا تھا ہو چکا

پریسکا :— (گریہ آلود آواز میں) ہاں، ہو چکا

غالیاس :— مگر اے شاہزادی، مشلینا کی وفات کو تو کئی ہفتے ہو گئے ہوں گے

پریسکا :۔ کاش ایسا ہی ہوتا

غالیاس :۔ پھر اے شہزادی اب رونے سے فایدہ

پریسکا :۔ اے غالیاس، میں اپنے لئے نہیں رو رہی ہوں۔ تجھے معلوم ہے میں خود یہاں اس حال میں آنا پسند نہیں کرتی تھی کہ اسے زندہ پاؤں اور اسی لئے میں نے پورے ایک مہینہ تک انتظار کیا۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس عالم میں، میری اس کی محبت کا اجتماع ناممکن ہے۔

غالیاس :۔ اسی سے تو کہتا ہوں کہ اب گریہ و زاری بیکار ہے۔

پریسکا :۔ آہ، اے غالیاس، کاش تم سمجھ سکتے، تم میں کوئی احساس محبت کا ہوتا۔ اے شقی، میں تو اس مسرور لمحہ کو رو رہی ہوں۔ جو مجھے نصیب تو ہوا، لیکن بجلی کی طرح آن کی آن میں ختم ہوگیا۔ میں یہاں آئی تو میں نے مشلینا کو زندہ پایا، اس نے مجھے پہچانا، لیکن میں اس کو سمجھا ہی رہی تھی کہ میں حقیقتاً وہی پریسکا ہوں جس سے تین سو سال اس طرف اس نے محبت کی تھی۔ ہاں میں یہ سمجھا ہی رہی تھی کہ وقت آگیا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ لیکن خیر، کوئی حرج نہیں، میں اس سے اب ایک ایسے عالم میں ملوں گی جہاں نہ وقت کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ محبت۔

غالیاس :۔ (گھبرا کر) دوسرے عالم میں

پریسکا :۔ ہاں، ہاں، دوسرے عالم میں

غالیاس :۔ سچ ہے اے شہزادی، مجھے آپ کے ایمان سے ایسے ہی اعتقاد کی توقع ہے۔

پریسکا :۔ بیوقوف، اس کا تعلق ایمان سے نہیں بلکہ محبت سے ہے

غالیاس :۔ محبت؟ محبت سے اس سے کیا واسطہ، اے شاہزادی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔

پریسکا :۔ کاش تم نے اوراشیا ہی کا قصہ پڑھا ہوتا تو تم سمجھ سکتے کہ محبت کیا چیز ہے۔

غالیاس :۔ اے شاہزادی وہ قصہ کیا ہے۔

پریسکا :۔ اوراشیا ایک ماہی گیر تھا جو روزانہ اپنی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں جاتا اور جال سے مچھلیاں پکڑ کر لاتا، ایک مرتبہ سارا دن گزر گیا لیکن کوئی مچھلی اسے نہ ملی۔ آخری مرتبہ جب اس نے جال ڈالا تو ایک کچھوا لا لیکن اس خیال سے کہ یہ بہت مقدس چیز ہے اور سمندر کا بادشاہ اسے بہت محبوب رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دیا، اس کے بعد اس نے پھر جال پانی میں نہیں ڈالا اور خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور ہوا کے تھپیڑے کشتی کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ کچھ دیر بعد دفعتہً اسے کسی نے شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اُسنے دیکھا تو ایک نہایت ہی حسین و جمیل بنت البحر اس کے سرہانے کھڑی مسکرا رہی ہے

اس نے اوراشیما سے کہا کہ "میں سمندر کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور اس نے مجھے تمھارے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمھارا شکریہ ادا کروں کیونکہ تم نے مقدس کچھوے کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ کہکر بنت البحر اسے اپنے ساتھ اپنے باپ کے محل میں لے گئی جہاں ہر چیز لولو و مرجان کی تھی سمندر کے بادشاہ نے اس کی بڑی مدارات کی اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کردی۔ جب تین سال اسی لطف و مسرت میں بسر ہو چکے تو اوراشیما کو ایک دن خیال آیا کہ وہ تو شکار کرنے کیلئے آیا تھا اور پھر گھر واپس نہیں گیا۔ اس کے بیوی بچے کیا کہتے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بےچین ہوگیا اور بنت البحر سے کہا کہ اگر اجازت دو تو ایک دن کے لئے وطن جاکر اپنے اہل و عیال کو دیکھ آؤں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مرتبہ واپس آنے کے بعد پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔

بنت البحر آبدیدہ ہوگئی اور بولی کہ "جانے کو تم چلے جاؤ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اب تم سے میں کبھی نہ مل سکوں گی۔ تاہم میں تمھیں ایک صندوقچہ دیتی ہوں جو واپسی میں تمھاری مدد کریگا لیکن تم اسے کھولنا نہیں چاہے کچھ ہو، ورنہ پھر ملنے کی کوئی صورت باقی نہ رہیگی"

اوراشیما نے وعدہ کیا کہ وہ کبھی اس کو نہ کھولے گا اور صندوقچہ لیکر اپنے وطن واپس آیا۔ یہاں آکر دیکھا تو ہر چیز بالکل بدلی ہوئی پائی، آدمی نئے، وضع و قطع نئی۔ وہ حیران رہ گیا کہ کیا ماجرا ہے اس نے بہت کوشش کی کہ اپنا گھر ڈھونڈھ نکالے مگر کامیاب نہ ہوا۔ اتفاق سے اسے ایک نہایت ہی ضعیف شخص نظر آیا اور اس سے پوچھا کہ "اوراشیما کے گھر والوں کا کچھ حال تمھیں معلوم ہے۔" بڈھا یہ سنکر حیران رہ گیا اور بولا کہ "اے جوان تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ چار سو سال ہوئے کہ اوراشیما شکار کے لئے نکلا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ قبرستان میں جاؤ ممکن ہے اس کی یادگار میں کوئی پتھر اس کے خاندان والوں نے نصب کر دیا ہو"

یہ سنکر اوراشیما ہنسا اور سمجھا کہ بڈھا مذاق کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کو گئے ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کو ہوش آیا کہ اگر اتنا زمانہ نہیں گزرا تو شہر کا شہر کیونکر بالکل بدل گیا دفعتًا اس کو صندوقچہ کا خیال آیا اور سوچا کہ ممکن ہے اس کے کھولنے سے اس راز کا پتہ چل سکے آخرکار اس نے بیتاب ہوکر اس صندوقچہ کو کھولا۔

نانیاس :۔ "کھول ڈالا"

پریسکا :۔ "ہاں، کھول ڈالا"

غانیاس :۔ "پھر اس نے کیا دیکھا"

پریسکا :- صرف سفید سا ٹھنڈا دھواں جو فضا میں بلند ہو کر جنوب کی طرف غائب ہو گیا۔

غالیاس :- پھر کیا ہوا

پریسکا :- ہوا یہ کہ جب اوراشیا کو معلوم ہوا وہ اب بنت البحر سے کبھی نہیں مل سکتا تو اس صدمہ سے آناً فاناً اس کے بال سفید ہو گئے، دانت گر گئے، اس کے جسم میں جھریاں پڑ گئیں اور وہ آن کی آن میں چار سو سال کا بڈھا بن گیا۔

(دفعتہً غار کے باہر سے قرنا وغیرہ کی آواز آتی ہے)

پریسکا :- اے غالیاس، کچھ سنا تم نے۔ لوگ یہاں آپہونچے،

غالیاس :- (گھبرا کر) بیشک بادشاہ آپہونچا اور مجھے اندیشہ ہے کہ غار بند کرنے سے قبل وہ اندر نہ آجائے اور کہیں تمھیں یہاں دیکھ لے،

پریسکا :- پھر کیا کرنا چاہئے۔

غالیاس :- اے شاہزادی آپ یہیں کسی کونہ میں چھپ جائیے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ اگر بادشاہ اندر آیا تو میں زور سے کوئی بات ایسی کہوں گا جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بادشاہ اندر آرہا ہے،

(غالیاس باہر چلا جاتا ہے)

پریسکا :- (مشلینا کے جسم پر جھک کر) اے مشلینا، تو نے اپنا وعدہ پورا کیا، تیری محبت میں کبھی شک پیدا نہیں ہوا اور تو نے صندوقچہ کھول کر اپنا عہد نہیں توڑا، اس لئے اب تو اس سے جدا نہیں رہ سکتا جس سے تجھے محبت ہے۔

(دفعتہً غار کے دروازے سے غالیاس کی آواز آتی ہے اور پریسکا چھپ جاتی ہے۔ بادشاہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوتا ہے اور خاموش سر جھکا کر سینہ پر صلیب کا نشان بناتا ہے)

بادشاہ :- (راہب اعظم سے) کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان کے مقدس جسموں کو قیمتی تابوتوں میں رکھ دیا جائے؟

راہب :- نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ غار کا دروازہ بند کر کے ان کو اسی حال میں چھوڑ دینا چاہئے۔

(صیاد۔ آگے بڑھتا ہے)

صیاد :- (بادشاہ سے) اے مولیٰ، غار کا بند کرنا مناسب نہیں،

بادشاہ :- "کیوں"

صیاد :- اس لئے کہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ پھر سو گئے ہیں اور ممکن ہے کہ دوبارہ جاگیں،

دوسرا راہب :- بیشک وہ سوگئے ہیں - اور اگر غار بند کر دیا گیا تو پھر کیونکر نکلیں گے۔

پہلا راہب :- اس مرتبہ وہ سوئے نہیں ہیں بلکہ مرگئے ہیں اور ان کی روحیں آسمان کی طرف صعود کر گئی ہیں

غالیاس :- بیشک ، وہ مر گئے ہیں اور آسمان پر چلے گئے ہیں

بادشاہ :- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کو صحیح باور کروں،

صیاد :- اے مولیٰ، وہ سوئے ہیں یا مر گئے ہیں ، دونوں حال میں غار بند کرنے کی ضرورت نہیں

غالیاس :- غار اگر بند نہ کیا گیا تو لوگ یہاں آئیں گے اور فضول ہنگامہ مچایا کریں گے۔

بادشاہ :- لیکن اگر وہ پھر جاگ پڑے تو اس صورت میں نکلیں گے کیونکر

غالیاس :- اس کے لئے یہ تدبیر مناسب ہے کہ غار کے اندر تین پھاوڑے رکھدئے جائیں- اگر وہ جاگے تو پتھر ہٹا کر نکل آئیں گے۔

بادشاہ :- ہاں، یہ تدبیر مناسب ہے

غالیاس :- (بلند آواز سے) پھاوڑے لاؤ

(لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور تین پھاوڑے لے آتے ہیں)

بادشاہ :- (غالیاس سے) اے غالیاس، اب غار بند کرنے کی طیاری کرو اور اعلان کردو کہ شاہزادی اس رسم میں اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتی۔

(اس رسم کی ادائی کے لئے تاپل وقرنا بجنے لگتے ہیں اور غالیاس سب کی آنکھ بچا کر اندر داخل ہوتا ہے)

غالیاس :- (پریسکا سے) اے شاہزادی ، وقت بہت تنگ ہے ، بتائیے اب کیا حکم ہے

پریسکا :- اے غالیاس، میں تمھاری بڑی احسانمند ہوں کہ تم نے اپنی جان خطرہ میں ڈالدی لیکن میرا کہنا نہ ٹالا - اچھا اب تم جاؤ اور مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو لو

غالیاس :- نہیں اے شاہزادی یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کو یہاں تنہا چھوڑ دوں ، مجھے بھی اپنے قدموں پر جان دینے کی اجازت دیجئے۔

پریسکا :- اے غالیاس، یہ ممکن نہیں - کیا تمھیں یاد نہیں کہ میں نے خواب میں صرف تنہا اپنا ہی زندہ دفن ہونا دیکھا تھا - اب تم جاؤ اور اگر دنیا میری بابت پوچھے تو وہی کہدینا جو میں تم سے کہہ چکی ہوں تمھیں یاد ہے ؟

غالیاس :- ہاں یاد ہے ،

پرسیکا :— "کیا"

غالیاس :— یہ کہ پرسیکا ایک عورت تھی جو محبت کے لئے زندہ رہی اور محبت ہی کے لئے اس نے جان دی۔

پرسیکا :— ہاں، یہی

(غالیاس باہر نکلتا ہے۔ اور غار کا دروازہ پرسیکا پر ہمیشہ کیلئے بند کردیا جاتا ہے)

مسئلۂ خلافت و امامت

(ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے)

"کاوشِ تحقیق" فطرت کا سرمایہ ہے جو بعض دماغوں میں خصوصیت کے ساتھ ودیعت کر دیا گیا ہوتا ہے وہ انسان کو کبھی کبھی بحث و نظر کے ایسے خشک اور ناہموار راستوں میں پہونچا دیتا ہے جن کے تصور سے بھی وہ افراد جو صرف "دماغی عیاشی" کا ذوق رکھتے ہوں کانوں پر ہاتھ رکھنے لگیں۔

بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ "نگار" کے صفحات پر "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" تذکروں کے بجائے ایک وقت میں مسئلہ "خلافت و امامت" کے سے "دقیانوسی" مسئلہ کو چھیڑا جائے گا اور اتنی دلچسپی کے ساتھ کہ اُس کا سلسلہ دو برس کے قریب عرصہ تک قائم رہے اور پھر جنوری کے مخصوص نمبر کا ایک اچھا خاصہ حصہ اس کی نذر کر دیا جائے۔

لطف یہ ہے کہ اس "سازِ بے آہنگ" کے چھیڑنے والے ایک غیر متعلق شخص، متنازع فیہ مسئلہ کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہ رکھنے والے کوئی "ہر نام" صاحب ہیں جو اقراری "ہندو" ہیں جس کے بعد اُن کی نسبت کچھ اور خیال کرنے کی ضرورت نہیں اور جبکہ اسلام کی تعلیم بھی یہ ہے کہ "ما قال" کو دیکھو "من قال" پر نظر نہ ڈالو۔

"ہر نام" صاحب نے شروع شروع یہ بحث صرف تاریخی حیثیت تک محدود رکھی تھی اور اعتقادی پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی جس کا بقول اُن کے ایک غیر مسلم شخص کو حق بھی نہیں ہے اس لئے اس بحث پر شیعی جماعت کے ذمہ دار حلقوں کی طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی کیونکہ تاریخی بحث میں مذہبی جانبداری کا پہلو پیدا ہو جانا واقعات کی بے لاگ سراغرسانی پر مضر اثر ڈالتا ہے۔

اس سے بڑھکر بے لوث تحقیقات کیا ہو سکتی ہے کہ تحقیق کرنے والا ایک غیر مسلم انسان "ہندو" اور فیصلہ کرنے والی ذات مدیر نگار کی سی جو (بقول خود) اصل مذہب کی ضرورت ہی کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگی ہو۔

جہاں تک تاریخی بحث کا تعلق ہے معاملہ ختم ہوگیا اور محترم مدیر نگار نے جیسا کہ "ہرنام" صاحب نے اپنے آخری مضمون میں نگار کے تائیدی سکوت کے ساتھ اظہار فرمایا ہے اس بحث کا آخری فیصلہ شیعوں کے حق میں کر دیا۔ یعنے انھوں نے تمام واقعات کی صحت کو تسلیم فرماتے ہوئے اُن کا نتیجہ یہی قرار دیا کہ حضرت رسول اکرم حضرت علی ہی کا خلیفہ و جانشین ہونا پسند فرماتے تھے اور آپ نے اس کا بار بار اظہار بھی فرمایا۔

مگر آپ نے اپنے محاکمہ کے دامن دار اطراف میں کچھ ایسے مسائل کو بھی چھیڑ دیا جو خالص اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں اور مارچ [illegible] کے پرچہ میں اسی محاکمہ کے پیش کردہ نتائج کی روشنی میں آپ نے چند سوالات بھی مرتب فرما کر شائع کئے جن کے جواب کے لئے آپ نے ہر دو مذاہب کے علماء و اہل نظر کو دعوت دی۔

ہرنام صاحب نے بھی "محاکمہ" کو دیکھنے کے بعد اپنا جو آخری بیان شائع کیا اُس میں میدان بحث اور محاذ گفتگو بدلجانے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کنارہ کشی کا اظہار کیا اور اب اس بحث کے لئے خاص شیعی جماعت کے ارباب علم سے تحریک کی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کریں۔ جناب نیاز نے بھی اس مضمون کی تذئیل میں "ہر دو مذاہب" کے بجائے "خصوصیت سے شیعی علماء" کی جانب دعوت کا رخ پھیر دیا اور نگار کے جنوری نمبر کے اعلان میں یہ جملہ بھی شایع کر دیا کہ "مسئلہ خلافت پر ایک بسیط مضمون شایع کیا جائے گا جو شیعی نقطۂ نظر سے آخری حرف ہوگا۔" میں نہیں کہہ سکتا کہ شیعی علماء کے طبقہ میں اس دعوت پر توجہ کیوں نہیں کی گئی؟

ممکن ہے اس کا سبب مدیر نگار کی طرف سے "مایوسی" ہو جیسا کہ مدرسۃ الواعظین کے اخبار "الواعظ" کی متعدد اشاعتوں میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدیر نگار سُنّی ہیں اور اُنھوں نے جتنے سوالات قایم کئے ہیں وہ صرف سنّیوں کی حمایت کے لئے۔

میں کم از کم اپنی "وسعت خیال" کے حدود میں جہاں تک مدیر نگار کے رویہ پر غور کرتا ہوں مجھے اس "سوء ظن" کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو سوال کرنے والے کی نیت سے جواب دینے والے کی زبان پر تو گرہ نہیں لگ سکتی۔ اُسے بہرحال اپنے نقطۂ نظر کے واضح کرنے کا موقع ہے اور سوال کو بیان حقیقت کا پیش خیمہ قرار دینے کا حق ہے۔

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ نگار میں اس مسئلہ کا اُٹھایا جانا ایک تجارت ہے اور صرف پرچہ کی گرم بازاری میں اضافہ منظور ہے۔ ان اصحاب کا جواب بھی میری طرف سے یہی ہے کہ اگر کسی کی ذاتی تجارت کے سلسلہ میں کسی اہم مسئلہ کی تحقیق کا فرض انجام پا جائے تو کیا بُرا ہے؟

بہرحال یہ دیکھکر کہ نگار کے سوالات تشنۂ جوابات ہیں اور اُن کی تحقیق ہر حقیقت پرور انسان کا فرض ہے، میں نے اس مضمون کی داغ بیل ڈالی ہے۔

مجھے اپنے بے نیاز القاب کرمفرما جناب نیاز سے بھی یہ نیازمندانہ گزارش کرنا ہے کہ جہاں تک بحث کا صرف تاریخی پہلو تھا جناب کی غیر جانبدارانہ حیثیت مسلم اور آپ کا بحیثیت حکم فیصلہ قابل قبول۔ لیکن اب اس بحث نے جو صورت اختیار کرلی ہے وہ مذہبی و اعتقادی ہے جس کے دلائل و اصول کا بہت کچھ تعلق مابعد الطبیعیاتی مبادی کے ساتھ ہے جن میں آپ خود مخصوص نظریات و معتقدات کے حامل ہیں جو اکثر و بیشتر عام مسلمانوں کے خلاف ہیں اور اُن اصول و نظریات کے ماتحت خود آپ اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان ایک محاذ اختلاف قایم ہے۔

اگر آپ نے اس بحث کا فیصلہ اپنے اصول کی بنیاد پر کرنا چاہا تو یہ ہرگز ایک غیر جانبدار حکم کا فیصلہ قرار نہیں پاسکیگا۔ بے شک اگر اس بحث کا بحیثیت حکم فیصلہ کرنا ہے تو ضرورت ہے کہ مراحل ابتدائی میں آپ اُنھیں اصول کو پیش نظر رکھئے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ اور مسلم ہیں اور جن میں شیعہ و سنی کی تفریق نہیں ہے اور "اُن اصول موضوعہ" کو پیش نظر رکھکر یہ دیکھئے کہ کون فریق ٹھیک کہہ رہا ہے۔

درصورتیکہ آپ اُن مبادی و اصول سے الگ ہوکر خود اپنے معتقدات کے اوپر بحث کرنا چاہتے ہیں تو اسے محاکمہ کا درجہ عطا نہیں کیا جاسکیگا بلکہ ایک فریق بنکر دلایل کے ذریعہ سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنیکا فرض ادا ہوگا جو ہر انسان کا حق ہے۔

سوالات کی تقسیم

جہاں تک سوالات کا تعلق ہے میں ان کو تین حصوں میں منقسم کرسکتا ہوں۔ ۱۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات، ۲۔ نفس مسئلہ خلافت، ۳۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات۔

پہلی قسم میں حسب ذیل سوالات مندرج ہیں :۔

۱۔ عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ وخطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء وائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں ؟

۲۔ انبیاء وائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلایل کیا ہوسکتے ہیں ؟

ان سوالوں کو میں نے مسئلہ خلافت کے مبادی میں اس لئے قرار دیا ہے کہ درحقیقت ان سوالوں کی بنیاد یونہی پڑی ہے کہ خلافت جناب امیر کے متعلق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اظہارات و

اعلانات سے استدلال پیش کیا گیا تھا جس کو اصل حقیقت کے اعتبار سے جناب مدیر نگار نے تسلیم فرمایا لیکن آنحضرتؐ کے اعلانات کو حضرت علیؑ کے ثبوت حق خلافت کے لئے کافی قرار دینے میں اس بنا پر عذر فرمایا کہ خود رسولؐ سے بھی خطاء اجتہادی ممکن ہے اور اس لئے آپ نے جو اعلان فرمایا ممکن ہے وہ آپ کی ذاتی رائے کی بنا پر ہو لیکن درحقیقت مسلمانوں کے لئے مفید و نتیجہ خیز نہ ہو۔ اس لئے مسلمانوں کا اس پر عمل نہ کرنا حق بجانب قرار پائے۔

اب اگر رسول سے کلیتہً یا بالخصوص اس مسئلہ میں خطاء اجتہادی کا امکان غلط قرار پا جائے تو حضرت علی کی خلافت بلافصل کا ثبوت بلا کسی دغدغہ کے پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا۔

دوسری قسم میں حسب ذیل سوالات ہیں:۔

۱۔ وصایت جناب امیر ثابت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں؟

۲۔ مسئلہ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

۳۔ اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لئے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں۔

۴۔ ہر دو فریق کی روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں۔ اگر پڑا تو کیا؟

چوتھے سوال کو نفس مسئلہ خلافت سے متعلق میں نے اس لئے قرار دیا کہ خود انھیں روایات میں جو مسئلہ وصایت کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں یہ شبہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ ان پر سیاسی ماحول کا کچھ اثر پڑا ہے یا نہیں اور اس لئے وہ معتبر سمجھی جا سکتی ہیں یا نہیں۔

تیسری قسم میں ذیل کے سوالات داخل ہیں:۔

۱۔ کیا انبیاء و ائمہ مستقبل کے حالات سے باخبر تھے۔ اگر تھے تو اس کا کیا ثبوت ہے۔

۲۔ قیام امامت کی ضرورت کیا ہے اور صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کا قائم رہنا کیوں ضروری ہے؟

۳۔ امامت کے بارھویں امام پر ختم ہو جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

۴۔ جو سلسلۂ امامت دوسرے شیعی فرقوں کے نزدیک صحیح ہے اُس کو غلط قرار دینے کے لئے اثنا عشری جماعت کیا دلایل اپنے پاس رکھتی ہے۔

۵۔ امام مستور یا مہدی موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ

میں نے ان سوالوں کو مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات میں اس لئے مندرج کیا ہے کہ اصل بحث جیسا کہ ہر نام صاحب کے افتتاحی مضمون سے ظاہر ہے اور جس کا "ہرنام" نے برقی صاحب کے جواب میں صراحۃً

اظہار بھی کیا ہے صرف حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے متعلق ہے یعنے سوال یہ درپیش ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت کا جانشین کس کو تسلیم کیا جائے ؟

اور اسی لئے "مسئلہ خلافت و امامت" میں درحقیقت اسی کو یکسوئی کے ساتھ طے کرنا چاہیئے۔

حضرت علیؑ کے بعد پھر یہ سلسلہ کس طرح چلے ؟ خلافت کو حسنی شاخ میں تسلیم کیا جائے یا حسینی شاخ میں ؟ اس سلسلہ کو بارہ کی تعداد پر ختم ہو جانا چاہیئے یا نہیں ؟ وجود امام سے کسی زمانہ کو خالی سمجھا جائے یا نہیں ؟ بارھویں نمبر پر حضرت امام مستور یا مہدی موعود کو تسلیم کیا جائے یا نہیں ؟ - یہ تمام باتیں خارج از مبحث قرار پاتی ہیں۔

حضرت علی کی خلافت کے مسئلہ میں جہاں محاذ اختلاف صرف "شیعہ اور سنی" کے درمیان ہے ایسے مباحث کا چھیڑ دیا جانا جن میں محاذ اختلاف بالکل جداگانہ ہو جاتا ہے سلسلہ گفتگو کو "ژولیدہ" اور بحث کو پریشان بنانے کا باعث ہے جو معاملہ فہمی کے خلاف ہے۔

فرض کیجئے کہ کوئی "آزاد خیال مفکر" حضرت رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلافصل تسلیم کرتا ہے لیکن پھر بھی اُن تمام معتقدات کو نہیں تسلیم کرتا جو اثنا عشری جماعت نے مذہبی حیثیت سے ضروری قرار دئے ہیں تو کیا ایسے شخص کے عقل و دماغ پر پہرہ بٹھایا جا سکتا ہے اور اُسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلافصل تسلیم کرے تو بس آخر تک اس سلسلہ کو اسی طرح سے صحیح سمجھ لے جو اثنا عشری جماعت نے قایم کیا ہے۔

جب ایسا نہیں تو حضرت علی کی خلافت ایسے صاف اور واضح مسئلہ میں کیوں ان غیر متعلق باتوں کو چھیڑ کر بحث کو پراگندہ بنایا جائے ؟

اس لئے میں اپنے زیر تحریر مقالہ میں ہرگز اس "خطاء اجتہادی" کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوں۔ میرا جواب صرف پہلی دو قسم کے سوالات سے متعلق ہوگا اور آخری قسم کے سوالات کی بحث کو اُس وقت کے لئے اٹھا رکھا جائے گا جب حضرت علی کی خلافت کا مسئلہ بالکل طے ہو جائے۔ پھر میں خود اپنے مقام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کروں گا کہ اس سلسلہ کو آگے کس طرح بڑھایا جائے ؟

پہلا سوال

عصمت و عفت کا مفہوم کیا ہے، گناہ اور خطا میں کوئی فرق ہے یا نہیں اور اگر لغزش و نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بتانے کے لئے کافی ہے تو کیوں ؟

"عصمت" کے لغوی معنی تو "حفاظت" کے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے علم کلام کی اصطلاح میں انبیا و ائمہ کے لئے اس کا استعمال کیا گیا ہے ایک خاص طرح کی نفسانی کمزوریوں سے لازمی طور پر اُن کے محفوظ ہونے کے معنی میں۔

چونکہ "حفاظت" کے معنی خود "متعلق" کے طالب ہیں یعنے کس شئے سے حفاظت؟ اس لئے اس کے مفہوم اصطلاحی میں قیود عاید کرنا یعنے اُن نفسانی کمزوریوں کی حد مقرر کرنا جن سے انبیا و ائمہ کو لازمی طور پر محفوظ ہونا چاہئے خود عقلی بحث کا تابع ہے یعنے یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کون کون باتیں ایک نبی و امام کی شان نبوت و امامت کے خلاف اور اُس مقصد کے منافی ہیں جس کے لئے نبی و امام کا تقرر ہوتا ہے۔ بس اُنہی تمام باتوں سے حفاظت "عصمت" کے اُس مفہوم کی تشکیل کرے گی جو اصطلاحی حیثیت سے نبی و امام کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

رہ گئی "عفت" اُس کے معنی "پرہیزگاری" اور "پارسائی" کے ہیں اور وہ علم اخلاق کی اصطلاح میں قوت شہویہ کے اعتدال کا نام ہے جو اپنے مکمل معیار کی حیثیت سے "عصمت" کا ایک شعبہ قرار پا سکتا ہو اُس کی پوری تفسیر نہیں جیسا کہ سوال کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"گناہ" اور "خطا" میں بے شک فرق ہے یعنے "گناہ" میں ارادہ اور ضمیر کا تعلق ضرور ہے لیکن "خطا" لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کو بھی کہتے ہیں مگر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عصمت جو نبی و امام کے لئے عقلی فیصلہ کی بنا پر ضروری ہے وہ صرف "گناہ" سے عصمت ہے یا "غلطی اور بھول چوک" سے عصمت بھی ضروری ہے۔ اسی بنا پر سوال کے ان الفاظ سے مجھے اختلاف ہے کہ "اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی کا امکان انبیا و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں؟ اس لئے کہ لغزش و نسیان صرف انبیا و ائمہ کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ایک حد تک غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے یعنے یہ کہ وہ "معصوم عن الخطاء" نہیں ہیں اور ایک حد تک یقیناً غیر معصوم بنانے کے لئے ناکافی ہے یعنے لغزش و نسیان کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ "معصوم عن الذنب" بھی نہوں لہذا سوال کے الفاظ یوں ہوتے تو بہتر تھا کہ "اگر لغزش و نسیان اجتہادی غلطی سے بھی انبیا و ائمہ کو معصوم ہونے کی ضرورت ہے تو کیوں؟ اس طرح بحث اپنے اُس راستہ پر آجائے گی جو اُس کے لئے ہونا چاہئے۔

مگر اس صورت میں سوال نمبر۲ کے ساتھ اس سوال کا کوئی فرق باقی نہ رہیگا اور اس لئے ان دونوں سوالوں کا الگ الگ مقرر کیا جانا صرف مجیب کی نکتہ رسی کا امتحان ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

بہر حال موجودہ صورت میں جبکہ سوال نمبر۲ بھی موجود ہے جس میں مجھ کو انبیاء و ائمہ کی غلطی یا لغزش

سے پاک ہونے کے دلایل لکھنا ضروری ہیں میں اس سوال کے جواب میں گناہ اور خطا دونوں سے انبیاء کی عصمت کے مفہوم کو واضح کرنے پر اکتفا کروں گا اور دوسرے جزو کو "یعنے یہ ضروری ہے تو کیوں ؟" دوسرے سوال کے جواب کے لئے اٹھا رکھوں گا۔

اس کے لئے سب سے پہلے جناب نیاز کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جو آپ نے اسلام کے پیش کردہ معیار نبوت کے متعلق اپنے محاکمہ (نگار فروری سنہ ۳۶ء) میں تحریر فرمائی ہے۔ پھر اُس پر ضروری تبصرہ کروں گا آپ تحریر فرماتے ہیں :۔

"انسان کو دیگر مخلوقات کے لحاظ سے اشرف المخلوقات صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُس کو عقل و فراست عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے جذبات حیوانی سے مغلوب نہیں ہو سکتا اگر وہ چاہے۔ بالکل اسی طرح ایک نبی، دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں صرف یہ شرف رکھتا ہے کہ اس میں وہ تمام قوتیں جو ایک انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہیں، زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور وہ باوجود تمام جذبات حیوانی رکھنے کے ان کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہے۔

ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو حد درجہ مسکین و غریب ہے، جو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا، جو ہر شخص کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے اور ہم اُس کی صلاحیت نفس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ غیر معمولی ضبط سے کام لیکر اپنے جذبات حیوانی پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ قدرتاً وہ حد درجہ بے حس واقع ہوا ہے تو ہم بجائے تعریف کرنے کے اُس کو بزدل و بے غیرت کہیں گے۔

ایک شخص حد درجہ عفت مآب و پاکباز ہے اور ہم اُس کے ضبط نفس کی تعریف کرتے ہیں لیکن اگر ہم یہ جان جائیں کہ اس میں قدرت کی طرف سے یہ مادہ ہی نہیں پایا جاتا اور وہ فطرتاً ناکارہ پیدا ہوا ہے تو پھر ہم بجائے تعریف کے اس کی حقارت کرنے لگتے ہیں۔

الغرض ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہ ہو، اسی پر ایک نبی کے خصوصیات کا زیادہ وسیع پیمانہ پر قیاس کر لیجئے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ نبی فطرتاً معصوم پیدا ہوا ہے تو اس کی عصمت کوئی قابل تعریف بات نہیں، اگر وہ غیب کی باتیں جان لیتا ہے تو اُس کی فراست و پیش بینی بے معنی ہے، اگر فرشتے اُس کی مدد کرتے ہیں تو اس کی کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اگر اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی تو اس کی سلامت روی ہیچ ہے۔ ایک نبی کو دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں امتیاز اگر حاصل ہے تو صرف یہ کہ باوجود ان تمام جذبات رکھنے کے جو تمام لوگوں میں پائے

جاتے ہیں اُن کے ضبط پر دوسرے انسانوں سے زیادہ قادر ہے، وہ دوسرے انسانوں کی طرح سوچتا ہے لیکن بہت غائر نگاہ سے، وہ مخالف و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن بہت کم، وہ کسی نتیجہ تک پہونچنے کے لئے اُنہی اسباب و دلایل کو سامنے رکھتا ہے جو دوسروں کے سامنے ہیں اور اکثر صحیح نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ الغرض وہ ہماری طرح ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا اور انسانی فراست سے جو غلطی یا لغزش اس دُنیا میں ہو سکتی ہے وہ اس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم۔ وہ اپنی نیت کے لحاظ سے، اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے لیکن اپنی تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کاروبار عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے اور یہی وہ مفہوم نبوت کا تھا جسے سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا اور جس کو سامنے رکھکر ہم رسول اللہ کی غیر معمولی عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ممکن ہے مسلمانوں کی جماعت نبوت کے اس مفہوم کو سُنکر متعجب ہو، علی الخصوص حضرات شیعہ، جو نہ صرف رسول اللہ بلکہ اہلبیت کے تمام افراد کو معصوم جانتے ہیں لیکن کیا کروں کلام پاک سے نبوت کا مفہوم میری سمجھ میں یہی آتا ہے اور اس سے ہٹ کر "پیدائشی معصومیت" سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔

نبی آخر الزماں سے قبل نبوت کا جو مفہوم لوگوں کے ذہن نشین تھا وہ یہ تھا کہ "رسول" نوع انسانی سے علٰحدہ کوئی چیز ہے اور اُس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس کی تردید رسول اللہ کی زبان سے یوں کی گئی "قل لو کان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیہم من السماء ملکا رسولا" (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۵) یعنی اگر زمین بجائے انسانوں کے فرشتوں کی آبادی ہوتی تو ہم کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔

اسی طرح سورۂ کہف (آیت ۱۱۰) میں رسول اللہ کی انسانی حیثیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰہکم الٰہ واحد" یعنی اسے رسول کہدے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ خدا مجھے تمہیں وحدانیت کی تعلیم دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ میں "ہل کنت الا بشرا رسولا" کہکر اسکی اور زیادہ وضاحت کر دیجاتی ہے"

(تقریباً ایک صفحہ کی عبارت کے بعد جو غیب دانی کے مسئلہ سے متعلق ہے اور اسلئے ہماری بحث سے خارج، تحریر ہوتا ہے)

"نبی کے متعلق یہ بھی عام اعتقاد پایا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی یا یہ کہ وہ خطاء و نسیان سے مبرا ہے لیکن کلام مجید سے اس کی بھی تردید ہوتی ہے۔

سورۂ سبا کی آیت ۴۹ میں رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے۔ "قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اہتدیت فبما یوحی الی ربی انہ سمیع قریب" یعنی کہدو کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اسکا

ذمہ دار میں ہوں اور اگر سیدھی راہ اختیار کرتا ہوں تو وہ خدا کی ہدایت ہے)

سورۂ مومن آیت ۵۵ میں ایک جگہ رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ " استغفر لذنبک وسبح بحمد ربک" (اپنی غلطی سے توبہ کر اور خدا کی حمد بیان کر)

سورۂ محمد آیت ۱۹ میں پھر " واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات " کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں

سورۂ فتح کی آیت ۱-۲ میں ارشاد ہوتا ہے :-

" انا فتحنا لک فتحاً مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک " یہاں بھی وہی لفظ ذنب موجود ہے۔

ایک بار رسول اللہ نے کسی اندھے کی بات نہ سنی اور اس سے منہ پھیر لیا۔ اس پر آپ کو اس طرح تنبیہ کی گئی

" عبس وتولیٰ ۔ ان جاءہ الاعمیٰ " سورۂ عبس آیت ۱-۲-۳-

سورۂ برأت (آیت ۴۳) میں رسول اللہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ :-

" عفا اللہ عنک لم اذنت لہم حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکاذبین "

کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے بعض جنگوں میں رسول اللہ کا ساتھ نہ دیا تھا لیکن رسول اللہ نے ان کو پھر شمول جنگ کی اجازت دیدی تھی اس پر آپ سے کہا گیا کہ جب تک سچے جھوٹوں کی تفریق و تصدیق نہ ہوئی تھی، کیوں انھیں اجازت دیگئی " سورۂ انعام کی آیت ۶۸ سے یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سے وہ نسیان بھی سرزد ہو سکتا تھا جسے عام طور پر شیطان سے منسوب کیا جاتا ہے ۔

آیات مذکورۂ بالا کے مطالعہ سے دو باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ کی ذات لغزش، غلطی نسیان یا بھول چوک سے مستثنیٰ نہ تھی اور دوسرے یہ کہ آپ کو آیندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے منصب نبوت کی توہین سمجھیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی عظمت و جلالت صرف اسی طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کو ایک انسان اور پھر نبی سمجھا جائے۔

میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادے اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے۔ یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ کی ذات مرکز تھی روحانی و مذہبی تعلیم کی بھی اور سیاسی رہنمائی کی بھی یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا لیکن آپ کی سیاسی زندگی میں اس کا امکان تھا کہ آپ سے کبھی کوئی فروگزاشت ہو جائے یا کوئی فیصلہ آپ ایسا کریں جو مناسب نہ ہو۔

یہ عبارت تمام و کمال بغیر اندیشۂ طول کلام کے اس لئے نقل کی گئی کہ اُس کے تمام اجزاء قارئین کرام کے پیش نظر رہیں۔ کوئی اور ہوتا تو اُسے خود نگار کے لئے مضمون لکھنے کے سلسلہ میں اس امر میں پس و پیش ہوتا کہ وہ خود جناب نیاز کے فیصلہ ہی کو محل بحث قرار دیکر نقد و تبصرہ سے کام لے لیکن چونکہ میں ممدوح کی وسیع الخیالی کا دل سے معتقد ہو چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں کہ انھوں نے "ہرنام" کے آخری مضمون کو جس میں محاکمہ کے بعض اجزاء کی تردید بھی کیگئی تھی بغیر کسی "ناگواری" کے جو "تنگ ظرف" افراد کا شیوہ ہے اور بلا کسی اظہار اختلاف کے بلکہ ایک طرح کے تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا اور پھر جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ ممدوح نے محاکمہ میں ان خیالات کے اظہار کے بعد پھر اپنے سوال میں اس مسئلہ کو زیر بحث قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اہل نظر کو خود اپنے خیالات کے نقد و موازنہ کا موقع دیرہے ہیں، اس لئے ہرگز مجھے کوئی پس و پیش نہیں ہے اس میں کہ خود جناب نیاز کے رسالہ میں اُنکے خیالات پر سخت سے سخت گرفتیں کروں کیونکہ جو شخص ایک نبی و رسول کی ذات کو خطاء اجتہادی سے مستثنیٰ نہیں سمجھتا وہ اپنی ذات کے لئے اس سے مستثنیٰ ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا

جہاں تک عبارت کے ابتدائی حصہ کا تعلق ہے، یہ کہ عصمت "سلب اختیارات" کا نام نہیں ہے اور نہ قوائے معصیت کے مفقود ہونے کا بلکہ یہی کہ باوجود تمام جذبات حیوانی کے اُن کے ضبط پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو اور ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اُس سے باز آئے۔"

یہ ایسی بات ہے جس سے سنجیدہ اور محقق علمائے اسلام و متکلمین شیعہ کو کوئی اختلاف نہیں ہے اور عصمت کا یہی مفہوم ہے جس کے لحاظ سے وہ ایک نبی و معصوم کے لئے معصوم ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے اُن کا قول ہے کہ نبی و امام فرشتوں سے افضل ہوتا ہے کہ فرشتہ (وہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو یا نہیں لیکن جو مفہوم اُس کا قرار دیا گیا ہے اُس کے لحاظ سے) وہ مخلوق ہے جس میں قوائے معصیت خلق ہی نہیں ہوتے اس لئے وہ اگر گناہ نہیں کرتا تو کوئی قابل تعریف بات نہیں لیکن معصوم باوجود گناہ کی تمام قوتیں رکھنے کے پھر بھی گناہ نہیں کرتا اس لئے وہ فرشتہ کے درجہ سے بلند درجہ رکھتا ہے ۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو مدیر نگار نے بایں الفاظ تحریر فرمایا ہے کہ :۔ "پیدائشی معصومیت سے نبی کو متصف کرنا میرے نزدیک منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔"

اس خیال میں کوئی ایسی ندرت نہیں ہے جس کو سنکر مسلمانوں کی جماعت اور علی الخصوص شیعہ متعجب ہوں۔ سند کے لئے بطور ایک ذمہ دارانہ تصدیق کے جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو "اسلام کی حکیمانہ زندگی" شائع کردہ "امامیہ مشن" لکھنؤ کے صفحہ ۳۸ - ۴۲ پر مندرج ہے۔

اس میں صاف صاف اسی نظریہ کی تلقین موجود ہے۔

"خود اختیاری حیثیت سے علمی و عملی ترقی کرنا یہ انسان کا جوہر خاص ہے —— یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ایک طرف تو جمادات۔ نباتات۔ حیوانات سب سے انسان کو اشرف قرار دیا دوسری طرف صنف ملائکہ سے بڑھا دیا —— ملک، وہ بے شک بلند مرتبہ ہستی ہے۔ رفیع المنزلت وجود ہے۔ بھلا کیا حق مجھ کو کہ میں ملائکہ کی منزل کو پست کہوں۔ عالم بالا کے رہنے والے، سدرہ پر منزل رکھنے والے، جوار حضرت احدیت میں بسنے والے اُن کی منزلت کو میں پست کہوں یہ ناممکن ہے۔ بہت بلند۔ بہت رفیع المرتبہ۔ بہت اعلیٰ منزلت۔ مگر میں نے عرض کیا "خود اختیاری ترقی کی صلاحیت" اختیار کے معنی ہمیشہ دو پہلوؤں کے طالب۔ وجود اور عدم، ہست و نیست، فعل و ترک۔ ملائکہ بہت بلند ہیں لیکن اُن کی بلندی محل، مرتبہ و منزل کی رفعت ظاہری اعتبار سے ہمارے لئے ویسی ہی ہے جیسے معمار نے یہ عمارت بنائی۔ اس کا کنگرہ وہاں رکھا۔ اینٹیں یہاں رکھیں۔ ہے ضرور وہ کنگرہ بلند مگر معمار نے وہاں رکھا ہے —— وہ ہے بلند لیکن تعریف ویسی ہی کروں گا جیسی موتی کی آب و تاب کی —— بطور ثنا و ستایش کے میں کمال کا اعتراف کروں۔ یہ ناممکن ہے اس لئے کہ بنانے والے نے بلند ہی رکھا —— اختیاری حیثیت سے بلند ہوتا تب میں تعریف کرتا —— وہاں کی یہ بلندی رمز ہے انسان سے اُس کے پست درجہ پر ہونے کی —— اُس کی پاک و مقدس ذات ہے۔ اُس کی ذات میں عصیان کا وجود نہیں ہے لیکن بایں معنی کہ قوت عصیان خلق ہی نہیں ہوئی۔ طاقت گناہ پیدا ہی نہیں کی گئی۔ صاف و شفاف جس کے دامن پر کوئی دھبا نہیں۔ بالکل پاک و منزہ لیکن انسان کے مقابلہ میں ملک ناز کر سکے، یہ ناممکن ہے۔ تمام ملائکہ بے شک بہت بڑے درجہ پر۔ بہت منزہ اور معصوم لیکن اُن کی عصمت خود اختیاری نہیں ہے۔ پیدا کئے گئے ہیں معصوم۔ ہیں معصوم —— مگر انسان متحارب قوتوں کا مالک، ایک جنگ ہے جو اس مختصر سی دنیائے جسم انسانی میں برپا رہتی ہے —— ایک طرف نفس امارہ کی طاقتیں ہیں —— وہ اپنی طرف لیجانا چاہتی ہیں —— ایک طرف عقل کا لشکر ہے وہ اپنی سی چاہتا ہے کر کے رہے —— یہ تصادم ہے۔ ان متحارب طاقتوں میں انسان رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی نظر سے امتیاز کرکے ساتھ دے۔ اب اگر انسان نے ان تمام متحارب طاقتوں کو دیکھ بھال کر ایک کا ساتھ دیا دوسرے سے بیزاری اختیار کی تو کیا کہنا —— پھر تو لڑ بھڑ کر فتح کرنے والا ظفریاب مجاہد ہے —— راستہ چلتے کوئی مال و دولت ہاتھ نہیں آگیا ہے۔ بلکہ اپنی قوت بازو سے جنگ کرکے فتح و ظفر حاصل کرکے ملک طاعت پر قبضہ کیا ہے —— یہ انسان ہے —— یہ ملک کے سامنے آتا ہے۔ فتحمندی کا نشان سر پہ لہراتا ہوا آتا ہے —— ملک سے کہتا ہے —— جو ملک تم کو دیا گیا تھا بغیر لڑے بھڑے ہوئے۔ صرف عطیہ کے طور پہ اُس کو میں نے لڑ بھڑ کر فتح کیا —— وہ ملک عصمت ہے اور یہ انسان کی طاعت ہے۔"

نبی و رسول کے متعلق ہرگز یہ خیال درست نہیں کہ اُس میں خصوصیات انسانی کو مفقود ہونا چاہئے بلکہ درحقیقت اُس میں خصوصیات انسانی کو پایۂ تکمیل پر ہونا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "انسان کامل" کہے جانے کا مستحق ہو اور مدیر نگار کے الفاظ میں وہ "ہماری طرح ایک انسان ہو لیکن بلند ترین سطح کا"

مگر خصوصیات انسانی کی تعیین میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

پست درجہ کے افراد کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں واقفیت ہے تو اُس کے ساتھ بہت سی باتوں سے ناواقفیت ــ سلامت روی ہے تو اُس کے ساتھ کجروی۔ تحفظ و تذکر ہے تو اُس کے ساتھ سہو و نسیان ــــ اصابت رائے ہے تو اُس کے ساتھ غلطی ــ یعنی محاسن کے ساتھ معائب کی شرکت اور کمالات کے ساتھ نقایص کی آمیزش ہے۔

"خصوصیات انسانی" کے تحت میں اگر ان نقایص کا شمار کیا گیا جن کے ساتھ اُن محاسن کا دامن آلودہ ہے تو "خصوصیات انسانی" کے پایۂ تکمیل پر ہونے یا "انسان کامل" کے مفہوم پیدا ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ سب سے زیادہ جاہل۔ سب سے زیادہ کجرو۔ سب سے زیادہ بُھلکڑ اور سب سے زیادہ غلطی کرنے والا ہو۔

لیکن "خصوصیات انسانی" اگر نام ہے اُس کمال کے پہلو کا جو پست افراد میں ان نقایص کے ساتھ آمیختہ ہے تو خصوصیات انسانی کی تکمیل اور انسان کامل کی امتیازی حیثیت یہ ہوگی کہ زائد سے زائد واقفکار، زائد سے زائد سلامت رو، زائد سے زائد باہوش اور زاید سے زاید صائب الرائے ہو۔

غالباً انسانی کمال کی بلند حیثیت کو کوئی شخص پہلی صورت کے ساتھ وابستہ نہیں قرار دیتا اور اسی لئے جناب نیاز بھی باوجود اس کہنے کے کہ "ایک نبی کی شان یہ ہے کہ اُس میں انسانی قوتیں زیادہ تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہوں" اور یہ کہ "وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا" نبی کے لئے اس کی ضرورت قرار دیتے ہیں کہ وہ تمام دوسرے انسانوں سے زیادہ ضبط نفس پر قادر ہے، سب سے زیادہ غائر نگاہ سے سوچتا ہے۔ بہت کم مخالف و مقابل قوتوں سے متاثر ہوتا ہے اور غلطی بہت کم کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی خصوصیات کا کمال اُنھیں محاسن کی تکمیل کے ساتھ وابستہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ نقائص "انسانی خصوصیات" کا جزو نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ایک متضاد حیثیت رکھتے ہیں جو اُن خصوصیات کے پست اور ناقص درجہ میں ہونے کی بنا پر کسی حد تک پائے جاتے ہیں اور جتنی خصوصیات انسانی کی تکمیل زیادہ ہو اُتنے ہی یہ نقایص گھٹتے چلے جاتے ہیں پھر اگر کوئی ایسی ہستی فرض کی جائے جس میں یہ نقایص موجود ہی نہ ہوں تو وہ ایک "غیر انسانی ہستی" یا "انسانی خصوصیات سے معرّا ذات" کیونکر قرار پائے گی بلکہ نتیجہ یہی قرار پائے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس میں خصوصیات انسانی اپنے پورے درجۂ کمال پر پائے جاتے ہیں اس لئے

وہ نقایص بالکل فنا ہو گئے ہیں اور دوسری لفظوں میں وہ ایک انسان ہے لیکن بلند ترین سطح کا۔

اس کے بعد پھر آخر انسانیت کا لازمہ یہ کیوں قرار دیا جائے کہ اُسے غلطی ضرور کرنا چاہئے۔ اُسے بے راہ روی میں ضرور مبتلا ہونا چاہئے۔ اُسے اپنی خواہشوں کی رو میں کبھی نہ کبھی ضرور بہنا چاہئے ورنہ وہ انسان نہیں سمجھا جائیگا۔

پھر دیکھئے کہ جذبات کی پیروی کرنا جس کا نام ہے گناہ۔ تحفظ و تذکر میں کوتاہی ہونا جس کا نام ہے سہو و نسیان غور و خوض میں صحیح نتیجہ پر نہ پہونچنا جس کا نام ہے غلطی اور خطاء اجتہادی۔ یہ سب ایک ہی سطح کے نقائص ہیں جنھیں "انسانی کمزوری" کے نام سے یاد کر کے عام طور سے انسانیت کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر "انسانیت" انھیں نقایص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ان کی پُٹ انسان میں ضرور ہونا چاہئے ورنہ وہ انسانیت سے خارج ہے تو پھر ان میں تفریق کیوں کہ بعض تو نبی میں بالکل مفقود فرض کی جائیں اور بعض کو کم درجہ پر تسلیم کیا جائے؟

آخر یہ کس لئے کہ گناہ تو رسول سے بالکل نہیں ہوتا اور غلطی یا لغزش جو انسانی فراست سے اس دنیا میں ہو سکتی ہے وہ اُس سے بھی ممکن ہے لیکن بہت کم۔

اگر یہ دونوں ہی انسانی کمزوریاں ہیں اور اُن کو ایک انسان میں ہونا چاہئے تو گناہ کو بھی یہ کہا جائے کہ وہ رسول سے ہو سکتا ہے مگر دوسروں کی بہ نسبت کم اور غلطی یا لغزش بھی ہو سکتی ہے مگر دوسروں کے لحاظ سے کم۔

اور اگر گناہ ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتا ہے اور اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ "وہ اپنی نیت کے لحاظ سے، اپنے مقاصد کے نقطۂ نظر سے یقیناً ایک معصوم انسان ہے" تو غلطی بھی ایک انسان سے باوجود انسان ہونے کے بالکل مفقود ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ "لیکن اپنے تدابیر اپنی فہم و دانش کے لحاظ سے اس کاروبار عالم میں وہ کبھی کبھی اجتہادی غلطی بھی کر سکتا ہے"۔

اگر یہ کہا جائے کہ "اجتہادی غلطی" درحقیقت ایک انسان کے لئے کسی طرح کا نقص اور عیب ہی نہیں تو پھر آخر رسول میں جسے کہا گیا ہے کہ وہ بلند ترین سطح کا انسان ہے غلطی کو دوسرے تمام افراد کی بہ نسبت بہت کم قرار دینے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟

اس کو دوسروں کی بہ نسبت رسول میں کم قرار دینا ہی صاف غمازی کر رہا ہے کہ یہ ایک دھبہ ضرور ہے جو انسانیت کے دامن پر بدنما حیثیت رکھتا ہے پھر ایک ایسی ہستی کے لئے جو بقول آپ کے ایک بلند ترین سطح سے تعلق رکھتی ہے اُسے بالکل مفقود مان لیا جائے تو کیا گناہ ہے؟ اس صورت میں وہ انسانیت سے خارج کیونکر ہوگا جبکہ اس دھبے کے کم ہونے سے اُس کی انسانیت کی کمی نہیں ثابت ہوئی بلکہ انسانیت میں بلندی پیدا ہوئی تو اُس کے معدوم ہو جانے سے انسانیت مفقود کیونکر ہو گی بلکہ وہ بلند ترین سطح پر پہونچ جائے گی جو حقیقۃً نبوت کا اصلی معیار ہے

"نہ کرنے" اور "نہ کرسکنے" کے لفظی اُلٹ پھیروں سے حقیقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ "عصمت" بایں معنی کسی نہ کسی درجہ تک دنیا کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔

یونیورسٹی اور کالجوں کے امتحانات۔ ایک لڑکا بہت غلطیاں کرتا ہے فیل ہو جاتا ہے۔ ایک ذہین ذکی لڑکا ہر درجہ میں کبھی فرسٹ ڈویژن سے کم معیار کے نمبر پاتا ہی نہیں۔ بے شک کہا جائے گا کہ یہ ذہین لڑکا کبھی فیل نہیں ہو سکتا اور کبھی غلط پرچہ نہیں لکھ سکتا۔

ایک حاذق طبیب کبھی نسخہ غلط نہیں لکھ سکتا۔ ایک ماہر وکیل کبھی بحث میں غلطی نہیں کر سکتا۔ ایک کامل قانون داں جج کبھی فیصلہ غلط نہیں کر سکتا۔ ایک کامل زبان داں کبھی محاورہ کی غلطی نہیں کر سکتا۔

وہ لڑکا جب غلطی کرے گا اُس کی ذہانت و محنت کی کمی سمجھی جائے گی۔ وہ جب نسخہ غلط لکھیگا حذاقت کے نقص کا نتیجہ ہوگا۔ وہ جب بحث میں غلطی کرے گا اُس کی مہارت کی کمزوری ثابت ہوگی۔ وہ جب فیصلہ غلط کریگا اُس کی قانون دانی محل بحث قرار پائے گی۔ وہ جب محاورہ کی غلطی کرے گا اُس کی زباندانی کا قصور ہوگا۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اس سے زیادہ ذہین طالبعلم ہو۔ جو اس سے زیادہ حاذق طبیب ہو۔ جو اس سے زیادہ ماہر وکیل ہو۔ جو اس سے زیادہ قانون داں جج ہو۔ جو اس سے زیادہ محاورہ داں اہل زبان ہو۔ اُس سے یہ غلطی غیر ممکن ہے۔

"غیر ممکن ہے" کیا معنی؟ یعنی اُس کی ذہانت۔ اُس کی حذاقت۔ اُس کی مہارت۔ اُس کی قانون دانی۔ اُس کی زبان دانی غلطی سے مانع ہے۔ اس لئے غیر ممکن۔

یوں ہی اگر کہا جائے کہ ایک نبی و رسول سے گناہ ہونا غیر ممکن، غلطی ہونا غیر ممکن تو اس غیر ممکن کے یہی معنی کیوں نہ قرار دئے جائیں کہ اُس کا کامل احساس فرائض، اُس کی پوری معرفت و حقیقت شناسی اور اُس کی کامل عقل و معاملہ فہمی گناہ اور غلطی سے مانع ہے۔

لطف یہ ہے کہ جناب مدیر نگار اس "نہ کرسکنے" پر ایک جگہ سخت احتجاج کرنے کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ "ایک انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ باوجود گناہ پر قدرت رکھنے کے اس سے باز آئے، وہ جھوٹ بول سکتا ہو، لیکن نہ بولے، وہ غصہ کر سکتا ہو لیکن نہ کرے، ماحول سے متاثر ہو سکتا ہو لیکن نہو" اس کے بعد پھر خود ہی حضرت رسول کی عصمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ تحریر فرمائے ہیں کہ:۔ "میں کبھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ کسی معصیت یا گناہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کیونکہ گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ جس حد تک مذہب کا تعلق تھا آپ کی ہر تعلیم وحی و الہام کے ماتحت ہوتی تھی اور اس میں کسی لغزش کا امکان نہ تھا۔"

اب فرمائیے کہ اس "مرتکب نہیں ہو سکتا" اور "امکان نہیں ہے" کے کیا معنی ہیں؟

لفظی تعبیر کے اسی اُلجھاؤ میں پھنس کر فرقہ شیعہ کے اس عقیدہ پر کہ خدا کے لئے ظلم محال ہے، فعل قبیح محال ہے، کذب محال ہے، وعدہ خلافی محال ہے جس کے دوسرے الفاظ یہی ہوئے کہ خدا ظلم نہیں کر سکتا فعل قبیح نہیں کر سکتا، جھوٹ اور وعدہ خلافی کا مرتکب نہیں ہو سکتا جمہور اہل اسلام کی جانب سے بڑی لے دے ہوتی ہے کہ دیکھو یہ خدا کی قدرت سے کے منکر ہیں اور اُس کو عدل پر مجبور قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے شیعہ عموم قدرت کے منکر نہیں ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی حکیمانہ شان اُس کی قدرت کو ان اُمور کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہونے دے سکتی۔

بالکل اسی صورت سے عصمت کے مسئلہ میں "گناہ نہ کرسکنے" یا "گناہ کے غیر ممکن ہونے" کے یہ معنی قرار دینا کہ معصوم گناہ پر قادر ہی نہیں ہے بالکل غلط ہے۔

"وہ گناہ نہیں کر سکتا" اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی عفت نفس اور پارسائی۔ قدس و نزاہت اور حکیمانہ رفعت ارادہ گناہ سے مانع ہے۔

وہ چاہے تو گناہ کر سکتا ہے مگر اپنے بلند انسانی خصوصیات کی بنا پر وہ چاہے ہی گا نہیں۔

اس سے ہرگز قدرت سلب نہیں ہوتی اور نہ "پیدائشی معصومیت" سے نبی کا متصف کرنا لازم آتا ہے جو بے شبہ منصب نبوت کی توہین کرنا ہے۔

دوسرا سوال

"انبیاء و ائمہ اگر غلطی یا لغزش سے پاک تھے تو اس کے عقلی یا نقلی دلائل کیا ہو سکتے ہیں؟"

یہی پہلے سوال کے آخری جزء کا محصل ہے جس کے الفاظ یہ تھے کہ "اگر لغزش و نسیان، اجتہادی غلطی کا امکان انبیاء و ائمہ کو غیر معصوم بنانے کے لئے کافی ہے تو کیوں؟"

جناب نیاز کا فیصلہ اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ اُن کی سابقہ عبارت سے ظاہر ہو چکا ہے یعنے اُن کا خیال ہے کہ گناہ سے تو ایک نبی یا رسول کا معصوم ہونا ضروری ہے لیکن لغزش و نسیان اور اجتہادی خطا کا امکان ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ رسول کسی معاملہ میں جو رائے قایم کرے وہ درست نہو اور اُس میں غلطی ہوئی ہو۔

اُن کی دلیل اس کے اوپر یہ ہے کہ "گناہ کا تعلق انسان کے ارادہ اور خرابی ضمیر سے ہے اور اس میں

کلام نہیں کہ جس حد تک نیت و ارادہ کا تعلق ہے ایک رسول کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن گناہ کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے انسانی لغزش، اجتہادی غلطی، نسیان اور بھول چوک کہتے ہیں اور اس کا امکان ہر وقت ہر انسان سے ہے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایک نبی کے ساتھ اُمت کا تعلق اگر وہ ہوتا جو ایک سالک و مرتاض پیر مرشد کے ساتھ اُس کے پاک باطن مرید کا یعنے نبی صرف روحانی حیثیت سے بندگان خدا کو خدا سے تقرب حاصل کرنے کا ایک باطنی ذریعہ ہوتا کہ اُس کی روحانی قدس و پاکیزگی سے فیض حاصل کر کے خلق خدا واصل الی اللہ ہو جائے اور اپنے نفس کو پاکیزہ بنا کر خدا کی بارگاہ سے نزدیکی حاصل کرے، تو بے شک اس کے لئے صرف رسول کا پاک باطن اور ضمیر کی خرابیوں سے علٰحدہ ہونا ضروری تھا تاکہ اُس کی باطنی صفائی اور نیت کی پاکیزگی سے مرتاض مرید کی روحانیت میں اضافہ ہو اور اُس کے نفس میں صفائی پیدا ہو۔ اس کے لئے اُس میں کسی قسم کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے عقلی کمال کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کیونکہ آخرت کی نجات کا تعلق ضمیر و نیت ہی کے ساتھ ہے اور اس لئے صاف سادہ مسلمانوں کے لئے یہ روایت نوک زبان ہے کہ "اہل الجنۃ بلہ" (یعنی بہشت کے لوگ سادہ لوح بھولے بھالے ہوتے ہیں) اور اسی لئے ایک بہت بڑے عالم اسلام کا مقولہ ہے:۔

"رب رجل نرجو شفاعتہ ولا نقبل شہادۃ"

(یعنی بہت سے ایسے آدمی ہیں کہ خدا کے یہاں ان کی شفاعت کے متوقع ہو سکتے ہیں (کیونکہ یہ آخرت کا معاملہ ہے) لیکن محکمہ قضا میں اُن کی گواہی قبول نہیں کرتے کیونکہ اس میں معاملہ فہمی اور عقل و تدبر کی ضرورت ہے")

مگر ایک نبی و رسول کی نسبت یہ خیال اگر کوئی ملائے مسجد یا صاف سادہ مقدس "مولوی" ظاہر کرتا تو پھر بھی قابل تعجب نہ تھا لیکن جناب مدیر نگار جیسے روشن خیال، وسیع النظر، متنور الفکر انسان کی جانب سے ہرگز اس کا اظہار ممکن نہیں ہے۔

پھر جبکہ رسول کی حیثیت صرف ایک واسطۂ روحانی اور وسیلۂ باطنی کی نہیں ہے بلکہ وہ اُمت کی عملی اصلاح کا ذمہ دار۔ اُن کے انسانی خصوصیات کا مکمل اور اپنے قول و عمل سے اُن کا حقیقی رہنما اور اُن کے لئے اتباع و پیروی کے واسطے ایک نمونہ ہوتا ہے۔ تو اب اُس کے لئے صرف باطن کا صاف اور ضمیر کا پاک ہونا ہرگز کافی نہیں ہے۔ وہ اپنے باطن اور ضمیر کے لحاظ سے کتنا ہی مکمل ہو لیکن اگر وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ رائے قایم کرنے میں غلطیاں کرتا ہے۔ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط سمجھ لیتا ہے اور غلط طرز عمل کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتا ہے اور غلط راستے پر چلتا اور دوسروں کو چلاتا ہے تو ایسا شخص ہرگز اصلاح خلق اور رہنمائی اُمت کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا اور کسی طرح نبوت و رسالت کے عہدہ کا اہل نہیں ہے۔

دُنیا کے ہر شعبہ میں اسی عصمت کی تلاش ہوتی ہے۔ مریض کو لاکھ یقین دلائیے کہ فلاں حکیم تمہارے بارے میں "بدنیت" ہرگز نہیں ہے یعنی وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں مار ڈالیگا لیکن اس کی اس "نیک نیتی" سے کبھی اُسکے مرض کا "درمان" نہیں ہو سکتا جبکہ وہ نسخوں میں غلطی کر جائے یعنے زہر کو تریاق سمجھ کر دیدیتا ہو۔ وہ تلاش کریگا "حاذق" کی یعنے جس سے غلطی نہ ہوتی ہو۔

ایک موکل کو ہزار اطمینان دلائیے کہ فلاں وکیل تمہارا دشمن نہیں ہے اور سمجھ بوجھ کر تمہارے مخالف پیروی نہیں کرے گا مگر کیا نتیجہ جبکہ اُسے معلوم ہو کہ اُس میں اصابت رائے نہیں یعنے وہ مضر پوائنٹس کو مفید سمجھ کر عرضی دعوے میں تحریر کرتا اور بحث میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ ہار جاتا ہے۔ وہ تلاش کرے گا "ماہر فن" وکیل کی یعنی جو دھوکا نہ کھاتا ہو۔

ایک طالبعلم کو کتنا ہی مشورہ دیجئے کہ فلاں اُستاد سے تعلیم حاصل کرو۔ وہ تمہیں غلط مطلب غلط سمجھتے ہوئے نہیں بتائیں گے۔ وہ کہیگا پھر میرا کیا فایدہ جبکہ وہ غلط مطلب صحیح سمجھ کر مجھے بتلائیں اور میری ذہنی گمراہی کا سبب قرار پائیں۔ وہ تلاش کرے گا ایسے معلم کی جو صحیح مطلب سمجھا ہو اور اُسے صحیح طریقہ سے سمجھا بھی دے۔

وکالت، بیرسٹری، پروفیسری، ماسٹری، تھانہ داری، ججی، کلکٹری، ڈاکٹری، کلرکی غرض ہر عہدہ ومنصب کو سارٹیفکٹوں اور ڈپلوماؤں کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے اور یہ تمام اسناد امتحانوں کی کامیابی کے ساتھ وابستہ اور کامیابی کے بھی مراتب اور بوقت اختلاف ترجیح ہمیشہ ممتاز درجہ کے پاس ہونے والوں کو دیجاتی ہے۔ اور کامیابی وناکامی نیز کامیابی کے درجوں کی تفریق امتحان کی کاپیوں کی جانچ پر مبنی اور ممتحنین کی طرف سے کاپیوں کی جانچ نمبروں کا دینا سب غلطیوں کی کمی اور زیادتی کے ساتھ متعلق۔ جس نے غلطیاں زیادہ کیں اُسکے نمبر سب سے کم۔ جس نے غلطی کم کی یا بالکل نہیں کی اُس کے نمبر سب سے زیادہ۔ وہ فیل۔ یہ پاس، وہ سند سے محروم۔ یہ سند سے سرفراز۔ وہ عہدہ ومنصب سے مایوس۔ یہ عہدہ کا مستحق۔ اب جائیے ممتحنین کے پاس۔ قسمیں کھا کھا کر اُنھیں یقین دلائیے کہ طالبعلموں کی نیت صاف ہوتی ہے اور ضمیر میں خرابی نہیں ہوتی یعنے وہ جو غلطی کرتے ہیں غلطی سمجھ کر ہرگز نہیں کرتے۔ ممتحن یہی کہیں گے کہ ہمیں نیت سے نہیں بحث۔ غلط پرچہ لکھنے والا صحیح سمجھ کر اُس غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہی تو اُس کی غلطی ہے۔ اس لئے پاس ہونے کا مستحق نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے ارکان اور اہل حل وعقد کے پاس جائیے کہ یہ طالبعلم فیل ضرور ہوا ہے مگر جان بوجھ کر فیل نہیں ہوا۔ نیت اُسکی پاک ہے لہذا سند سے محروم نہ کیا جائے۔ وہ کہیں گے ہمیں نیت سے بحث نہیں۔ بہرحال پاس ہونے کے قابل نہ تھا اسلئے سند پانیکا مستحق نہیں۔ خداوندان عہدہ ومنصب کے پاس جائیے کہ اسکو منصفی، ججی، پروفیسری وغیرہ کے عہدوں سے محروم نہ کیجئے۔ اسنے پرچے غلط لکھے غلطیاں ضرور کیں مگر غلط سمجھ کر نہیں کی۔ یہ پاس نہیں ہوا مگر جان بوجھکر ایسا نہیں کیا۔ وہ کہیں گے ہمیں اس سے مطلب نہیں۔ ہمارے یہاں

تو اتنی قابلیت کی ضرورت ہے۔ اس سند کی حاجت ہی بہرحال جب غلطیاں کیں معلوم ہوا قابلیت ناقص ہے لہذا عہدہ و منصب کی اہلیت نہیں۔ غرض دنیا کے ہر شعبہ میں جس عصمت کی تلاش ہے اور جس پر دنیا کا نظام قائم ہے وہ یہی عصمت ہے یعنی غلطیوں سے عصمت۔

اب چونکہ ہماری قدرت کوتاہ ہے اس لئے ہم ہر شعبہ میں اپنے مقدور بھر تلاش کرتے ہیں۔ ہم کو بالکل "مکمل عصمت" نہیں ملتی مگر اس کے زیادہ سے زیادہ کامل نمونہ کو ہم اختیار کرکے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض انجام دیدیا۔ طبیب کی تلاش ہوئی تو ایسا طبیب ڈھونڈھ لیا جو ہمارے حدود دسترس میں کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وکیل ڈھونڈھا تو ایسا جو کم از کم غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

درحقیقت یہ "کم از کم" کی تحدید ہماری "کوتاہ دستی" کا نتیجہ ہے۔ ہماری پیاس بھی اس "کم از کم" پر بجھتی نہیں مگر "عصمت بی بی بے چادری" ہمارا امکان اس سے زیادہ نہیں اس لئے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

لیکن اگر ان میں سے ہر شعبہ میں منتخب کرنے والی ایسی ہستی ہو جس کی قدرت محدود نہیں ہے اور اطلاع کوتاہ نہیں ہے اور جس سے خود بھی غلطی کا امکان نہیں ہے تو ہم کو سمجھنا لازمی ہے کہ اُس نے بھی "عصمت" کے جوہر کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا اور چونکہ اُس کے علم و قدرت میں کوتاہی نہیں۔ اس لئے اُس کو "کم از کم" والی مجبوری پیش نہ آئی ہوگی اور اُس نے کامل "غلطی سے مبرا" ہی کو مقرر کیا ہوگا جس کی اصطلاحی لفظ ہے "معصوم"۔

میں طبیب ڈھونڈھتا ہوں "معصوم" مگر مجھے ملتا نہیں۔ اگر خدا میرے لئے کسی طبیب کو خود مقرر کر دے تو مجھے یقین کرنا چاہئے کہ وہ اُس کے علم میں "معصوم طبیب" ہے اور اُس کے علم میں تخلف نہیں ہے۔

میں وکیل ڈھونڈھتا ہوں "معصوم"، مگر میرے امکانی ہاتھوں سے وہ دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر خدا میرے مقدمہ کی پیروی کے لئے کوئی وکیل مقرر کر دے تو میں یقینی طور پر سمجھوں گا کہ وہ "معصوم وکیل" ہے۔ ایسے ہی ہر شعبہ میں۔

نبی و رسول کا تقرر اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں بھی اپنے نزدیک نبوت و رسالت کے لئے "معصوم" ہی کو ڈھونڈھتا مگر جیسے طبیب مجھے بالکل معصوم نہ ملا۔ وکیل بالکل معصوم نہ ملا۔ ویسے ہی نبی و رسول بھی بالکل معصوم میرے ہاتھوں سے دستیاب نہ ہوتا مگر جو سب سے زیادہ مکمل درجہ میری تلاش میں ملتا اُس کو اپنا مقصد قرار دے لیتا میں بے شک ایسے کو نبی بنا لیتا اور رسول منتخب کر لیتا جو میرے حدود و اطلاع میں غلطیوں سے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو یعنی کم سے کم غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہو لیکن نبوت کا عہدہ تو براہ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے اور اُسی کی قرارداد پر مبنی ہے۔ اُس نے اگر "معصوم" کو نہ ڈھونڈھا تو وہ اپنے "حکیمانہ انتخاب" میں مجھ سے بھی پست ہو گیا۔ اس لئے منتخب کرے گا تو وہ معصوم ہوگا اور چونکہ اس کا ڈھونڈھ کر منتخب کرنے والا میں نہیں ہوں بلکہ خدا ہے اس لئے وہاں "کم از کم" والی حد بندی کے کوئی معنی نہیں۔ وہ مقرر کرے گا تو ایسے ہی کو

جو بالکل غلطیوں سے مبرا معصوم عن الخطاء ہو۔

اور یہی رمز ہے کہ شیعوں نے امامت میں بھی عصمت کی شق لگا دی ہے چونکہ امامت و خلافت بھی اُنکے نزدیک مثل نبوت کے خدا کی طرف کا مقرر کردہ منصب ہے اس لئے "رمز عصمت" میں نبوت و امامت دونوں مشترک حیثیت رکھتے ہیں جیسی عصمت کی ضرورت "نبوت" میں ویسی ہی "امامت" میں۔ تفرقہ کی کوئی گنجایش نہیں۔

بھلا بتائیے تو سہی کہ صرف نیک نیتی اور ضمیر کی پاکیزگی ایک نبی و رسول کے لئے کس مرض کی دوا ہوگی اور مقصد نبوت و رسالت کو کس طرح پورا کرے گی جبکہ اُس کی غلطیوں کی بنا پر اُس کے ہاتھوں خلق خدا کے گمراہ ہونیکا اندیشہ موجود ہے۔

چلتی ہوا کے جھونکے کو جبرئیل کے پر کی ہوا سمجھتا اور نیک نیتی کے ساتھ حقیقۃً یقین کرلیتا ہے۔ دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے انسان کی آواز کو صدائے غیبی جانتا اور اُس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے دل میں پیدا شدہ خیالات کو خواہ مخواہ خدا کی طرف سے نازل شدہ خیال کرتا اور واقعی اعتقاد کرلیتا ہو۔ غلط باتوں کو صحیح سمجھتا اور اپنے نزدیک لوگوں کو اُسی صحیح راستے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو ضروری اور نار وا افعال کو لازم العمل سمجھ کر دنیا کو دعوت دیتا، سختی کے ساتھ اُن پر خود کاربند ہوتا اور دوسروں کو کاربند بناتا ہے۔ یقیناً ایسے شخص کے دامن پر "گناہ" کا دھبّا مشکل سے لگایا جا سکیگا۔ اُس کے ضمیر پر حملہ ہرگز روا نہوگا۔ سزائے اخروی کا ایسے شخص کو مستحق ثابت کرنا بہت دشوار ہے۔ لیکن کیا مقصد نبوت و رسالت ایسے شخص سے انجام پایا؟ ہدایت خلق کا مقصد حاصل ہوا اور دنیا ہدایت یافتہ ہوئی؟

میں سمجھتا ہوں کہ کسی چھوٹے موٹے گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا اور دنیا کو تبلا دینا کہ یہ گناہ ہے اتنا خطرناک اور مقصد نبوت کے لئے مضرت رساں نہیں ہے جتنا غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا، گناہ کو ثواب سمجھ کر کرنا اور غلط مسلک کی طرف صحیح سمجھ کر رہنمائی کرنا۔

مسائل الوہیت و نبوت کے بارے میں جہاں تک ارباب تحقیق کا خیال ہے اُن کا اصل تعلق عقلی احکام کے ساتھ ہے اور دلایل نقلیہ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے کیونکہ نقل کے حدود عمل ہی ان دونوں مرحلوں کے بعد سے شروع ہوتے ہیں۔ نیز عقلی احکام قطعی حیثیت رکھتے ہیں لیکن نقلی دلائل زیادہ تر مظنون الدلالۃ۔ اس لئے ظاہری الفاظ کسی مسلّمہ عقلی کے خلاف بھی نظر آتے ہیں تو اُنھیں بہرحال ایسے معنی پر محمول کیا جاتا ہے جو قطعی الثبوت نتائج کے خلاف نہوں۔

اسی لئے " الرحمٰن علی العرش استویٰ " کے الفاظ سے خدا کے تمکن جسمانی، اور "یداہ مبسوطتان" سے خدا کے لانبے لانبے ہاتھوں کا عقیدہ درخور قبول نہیں قرار دیا گیا اور اُس کے معنی بہر حال ایسے قرار دئے گئے جو ذوق سلیم کے بالکل خلاف بھی نہوں اور ایک قطعی الثبوت حقیقت کے منافی بھی نہ قرار پائیں۔

یہی صورت نبوت کے عقیدہ کی ہے۔ اسی بنا پر خود جناب نیاز کو بھی تاویل سے چارۂ کار نظر نہیں آیا کیونکہ "گناہ" سے انبیاء کی عصمت کا خود اُنھوں نے اقرار کیا ہے مگر اُن کے پیش کردہ آیات میں "گناہ" ہی کے مرادف لفظ کا تذکرہ ہے۔

"استغفر لذنبک" اور "لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک" ان دونوں آیتوں میں صاف "ذنب" کی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "گناہ" اور مغفرت کی لفظ کا تعلق بھی یہی بتلاتا ہے اور "عفا اللہ عنک" کے الفاظ بھی اسی کی ترجمانی کرتے ہیں مگر چونکہ گناہ کی نسبت کو خود اُن کی عقل نے بھی قطعی طور پر منتفی قرار دیا ہے اس لئے اُنھوں نے ان تمام آیات کو خطار اجتہادی پر ڈھالا ہے حالانکہ اجتہادی غلطی ہرگز "ذنب" کا مصداق نہیں ہوتی۔

اُنھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ رسول کسی "معصیت" یا گناہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا لیکن "عصیٰ آدم ربہ فغویٰ" قرآن مجید میں موجود ہے جس میں صاف لفظ معصیت کا استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ایسے آیات موجود ہیں جن سے رسالتمآب کے غلطیوں سے بری ہونے کا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور جسے صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ شان نبوت و رسالت قطعی طور سے اسی کی مقتضی بھی ہو جیسا کہ اس کے قبل توضیح کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

آیت :۔ "قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الیّ ربی" میں بطور تعلیق ضرور کہا گیا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو تو میں اُس کا ذمہ دار ہوں گا اور اگر سیدھی راہ اختیار کروں تو خدا کی ہدایت سے ہے۔"

لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جملۂ شرطیہ کے دونوں طرف کے لئے وقوع ضروری نہیں ہے۔ اُس میں ثبوت اور نفی دونوں کی گنجائش ہے۔ مگر دوسری آیت میں صاف پہلے جملہ والی شرط کو منتفی قرار دیا گیا ہے یعنے ارشاد ہوا ہے:۔

" ماضل صاحبکم وما غویٰ" ـــــ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بے شک امکانی حیثیت کے حدود میں بحیثیت بشری رسول لغزش پر بھی قدرت رکھتا ہے لیکن اس لغزش کا وقوع نہیں ہے۔ وہ گویا اس کا عدم وقوع وہ اُن خصوصیات انسانی کے اعلیٰ معیار کی بنا پر ہے جو رسول کو حامل وحی بنانے کا باعث ہیں جیسے "و فبما یوحی الیّ ربی"

کی لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے ۔ اور انھیں دونوں پہلوؤں کو "قل انما انا بشر مثلکم" ۔ یوحیٰ الیَّ میں نمایاں کیا گیا ہے یعنے پہلے جزو میں رسول اور دوسرے افراد کے درمیان جو نقطۂ اشتراک ہے اُس کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں ما بہ الامتیاز کا ذکر ہے جو رسول کی ذات کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے کیونکہ خدا کی وحی بغیر استحقاق نہیں ہوا کرتی اور استحقاق خصوصیات ذاتی پر مبنی ہے ۔

"وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحی یوحیٰ" میں صاف ظاہر کیا گیا ہے کہ پیغمبر کا کوئی کلام مرضی الٰہی کے خلاف ہوتا ہی نہیں اور جو کچھ زبان سے کہیں وہ وہی ہے کہ اگر وحی بھی اُترتی تو وہی کہتی جو انھوں نے اپنے ذاتی ارادہ سے کہا ہے ۔

آیات اتباع جیسے :- "ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" "ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" وغیرہ یہ بھی غیر مبہم طریقہ سے پیغمبر کے اتباع کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ "اتباع" اور "اطاعت" میں فرق ہے کیونکہ اطاعت صرف احکام سے تعلق رکھتی ہے اور اتباع اور تاسّی دونوں عمل سے متعلق ہیں ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کو نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے جس کے بعد غلطی کے امکان کے کوئی معنی نہیں ۔

"انک لعلیٰ خلق عظیم" میں بھی خدائے عظیم کی جانب سے رسول کے افعال و اعمال کو اعتدال عظیم پر فائز قرار دیکر اُس میں کسی طرح کے نقص و کمزوری کے شبہ کا سد باب کر دیا ہے اور "النبیّ اولیٰ بالمومنین من انفسھم" کے الفاظ میں اُن کو تمام مومنین کے متعلق خود اُن مومنین کے ذاتی اختیارات سے بالاتر اختیارات تفویض کرکے اس کی ذمہ داری لے لی ہے کہ یہ جو کچھ مسلمانوں کے حق میں کریں گے وہ مسلمانوں کے لئے مفید ہی ہوگا جس کے بعد اس کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ جو کچھ اُنھوں نے مسلمانوں کے لئے سوچا ہو اور طریق عمل اختیار کیا ہو اور اُنھیں ہدایت کی ہو وہ درحقیقت موزوں نہ ہو اور خود مسلمان اُن کے حکم کے خلاف اپنے لئے جو صورت تجویز کریں وہ مناسب و اصلح ہو ۔

درحقیقت ایک نبی و رسول کے لئے غلطی کا امکان ہونے کی صورت میں پھر تو اُس کے کسی قول و فعل پر قطعی طور سے اعتماد ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ ٹھیک ہی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہوگا لیکن اصول عقائد میں ظن کوئی چیز نہیں ۔ "انّ الظنّ لایغنی من الحق شیئاً"

اسی لئے بعض وہ علمائے اسلام جنھوں نے خطاء اجتہادی کو رسول کے لئے جایز کہا ہے ، اُنھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ رسول سے خطاء اجتہادی ممکن تو ہے مگر خدا اُس خطا پر رسول کو برقرار نہیں رہنے دیتا ۔ اُس کی طرف سے اُس خطا کی اصلاح ہوتی ہے ۔ اور اس کے نظائر میں بھی مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ :-

"عبس و تولّٰی ان جاءہ الاعمٰی" ——— اور "عفا اللہ عنک لم اذنت لہم" ——— وغیرہ
اس کا لازمہ یہ ہے کہ جہاں پر خطا کی اصلاح نہ ہوا اور کسی آیت کے ذریعہ سے اُس خطا پر تنبیہ نہ کیا گیا ہو وہ خطا نہ سمجھی جائے گی بلکہ رسول کا قول و عمل خدا وند عالم کی جانب سے تنبیہ نہ کئے جانے کے ضمیمہ کے ساتھ دلیل قطعی ہوگا اُس طرز عمل اور ہدایت کی صحت کا۔

اب یہ ملاحظہ کیجئے کہ خلافت جناب امیر کے مسئلہ میں اگر رسول سے خطاء اجتہادی ہوئی تو اُس کا سلسلہ کب سے شروع ہوا؟ اُس وقت سے کہ جب نبوت کا ابتدائی دور تھا اور بیعت العشیرہ میں پیغمبر نے لوگوں سے اپنی نصرت کا وعدہ لینا چاہا اور کوئی طیار نہ ہوا اور صرف علی تھے جنھوں نے لبیک کہی اور اُسوقت رسول نے ارشاد کیا کہ یہی میرا وزیر ہوگا، خلیفہ ہوگا اور جانشین ہوگا۔

اس وقت سے خطاء اجتہادی کی بنیاد پڑی اور پھر ہر موقع پر رسول اپنی اس خطاء اجتہادی کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ جس میں ماہ گزرے۔ سال گزرے۔ رزم و بزم کے کتنے ہی موقع سامنے آگئے اور ہر جگہ پیغمبر نے اپنے اس پروپیگنڈے کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ سب سے آخر میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں حج آخر کے بعد بڑے شد و مد کے ساتھ رسول نے تقریر کر کے مسلمانوں کے سامنے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا، خلق خدا کو عام دعوت دی اور علی کی خلافت کا اعلان کیا۔

اس کے بعد جب مدینہ واپس آئے تب بھی جب تک مرض الموت کی شدت انتہا تک نہیں پہونچی۔ جب تک کہ بات کرنے اور تقریر کرنے کا دم رہا اپنی اس خطاء اجتہادی کی تبلیغ کرتے رہے اور اس طول طویل مدت، تمام زمانۂ رسالت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خدا نے تنبیہ کی۔ اندھے کی بات نہ سنی اور اُس کی طرف سے منھ پھیر لیا۔ تنبیہ ہوئی۔ بعض لوگوں کو جنگ میں شمولیت کی اجازت دی۔ تنبیہ ہوئی۔ بعض عورتوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا۔ تنبیہ ہوئی۔ سورۂ برأت سنانے کسی غیر مستحق کو بھیجدیا۔ تنبیہ ہوئی لیکن اتنے مہتم بالشان مسئلہ میں رسول آخر عمر تک خطاء اجتہادی پر برقرار رہے۔ اُس کی تبلیغ کرتے رہے۔ اُس کی جانب دعوت دیتے رہے مگر خدا نے آدھی بات بھی نہ کہی۔ ذرا کمزور سے کمزور اور چھوٹی سے چھوٹی تنبیہ بھی نہ ہوئی یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد جو مکہ و مدینہ کے درمیان ہوا پھر قرآنی وحی کا سلسلہ بھی بند ہو گیا مگر رسول اس کے بعد بھی اپنی خطاء اجتہادی پر قایم رہے۔

بلکہ اس دوران میں خدا نے عوض اس کے کہ رسول کو اُن کی خطاء اجتہادی پر تنبیہ کرتا اپنے رویہ سے اُن کی خطاء اجتہادی کو اور تقویت دی مثلاً علی نے حالت رکوع میں سائل کو انگھوٹھی دیدی۔ وہاں سے آیت اُتر آئی:— "انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلٰوۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"

اہلسنت کی تفسیریں اٹھا کر دیکھو۔ سب نے یہ روایت لکھی ہے کہ مراد اس سے علی ہیں۔ اب لاکھ اہلسنت شور مچائیں کہ "ولی" کے معنی یہاں مددگار۔ ناصر۔ دوست وغیرہ کے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے بھی ہیں ضرور۔ اب فرض کرو کہ خدا کا مقصود اس لفظ سے وہی ناصر و مددگار رہا بھی ہو لیکن کیا اس سے رسول کی اس خطار اجتہادی کو تقویت حاصل نہیں ہوئی؟

رسول نے کہا:۔ "انا مدینۃ العلم و علی بابہا فمن اراد العلم فلیات الباب"۔ میں شہر علم ہوں اور علی اسکا دروازہ ہیں، تو جو شخص علم کا طالب ہو وہ دروازہ پر آئے۔

خدا نے ارشاد کیا:۔ "لیس البران تاتوا البیوت من ظہورہا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابہا" (یعنی) ہرگز یہ حسن عمل نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ گھروں میں جاؤ تو دروازوں کی طرف سے جاؤ۔"

اب سنی کہیں اور ممکن ہے سچ بھی کہتے ہوں کہ یہ عام بات ہے، اس کا علی سے کوئی تعلق نہیں مگر رسول کے اس قول کے ساتھ اس آیت کے اترنے نے رسول کے پروپیگنڈے کو کیا قوت نہیں پہونچائی؟

رسول سورۂ برأت لیجانے پر حضرت ابوبکر کو مامور کرتے ہیں۔ خدا واپس منگواتا ہے یہ کہکر کہ تمہاری نمایندگی صرف علی ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے مقصود خلافت کی قرار داد ہو لیکن کیا رسول کی خطار اجتہادی کو جو حضرت علی کے بارے میں تھی اس سے قوت نہیں حاصل ہوئی؟

رسول غدیر خم میں تقریر کرتے ہیں اور اپنی "خطار اجتہادی" کے وسیع "پروپیگنڈے" کی سب سے آخری اور پرزور کارروائی عمل میں لاکر علی کی خلافت کا اعلان کرتے ہیں اور خدا کی طرف سے آیت اترتی ہے:۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

(یعنی) "آج میں نے تمہارا دین مکمل کیا۔ آج اپنی نعمت پوری کی اور آج تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ کیا" اس سے حقیقت میں مقصود جو کچھ بھی رہا ہو لیکن کیا اس سے رسول کی خطار اجتہادی پر مہر تصدیق ثبت نہیں ہوئی؟

میں سچ کہتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیعہ واقعاً گمراہی میں مبتلا ہیں اور روز قیامت سوال ہوا تو شیعہ صاف کہدیں گے کہ ہماری گمراہی کی ذمہ دار تیرے حبیب کی خطار اجتہادی ہے اور انکی خطار اجتہادی کو تقویت پہونچانے کی ذمہ داری تیرے رویّہ اور جانبداری و حمایت پر ہے جس کے بعد اگر ہم گمراہ ہوئے تو تیرے ہاتھوں اور تیرے حبیب کے ہاتھوں، ہم بالکل بے قصور ہیں اور بالکل بے گناہ۔ اور پھر جب تیرا حبیب خطار اجتہادی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اپنی عمر بھر مبتلا رہ سکتا ہے تو ہم تو گنہگار انسان ہیں

ـــــ ہم اگر خطائے اجتہادی میں مبتلا ہوئے اور عمر بھر مبتلا رہے تو ہمیں سزا دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ اور یقیناً اگر خدا ظالم نہیں ہے تو کبھی وہ ہم کو اس کے بعد آتشِ جہنم میں نہیں بھیج سکتا۔ ہم نجات کے حقدار ہیں اور کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔"

تیسرا سوال

وصایت جناب امیرؑ ثابت کرنے کے لئے حضرات شیعہ کیا نصوص قطعیہ پیش کرتے ہیں ؟

اس بحث کے بہت سے اجزا ناقص اور غیر مکمل صورت میں "مرزا نام" صاحب کے مضمون میں آچکے ہیں اس مسئلہ ایک غیر متعلق ہندو دوسرے مذہب کے متعلق کتنی ہی وسعت نظر حاصل کرے لیکن اُسی مذہب کے ایک واقفکار انسان کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اُن اجزا کے ثبوت وصحت کے اوپر جناب نیازؔ کی مہرِ تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہم اُن کو اس جگہ مکمل اور حقیقی صورت کے ساتھ پیش کریں جس کی بنا پر اُن کو شیعہ بطور نصوص قطعیہ سمجھتے اور پیش کیا کرتے ہیں۔

(ا)

واقعہ بیعت عشیرہ جس میں حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ:۔

" ہذا اخی ووصیی وخلیفتی فیکم "۔ اس ارشاد کے لب ولہجہ اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں کہ یہ رسول نے بطور مشورہ ارشاد کیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ اگر خلیفہ کا انتخاب کیا جائے تو میرا ووٹ تو علی سمجھنا۔ بلکہ الفاظ اور عنوان واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک قرار داد اور اعلان ہے جو رسول کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔

رسول کا سب سے پہلے تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ کون شخص تم میں سے میرا ساتھ دیتا ہے تاکہ وہی میرا خلیفہ و وزیر ہو اور پھر جب سب نے سکوت کیا اور علی نے اقرار نصرت کیا تو رسول کا یہ ارشاد فرمانا کہ "دیکھو یہ ہے میرا وصی وخلیفہ و وزیر" غیر مبہم طریقہ سے بتلاتا ہے کہ (الف) رسولؐ خلافت کی قرار داد کا اختیار اپنے لئے سمجھتے تھے ورنہ آپ کو اس معاہدہ کا کوئی حق ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جو شخص میری نصرت کا اقرار کرے وہی میرا خلیفہ و وزیر قرار پائے گا۔

(ب) یہ کہ جب علی نے وعدۂ نصرت کر لیا تو اسی وقت معاہدہ کی تکمیل اور ولی عہدی و جانشینی کا اعلان کر دیا گیا اب جس وقت تک کہ یہ حکم منسوخ نہ ہو اُس وقت تک اُس سے تخلف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور اسی بنا پر بعض روایات میں موجود ہے کہ جب اس کے بعد مجمع متفرق ہوا تو قریش جناب ابوطالب (حضرت علی کے والد سے)

بطور تمسخر کہہ رہے تھے کہ لیجئے اب تو اپنے بیٹے کی اطاعت کیجئے۔ اُن کو آپ پر حاکم مقرر کر دیا گیا۔

پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پوری کارروائی رسول کی جانب سے بنا بر وحی عمل میں آئی تھی جس کے متعلق قرآن مجید میں آیت موجود ہے:-

" انذر عشیرتک الاقربین و اخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین "

(یعنی اپنے قریب کے عزیزوں کو متنبہ کرو اور اپنے بازوؤں کو جھکا دو اُس شخص کے لئے جو مومنین میں سے تمہارا اتباع کرے)

اس میں صاف دو حکم نظر آرہے ہیں۔ ایک (عشیرتک الاقربین) کا انذار۔ دوسرے اُس شخص کے لئے جو اتباع کی حامی بھرے اور نصرت کا اقرار کرے ایک خاص قسم کا امتیاز جسے " واخفض جناحک " کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام مذہبی شعبوں میں " وحی متلو " یعنی قرآن کی ہدایتیں مجمل حیثیت رکھتی ہیں جنکی تفصیل رسول کے عمل سے ہوئی ہے، مثلاً قرآن میں ہے " اقیموا الصلوٰۃ " رسول نے نماز پڑھ کے دکھلائی کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے۔ " کتب علیکم الصیام " رسول نے روزہ رکھکر دکھلایا کہ اس طرح۔ " ﷲ علی الناس حج البیت "۔ رسالتمآب نے مناسک حج ادا کرکے اُن کی تشریح کی۔ بہرحال جہاں تک دیکھا جائے مذہب کے ہر شعبہ میں قرآنی مندرجات ایک اجمال کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تشریح ہمیشہ افعال پیغمبر سے ہوئی ہے۔

" واخفض جناحک لمن اتبعک " کا جزو جو " انذر عشیرتک الاقربین " کے ساتھ لگا ہوا ہے اور جس سے باجماع مفسرین بیعت عشیرہ کا واقعہ مراد ہے صاف بتلا رہا ہے کہ یہ " واخفض جناحک " کا حکم کوئی عام بات نہیں ہے جو اس موقع سے کوئی خصوصی تعلق نہ رکھتی ہو بلکہ اس کا تعلق اس موقع کے ساتھ ضرور ہے۔ " اخفض جناحک " کے معنی " حسن اخلاق سے پیش آنے " کے لینا رسول کے وسعت اخلاق کی توہین کرنا ہے کیونکہ وہ رسول تو ایسا تھا جو کفار و مشرکین تک سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔

یقیناً یہ " واخفض جناحک " جو " لمن اتبعک من المومنین " کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے کسی طرح کے امتیاز خصوصی کا پتہ دیتا ہے جو اُس موقع پر اتباع کا اقرار کرنے والے کی ذات سے متعلق ہے۔ رسول کے عمل سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے دونوں جزوں کا امتثال کیا اور اُسی امتثال سے درحقیقت اُنکے معانی کی تشریح ہوئی۔

اُنھوں نے اپنے اعزا و اقارب کو جمع کرکے تبلیغ و دعوت کے ساتھ " انذر عشیرتک الاقربین " کی ہدایت کو انجام دیا اور " لمن اتبعک من المومنین " کے لئے خصوصی حیثیت سے " واخفض جناحک " کے اتباع میں اُنھوں نے اتباع و نصرت کا اقرار کرنے والی ذات کے لئے ایک امتیاز خصوصی عطا کیا۔

معلوم ہوتا ہے رسول " خفض جناح " (یعنی بازو جھکا دینے) کا مطلب سمجھے ایک طرح کے معاہدہ و

اقرار کا بار اپنے کاندھوں پر لے لینا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرے کہ پیغمبر نے خدا کے الفاظ سمجھنے میں غلطی کی۔ "خفض جناح" کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے مگر اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول نے جو کچھ کیا وہ "نیک نیتی" کے ساتھ اپنے خیال میں "بر بنائے وحی"۔ اب اگر اُن سے الفاظ وحی کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی تو خدا کا فرض تھا کہ وہ اُن کو اس غلطی پر متنبہ کرے اور اُس کی اصلاح کردے اور پھر وحی کے مفاد اور تبلیغ احکام خداوندی میں غلطی تو ایسی چیز ہے جسے غالباً جناب نیاز صاحب بھی رسول کی ذات کے لئے غیر ممکن قرار دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی کی جانشینی کا یہ اعلان بر بنائے وحی تھا اور حکم خداوندی کی بنا پر تھا جو وحی متلو یعنی قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔

(۲)

آیت ولایت۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون"

اس کے لئے ملاحظہ ہوں ذیل کے روایات:۔

الخطیب فی المتفق عن ابن عباس - عبدالرزاق - عبد بن حمید - ابن جریر - ابوالشیخ - ابن مردویہ عن ابن عباس - طبرانی فی الاوسط - ابن مردویہ عن عمار بن یاسر - ابوالشیخ - ابن مردویہ عن علی بن ابیطالب ابن ابی حاتم - ابوالشیخ - ابن عساکر عن سلمہ بن کہیل - ابن جریر عن مجاہد - ابن جریر عن السدی و عتبہ بن حکیم - طبرانی و ابن مردویہ - ابونعیم عن ابی رافع - ابن مردویہ عن ابن عباس۔

(در منثور للحافظ السیوطی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۹۳ - ۲۹۴)

ان روایات میں متفقہ طور پر یہ مذکور ہے کہ یہ آیت اُس موقع پر اُتری ہے کہ جب حضرت علی نے ایک سائل کو نماز کی حالت میں انگشت شہادت کے اشارہ سے انگوٹھی دی تھی۔

فضا کے سیاسی تقاضا کی بنا پر علی کی کوئی فضیلت بلا معارض تو رہ ہی نہیں سکتی تھی اس لئے اس آیت کی نسبت بھی بعض روایات دوسرے موجود ہیں مگر مذکورۂ بالا محدثین کی شہادتیں جو بہرحال علی کے ساتھ کوئی جانبداری نہ رکھتے تھے اور مذہبی حیثیت سے اُن کو اس روایت کے گڑھنے کی ضرورت تھی اُن دوسرے معارض روایات کو جو بجائے خود بھی متعارض ہیں بالکل مشکوک بنا دیتی ہیں اور اسی لئے تمام مفسرین اہلسنت اس روایت سے بالکل انکار کی گنجائش ہرگز نہیں پاتے مگر وہ کہتے ہیں کہ "ولی" کے معنی ناصر و مددگار کے ہیں۔ حاکم و متصرف کے معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟ بے شک کیا ضرورت ہے اگر قرائن کی بنا پر

انہی معنی کا تعین نہوتا ہو کیونکہ لفظ مشترک کا کسی ایک معنی کے ساتھ تعلق ہمیشہ قرائن ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔
یہاں مددگار و ناصر مراد لینے سے ایک تو خاص کوئی محصل اس آیت کا ہوتا ہی نہیں اس لئے کہ مددگار و ناصر تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہے۔ ارشاد ہوا ہے :۔ " والمؤمنون بعضہم اولیاء بعض "۔ (یعنی مومنین آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) پھر اس میں تخصیص کے کیا معنی؟ اور پھر رسول اپنے قول و عمل سے اسی لفظ کی حاکم و متصرف کے معنی میں تکرار کر کر کے برابر تفسیر کرتے رہے جیسے بریدہ کی روایت جس میں آپ نے فرمایا " ہو ولیکم بعدی "۔
ان الفاظ کا تذکرہ کثیر التعداد روایات میں موجود ہے جن میں سے بعض ہر نام صاحب کے مضمون میں آ چکی ہیں۔ پھر جبکہ رسول کے ان ارشادات میں واضح طور پر یہ معین ہے کہ ولی کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں اور اسی بنا پر جناب مدیر نگار بھی تحریر فرماتے ہیں :۔ " اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ انکے بعد جناب امیر خلیفہ قرار دئے جائیں جیسا کہ آپ نے بارہا اشارتاً و کنایتاً کیا بلکہ ایک حد تک صراحتاً اس کو ظاہر بھی کیا " اور جبکہ یہی " ولی " کی لفظ قرآن مجید میں بھی موجود ہے اور جبکہ بروایت اکثر مفسرین وہاں بھی ولایت کی صفت علی کے لئے قرار دی گئی ہے تو پھر آخر رسول کے اُن ارشادات کے بربنائے وحی ماننے میں کیوں توقف کیا جائے ؟
اتنا تو کم از کم ضرور ہی ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اس " ولی " کی لفظ کے معنی جو قرآن میں ہے " حاکم و متصرف " ہی کے سمجھے اور اس سے مراد بھی علی ہی کی ذات قرار دی اور اس لئے وہاں چونکہ خدا و رسول کے بعد ولایت میں علی کا درجہ رکھا گیا تھا لہذا آپ نے بھی ارشاد کیا :۔ " ہو ولیکم بعدی "۔
اب اگر رسول سے الفاظ وحی کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو خدا کا فرض تھا کہ تنبہ کر دیتا اور اس غلطی پر رسول کو برقرار نہ رہنے دیتا اور پھر الفاظ وحی کے غلط معنی سمجھنے کے امکان کا رسول کی نسبت غالباً کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

(۳)

آیت تبلیغ جس کے الفاظ یہ ہیں :۔
" یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس "
(یعنی) " اے پیغمبر پہنچا دو اُس شے کو جو نازل کی گئی ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کی رسالت کو کچھ پہنچایا ہی نہیں اور خدا لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا "۔
یہی وہ پُرزور حکم محکم ہے جس سے حضرت علی کی ولایت کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور اسی کو غالباً " ہر نام " صاحب نے لکھا ہے کہ " شیعہ علی کی امامت کے متعلق قرانی ہدایت کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں "۔ حسب ذیل روایات اہلسنت اس باب میں متفق ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت علی

کی تبلیغ کے بارے میں نازل ہوئی ہے :-

ابن ابی حاتم و ابن مردویہ و ابن عساکر عن ابی سعید الخدری - ابن مردویہ عن ابن مسعود - ابن ابی حاتم عن عنترۃ عن علی ابوبکر الشیرازی فیانزل من القرآن فی علی عن ابن عباس - ابو اسحٰق احمد بن محمد الثعلبی عن البراء بن عازب - محمد بن طلحہ - القرشی فی مطالب السئول باسناد الواحدی - عبدالرزاق الرسعنی عن ابن عباس - نظام الدین النیشاپوری فی غرائب القرآن عن ابی سعید الخدری و ابن عباس والبراء بن عازب و محمد بن علی - السید علی الہمدانی فی مودۃ القربیٰ عن ابن عباس - نورالدین ابن الصباغ المالکی فی الفصول المہمۃ باسناد الواحدی - بدرالدین العینی فی عمدۃ القاری - جمال الدین المحدث الشیرازی فی کتاب الاربعین - شہاب الدین احمد فی توضیح الدلائل - محمد بن معتمد خاں البدخشی فی مفتاح النجی ---- وغیرہ

"جو اشخاص اس بارے میں شک و شبہ کرتے ہیں وہ کسی خاص ایسے حکم کا پتہ نہیں دیتے جس کی تبلیغ کا اس زور و شور کے ساتھ تاکیدی حکم ہوا ہو۔ اُن میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ " ما انزل الیک" سے قرآن و شریعت مراد ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدائے زمانۂ بعثت سے رسول کی عمر گزری تبلیغ قرآن و شریعت کرتے کرتے۔ توحید و رسالت اور معاد ایسے اصول دین سے لیکر نماز و روزہ حج و زکوٰۃ اور احکام معاملات و قصاص و دیات تک آپ نے سب کی تبلیغ کی اور کبھی نہ ہچکچائے۔ نہ پس و پیش کیا۔ نہ کسی خوف و اندیشہ کے احساس سے متاثر ہوئے۔ پھر آخر اب ساری رسالت کی عمر ختم ہونے کے بعد یہ کہنے کے کیا معنی کہ اے رسول تبلیغ کرو دین و شریعت کی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کچھ رسالت پہونچائی ہی نہیں ؟ کیا رسول اب تک تبلیغ دین و شریعت نہ کر چکے تھے ؟ کیا آپ نے خداوندی پیغام دُنیا کو نہ پہونچائے تھے ؟ کیا آپ نے احکام الٰہی سے لوگوں کو خبر دار نہ کیا تھا ؟ پھر آخر اب اس حکم کا حاصل ؟!

اور پھر تبلیغ رسالت کے معنی ہی تبلیغ دین و شریعت کے ہیں۔ اس کے بعد " ما انزل الیک" کو بھی دین و شریعت کے معنی میں لے لینا قرآن پاک کی آیت کو جسے مسلمان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ کہتے ہیں معنی و مفہوم کے جوہر سے بے نیاز سمجھنا ہے۔

مفہوم آیت کا اس وقت یہ ہوگا کہ " اے رسول دین و شریعت کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی تو تم نے دین و شریعت کی تبلیغ نہیں کی"

کیا یہ " دندان تو جملہ در دہان اند - چشمان تو زیر ابرو انند " کا صحیح نمونہ یا اس سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔ الفاظ کی یہ ترکیب صاف بتلاتی ہے کہ " ما انزل الیک" سے کوئی خاص اہم حکم مراد ہے اور اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ یہ حکم ایسا اہم حکم ہے کہ اس کی اگر تم نے تبلیغ نہیں کی تو گویا تمام دین و شریعت کی تبلیغ نہیں ہوئی۔

اس کی مثالیں روزمرہ کی زبان میں برابر آتی رہتی ہیں۔ محل تاکید میں برابر کہتے ہیں کہ "تم نے اگر یہ کام نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں" اب وہ خاص حکم کیا ہے ؟

آیت سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حکم ایسا ہے جس میں خطرات پائے جاتے ہیں اور انہی خطرات کا اندیشہ رسول کو ابتک اس حکم کی تبلیغ سے مانع رہا ہے اور درحقیقت رسول حکیمانہ مصالح کی بناپر اس کے منتظر تھے کہ اس طرح کا تاکیدی حکم خدا کی جانب سے آجائے تو آپ اس اہم اعلان کی طرف اقدام فرمائیں۔

پھر وہ خطرات کیا ہیں ؟

یہ بھی آیت سے ظاہر ہے کہ خطرہ کسی آفت ارضی وسماوی، کسی بلائے ناگہانی، کسی آندھی پانی کا نہیں ہے بلکہ لوگوں سے خطرہ ہے۔ لوگوں کی مخالفت سے صرف نہیں، بلکہ ضرر رسانی اور اتلاف جانی سے اور اگر ایسا نہ ہو تو " واللہ یعصمک من الناس " کے ٹکڑے کا کوئی محل نہیں۔

آیت سورۂ مائدہ کی ہے جو حجۃ الوداع میں اُترا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام قبائل عرب اسلام لا چکے تھے اور حضرت سرورکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطیع ہو چکے تھے۔ یہود کی شورشیں ختم ہو گئیں۔ عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ میں صلح ہو چکی۔ مشرکین قریش کی جنگجویانہ روح خندق کے بعد ختم ہو گئی اور اُنکی عداوت دعناد نے صلح حدیبیہ میں آخری سانسیں لیں جس کے بعد فتح مکہ میں اُس کی حس وحرکت بالکل باقی نہیں رہی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کا آخری سال اور آخری حج۔ ستر ہزار مسلمان مکۂ معظمہ میں آکر رسول کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے میں مصروف۔ اس صورت میں یہ خوف ودہشت۔ یہ خطرہ کا احساس یہود سے ہو نہیں سکتا۔ نصاریٰ سے ہو نہیں سکتا۔ مشرکین سے ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے جو کسی قول۔ کسی روایت کسی معمولی سے معمولی اسناد کی بناپر بھی ابتدائے اسلام کی نازل شدہ نہیں ہے بلکہ اسی موقع کی ہے جب اسلام کو انتہائی قوت حاصل ہو گئی تھی اور غیر مسلمین سے پیغمبر کو کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

پھر " واللہ یعصمک من الناس "، کے الفاظ کیا یہی نہیں بتلاتے ہیں کہ حکم کوئی ایسا تھا جس میں خود مسلمانوں کی جماعت سے خطرہ تھا اور انھیں کے متعلق رسول سے برگشتگی اور نقصان رسانی کا اندیشہ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اقلیت کی مخالفت اور اکثریت کی موافقت کے ساتھ " الناس " کی تعمیم درست نہیں ہو سکتی اور نہ خطرہ کا کوئی محل ہے بلکہ " واللہ یعصمک من الناس "، کے الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ معاملہ ایسا تھا جس میں جمہور رسول کی رائے کے خلاف تھے اور آپ کو اُس میں عام مخالفت کا خیال تھا۔

یقیناً مفسرین اُس نقطہ سے ہٹ کر جو اکثر ارباب تفسیر میں متفقہ حیثیت رکھتا ہے آیت کے ان تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی خاص تاویل وتفسیر کر ہی نہیں سکتے۔

آیت اپنے تمام خصوصیات کی بنا پر صرف خلافت حضرت علیؑ کے بارے میں منطبق ہوتی ہے۔ رسولؐ کو اس معاملہ میں یقیناً عام مخالفت کا اندیشہ تھا اور خود مسلمانوں کے بارے میں آپ کو احساس تھا کہ وہ اس سے ہرگز متفق نہیں ہوں گے جیسا کہ جناب مدیر نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"آپ اچھی طرح واقف تھے کہ جناب امیر کا خلیفہ بن جانا آسان نہیں ہے اور ان کے اتنے مخالف موجود ہیں کہ اس پر اصرار کرنا سخت فتنہ و فساد کا باعث ہوگا"

آگے چلکر آپ نے تحریر کیا ہے:-

"یہ فطرت انسانی ہے کہ جب ایک محبوب کے متعدد چاہنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک اپنا ہی درخور حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر اُسے کسی خاص شخص سے زیادہ تعلق ہو جاتا ہے تو دوسرے دل کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ رسالتمآب جس خصوصیت کا اظہار جناب امیر سے کیا کرتے تھے، اُسے فطرتاً تمام صحابہ کے لئے باعث رشک ہونا چاہئے تھا اور غالباً حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جو عزت جناب امیر کی رسول اللہ کے دل میں تھی بالکل وہی دوسروں کی نگاہ میں تھی، اس کے علاوہ حضرت علی کی طرف سے ایک عام جذبۂ ناپسندیدگی کا سبب یہ بھی تھا کہ غزوات میں سب سے زیادہ آپ ہی نے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور شاذ ہی کوئی خاندان یا قبیلہ ایسا ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ ہر چند یہ جو کچھ ہوا سب اسلامی نقطۂ نظر سے تھا اور اس میں ذاتی اغراض و مقاصد کا مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اہل عرب اپنی کینہ پرور طبیعت کی وجہ سے مجبور تھے اور یہ کانٹا اُن کے دل سے کسی طرح نہ نکلتا تھا"

"ہرنام" صاحب نے بھی اپنے ابتدائی مضمون میں کافی شواہد اس امر کے لکھے ہیں کہ کس کس طرح صحابہ حضرت علی کے معاملہ میں رسول کے رویہ پر اعتراض و مخالفت کرتے تھے۔ نیز یہ کہ خود رسول کو صحابہ کی نسبت اس معاملہ میں کتنی بے اطمینانی تھی اور آپ اپنی فراست کی بنا پر گویا دیکھ رہے تھے کہ کس طرح صحابہ آپ کے بعد علی سے روگردانی کریں گے اور اُن کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔

اس صورت حال کی بنا پر بے شک اُصول درایت کے لحاظ سے بالکل قرین قیاس ہے یہی امر کہ حضرت رسول گو اشارۃً و صراحتۃً خاص خاص موقعوں پر علی کی خلافت کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن آپ کو اس کے عمومی اعلان و اظہار میں خطرہ کا اندیشہ ہو اور آپ منتظر ہوں کہ خدا کی طرف سے پرزور تاکیدی حکم آئے جس کے بعد میرے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تب میں اس کا سرانجام کروں۔

خدا نے بھی اس آیت میں اطمینان دہی کے طور پر یہ وعدہ نہیں کیا ہے اور نہ خبر دی ہے کہ تم جو کچھ تبلیغ کرو گے اُسے سب تسلیم کرلیں گے اور اختلاف نہ کریں گے بلکہ صرف یہ وعدہ کیا ہے کہ تمھاری جان کو ان کے ہاتھ سے کوئی

گزند نہ پہونچیگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کے خلاف مخالفانہ شورش برپا ہوگی اور لوگ اُسکے مخالف بھی ہوں گے مگر رسول کی جان کو صدمہ نہیں پہونچے گا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر آیت کا مقصود یہی تھا تو اس میں صاف صاف علیؓ کے نصب خلافت کا ذکر کیوں نہ کر دیا گیا اور نام لیکر تصریح کیوں نہ کر دی گئی؟

مگر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ مکتم قرآنی کی ایک حکیمانہ روش تھی۔ اگر قرآن میں کہیں اس طرح کے مضامین کو صاف صاف نام کی تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہوتا تو اسوقت مسلمانوں کے قرآن بھی دو ہوتے۔ ایک قرآن میں وہ آیتیں درج ہوتیں اور ایک میں سرے سے وہ آیتیں درج ہی نہ ہوتیں۔ اس صورت میں جو کچھ حقیقت کا اظہار قرآنی آیات سے اس وقت ہو رہا ہے اُتنا بھی نہ ہوتا اس لئے یہ قرآن کا ایک خاص حکیمانہ انداز تھا کہ اُس نے اپنے مقاصد کو ایک طرح کے ابہام کے پردہ میں رکھا ہے لیکن قرائن ایسے قائم کئے ہیں جن سے ایک سنجیدہ غور کرنے والا انسان حقیقت تک پہونچ سکتا ہے۔

ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ قرآن میں خاص خاص آیتیں منافقین کے تذکرہ پر مشتمل ہیں۔ اُن کا کوئی نہ کوئی مصداق ضرور ہے مگر نام نہیں لیا گیا۔ سورۂ طلاق و تحریم میں رسول اللہ کے بعض ازواج کی نسبت خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اُن کا بھی مصداق کوئی ہے مگر نام نہیں لیا۔

اسی طرح سیکڑوں آیات متعدد مواقع پر کثیر التعداد صحابیوں کی تنبیہ، تعریف، یا مذمت میں اُتاری گئیں اور کہیں کسی ایک کا بھی نام نہیں۔ تمام صحابۂ کرام میں صرف "زید بن حارثہ" کا نام قرآن میں لایا گیا (فلما قضی زید منہا وطرا زوجنا کہا) لیکن زید کی ہستی کسی حیثیت سے مسلمانوں میں محل اختلاف تھی ہی نہیں کیونکہ زید کی شہادت حیات رسول اللہ میں ہی ہوگئی اور اس مسئلہ کو بھی مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلافی درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کسی ایک جگہ بھی کسی کا نام موجود نہیں ہے۔

اس کی وجہ سے یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ تمام آیات فرضی و تمثیلی افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مصداق کوئی اُس زمانہ میں تھا ہی نہیں بلکہ حقیقۃً مصداق ہر ایک کا معین تھا مگر قرآن کی "وحی متلو" میں اُس کا نام نہیں ہے۔

اس کے لئے بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ نام تھے اور وہ حذف کر دئے گئے مگر میں اس کا قائل نہیں ہوں میں اس کو جیسا کہ میں نے کہا قرآن کی ایک حکیمانہ کارروائی سمجھتا ہوں جس میں مفاد اسلامی کا پہلو مضمر تھا۔

بعض روایات میں بعض صحابہ کے قرآن میں جو کہیں کہیں بعض ناموں کا تصریح اضافہ ہونا مذکور ہے اُسے میں "تفسیری نوٹ" کی حیثیت سے قرار دیتا ہوں جس سے تعین مراد میں مدد ضرور ملسکتی ہے۔ چنانچہ

زیر بحث آیت کے متعلق بھی یہ روایت موجود ہے کہ ابن مسعودؓ اس آیت کو بایں الفاظ پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت رسول کے زمانہ میں وہ یونہی پڑھی جاتی تھی کہ :-

"یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (ان علیا مولی المومنین) وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ"

(درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸)

اس سب کے بعد جہاں تک روایت و درایت کا تعلق ہے ہیں تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں پاتا کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی خلافت ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے بعد خدا کی ہدایت اس باب میں صراحتہً ظاہر ہے۔

(۴)

حدیث غدیر۔ جس کے متعلق جناب نیاز صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ "یہ شیعوں کے پاس ولایت جناب امیر کی سب سے بڑی شہادت ہے۔"

اس واقعہ کی تفصیل ہمنام صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ نیز جناب مدیر نگار نے بھی اپنے محاکمہ میں اس کی تکرار کی ہے۔ یہ حضرت رسول کا وہ صاف کھلا ہوا تاریخی اعلان ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور اس میں آپ نے یہ ارشاد کیا ہے کہ :-

"خدا میرا مولیٰ ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور اس کے بعد جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولیٰ ہے"

خود الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس اعلان میں مذہبی شان پائی جاتی ہے۔ یہ کوئی سیاسی مشورہ نہیں ہے نہ ذاتی اظہار خیال ہے۔ بلکہ بحیثیت رسول، بحیثیت پیغمبر آپ اپنے بعد کے لئے اعلان کر رہے ہیں۔

بعض لوگ حدیث کے معنی میں کلام کرتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ "نص" نہیں ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نص ہوتا تو اس کے اور کیا الفاظ ہو سکتے تھے؟

اس کے پہلے "وزیر" کہہ چکے۔ "وصی" کہہ چکے۔ "خلیفہ" کہہ چکے۔ "ولی" کہہ چکے۔ اب کہتے ہیں کہ "خدا میرا مولا ہے اور میں تمہارا مولا ہوں۔ اب جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں۔"

اس سے کیا پتہ نہیں چلتا کہ علیؑ کا مولا ہونا اسی طرح حاکم و متصرف ہونے کی شان سے ہے جس طرح خدا کا اور رسول کا ہے۔ مگر تاویل کی دنیا تنگ نہیں ہے۔ طے ہے کہ ہر معاملہ میں رسول روزمرہ کی زبان پر بات چیت کرتے ہیں اور وہی معنی سمجھ لئے جاتے ہیں جو عام محاورہ کے مطابق اس لفظ کے ہیں۔ مگر اس معاملۂ خاص میں در بارۂ علی بن ابیطالب جو کچھ رسول کی زبان سے نکلے اس کو دوسرے معنی پہنانے جائز "خلیفہ" کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اہل و متعلقین میں وہ ان کی جگہ پر ہیں اور "وزیر" کہا

اس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی بھر وہ آپ کی کمر کو مضبوط رکھنے والے اور "وصی" کہا تو صرف آپ کے قرضوں کے ادا کرنے کے لئے اور "ولی" کہا تو بمعنی دوست اور "مولیٰ" کہا تو وہ "ناصر" کے معنی ہیں۔

اس طرح یقیناً ایک متکلم گنگ ہو جائے گا۔ الفاظ کا دفتر ختم ہو جائے گا اور اُس کے مافی الضمیر معنی کسی کے ذہن نشین نہ ہونگے۔ آج کل دُنیا "درایت" "درایت" پکارتی ہے اور یہاں پر عقل سے کام نہیں لیتی کہ حضرت رسول اپنا سفر قطع کرتے ہیں، ہزاروں آدمیوں کو چٹیل بیابان میں، خاص تمازت آفتاب کے وقت مجتمع کرتے ہیں۔ منبر پر جاتے ہیں۔ پرزور الفاظ میں تمہید قایم کرتے ہیں۔ اپنی وفات کی خبر دیتے ہیں۔ لوگوں سے اپنی ہر طرح کی سرداری، حکومت، لوگوں کے نفس پر کامل سلطنت کا اقرار لیتے ہیں اور اس کے بعد کہتے کیا ہیں؟ یہ کہ جس کا میں "دوست" ہوں اُس کے علی بھی "دوست" ہیں — یا۔ جس کا میں "مددگار" ہوں اُس کے علی بھی "مددگار" ہیں — آخر یہ کونسی ایسی بات تھی جو لوگوں کی طبیعتوں پر بار ہو۔ جس کے لئے اپنے اختیارات جتلانے کی ضرورت ہو اور اپنی حکومت کے اقرار لینے کی حاجت ہو؟ اس تمام کارروائی کا حاصل کیا ہوا؟ اور یہ کونسی ایسی بات تھی جس کا اس شد و مد، زور و شور کے ساتھ اعلان ہو؟ — پھر یہ کونسا ایسا امر تھا جس پر حضرت عمر بڑھیں اور جناب امیر کو مُبارکباد دیں کہ:— "هنيئاً لك اصبحت مولىٰ كل مؤمن ومؤمنة"۔ (یعنی) "مبارک ہو آپ کو کہ ہر مومن و مومنہ کے مولا قرار پاگئے" یہ مبارکباد کاہے کی ہے؟ اس کی ہے کہ آپ آج ہر مومن و مومنہ کے مددگار بن گئے؟!

کہا جاتا ہے کہ مولیٰ کے معنی حاکم و متصرف کے ہیں ہی نہیں۔ مگر نہیں ہیں وہیں تک کہ جہاں تک غدیر خم کے واقعہ کا تعلق ہے لیکن ادھر یہ موقعہ دل سے اُترا اور کسی دوسری جگہ مولیٰ کی لفظ آئی۔ پھر اُس کے معنی مالک متصرف، حاکم وغیرہ کے قرار پا جائیں گے۔

ملاحظہ ہو تفسیر سراج منیر خطیب شربینی (مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ) سورۂ انعام:—

"ثم ردوا اى الخلق الى الله اى الى حكمه وجزائه مولاهم اى سيدهم ومدبر امورهم كلها الحق اى الثابت الولاية وكل ولاية غيره تعالى عدم"

(یعنی) قرآن مجید کی اس آیت میں کہ "ثم ردوا الى الله مولاهم الحق" مولا کے معنی ہیں سید و آقا اور امور کا منتظم۔ حق کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت حکومت اُسی کی برقرار ہے اور اُس کے سوا ہر ایک کی حکومت کالعدم ہے"

سورۂ یونس کی آیت:— "وردوا الى الله مولاهم الحق" میں بھی لکھا ہے:—

"مولاهم اى ربهم ومتولى امورهم على الحقيقة" (یعنی) مولا کے معنی ہیں مالک اور اُنکے اُمور کا حقیقی منتظم"

(سراج منیر جلد ۲ صفحہ ۱۶)

تفسیر بیضاوی میں بھی سورۂ یونس اور انعام دونوں جگہ اس کی تصریح ہے۔

تاج العروس شرح قاموس مصنفہ سید مرتضیٰ زبیدی (مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۳۹۹) میں ہے:۔

"المولیٰ ایضاً الولیّ الذی یلی علیک امرک وہما بمعنی واحد ومنہ الحدیث ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن مولٰہا ورواہ بعضہم بغیر اذن ولیہا وروی ابن سلام عن یونس المولیٰ فی الدّین ہوالولیّ وذالک قولہ تعالےٰ ذٰلک بانّ اللّٰہ مولی الّذین آمنوا وان الکافرین لامولیٰ لہم ای لاولیّ لہم ومنہ الحدیث من کنت مولاہ فعلیّ مولاہ ای من کنت ولیہ"

اس عبارت میں صاف تصریح موجود ہے کہ مولا کے معنی صاحب اختیار اور حاکم کے ہیں اور یہ کہ مولیٰ اور ولی دونوں مترادف حیثیت رکھتے ہیں۔

اگر واقعات کا مطالعہ کرنے والا بے لوث نگاہ رکھتا ہو تو وہ صاف سمجھے گا کہ رسول نے حضرت علی کی خلافت، حکومت وجانشینی کا اعلان کیا اور لوگوں نے بھی اُسوقت یہی سمجھا اور اسی لئے حضرت علی کو مبارکبادیں دیں۔

ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث کو شیعہ اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کرتے ہیں اور پیش کرنا درست بھی ہے جیسے حدیث منزلت جس میں حضرت رسول نے جناب امیر کو مخاطب کرکے ارشاد کیا ہے:۔

"کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم مجھ سے وہی نسبت رکھو جو ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں ہے"

یہ حدیث آپ نے اُس وقت ارشاد فرمائی ہے جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ نے اپنے ساتھ تمام صحابہ کو چلنے کا حکم دیا تو حضرت علی کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ مدینہ ہی قیام کریں۔

اگر آخر کا فقرہ "الا انہ لانبیّ بعدی" نہوتا تو شاید کہا جا سکتا تھا کہ منزلت ہارونی کا تعلق صرف اُتنے زمانہ سے تھا جب آنحضرتؐ تشریف لئے جارہے تھے مگر اس جملہ نے آکر اپنے قبل میں تعمیم کا پتہ دیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ہارون موسیٰ کے جانشین اور نائب اور شریک کار تھے۔ بے شک اگر نبوت کا سلسلہ رسول کے بعد قطع نہ ہوتا تو نبوّت بھی جناب امیر کے لئے ثابت ہوتی لیکن چونکہ نبوّت کا دروازہ بند ہوگیا اس لئے خلافت وجانشینی بشکل امامت آپ کے لئے ثابت رہے گی۔

حدیث ثقلین جس کو خصوصیت کے ساتھ آنحضرتؐ نے علی بن ابیطالب کے اعلان ولایت کے موقع پر بھی بیان فرمایا اور اس کے بعد اپنے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد بھی ارشاد کیا۔ اس میں تمام اُمت کو جن میں اُسوقت تو صحابۂ کرام ہی تھے اور تمام اکابر داخل تھے اہلبیت کے ساتھ تمسک کا

حکم دیا اور یہ کہ ان کا دامن چھوڑو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُمت نے اس کے اوپر عمل کس طرح کیا اور اس پر عمل کی صورت کیا تھی جبکہ مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کی پیشوائی خلفائے وقت کے لئے حاصل تھی جس کے بعد اہلبیت کی حیثیت ایک معمولی اُمتی سے زیادہ نہ رہی تھی اور کوئی امتیاز خصوصی اُن کے لئے ہرگز حاصل نہ تھا۔

یہ احادیث بے شک "وحی متلو" کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یعنے حدیث اور قرآن میں امتیاز ضرور ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ قرآن کا تعلق فرمان خداوندی سے ہے اور دوسرے کا رسول اللہ کی ذاتی رائے سے۔ احادیث رسول بھی اکثر بربنائے وحی ہوتے تھے لیکن خود وحی میں یہ تفرقہ ہے کہ وہ کبھی "وحی متلو" کی حیثیت رکھتی تھی جس کو کہتے ہیں "قرآن" اور کبھی "وحی غیر متلو" جس کی مظہر ہے حدیث۔ اس لئے اکثر مسائل مذہبی یعنے روزہ اور نماز وغیرہ ایسے خالص عبادات کے احکام بھی احادیث سے ثابت ہوئے ہیں حالانکہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے خود مدیر نگار بھی قایل ہیں کہ رسول کے احکام تمام بربنائے وحی ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ حدیث ثقلین کے بیان فرمانے میں غدیر خم والے خطبہ میں خود آنحضرت صلعم نے صاف صاف اس کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے:۔

ارشاد ہوتا ہے:۔ "قد نبّانی اللطیف الخبیر انّھما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیّ الحوض"

(یعنی) مجھ کو خدائے تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں (قرآن اور اہلبیت) ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہانتک کہ میرے پاس حوض کوثر پر وارد ہوں"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا اعلان اہلبیت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی رائے سے نہ تھا بلکہ وحی خداوندی کی بنا پر تھا جس کے بعد شک وشبہ کی گنجایش نہیں رہتی۔

چوتھا سوال

مسئلۂ خلافت کو اصل مذہب اسلام سے کیا تعلق ہے؟

میرے خیال میں وہی تعلق جو ایک اہم مذہبی حکم کو کسی مذہب کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ جناب مدیر نگار کی رائے یہ ہے کہ:۔

" اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ اصولاً ہونا چاہئے بلکہ اس کا تعلق صرف سیاسیات سے تھا۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے یعنی رسول اللہ کو وحی کے ذریعے کوئی ہدایت اس باب میں نہیں کی گئی اور اگر اس کو واقعی کوئی مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تو یقیناً وحی کے ذریعہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ـــ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان کے بعد جناب امیر خلیفہ قرار دئے جائیں ـــ لیکن ـــ اس نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی سی تھی جس کو وحی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوں تو بار بار رسول اللہ نے جناب امیر کو ولی، مولیٰ، وصی وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا لیکن جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کرلی ـــ اگر رسول اللہ کی یہ خواہش کسی وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتی تو آپ بلا پس و پیش نہایت صاف الفاظ میں اسکا اظہار کرجاتے اور وہ الفاظ کلام مجید میں بھی ہوتے ـــ اگر حضرات شیعہ کے قول کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو حسب ذیل باتیں معارض نظر آتی ہیں:-

۱ـــ اگر خلافت جناب امیر کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو اسے کلام مجید میں ہونا چاہئے تھا حالانکہ نہیں ہے۔

۲ـــ اگر واقعی فرمان خداوندی ایسا ہی ہوتا جیسا کہ حضرات شیعہ سمجھتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ دیگر احکام کی طرح نہایت صاف و واضح الفاظ میں اس کا ذکر کلام مجید میں ہوتا، رسول اللہ خود اپنے سامنے ہی حضرت علی کی باقاعدہ خلافت سب لوگوں سے تسلیم کرا کے رخصت ہوتے، حالانکہ یہ بھی تاریخ سے ثابت نہیں۔

۳ـــ اگر یہ کوئی خالص مذہبی مسئلہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ حضرت علی خود اس سے واقف ہوتے اور چونکہ وہ احکام مذہبی کے نہایت سخت پابند تھے اس لئے وہ باوجود تمام مخالفتوں کے اپنی خلافت کی کوشش ضرور کرتے، لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کرلی تو آپ خاموش ہو رہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ آپ نے خود حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، لیکن آپ کا اس بیعت کو گوارا کرلینا اسی سے ظاہر ہے کہ آپ صحابہ کے تمام مشوروں میں شریک ہوتے تھے، اور اکثر آپ کی رائے پر عمل بھی کیا جاتا۔ اگر حضرت علی حضرت ابوبکر کو غاصب خلیفہ سمجھتے یا ان کی خلافت آپ کے نزدیک خلاف منشاء خداوندی ہوتی تو کم از کم آپ یہ ضرور کرتے کہ اُن سے ہمیشہ کے لئے کٹ کر علحدہ ہو جاتے اور مراسم موالات ترک کردیتے، اگر جنگ کرنا مناسب نہ تھا ـــ اگر یہ تمام زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت کا تھا

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسا مبغوض عہد تھا جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا تھا نہ اُس کا رسول۔
لیکن حیرت ہے کہ جناب امیر نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانہ کا ساتھ دینے میں بسر کر دیا اور انھوں نے نہ کبھی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ منشار خدا اور رسول کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت علی کا خلفائے ثلثہ کے زمانہ میں حد درجہ امن پسندانہ زندگی بسر کرنا اور سب کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہونا سوائے اس کے اور کسی سبب کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ مسئلۂ خلافت کو خالص مذہبی مسئلہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو سیاسی معاملہ جانکر واقعات و حالات کے لحاظ سے اپنی خلافت پر زور دینا یا اس کے لئے کوشش کرنا مناسب خیال نہ فرماتے تھے۔"

مذکورہ عبارت میں جس شد و مد کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسئلۂ خلافت کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا وہ ناظرین کے پیش نظر ہے۔ اس کے سامنے ایک کاتب کے قلم میں بڑی طاقت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر سکے۔

آفریں ہے جناب "ہرنام" صاحب کو کہ اُنھوں نے باوجود اجنبیت اور اظہار عجز و اعتراف قصور کے اپنے آخری مضمون میں اس بحث کے اکثر پہلوؤں کو اتنی خوبصورتی سے روشن کیا ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں۔

اُنھوں نے کہا ہے کہ خلافت کا تعلق مذہب سے اُسی وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اُسے صرف سیاسیات کے شعبہ سے متعلق رکھا جائے لیکن اگر خلافت کی حیثیت اس سے مختلف ہے، اسی بنا پر مسلمانوں کی جانب سے اُس کی تعریف کی جاتی ہے یہ کہ:۔ "ھی النیابۃ عن النبی فی امور الدین والدنیا" تو اُس کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے۔

اُنھوں نے واقعات کی بنا پر یہ بھی دکھلایا ہے کہ پیغمبر نے اس کو بطور ایک سیاسی مسئلہ کے پیش نہیں کیا تھا بلکہ معیار نجات بتایا تھا اور اُس پر آخرت کی بازپرس کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور خالص سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ جناب "ہرنام" کا مذکورۂ بالا استدلال یقینی بہت مضبوط ہے جس سے اُن کی نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ کہنا کہ "کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت ہے" اُسی وقت تک حق بجانب قرار پا سکتا ہے جب تک حقیقت پر اطلاع نہیں، لیکن گزشتہ سوال کے جواب میں ہمارے بیانات نے یہ امر بالکل صاف کر دیا ہے کہ کلام مجید اس مسئلہ میں ساکت نہیں ہے اور یہ کہ رسول اللہ کی تبلیغ اس باب میں وحی الٰہی اور ہدایت خداوندی پر مبنی تھی۔
اگر رسول اللہ کی نامزدگی کی حیثیت صرف ایک ذاتی رائے کی حیثیت رکھتی تو آپ کو صاف صاف اُس کا

اظہار کرنا چاہئے تھا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کو یہ ہرگز روا نہیں تھا کہ بطور حکم مذہبی اُس کا اعلان کریں اور اُسے نجات و فلاح اُخروی کا معیار قرار دیں کیونکہ ایک نبی سے اگر خطار اجتہادی ممکن بھی ہو تو بھی یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک غیر مذہبی چیز کو مذہبی لباس میں پیش کرے کیونکہ یہ ایک بدترین فریب دہی اور تلبیس ہے جس کا ایک دیانتدار آدمی کبھی مرتکب نہیں ہو سکتا۔

یہ کہنا کہ "جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اس باب میں خاموشی اختیار کرلی" یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے جس کے متعلق ہر تام صاحب اپنے مضمون میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرقۂ شیعہ کے قول کے لئے جو باتیں بطور معارض پیش کی گئی ہیں اُن میں سے کوئی بھی درست نہیں ہے۔

خلافت جناب امیر کا اعلان بر بنائے وحی تھا اور وہ وحی قرآن میں بھی موجود ہے اور رسول نے بھی اُس کا اظہار کیا اور عام مجمع کے سامنے اعلان کیا۔ روایت میں یہ موجود ہے کہ آپ نے سب سے اقرار لیا کہ کیا میں تم سب کا مولا نہیں ہوں؟! جب سب نے اقرار کیا تب آپ نے یہ کہا کہ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علی بھی مولا ہے۔

اس سے بڑھ کر اعلان کرنے اور اقرار لینے کی کیا صورت ہو سکتی تھی جبکہ قرآن نے رسول کے فرائض کو بھی اس سے زیادہ نہیں بتلایا ہے۔ ارشاد کیا ہے :- " وما علیک الا البلاغ " نیز یہ بھی کہا ہے کہ رسول کا کام جبر کرنا نہیں ہے۔ " وما انت علیہم بمسیطر"۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے :- "افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین"

اس اصول کے مطابق یہاں رسول پر فرض یہی عاید کیا گیا تھا کہ وہ تبلیغ کردیں (یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک) چنانچہ انھوں نے تبلیغ کردی اور اتنے غیر معمولی اور اہم طریقہ سے کسی حکم کی اس سے پہلے تبلیغ نہیں کی تھی۔ پھر اب اس کے بعد رسول کیا کرتے اور کس طرح لوگوں سے تسلیم کراتے۔

حضرت علی ضرور واقف تھے کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے لیکن ہر مذہبی حکم کے اجراء کے لئے ہر حال میں خونریزی اور مسلمانوں کا قتل عام تو روا نہیں ہے۔ آپ فضا سے خوب واقف تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اسوقت ہوا کا رُخ کدھر ہے اور سیلاب کا بہاؤ کس طرف؟ آپ کو معلوم تھا کہ اسوقت اس حق کا حصول اور اس فرض مذہبی کا قیام بغیر عظیم کشت و خون کے نہیں ہو سکتا اور اس طرح کا ہنگامہ پیدا ہو جاتا اسوقت اصل اسلام ہی کے لئے سبب فنا۔ آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک مذہبی مسئلہ کے متعلق رہنمائی کا فرض کس طرح پورا ہوتا ہے؟ صرف تبلیغ و تلقین سے جس کی تمام منزلوں کو پیغمبر خود طے کر چکے تھے جس سے اتمام حجت پورے طور پر ہو چکی تھی۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کی جماعت میں خود حضرت رسول کے زمانہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جن کے دلوں میں روح اسلامی جاگزیں نہیں ہوئی تھی۔ جو ذرا ذرا سی بات پر پیچھے پلٹ جانے پر طیار تھے جو رسول پر احسان جتاتے تھے کہ ہم آپ پر اسلام لائے۔ جن نگاہوں میں احکام مذہبی کی وقعت اتنی سبک تھی کہ رسول کے پیچھے سے نمازیں توڑ کے باجا دیکھنے چلے جاتے تھے اور رسول کو اکیلا چھوڑ دیتے تھے۔ جو کفار و مشرکین کو خبر رسانی کرتے تھے۔ جو سامنے آکر کہتے تھے کہ ہم آپ پر ایمان لائے اور پیٹ پیچھے مذاق اُڑاتے تھے اور تمسخر کرتے تھے۔ جو رسول کی طرف گمراہی کی نسبت دیتے تھے۔ جو آپ کی باتوں پر اعتراض کرتے تھے۔ اور نبوت میں شک کرتے تھے۔ لیکن آنحضرت نے ان تمام باتوں کو انگیز کیا۔ ان لوگوں پر کبھی تشدد نہیں کیا۔ ان کو اپنی جماعت سے باہر نہیں نکالا۔ ان پر کبھی تلوار نہیں چلائی بلکہ اُن کے رازہائے درون پردہ کو نام لیکر اپنی جانب سے ظاہر بھی نہیں کیا صرف اس لئے کہ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے ہیں تو یہی سہی۔ ظاہری اسلام کے نام لیوا ہیں یہی سہی۔ قومیت اسلامی کی تشکیل ہوگی تو اُن میں کھرے افراد پیدا ہو ہی جائیں گے۔

یقیناً اگر حضرت علی اپنے پیش رو کے حقیقی جانشین تھے تو اُن کو اُسی تعلیم کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آپ کی خلافت حقیقی کی صحیح شان ہی باقی نہ رہتی۔

بے شک جس طرح رسول کا فرض تھا کہ وہ غلطیوں پر ٹوکتے رہیں۔ لغزشوں پر تنبہ کریں۔ کجرویوں کا اظہار کرتے رہیں اور حقیقت کا انکشاف کرتے رہیں اور بس۔ اُسی طرح حضرت علی کا بھی فرض تھا کہ وہ اختیار کردہ رویّہ سے اپنی ناراضگی نیز اُس طرز عمل کی غلطی کا اظہار کردیں چنانچہ آپ نے ایسا کیا۔

اگر شیعوں کی روایت کو نہ بھی مانا جائے کہ حضرت علی نے بالکل حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تب بھی اتنا تو بربنائے روایت امام بخاری مسلّم ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ کی زندگی تک قطعی بیعت نہیں کی اس لئے کہ اُسوقت تک آپ کی کچھ نہ کچھ وجاہت مسلمانوں میں سمجھی جاتی تھی لیکن جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہوگیا تو لوگ آپ سے بالکل روگرداں ہو گئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کی اُس بیٹی نے جس کو حضرت " سیدة نساء العالمین" فرما گئے تھے اور "بضعة منّی" کی لفظ سے یاد کر گئے تھے اُس نے مرتے مرتے تک اس بیعت کو تسلیم نہیں کیا اور حضرت علی نے بھی اپنی ناراضگی کا ثبوت پیش کیا۔

بقول بعض اہل تحقیق حقیقت یہیں سے منکشف ہو جاتی ہے اس لئے کہ مسلمانوں کی متفقہ حدیث ہے:۔ "من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتة جاہلیة"۔ (یعنی) جو شخص مرجائے اور اپنے امام زمانہ کے ساتھ معرفت و عقیدت نہ حاصل کرے اُس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔"— اب مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے

اپنے رسول کی مقدس بیٹی سیدۃ نساء العالمین کی موت کے بارے میں جو بغیر خلیفۂ وقت کی اطاعت کے حاصل ہوئی۔

اگر سیدۂ عالم کی ذات کو اس حدیث کی زد سے الگ کرنا ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ خلافت مذہبی حیثیت سے درست نہ تھی۔ اسی طرح حضرت علی کا صرف ایک دن کا توقف بھی قبول بیعت میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ اس کو صحیح خلافت نہ سمجھتے تھے اس لئے کہ موت کے اندیشہ سے کوئی بشر کسی وقت خالی نہیں ہے اور ایک امام جائز کی اطاعت سے انحراف کی صورت میں موت بہرحال موت جاہلیت ہوتی ہے۔ رہ گیا حضرت علی کا ان حضرات کے مشوروں میں شریک ہونا۔ اُن کو صحیح رائے بتلانا اور اُن کی موقع بموقع رہنمائی کرنا۔ یہی تو درحقیقت دلیل ہے حضرت علی کی اُس طہارت ضمیر اور ہمدردی اسلامی کی جو آپ کو حقیقی جانشین رسول و محافظ اسلام کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

جبکہ حالات کی بنا پر رسول کے اُس حکم سے انحراف ہوگیا جو آپ نے خلافت علی کے اعلان کی صورت میں دیا تھا اور لوگوں نے اس فرض کی انجام دہی سے عدول کیا تو اب اگر کوئی خودغرض، پست طبیعت اور چھوٹے نفس کا انسان ہوتا تو اس کے بعد وہ بددل ہوکر اسلام و مسلمین کی خدمت سے بالکل جدا اور بقول مدیر نگار کٹ کر ہمیشہ کے لئے علٰحدہ ہو جاتا۔ لیکن اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا کہ اس شخص کے قدیم خدمات اور اسلام کے ساتھ ہمدردیاں صرف حصول خلافت کی امید میں تھیں۔

نیز اگر مسلمانوں نے کسی ایک حکم مذہبی کی مخالفت کی تو اس کا یہ اثر تو نہیں ہونا چاہئے کہ اب اسلام کے دوسرے احکام کو بھی بدلجانے دیا جائے یا خود مذہب اسلام کے صدمات کو گوارا کرلیا جائے۔

حضرت علی کے مشورے ہمیشہ یہی دو نوعیتیں رکھتے تھے۔ ایک جب کبھی کوئی مسئلہ شرعی پیش ہوا اور دربار خلافت سے حکم خداوندی کے خلاف فیصلہ ہونے لگا اُسوقت موقع ملا تو علی نے اصلاح کی اور دوسرے یہ کہ مفاد اسلامی کو کسی جنگ یا دوسری طرح کی دشواری میں نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوا تو آپ نے صحیح مشورہ دیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حفاظت اسلام اور صیانت مذہب کی ذمہ داریاں آپ کے ساتھ وابستہ تھیں جنھیں آپ کسی نہ کسی طرح انجام دیتے تھے اور یہی وہ حقیقی خلافت و امامت ہے جو ان کے لئے مخصوص تھی اور جس کے فرائض وہ کسی نہ کسی پردہ میں ادا ضرور کرتے تھے اگرچہ ظاہری خلافت یعنی مسند حکومت پر دوسرے افراد نے قبضہ بھی کرلیا ہو۔

حضرت رسول کا سلوک منافقین کے ساتھ اور اُن لوگوں کے ساتھ جو اکثر آپ کی عدول حکمی کرتے

رہتے تھے صاف اسی رویہ کا مظہر ہے۔

آپ نے باوجود اُن کے مخالفانہ حالات کے کبھی اُن سے ترک موالات نہیں کیا اور ہمیشہ اصلاح کی کوشش فرماتے رہے۔ اُسی طرح جانشین رسول حضرت علی۔

اس میں کیا کوئی شبہ ہے کہ منافقین کی زندگی کا تمام دور مبغوض الٰہی ہے جس سے نہ خدا خوش ہو سکتا ہو نہ اُس کا رسول پھر کیا حیرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے اس امر پر کہ حضرت رسول نے اپنی عمر کا کثیر حصہ ان غیر اسلامی افراد کے ساتھ بسر کیا۔

یقیناً اگر رسول کا منافقین کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا اور اسلامی سلوک کرنا اُن کے نفاق کی تائید نہیں ہے جبکہ آیات قرآنی اُن کو اُن کے نفاق پر متنبہ کرتی رہتی تھیں تو اسی طرح حضرت علی کا تعلقات معاشرت قائم رکھنا اُن لوگوں کے ساتھ جنھوں نے مسئلہ خلافت میں رسول کی مخالفت کی اُن کے اس اقدام کی تائید نہیں قرار پا سکتی جبکہ آپ نے اُس پر احتجاج کیا اور اظہار اختلاف کر دیا۔ اور جس طرح اُن کے ساتھ حُسن سلوک اور نیک برتاؤ اُن کو آخرت میں رستگار و نیکوکردار بنانے کا ضامن نہیں ہے اُسی طرح ان اشخاص کے ساتھ حضرت علی کا یہ حسن سلوک اُن کے نجات اخروی اور نیکوکرداری کا ہرگز ثبوت نہیں ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس دور میں اصل خلافت اسلامی کے معاملہ میں کتنا ہی حکم خداوندی سے کنارہ کشی کی گئی ہو مگر دوسرے معاملات میں اپنے حدود دعلمی کے اندر بہت حد تک ظواہر اسلامی محفوظ رکھے جاتے تھے اور پابندی شریعت کا اظہار کیا جاتا تھا یعنے شریعت اسلام اور احکام خداوندی کے ساتھ کھُلم کھُلا بغاوت کا اعلان نہیں تھا، محرمات و کبائر کی تلقین نہیں تھی بلکہ اُن کے اوپر حدود کا اجرا کیا جاتا تھا اور بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اس سے اغماض نہیں برتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے حقیقت اسلام کو کتنا ہی صدمہ پہونچا ہو لیکن بہرحال اسلام کی ظاہری صورت محفوظ تھی اور چونکہ اُس وقت تلوار اُٹھانے کی صورت میں یقیناً اسلام کی عمر ختم ہی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے علی ایسے محافظ اسلام نے تلوار نیام میں رکھی اور پچیس برس کی طویل مدت اپنے حقوق کی پامالی اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں گزار دی اور خاموش فضا میں ذرا بھی سنسنی پیدا نہیں کی۔

نفسیاتی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے یہ بات کہ ایک بہادر اور شیر دل انسان جس کی عمر بچپنے سے لیکر جوانی اور بھرپور جوانی تک برابر میدان جنگ میں گزری، جس کی تلوار سے برابر خون ٹپکتا رہا اور جس نے سیکڑوں آدمیوں کو موت کی نیند سُلا دیا۔ اسی کے ساتھ جس نے کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ ہمیشہ فتح پائی۔ وہ ایک مرتبہ پچیس ۲۵ برس تک اتنا خاموشی پسند ہو جاتا ہے کہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریک اُس کی جانب سے عمل میں نہیں آتی اور کسی جنگجویانہ رویہ کا اظہار اُس کی طرف سے نہیں ہوتا۔

کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ علی ایک جذباتی انسان نہیں تھے۔ اُنھوں نے خون کے دریا بہا دئے مگر جوشِ غیظ و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ فرض کا احساس کرکے اور سکوت اختیار کیا تو کمزوری سے نہیں بلکہ مصلحت کا احساس کرکے۔ اُنھوں نے یہ دیکھا کہ وہ ہی اسلام جس کی حفاظت اُسوقت تلوار کھینچکر کیجا رہی تھی اُسی کی حفاظت اس وقت تلوار کو نیام میں رکھنے پر موقوف ہے۔ اس لئے آپ نے اسلام کی موجودہ ظاہری صورت کی بقا کو غنیمت سمجھا اور فوج کشی و شمشیر زنی سے پرہیز کیا۔

بے شک جب یہ خلافت بنو امیہ تک پہونچی اب اسلام کے ظاہری شعائر بھی مٹائے جا رہے تھے۔ اب احکام مذہبی کے مقابلہ میں کھُلم کھُلا مخالفت ہو رہی تھی۔ اب شریعت کے مقابلہ میں صاف بغاوت کا اعلان تھا اس لئے انہی علی کے فرزند حسین نے کربلا کے معرکہ کو برپا کرکے دنیا کو دکھلا دیا کہ اُسی اسلام کی حفاظت کیلئے جس طرح ایک وقت میں فاتحانہ شان سے جنگ کی جاسکتی ہے جس طرح ایک وقت میں مظلومانہ شان سے سکوت کیا جاسکتا ہے۔ اُسی طرح ایک وقت میں مقہورانہ اور بیکسانہ شان سے قتل بھی ہوا جاسکتا ہے۔

البتہ حضرت علی نے ابتدائی دور میں جنگ مناسب نہیں سمجھی لیکن آپ نے اپنے حق خلافت کے اظہار سے بھی کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ نیز کسی دوسرے کے انعقاد خلافت کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی یہاں تک کہ تیسرے دور میں جب مجلس شوریٰ کے اندر آپ کو بھی ایک رکن قرار دیا تو آپ نے خاموشی کے ساتھ ووٹ بحق حضرت عثمان نہیں دیا بلکہ پورے شد و مد کے ساتھ اپنے حق خلافت کو مرجح ثابت کیا اور وہ تاریخی خطبہ پڑھا جو دنیائے تاریخ میں یادگار رہیگا، جس میں تمام احادیث فضائل کو بھی ایک ایک کرکے پیش کیا ہے اور غدیر نیز دوسرے موقعوں کے صریحی اعلانات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور جب جناب عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ سیاسی چال چلی کہ جو شخص اپنے تئیں خلافت سے علٰحدہ کرلے وہ حکم ہوجائے تو حضرت علی نے فیصلہ اپنے خلاف ہوجانا گوارا کیا جو صورت حال کی بنا پر پہلے سے یقینی تھا لیکن خود اپنے تئیں خلافت سے علٰحدہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کو جہاں تک پُر امن طریقہ سے ہوسکتا تھا برابر پورا کرتے رہے اور مسلمانوں کی گمراہی کے اسباب میں خود عملی طور پر شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت علی خلفاء کے ساتھ حقیقۃً اتحاد رکھتے تھے اور آپ کو کوئی ناگواری اُن حضرات کی خلافت سے نہ تھی۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ بہادر جرنیل جو ابتدائے بعثت سے لیکر رسول کے آخر عمر تک برابر ہر لڑائی میں علمدار یا سپہ سالار رہا ہو۔ جس نے کبھی شکست کی صورت نہ دیکھی ہو۔ جس کی شجاعت کا بہادران عرب کے دل پر سکہ ہو، رسول کے بعد اتنی لڑائیاں ہوجائیں۔ روم و شام کے ممالک فتح ہوں۔ ایران و عراق پر اسلامی فوج کشی ہو اور قبایل سے اسلامی جہاد مگر وہی بہادر، ہاں وہی جرنیل اس پوری

طویل مدت میں کسی ایک لڑائی میں بھی شرکت نہ کرے۔ بالکل علٰحدہ رہے اور ایسا معلوم ہو کہ اس کے بازوؤں کی طاقت سلب ہو گئی۔ اُس کے دل کی ہمت جاتی رہی اور اُس کی تلوار کُند ہو گئی۔

فوجوں کی سپہ سالاری نئے نئے جرنیلوں کے سپرد ہو، خالد بن الولید سیف اللہ ہو جائیں، سعد بن الوقاص فاتح عراق و ایران مشہور ہوں مگر علی کا کہیں نام نظر نہ آئے۔

بے شک کسی خاص موقع پر جب کوئی ایسی ہی ضرورت پیش آئے اور دربار خلافت کی طرف سے مشورہ کے لئے بلائے جائیں تو چلے جائیں اور اُسوقت صحیح مشورہ دیدیں۔

یہ رزم کا تذکرہ تھا اور جہاد کا مرحلہ، اب علمی کارنامہ کا حال سنو کہ قرآن کے جمع و تالیف ایسی اہم خدمت جس پر مسلمانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا انحصار اور علی کی ایسی ذات جس کے متعلق حضرت رسول نے ارشاد کیا ہو" انا مدینۃ العلم و علی بابہا" اور خاص طور سے علم القرآن کی یہ فرما کر گواہی دی ہو کہ:- "علی مع القرآن والقرآن مع علی" اور "لن یفترقا حتی یردا علی الحوض" کے الفاظ میں بھی قرآن و اہلبیت کی دوامی معیت کا ثبوت دیا ہو اور خود علی کا یہ دعویٰ رہا ہو کہ "یسلونی عن کل آیۃ من کتاب اللہ عز و جل"۔ "مجھ سے قرآن کی ہر آیت کے بارے میں سوال کر لو"۔ لیکن جب قرآن کی جمع و تالیف کا مرحلہ پیش آئے تو زید بن ثابت کے خدمات حاصل کئے جائیں۔ مسجد کے دروازہ پر آدمی بٹھائے جائیں اور ایک ایک سے قرآن کی آیتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور دو دو آدمیوں کی گواہی پر آیتیں درج کی جائیں اور بعض آیتیں بڑی جستجو کے بعد کسی ایک صحابی کے پاس دستیاب ہوں اور اُسی کے اعتماد پر لکھی جائیں مگر علی کو اس خدمت میں شریک نہ کیا جائے اور اُن کا نام تک نظر نہ آئے کہ وہ بھی اس اہم کام میں کوئی دخل رکھتے تھے۔

کیا اس کے بعد یہ دعویٰ قرین قیاس ہے کہ علی اور خلفاء میں اتحاد تھا اور کسی طرح کی کوئی رنجش درمیان میں نہ تھی؟ یا یہ کہنا درست ہے کہ اگر حضرت علی اس خلافت کو جائز تصور نہ کرتے تھے تو آپ کٹ کر علٰحدہ ہو جاتے؟

اس کے بعد اگر یہ نظر آئے کہ جب کبھی علی کو مشورہ کے لئے بلایا گیا تو آپ نے مشورہ سے عذر نہیں کیا اور مشورہ وہی دیا جو حقیقتاً آپ کے نزدیک صحیح تھا تو اسے صرف علی کی بلند نفسی اور عالی ظرفی سمجھنا چاہئے امانت و دیانت سمجھنا چاہیئے۔ بے لوثی اور اسلامی ہمدردی سمجھنا چاہئے اور یہی وہ بلند اخلاقی معیار ہے جو رسول کے بعد علی کو بلند ترین سطح کا انسان ثابت کرتا ہے ــ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ آپ نے مذہبی حیثیت سے خلفاء کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا اور آپ کو اُس پر اعتراض نہیں تھا۔

پانچواں سوال

اسلام نے ہیئت اجتماعی کا کیا اصول پیش کیا ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے نیابت و خلافت کا سلسلہ نامزدگی کے ذریعہ سے صحیح تسلیم کرنا اور کسی ایک خاندان کے لئے مخصوص سمجھنا درست ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کے متعلق جناب مدیر نگار کی رائے جس پر اس سوال کی بنیاد قائم ہے حسب ذیل ہے:—

"اسلام جمہوری حکومت کا حامی تھا اور وہ مسئلہ نیابت کی بنیاد خاندانی یا ذاتی وجاہت پر قائم کرنا نہ چاہتا تھا، اس لئے رسول اللہ کا اپنے بعد کسی کو نامزد کر جانا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔"

یہ حقیقتہً وہ ایک ہمہ گیر خیال ہے جو اسوقت فی صدی ننانوے (۹۹) مسلمانوں کے دماغ میں مضمر ہے یہاں تک کہ بہت سے افراد شیعہ بھی دانستہ و نادانستہ اس کے ساتھ رطب اللسان نظر آتے ہیں یہاں تک کہ عراق و ایران کا فتنۂ "مشروطہ و مستبدہ" اسی ایک خیال میں کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اور اس لئے مسلمانوں کی جماعت متعجب ہوگی اگر میں اس کے خلاف اظہار خیال کروں لیکن کیا کروں نہ کلام پاک اور نیز درایت اسلامی کی رو سے میری سمجھ میں اس کے خلاف ہی آتا ہے۔

جیسا کہ جناب نیاز نے متعدد بار تحریر فرمایا ہے اور حقیقت ثابتہ بھی ہے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دو حیثیتیں حاصل تھیں۔ ایک حیثیت معلم روحانی ہونے کی اور دوسری حیثیت حاکم و متصرف ہونے کی نگار کے الفاظ میں پہلی حیثیت مذہبی ہے اور دوسری سیاسی۔

پہلی حیثیت کے متعلق خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ براہ راست الہامی چیز ہے اس لئے اس کا تعلق خدا سے ہونا چاہئے لیکن دوسری حیثیت کے لحاظ سے تو پیغمبر ایک بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے جو سیاسی حیثیت سے نافذ الحکم ہو۔

اگر اسلام میں حکومت کی بنیاد بہر صورت جمہوریت ہی پر ہوتی تو آخر خود رسول کا انتخاب بحیثیت حاکم متصرف کے کس انتخاب عام اور افراد جامعہ کے عمومی اختیار و قرارداد سے ہوا تھا؟— اور جب رسول کی مختارانہ بادشاہت میں افراد امت کا کوئی دسترس نہیں ہے تو رسول اگر اپنے بعد کے لئے بحیثیت خلیفہ و جانشین کسی شخص کو حاکم و متصرف قرار دیجائے تو اس میں جمہور کو مداخلت کا کیا حق ہوگا اور یہ کہنا کہاں صحیح ہوگا کہ یہ اسلام کی روح جمہوریت کے خلاف ہے۔

میرے خیال میں " روح جمہوریت " جسے عام لوگ جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ تو اُسی وقت رخصت ہوگئی جب پیغمبر کا انتخاب خدا کی جانب سے ہوا اور عام افراد کو اس میں رائے دہندگی کا حق نہیں دیا گیا۔ احکام و تجویزات پیغمبر کے مقابلہ میں عام افراد کا سلب حقوق اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ صاف صاف اعلان کر دیا:۔ " ماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم "۔ (یعنی) " ہرگز مسلمانوں میں کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول کوئی بات طے کر دیں تو انھیں کوئی اختیار باقی رہے اپنے امر میں "۔

بلکہ اسلام نے رسول کے لئے اتنی بڑی مکمل ڈکٹیٹر شپ قرار دی ہے جس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہو اس طرح کہ:- " النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم "۔ (یعنی) نبی کو تمام مومنین پر خود اُن کے نفوس سے زائد اختیار ہے "۔ اور جب غدیر کے واقعہ پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول نے اپنی اس مستقل حاکمانہ حیثیت (مکمل ڈکٹیٹر شپ) کا حوالہ دیتے ہوئے اور سب سے اُس کا اقرار لیتے ہوئے خود اپنے اختیارات امتیازی سے بالکل اپنی ہی حیثیت اپنے ہی اختیار و اقتدار کو اپنے بعد علی کو تفویض کیا یہ کہکر کہ:- " من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ "۔

اس کے بعد یہ کہنا کہاں صحیح ہے کہ اسلام روح جمہوریت کا حامی ہے اور اس لئے کسی کو نامزد کرنا روح اسلامی کے خلاف ہے۔

" جمہوریت " یقیناً خوش آیند مفہوم ہے لیکن اس کا اصلی مفاد یہ ہے کہ تمام افراد جامعہ کے حقوق یکساں حیثیت سے محفوظ رہیں اور اُس میں تغلب و تصرف کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ اُس " جمہوریت " سے جس کی تشکیل دنیا میں ہوا کرتی ہے غیر ممکن ہے۔

جب تک اہل دنیا میں دو طبقے ہیں عوام و خواص اور عوام کی اکثریت ذاتی رائے نہ رکھنے والی بلکہ " بھیڑیا دھسان " صورت سے ہر پکارنے والے کی آواز پر نا سمجھی سے چلی جانے والی اور خواص کی اکثریت بندۂ ہوا و ہوس ہونے کی جہت سے اغراض شخصیہ کا پتلا اور ذاتی جاہ طلبی و اقتدار پسندی کا مجسمہ ہے۔ اُسوقت تک صحیح جمہوریت کا دنیا میں وجود ہو ہی نہیں سکتا اور جسے " جمہوریت " کہا جاتا ہے وہ ایک سخت ترین " مغویانہ " استبداد ہے جسے " جمہوریت " کے نام سے بھولی بھالی جمہور کے سر خواہ مخواہ منڈھا جاتا ہے اور اس دھوکے کی ٹٹی میں اغراض نفسانیہ کا شکار کھیلا جاتا ہے۔

بے شک مفاد " جمہوریت " کے حاصل ہونے کے لئے ایک اطمینان بخش صورت ہے یہ کہ نمایندۂ خداوندی جس کے بارے میں یہ حقیقت مسلم ہو چکی ہے کہ وہ جانبداری و رعایت اور دوسرے لفظوں میں ضمیر کی خرابیوں سے پاک و منزہ یعنی بالکل معصوم ہے خود اپنی صوابدید سے کسی شخص کو مصالح عامہ کا ذمہ دار بنا جائے۔

اس طرح یقیناً تمام افراد کو سمجھ لینا پڑے گا کہ اب کسی کے ساتھ ظلم و تشدد، جبر و استبداد نہ ہوگا اور سب یکساں طور پر حریت کی ہوائیں سانس لیں گے اور مساوات کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس نکتہ کو کافی تفصیل کے ساتھ جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب نے اپنے رسالہ "وجود حجت" میں اپنے خاص انداز تحریر میں لکھا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے :-

"امام اور بالفاظ دیگر حافظ شریعت کا تقرر اگر باہمی پنچایت اور انتخاب خود اختیاری و کثرت آراء کی بناء پر ہو تو اس حافظ و نگہبان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ خود شریعت کے بارے میں اکثریت جس طریقہ پر جائے گی وہی حق سمجھا جائے اگرچہ وہ شریعت کی تبدیل و تحریف اور اُس کی تراش و خراش ہی کیوں نہ ہو اور اگر نظام شریعت پر عملدر آمد کے بارے میں اکثریت سے غلطی کا احتمال ہے تو حافظ شریعت کے انتخاب میں اس غلطی کا امکان بہت زیادہ ہے۔ ملکی و ملّی عہدوں کے انتخابات اور اُن کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور ہر شخص اُن سے واقف ہے۔

بیجا رعایت، جانبداری، بے انصافی، تقاضائے مروت اور آپس کے تعلقات، موجودہ منافع اور آیندہ کے توقعات، جھوٹے مواعید کا فریب اور بے حقیقت طفل تسلیاں، ذاتی نفوذ و اقتدار اور حکام کی بارگاہ میں بے حقیقت اثر و رسوخ۔ ظاہری تزک و احتشام اور طمع کار، وجاہت و اعزاز یہ چیزیں وہ ہیں جو اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کے کامیاب ترین ذرائع ہیں اور اکثریتوں کی تشکیل اکثر و بیشتر انہی بنیادوں پر ہوتی ہے ــــ امامت کسی محدود جماعت یا مخصوص قریہ، شہر یا صوبہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے بلکہ وہ تمام اُمت کی مصلحت و انتظام کی ذمہ دار ہے اور جہاں جہاں تک کسی شریعت کا دامن وسیع ہو امامت کو وسعت حاصل ہوگی، وہ ایسا منصب ہے جس کے سبب سے یتیم بچہ، بیوہ، کمزور اور مظلوم، غنی، فقیر، قوی، ضعیف سب کو برابر فایدہ پہونچے اور عالم میں بشری نظام خدائی منشاء کے مطابق پورے طور پر درست ہو، اگر امامت ایک ایسے شخص کے سپرد کر دی گئی جو خود خواہشات نفس کا پابند ہے تو اُس سے خود دوسروں پر ظلم و ستم کا خدشہ ہے چہ جائیکہ اس کے ذریعہ ظالم و مظلوم میں پورے طور سے انصاف کا فرض انجام پائے۔

بلکہ یہ غرض اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اُس کا تقرر اُس علّام الغیوب ہستی کے سپرد کر دیا جائے جو بنی نوع بشر کے باطنی رموز و نیات سے پورے طور پر واقف ہے۔ اس سے بڑھ کر مصالح عامہ کا لحاظ کیونکر ہو سکتا ہے۔

درحقیقت یہ اُصول کہ امامت کے انتخاب کو رسول کے واسطہ سے حضرت باری عز اسمہ تک منتہی

ہونا چاہئے مکمل طور سے جمہوریت و مساوات پر مبنی ہے ۔ درحقیقت حاضر و مستقبل میں بشری مصالح کی نگہداشت اور تمام طبقات بشر کے مساوی طور پر حقوق کی حفاظت جو الٰہی لطف وعدل و حکمت کی روشنی میں انجام پائے اور جس میں دھوکے دھڑی، مکروفریب، تعصب و استبداد، حق تلفی و ناحق کوشی، اہل حل وعقد اور اُمت کے نمایندوں میں اہل تدلیس ونفاق کے مداخلہ اور آزادی رائے کے نام سے کمزور افراد کے اختیارات سلب کرنے اور جبر و قہر سے اُن کی زبان بند کرنیکا امکان ہو اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی۔"

یہ اس مسئلہ کا تصفیہ کن پہلو ہے جس کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔

چھٹا سوال

ہر دو فرق کے روایات پر سیاسی ماحول کا کوئی اثر پڑا یا نہیں ۔ اگر پڑا تو کیا ؟

اس سوال کے جواب میں اگر واقعات سے استناد کیا جائے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سیاسی ماحول کا جہاں تک اثر پڑا ہے وہ خلافت جناب امیرؑ کے روایات کے مضر پہلو سے تعلق رکھتا ہے ۔ یعنی اہل سنت کے وہ روایات جن سے دوسرے خلفاء کی افضلیت ظاہر ہوتی ہے یا جن سے خلافت جناب امیرؑ یا آپ کی افضلیت کے روایات کا معارضہ کیا جاتا ہے ۔ اُن میں بہت زیادہ سیاسی اثرات کارفرما ہیں اور اسی لئے اُن کی تائید فرقۂ شیعہ کے روایات سے بالکل نہیں ہوتی لیکن فرقۂ شیعہ کے روایات جن کی تائید خود اہلسنت کے روایات میں بھی موجود ہے اُن میں کسی سیاسی ماحول کا اثر پڑنا حقیقت کے بالکل خلاف ہے ۔

بلکہ سیاسی ماحول تو ان روایات کے بالکل مخفی اور نسیاً منسیاً ہو جانے کا مقتضی تھا جس کے بعد میں تو حق کی طاقت کا ایک حیرت انگیز معجزہ سمجھتا ہوں کہ یہ فضائل باقی رہے اور اتنے نمایاں طریقہ سے کہ باوجود انتہائی کوششوں کے ان کے مقابل روایات فضیلت ان کے برابر کیا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکا ۔

اس سوال کے جواب میں اس سے زیادہ لکھنے کا اب قلم کو حوصلہ نہیں ہے ۔ اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہی تو پھر دیکھا جائے گا ۔ والسلام ۔

(نگار) مسئلہ خلافت و امامت کے متعلق یہ بالکل پہلا مقالہ ہے جس میں "نقل" سے ہٹ کر "عقل" سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے اور جو عقاید اہل تشیع کی "روایتی سطح" پر بھی پوری طرح منطبق

ہوتا ہے۔ میں نے جو چند سوالات قائم کئے تھے اُن سے مدعا یہی تھا کہ اس بحث کا علمی پہلو سامنے آجائے اور اسی لئے میں نے سب سے پہلے شیعی علمار کو متوجہ کیا تھا کیونکہ جب تک اُنکی "درایت" کا صحیح علم نہ ہوجائے بحث و گفتگو کے حدود متعین نہیں ہوسکتے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ مقالہ شیعی نقطہ نظر کی بہترین نمایندگی کرتا ہے اور اس سے زیادہ اگر کچھ لکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کی "شرح و بسط" ہوگی۔ الغرض شیعی جماعت کی طرف سے یہ چیز ایک قطعی و آخری بحث کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے اور اب اسی کے "ردو قبول" پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنی رائے بھی ساتھ ہی ساتھ شائع کردوں، لیکن چونکہ بدقسمتی سے میرا شمار ان لوگوں میں سے ہے جنھیں نہ تشیع سے کوئی واسطہ ہے نہ تسنن سے (اور اگر ہے تو دونوں سے یکساں)، اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اہل تسنن کی رائے معلوم کئے بغیر (جو واقعی فریق ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں) اس مسئلہ پر کچھ لکھوں۔

بہرحال یہ مقالہ تمام علمار اہل سنت کے سامنے ہے اور نگار کے صفحات ان کے خیالات گرامی کے اظہار کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر انھوں نے توجہ کی تو یہ نہ صرف میرے لئے بلکہ تمام اہل علم کے لئے باعث مسرت ہوگا، ورنہ بدرجہ مجبوری مجھی کو وہ کچھ کہنا پڑے گا جس کا دوسرا نام دنیا نے "ناگفتہ بہ" رکھ چھوڑا ہے۔

سائنس کے بعض دلچسپ معلومات

کائنات ایک اعجوبہ زار ہے، بشرطیکہ آنکہ ہماری رگِ جستجو حرکت میں آئے، ورنہ وہ اس قدر بے نمک چیز ہے کہ ایک انسان کے رہنے اور بسنے کی چیز معلوم نہیں ہوتی — وہی ایک سی صبح و شام، وہی ایک انداز کا طلوع و غروب، وہی وقت مقررہ پر سمندر کا مدوجزر، وہی یکساں موسموں کی آمد و شد، وہی غرہ و محاق، وہی تم وہی ہم — الغرض تصور سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جس نے اس یکسانیت کو اپنے لئے سراپا تجدد و تنوع بنالیا ہے اور کائنات اس کے لئے یکسر رنگ و تماشا ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے لئے "بر شپت پائے خود زدنیم" کا نظریہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کا مسلک صرف یہ ہے کہ

قطرگی بگزار تا عماں شوی

اور اس لئے وہ "طارم اعلیٰ" سے ادھر کی کوئی بات کرتی ہی نہیں، اور اسی کا نام اس نے زندگی رکھا ہے۔

انسان فطرتاً جستجو پسند پیدا ہوا ہے اور یہی اس کی حیات کا راز ہے —— حیات سے مراد میری صرف سانس لیتے رہنا نہیں ہے بلکہ زندگانی جس کا دوسرا نام "زندہ دلی" بھی ہے — جستجو نام حرکت کا ہے جوارح ظاہری کی حرکت نہیں بلکہ حرکت ذہن و دماغ، اور جب تک یہ کیفیت کسی قوم میں پائی جاتی ہے زندہ رہتی ہے، اور جب یہ خصوصیت مفقود ہو جاتی ہے تو وہ مرجاتی ہے — ہو اللذی یحیی و یمیت!

آج اگر آپ "زندگی و موت" کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو "مغرب و مشرق" کا مطالعہ کیجئے کہ وہاں "دونوں جہان" ملنے پر بھی بس نہیں اور یہاں احساس کی معراج کا یہ عالم کہ

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

وہاں انسان سے مراد اس کا ہوش و گوش ہے، اس کی ذہنی بیداری ہے، اسکی دماغی آزادی ہے

اور اس کا ایک جگہ چین سے نہ بیٹھا رہنا۔ یہاں انسان وہ ہے جو دوسروں کے کان سے سُنے، دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے، اور ایک غیر متحرک پارۂ سنگ کی طرح جہاں پڑا ہے وہیں پڑا رہے۔ وہاں زندگی نام ہے مستقبل کے پردوں کے اُٹھا دینے کا، یہاں صرف ماضی۔ تاریک ماضی کی پرستش وپرائش کا۔ وہاں انسانِ کامل ہنوز پردۂ خفا میں ہے اور اس کے پالینے کے لئے ہر دل بیتاب ہے، یہاں وہ ماضی بعید میں پیدا ہو کر مرچکا ہے اور اب دوبارہ اس کے احیاء کی امید نہیں۔ الغرض یوں سمجھئے کہ ہم صرف خدا پر لو لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ روشنی خود اپنے اندر ڈھونڈھ رہے ہیں۔

پھر ان دو مختلف ومتضاد ذہنیتوں کی جو دو مختلف راہیں متعین ہو جانا چاہئے، ان کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہنوز یہی نزاع باقی ہے کہ "کعبہ وترکستان" کی راہ کونسی ہے اور وہاں یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

قوموں کا مستقبل اُن کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے، یعنی دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ ہم نے کیا کیا کیونکہ کائنات وعمل دونوں غیر محدود ہیں بلکہ صرف یہ کہ ہماری جو نسلیں اب آنے والی ہیں، ان کے میدانِ عمل کو ہم نے کتنا وسیع بنا دیا اور ان کے ذہن میں ہم نے کتنی جرأت اقدام پیدا کر دی۔ سو اس کا حال ہم کو اس اُصولِ تعلیم وتربیت سے معلوم ہوسکتا ہے جو ایک قوم اپنے بچوں کے لئے متعین کرتی ہو میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں اپنے یہاں کی مشہور قومی ومذہبی درسگاہوں کی کہنگی وفرسودگی کا رونا لیکر بیٹھ جاؤں اور نہ غالباً اس کی ضرورت۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ زندہ قوموں کے بچوں کو جن اُصول پر تعلیم دیجاتی ہے اس کے تیور کیا ہوتے ہیں اور اس کا مستقبل کتنا شاندار ہوتا ہے۔ میں یہ پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ اصل چیز انسان کو ترقی کی راہ پر لگانے والی اس کی جستجو ہے اور چونکہ اس کا اولین تعلق فرائض الاعضاء سے ہے اس لئے آیئے دیکھیں کہ خود اپنی ذات کے متعلق جتنا علم مغرب کے بچوں کو حاصل ہے، اس سے ہم کس حد تک آگاہ ہیں۔

ہم روتے کیوں ہیں

اس سوال کا جواب دیتے وقت سب سے پہلا خیال جو ہمارے دل میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ جب ہم رنجیدہ ہوتے ہیں تو رونے لگتے ہیں مگر رونے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم کسی جسمانی یا روحی تکلیف سے بھی

رونے لگتے ہیں، کسی خاص جذبہ سے متاثر ہوکر بھی رونا ہم کو آجاتا ہے اور بعض اسباب تو بالکل مادی وجسمانی ہوتے ہیں، مثلاً پیاز سے آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ اگر آنکھ میں کوئی کیڑا یا خاک کا ذرہ پڑ جائے تو بھی آنسو بہنے لگیں گے۔ زیادہ کھانسنے، استفراغ کرنے اور کسی چیز میں بہت قوت صرف کرنے سے بھی آنکھوں سے پانی بہنے لگیگا۔ مگر دراصل رونے کا باعث نفسیاتی تحریک ہوا کرتی ہے۔ "رونا" دراصل آنسوؤں کے غدود کی ایک تحریک ہے یہ غدود بالکل آنکھوں کے اوپر ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ آنکھوں کو تر رکھا کریں۔ ان غدود میں جب تحریک زیادہ ہو جاتی ہے تو پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے آنکھ اور ناک سے بہنے لگتے ہیں اور جب یہ پانی بہت زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ آنکھوں سے نکل کر رخسار تک آنے لگتا ہے اور اسی کو "رونا" کہتے ہیں۔ غدود کے تحریک کی یہ زیادتی منحصر ہے خون کے دباؤ کی زیادتی پر۔ اور خون کا دباؤ جذبات کی فراوانی سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آنسوؤں کا بہنا بالکل قدرتی امر ہے۔ آنسو اس اجتماع خون کو کم کر کے سکون پہونچاتے ہیں گویا وہ قدرتی محافظ ہیں یعنی رونے سے دماغ کا اجتماع خون دور ہو جاتا ہے۔

خون کیوں جم جاتا ہے؟

بعض دفعہ جب انگلی یا بدن کے کسی حصہ کی کھال کٹ جاتی ہے تو کسی رگ کو بھی کچھ نقصان پہونچ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا ہے پھر اگر زخم یا چوٹ معمولی ہے تو تھوڑی دیر کے بعد یہ خون بند ہو جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

یوں تو خون بند ہونے کے کئی اسباب ہیں مگر سب سے اہم وجہ خون کا جم جانا ہے۔ یعنی جب خون کا رقیق حصہ جسے (PLASMA) کہتے ہیں جم جاتا ہے تو خون بند ہو جاتا ہے۔

یہ مادہ چھوٹے چھوٹے تاگوں کی شکل کا ہوتا ہے اور اس واسطے اس کا نام (FIBRIN) رکھا گیا ہے۔ یہ تاگے خون میں ہر طرف دوڑتے پھرتے ہیں اور حلقہ سا بنائے ہوئے خون کے تمام اجزا اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ بدن سے باہر ہوتے ہیں تو سکڑنے لگتے ہیں اور ایک جال سا بنا کر انھیں اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اور یہی انجماد خون ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس انجماد سے ایک زرد قسم کا رقیق مادہ پیدا ہوتا ہے اسے (SERUM) کہتے ہیں۔

ہم مسکراتے کیوں ہیں؟

جب کسی اجنبی یا کسی پرانے دوست سے ملاقات ہوتی ہے اور اُس سے ملنے کے لئے ہم بڑھتے ہیں تو مصافحہ کرتے وقت مسکرانے کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ مسکراہٹ، ایک محبت اور ایک قسم کے تعارف کا نشان ہے۔ ایسے موقعوں پر بے اختیارانہ چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ لیکن اس عادت کی کوئی نہ کوئی فطری وجہ بھی ہونا چاہئے۔

چارلس ڈارون نے سب سے پہلے دُنیا کو یہ بتایا کہ مسکرانے اور غرانے میں جو پٹھے استعمال ہوتے ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب دو اجنبی کتے ملتے ہیں تو کچھ دیر تک غراتے رہتے ہیں۔ اس غرانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو ان میں سے ہر کتا دوسرے سے جنگ کے لئے طیار ہے۔

اسی طرح جب کوئی مسکراتا ہے تو گویا وہ مسکراہٹ، غراہٹ کا ایک ابتدائی ہے جو در اصل محافظت کی ایک علامت تھی۔ چنانچہ ہم اجنبیوں سے مل کر اس وجہ سے مسکراتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد جو جانور تھے پہلے اجنبیوں کو دیکھ کر غراتے تھے۔ اس کی ایک مثال بندر میں مل سکتی ہے جو اجنبی کو اپنے قریب آتا دیکھ کر غراتا ہے۔

شرما جانے کی وجہ

یہ کیفیت زیادہ تر نوجوان یا کنواری لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر ان کے سامنے ان کی تعریف کیجائے تو چہرہ سے شرمیلا پن ظاہر ہونے لگیگا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خون جلدی سے چہرہ اور گردن کی طرف دوڑ جاتا ہے اور شرائین کو خون سے بھر دیتا ہے۔ اگر یہ خون عروق کا ہوا تو چہرہ کا رُخ اودا ہوجائے گا۔

(ہیک ٹک) HACK TUCK لکھتا ہے کہ شرم کی سُرخی گردن اور کان سے شروع ہوتی ہے، غصہ کی سرخی آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے اور محبت کی سرخی پیشانی سے شروع ہوتی ہے۔

ڈارون کا اس بارہ میں یہ خیال ہے کہ جب کسی آدمی کو یہ خیال آتا ہے کہ دوسرے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ اپنی توجہ خود اپنے چہرہ کی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ اور اسی لئے اُس طرف خون کی روانی منتقل ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ اب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ماسو (MOSSO) اور ونٹ (WUNDT) وغیرہ

کے نظریہ کے مطابق شرم یا غصہ کی وجہ سے وہ رگیں جو چہرہ میں دوران خون کی ذمہ دار ہیں عارضی طور سے معطل ہو جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس حصہ میں زیادہ خون آجاتا ہے۔

تم زرد کیوں ہو جاتے ہو؟

بعض وقت کسی غیر متوقع خوفناک چیز کو دیکھ کر آدمی کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ بے ہوش بھی ہو جاتا ہے۔ رونگٹے کھڑے ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ہر بال سے متعلق ایک چھوٹا سا پٹھا بھی ہوتا ہے جو خوف کا جذبہ غالب آجانے کی وجہ سے اور چھوٹا ہو جاتا ہے اور جس طرح کسی رسی کو باندھ کر کھینچنے سے ایک لکڑی کا لٹھا سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اسی طرح جب وہ پٹھا چھوٹا ہوتا ہے تو بال بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔

چہرہ اسواسطے خوف سے زرد ہو جاتا ہے کہ جلد کے نیچے جو رگیں ہوتی ہیں وہ یکایک خون سے خالی ہو جاتی ہیں۔ یہ خون جسم کی بڑی نالیوں میں پہونچ جاتا ہے اور اب خون کا دوران نئے سرے سے شروع ہوتا ہے جس میں جسم کی سطح پر تو خون ہوتا نہیں البتہ اس کی جگہ پر اندرونی جسم خون سے بھر جاتا ہے۔

لیکن چہرہ کی یہ حالت خوف کی ہی حالت میں نہیں ہو جاتی بلکہ فوری غصہ سے بھی یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں صرف چہرہ ہی سے خون نہیں ہٹ جاتا بلکہ تھوڑی دیر کے لئے بدن کی تمام بالائی سطح خون سے خالی ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ خون دماغ سے بھی نکل جاتا ہے تو آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔

گورے رنگ کے آدمی شمال میں اور سانولے رنگ کے جنوب میں کیوں پائے جاتے ہیں؟

یہ عجیب بات ہے کہ گورے رنگ اور ہلکے رنگ کے بالوں والے آدمی زیادہ تر شمال میں پائے جاتے ہیں جہاں کی آب و ہوا سرد یا معتدل ہوتی ہے اور سانولے رنگ اور سیاہ بالوں والے گرم ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انگریز، جرمن، اہل سوئڈن، اہل ناروے، اہل ہالینڈ وغیرہ (جو بالکل شمال میں رہتے ہیں) عموماً بہت گورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کے برخلاف فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، یونانی، اور ترک وغیرہ اتنے صاف رنگ کے نہیں ہوتے۔ اسی طرح جیسے جیسے جنوب کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ وہاں کے باشندوں کا رنگ سیاہ نظر آئے گا۔ اگر کوئی قوم جنوبی آب و ہوا میں جا کر رہنے لگے تو خواہ وہ کتنی ہی

صاف رنگ کی کیوں نہ ہو مگر اُس کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور وہ سانولی ہو جائے گی۔ اس کی مثال یونانی ہیں جو کبھی بہت حسین گورے رنگ اور سنہرے بالوں والے ہوتے تھے مگر اب ان کا رنگ سانولا ہو گیا ہے اور بال کالے پڑ گئے ہیں ——— اس کی کیا وجہ ہے ؟ ——— سبب یہ ہے کہ سورج کی تمازت جنوب میں رہنے والوں کو سانولا اور سیاہ کر دیتی ہے۔ سورج کی گرم شعاعوں سے محافظت کے لئے قدرت انسان کی کھال میں ایک روغنی مادہ پیدا کر دیتی ہے جو گرم شعاعوں کو روکتا اور حدت آفتاب کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مادہ ایک رنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو چہرہ اور بالوں سے نمایاں ہو جاتا ہے

چوٹ کا احساس کیونکر ہوتا ہے ؟

اگر لڑائی میں یا کسی اور طریقہ سے چوٹ لگ جائے تو اُسوقت تکلیف نہیں معلوم ہوتی بلکہ کچھ دیر کے بعد اُس کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری انگلی یا بدن کے کسی حصہ میں معمولی سی چوٹ آجاتی ہے مگر جب تک ہم خون نہیں دیکھتے اُسوقت تک ہم کو چوٹ کا خیال بھی نہیں آتا لیکن جیسے ہی خون نظر پڑتا ہے یا ہماری توجہ ہماری چوٹ کی طرف (جو ہم کو لگتے وقت نہیں محسوس ہوئی تھی) منعطف کرائی جاتی ہے تو ہمیں یکایک تھوڑی سی تکلیف یا درد معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں رگوں کے کرنٹ (CURRENT) مرکز سے باہر سطح جسم کی طرف دوڑتے ہیں اور درد کے کرنٹ اندر آنے والے کرنٹ ہوتے ہیں اور اگر اُس وقت یہ کرنٹ، آنے کی جگہ نہ پائیں تو درد نہ محسوس ہو۔ اس کی مثال یوں دیجا سکتی ہے کہ ایک اسٹیشن پر کئی ریل کی پٹریاں ہیں اور کوئی پٹری خالی نہیں بلکہ ہر پٹری سے کوئی نہ کوئی ٹرین جاری ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اور کوئی ٹرین اُسوقت تک اس اسٹیشن پر نہ آسکیگی جب تک کہ اُسے جگہ نہ خالی ملیگی اور چونکہ فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں لہذا کوئی دوسری گاڑی آ نہیں سکتی۔ اب چوٹ لگتے وقت درد کی گاڑی گویا آنے والی گاڑی ہے جس کے ساتھ درد بھی آ رہا ہے لیکن رگوں کے دوسرے کرنٹ باہر جا رہے ہیں اس لئے مقدم الذکر کو آنے کی جگہ نہیں ملتی اور اسی وجہ سے درد بھی نہیں محسوس ہوتا۔ جیسے ہی باہر جانے والے کرنٹ ختم ہو جاتے ہیں اور درد والے کرنٹ اندر آتے ہیں درد محسوس ہونے لگتا ہے۔

تم بہ نسبت رات کے دن میں کیوں زیادہ لمبے ہو جاتے ہو

اگر کسی شخص سے یہ سوال کیا جائے تو وہ یہ جواب دیگا کہ جتنے لمبے ہم رات کو تھے اتنے ہی دن میں بھی تھے

اور وہ اس سوال کو مذاق سمجھ کر بجائے جواب دینے کے ہنس کر ٹال جائے گا لیکن اگر کوئی شخص بیدار ہوتے ہی صبح کے وقت اپنے آپ کو ناپے اور پھر سوتے وقت ناپے تو اُسے پتہ چلیگا کہ صبح کے وقت اس کا قد کچھ تھوڑا سا بڑھ گیا تھا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کا جسم ڈھانچے اور پٹھوں کی وجہ سے سیدھا رہتا ہے اور اس میں سب سے زیادہ حصہ ریڑھ کی ہڈی کا ہے۔ یہ ہڈی کوئی ٹھوس ہڈی نہیں ہوتی کیونکہ اگر یہ ٹھوس ہو تو آدمی اپنے آپ کو ہر راہ جھکا نہیں سکتا۔ بلکہ یہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں سے مل کر بنتی ہے جن کو فقرات یا گریاں کہتے ہیں اور جو خود ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہ ہڈیاں ایک دوسرے پر ہوتیں تو ان سے دماغ اور جسم کو بہت تکلیف پہونچتی کیونکہ وہ ہڈیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھایا کرتیں، اس لئے اس تکلیف سے بچانے کے لئے قدرت نے ان چھوٹی ہڈیوں کے درمیان نرم نرم تکیہ یا گدے سے پیدا کر دئے ہیں۔ رات کو جب ریڑھ کی ہڈی پر وزن نہیں رہتا تو یہ گدے پھول جاتے ہیں اور جسم میں نسبتاً زیادہ درازی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دن کے وقت یہ پھر پچک جاتے ہیں اور جسم کی درازی کم ہو جاتی ہے۔

چیزوں کے رنگ مختلف کیوں ہوتے ہیں؟

ہر چیز کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوتا ہے۔ کوئی چیز سرخ ہوتی ہے، کوئی سبز، کوئی سیاہ، کوئی نیلی، مگر سائنس یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی شے "رنگ" کی قسم سے ہوتی ہی نہیں "رنگ" صرف انسانی دماغ میں ہوتا ہے اور ہم کو مختلف چیزیں مختلف "رنگ" کی صرف دکھائی پڑتی ہیں ورنہ در اصل رنگ کسی قسم کا نہیں ہوتا پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف رنگ نظر کیوں آتے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کی سطح اس طرح کی بنی ہوتی ہے کہ نظر آنے والے چیز کی بعض شعاعیں مٹ جاتی ہیں۔ اور بعض منعکس ہو جاتی ہیں۔ جو شعاعیں منعکس ہو جاتی ہیں وہ اُس شے کا رنگ ظاہر کرتی ہیں۔ اگر روشنی کی تمام شعاعیں جذب ہو جائیں تو کوئی چیز ہی نہ دکھائی پڑے۔ گویا کسی چیز کا کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا بلکہ صرف اُس شے کی ایک صفت ہوتی ہے۔ اور مختلف چیزوں کے مختلف رنگ ہم کو اسواسطے نظر آتے ہیں کہ ان میں شعاعیں منعکس کرتے اور مختلف صفات پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح دنیا میں "آواز" کا بھی وجود نہیں ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جاندار نہ پایا جائے تو آواز بھی نہ سنائی پڑے۔ خواہ کسی پل پر سے کوئی ریل گاڑی کبھی دوسری گاڑی سے ٹکرا کر نیچے گر پڑے مگر پھر بھی

کوئی آواز نہ معلوم ہوگی۔

آواز دراصل مشتمل ہے ہوا کے تموجات پر، جو بذات خود بے آواز ہیں جب یہ ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں تو دماغ تک پہونچ جاتے ہیں اور وہاں آواز میں بدل جاتے ہیں۔ اُس وقت ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم کچھ سن رہے ہیں، مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے چونکہ یہ تموجات خود ہی بے آواز ہیں اس لئے اگر فضا میں کان ان کو نہ روکے تو کبھی کوئی آواز ہی نہ سنائی دے۔ آواز کا دراصل رنگ کی طرح کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

صابن کے حباب

صابن کا بلبلہ جو کسی نلکی سے اُڑایا جاتا ہے اپنے اندر کاربن ڈائکسائڈ گیس (CORBON DIOX-IDE GAS) رکھتا ہے جو پھیپھڑوں سے نکلتی ہے۔ اس طرح سے جو بلبلہ بنتا ہے وہ صابن اور پانی سے مخلوط اور لچک دار ہوتا ہے یعنی بغیر توڑے ہوئے اُسے مختلف سمتوں کی طرف کھینچا جا سکتا ہے اس قسم کے بلبلوں میں زیادہ لچک پیدا کرنے کے لئے صابن، پانی اور گلیسرین کا مرکب استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور معمولی زرد صابن، اکثر بیش قیمت خوشبودار صابنوں سے اس معاملہ میں زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔

اگر اس بلبلہ کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کی سطح پر کئی رنگ ہیں یہ رنگ عموماً ہلکے ہوتے ہیں اور زیادہ تر پیازی، گلابی، ہرے یا نیلے ہوتے ہیں۔ چند سکنڈ کے بعد بلبلہ کی سطح پر ایک سیاہ سا دھبہ دکھائی پڑنا شروع ہوتا ہے۔ یہ دھبہ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ چند لحوں میں بالکل ہی کالا ہو جاتا ہے اور پھر بلبلہ پھٹ جاتا ہے۔ یہ سیاہ دھبہ دراصل حباب کا باریک ترین حصہ ہوتا ہے اور اسی لئے سب سے پہلے حباب اسی جگہ سے پھٹتا ہے۔ یہاں پر حباب کی سطح (کھال) اتنی باریک ہو جاتی ہے کہ وہ روشنی کی شعاعوں کو منعکس نہیں کر سکتی۔

صابن کے بلبلوں کی مدد سے ذرات مادہ کا سائز بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک خاص سائز کا بلبلہ بنانے کے لئے پانی اور صابن کے کتنے مقدار کی ضرورت ہے، جب کوئی حباب طیار ہوتا ہے تو اُسے ناپا جا سکتا ہے اور اسی طرح اس کی سطح میں صابن اور پانی کے ذرات کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ فلم (حباب) کی موٹائی اُس کے رنگ سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے جب بلبلہ کی موٹائی اور اُس کا رقبہ معلوم ہو تو ذرات کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک پتھر کے ٹکڑے نے تاریخ پر کیا اثر ڈالا

سو برس سے کچھ زیادہ زمانہ ہوا جب مصر میں ایک چپٹا سا پتھر دستیاب ہوا تھا جس نے دنیا کی قدیم ترین تہذیب پر غیر معمولی روشنی ڈالی۔

مصر کے نقوش (جو جانوروں کی مختلف تصویریں ہوا کرتے تھے) صدیوں تک معمہ بنے رہے اور چونکہ ان میں سے کسی ایک علامت کا حل بھی کسی شخص کو معلوم نہیں تھا اس لئے ان معموں کا حل ناممکن نظر آتا تھا مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ ان کا حل اگر معلوم کر لیا گیا تو گویا مصر قدیم کی تہذیب و تمدن اور تاریخ بھی روشنی میں آجائے گی۔ ایک مرتبہ مسٹر جیل چیمبولین (JEAN CHAMBERLAIN) ایک ماہر آثار قدیمہ کو شمالی مصر کی طرف زمین کھدوانے کے سلسلہ میں ایک چپٹا سا پتھر دستیاب ہوا جو اب "سنگ روزیٹا" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ وہ مصری بندرگاہ روزیٹا (ROSETTA) کے قریب ملا تھا۔ اس پتھر پر دو زبانوں میں ایک کتبہ لکھا تھا، یعنی مصری اور یونانی زبان میں مصری زبان کا کتبہ دونوں طرح کی مصری تحریر میں تھا، یعنی جانوروں کی شکلوں میں بھی تھا اور "عوام الناس کی تحریر" میں بھی۔ اس پتھر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تینوں تحریریں دراصل ایک ہی عبارت ہیں۔

اب اتنا پتہ پانے کے بعد مصری ماہرین تحریر نے ان شکلوں کو پڑھنا اور یونانی عبارت سے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ بعض شکلوں کے واسطے جو مسلسل لکیر کھینچی گئی ہے وہ کوئی شاہی نام ظاہر کرتی ہے۔ اسے (CARTOUCHE) کہتے ہیں۔ یہ بھی مانا گیا کہ اگر یہ (PTOLEMY)(CARTOUCHE) کا نام ظاہر کرتا ہے تو اس کے الفاظ یونانی الفاظ کے ہم وزن ہوں گے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ترجمہ یونانی زبان میں شروع کیا جائے۔ اس سے قبل ایک اور پتھر مل چکا تھا جس میں لفظ کلوپٹرا (CLEOPATRA) پرانے طرز تحریر میں کندہ تھا اور یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ لفظ واقعی "کلوپٹرا" ہی ہے۔ اب اس کلوپٹرا والے پتھر کو تازہ پتھر سے ملایا گیا تو معلوم ہوا کہ PTOLEMY اور CLEOPATRA کے ناموں کے اکثر حروف دونوں پتھروں میں ملتے ہیں مثلاً حرف L کلوپٹرا کے لفظ میں دوسرا حرف ہے اور ٹولمی کے لفظ میں چوتھا۔ اسی طرح حرف P کلوپٹرا کے لفظ میں پانچواں حرف ہے اور ٹولمی کے لفظ میں پہلا، وقس علی ہذا۔

اسی طرح دونوں پتھروں کا معائنہ کرنے سے اس کا پتہ چلا کہ دونوں کی بعض شکلیں بالکل ملتی ہیں مثلاً کسی نام میں کوئی چڑیا بنی ہوئی تھی، وہی چڑیا دوسرے نام میں بھی اسی جگہ بطور حرف کے استعمال ہوئی

جہاں واقعی اُس حرف کو استعمال کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ اس چڑیا کا ترجمہ انگریزی حرف اے "A" سے کیا گیا ایک اور شکل کا ترجمہ "آر" "R" کیا گیا۔ غرضیکہ رفتہ رفتہ اسی طرح ہر شکل کا ترجمہ کرلیا گیا اور معمہ حل ہوگیا۔

اب اس حل کی بدولت مصر کی تمام پرانی تحریریں نہایت آسانی سے پڑھی جاسکتی ہیں اور ان کو پڑھنے کے بعد ہم کو مصر کی قدیم تاریخ اور اُس کے طرزِ معاشرت و تہذیب و تمدن کا وہ حال معلوم ہوگیا ہے جس کا ابھی تک کسی کو پتہ بھی نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر وہ سنگ روزیٹا، دستیاب نہ ہوتا تو قدیم مصری تہذیب سے ہم اب بھی بالکل نا آشنا ہوتے۔

زمین کے بننے کے متعلق جدید نظریات

اگر ہم دنیا کے نقشہ یا کرہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں چند خصوصیتیں نظر آئیں گی مثلاً تقریباً ہر جزیرہ نما کی جنوب کی طرف نوک ہوتی ہے بلکہ اکثر براعظم اور بڑے ممالک کا بھی یہی نقشہ ہوتا ہے جیسے (افریقہ، جنوبی امریکہ اور ہندوستان) دوسرے یہ کہ خشکی کا تقریباً تمام حصہ کرہ کے شمالی نصف کرہ میں واقع ہے اور تقریباً تمام بحری حصہ، جنوبی نصف کرہ میں۔ اسی طرح اگر شمالی نصف کرہ کی خشکی کے رقبہ کا نقشہ ایک کرہ کو دیکھ کر قطب شمالی کے نقطہ سے کھینچا جائے اور جنوبی نصف کرہ کی خشکی کے رقبہ کا نقشہ کرہ کو دیکھ کر قطب جنوبی کے نقطہ سے کھینچا جائے اور دونوں نقشوں کو ایک دوسرے پر منطبق کردیا جائے تو خشکی کا حصہ سمندر پر پڑے گا صرف جنوبی امریکہ کا ایک حصہ ایسا قابل تذکرہ ہے جو شمالی چین کے ایک حصہ پر پڑیگا۔ آخر ایسا کیوں ہے ـــــ ؟

زمین بننے کے جدید نظریات نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ کوئی گول چیز پر بہت دباؤ پڑتا ہے تو وہ TET RA HED RON (چار مساوی مثلث نما شکل رکھنے والی ٹھوس چیز) کی طرح بن جاتی ہے۔ TET RA HED RON اس طرح بن سکتا ہے کہ چار مساوی مثلث کسی دفتی سے کاٹے جائیں اور ان کو کناروں پر ایک ساتھ چپکا دیا جائے اس طرح سے ایک لٹو کی ایسی شکل بن جائے گی جس کے سرے پر چوڑی چوڑی سطح ہوگی اور تہ پر ایک نوک۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری زمین بھی تھوڑی سی لٹو کی شکل کی طرح ہے یہ اس وجہ سے بھی ہے کہ زمین جب ٹھنڈی ہوتی ہے اور سکڑتی ہے تو TET RA HED RON کی سی ہوجاتی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنی گولہ کی ایسی شکل اپنے دورہ کی وجہ سے قائم رکھنا چاہتی ہے۔

اب اگر دفتی کے بنے ہوئے اس TET RA HED RON کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنارے

مرکز کشش کے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت ان نقطوں کے۔ اور اگر اس شکل کی سطح پر پانی ٹھہرانے کی کوشش کی جائے تو وہ قدرتاً کناروں کی طرف بہیگا اور یہ نقطے بھی پانی میں آجائیں گے چنانچہ یہ نقطے، کرۂ ارض میں براعظموں یا زمین کے قطعات کی جگہ پر ہیں اور سطح سمندری حصہ کے لئے۔

سورج کیوں گرم رہتا ہے؟

سورج کی گرمی کا سوال ہمارے لئے نہایت اہم ہے کیونکہ سورج ہی کی شعاعوں پر زندگی کا انحصار ہے تقریباً ایک صدی پہلے لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ سورج آگ کا ایک عظیم الشان گولہ ہے اور اُس میں سے اُسی طرح گرمی نکلتی ہے جس طرح جلتے ہوئے کوئلے کے ڈھیر سے چنانچہ ایک جلتی ہوئی بھٹی کی طرح سورج کو بھی سمجھا جاتا تھا۔

لیکن اس نظریہ کی اُسوقت تردید کرنا پڑی جب یہ ثابت کیا گیا کہ دوسری چیزوں کے جلنے کی طرح، سورج ایسے زبردست گولے سے بھی جو گرمی نکلتی ہے اُسے چند ہزار سال میں ختم ہو جانا چاہئے لیکن یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا میں زندگی کا وجود لاکھوں برس سے پایا جاتا ہے اور سطح زمین پر گرمی کی حدت میں کبھی کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سورج کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک زبردست جلتی ہوئی بھٹی کی طرح ہے غلط ہے۔ چنانچہ سورج کی گرمی کو تشریح کرنے کے لئے مختلف دیگر نظرئے پیش کئے گئے۔

سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ جب سورج ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ سکڑتا ہے جس کی وجہ سے گرمی بھی بڑھ جاتی ہے جو کافی عرصہ تک قائم رہتی ہے لیکن پھر یہ کہا گیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو سورج کی گرمی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس کے بعد یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ ٹوٹے ہوئے تارے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے اجرام فلکی، آفتاب کی زبردست قوت کشش کی وجہ سے اس سے جا کر ٹکراتے ہیں اور اسی ٹکر کی وجہ سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ رگڑ یا کسی تیز ٹکر سے گرمی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اس نظریہ کو پیش کر کے یہ کہا گیا کہ اسی طرح سورج میں گرمی پیدا ہوتی ہے جو بہت عرصہ تک رہیگی۔ لیکن یہ نظریہ بھی حساب سے غلط ثابت کیا گیا۔

اب جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ سورج کی گرمی، ریڈیم، کی وجہ سے قائم ہے اور اُس میں اسوقت تک جو گرمی قائم ہے وہ ریڈیم کے ذرات (ATOMS) کی وجہ سے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ریڈیم کا زور ہزاروں برس تک قائم رہتا ہے اور اُس کی ایک ادنی چنگاری بھی بہت زندگی رکھتی ہے (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمین کی گرمی اُس ریڈیم کی وجہ سے ایک حد تک قائم ہے جو اُس کی سطح کے نیچے اُس کی تہوں میں ہے)

آج کل اس نظریہ کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے اور اُس پر بھی کئی اعتراضات وارد ہوگئے ہیں لہذا یہ کہنا پڑے گا کہ سورج کی گرمی کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا ہے۔

تم گرم کیوں رہتے ہو؟

دنیا میں دو قسم کی مخلوق ہیں۔ سرد خون والی اور گرم خون والی۔ مینڈک، سانپ، چھپکلی، گھونگھا اور مچھلی سرد خون رکھتی ہیں اور شیر، چیتے، گھوڑے، بلی، کتے وغیرہ گرم خون کے ہیں۔ انسان بھی گرم خون والا جانور ہے۔

ان دونوں قسموں کے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ سرد خون رکھنے والے جانوروں پر ان کے ماحول کے ٹمپریچر کا بھی اثر پڑتا ہے مگر گرم خون والے جانوروں کا ٹمپریچر وہی رہتا ہے خواہ ان کے ماحول میں کتنی ہی سردی یا گرمی کیوں نہ ہو۔ گویا اگر کسی مینڈک کو ۴۰ ڈگری حرارت میں رکھدیا جائے تو مینڈک کی حرارت بھی اتنی ہی ہوجائے گی۔ سرد خون رکھنے والے جانور سردی کے مارے منجمد بھی ہوسکتے ہیں اور اگر ایک مقررہ درجۂ حرارت سے زیادہ کی گرمی میں انھیں رکھا جائے تو وہ مر بھی جائیں۔

گرم خون رکھنے والے جانوروں کی حالت جداگانہ ہے۔ مثلاً تندرستی کی حالت میں ایک انسان کا درجۂ حرارت تقریباً ایک ہی رہتا ہے۔ اب خواہ وہ قطب شمالی میں جاکر رہے یا خط استوا کے ممالک میں، اُس کا جسمانی درجۂ حرارت یہی رہیگا۔ البتہ جب وہ مرجائے گا تو اُس کی لاش کی حرارت ماحول کی حرارت کے مطابق ہوگی۔ گویا انسان کا ٹمپریچر زندگی پر منحصر ہے، قدرت نے اُس کے لئے کئی ایسے سامان مہیا کر دئے ہیں جو اس کا درجۂ حرارت معتدل رکھتے ہیں۔ بہت سردی میں کھال سکڑتی ہے اور خون کی ایک کثیر مقدار کو سطح پر جانے اور ٹھنڈا ہوجانے سے روکتی ہے۔ گرمیوں میں جسم کے مساوات کھل جاتے ہیں، پسینہ باہر نکلتا ہے، بخارات اُٹھتے ہیں اور ان چیزوں سے بدن میں ٹھنڈک پہونچتی ہے۔ ہمارے بدن میں جو گرمی ہے وہ جلنے (COMBUSTION) کی وجہ سے قائم رہتی ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ فطرت نے گرمی کی جو اوسط مقدار ہمارے بدن میں رکھی ہے وہ کس لحاظ سے ہے۔ غالباً اس کے جواب میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ اتنی ہی گرمی مناسب تھی۔

کیا تم اپنا دماغ خود دیکھ سکتے ہو؟

اگر کوئی آدمی اپنا دماغ دیکھنا چاہے تو وہ ایک بند کمرہ میں ایک سیاہ کپڑے اور ایک موم بتی کی

مدد سے عملی تجربہ کرکے دیکھ سکتا ہے۔

تجربہ شروع کرنے والے کو سب سے پہلے ۲ مربع فٹ سیاہ کپڑا لینا چاہیئے جو بالکل صاف، چکنا ہو اور اُس میں لکیریں نہ پڑی ہوں۔ کمرہ میں بالکل اندھیرا ہو اور ایک موم بتی بھی موجود رہے۔ اس کپڑے کو دیوار پر اس طرح لٹکانا چاہیئے کہ اس کا نیچے والا کنارہ تجربہ کرنے والے کی آنکھوں کے برابر ہو (خواہ وہ کھڑا ہو یا بیٹھا) اس کے بعد اُس شخص کو سیاہ کپڑے سے ۳ فٹ کے فاصلہ پر آجانا چاہیئے اور پھر اپنا سر متوازی رکھتے ہوئے اور ٹھوڑی نیچے کرکے اُسے اپنی آنکھوں کو ۴۵ ڈگری اوپر اُٹھانا چاہیئے تاکہ اسکی نظریں سیاہ کپڑے کے بالکل وسط پر پڑیں۔ ٹھیک اسی حالت میں ایک روشن شمع اُس کی ناک سے ۶ اِنچ کے فاصلہ پر رکھی جائے اس کے بعد شمع کو اُس کے چہرہ کے دونوں رخوں کی طرف (دائیں بائیں) آہستہ آہستہ حرکت دیجائے اور ہر حرکت میں ۲ سکنڈ صرف کئے جائیں۔ اور اس حرکت کا طول آٹھ اِنچ کے قریب ہونا چاہیئے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس حرکت کے دوران میں شمع کے شعلہ میں نہ ہوا لگنے پائے اور نہ سانس، بلکہ اُس شعلہ کو برابر جلنا چاہیئے۔

اگر یہ تجربہ بہت ہوشیاری سے کیا جائے اور سر اپنی جگہ پر نیچے اور نظریں اُٹھی رہیں تو تجربہ کرنے والے کو یہ نظر آنا شروع ہوگا کہ اُس کے سامنے فضا میں اُس کے دماغ کا نقشہ کھنچ رہا ہے۔ اُسے درخت کی پتی کی طرح اُس شکل میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی رگیں دکھائی پڑیں گی۔ یہ رگیں عام طور سے کالی ہوتی ہیں اور غیر مساوی طور پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہرحال جب آنکھوں کے سامنے یہ شکل بننے لگے تو تجربہ کرنے والے کو چاہیئے کہ وہ اپنی نظریں اُسی پر جمائے رہے اور نظر ہلنے نہ پائے یہ سیاہ منتشر جال دراصل مشتمل ہوتا ہے خون کی نالیوں پر، یہ خیال رہے کہ اس شکل کو صرف تجربہ کرنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔ کمرہ میں جو لوگ اور رہونگے وہ نہ دیکھ پائیں گے البتہ اگر کوئی دوسرا یہی کام کرے تو وہ بھی اس شکل کو دیکھ سکتا ہے۔

دراصل یہ محض فریب نظر ہے۔ فضا میں کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف ایک واہمہ اور تخیل ہوتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی شکل آنکھوں اور دماغ کے اندرونی شکل کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جو شکل دیکھی جاتی ہے وہ دماغ نہیں ہے بلکہ آنکھوں کا اندرونی پردہ ہے، بہرحال یہ کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ دماغ کی تہوں کی طرح ایک شکل ضرور سامنے آجاتی ہے۔

طیاریچیوں پر کیا گزرتی ہے؟

قدرت نے انسان کو مثل چڑیوں کے قوت پرواز نہیں عطا کی ہے اسی لئے جب انسان یکایک

بلندی پر پہونچ جاتا ہے تو اُسے عجیب وغریب باتیں پیش آتی ہیں شدید سردی کی وجہ سے وہ بے حس ہوجاتا ہے اور بلندی پر ہوا کے ہلکے ہوجانے کی وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ خارجی آکسیجن حاصل کرے قصہ مختصر یہ کہ ایسے مقامات پر پہونچکر اکثر انسان کی عقل گم ہوجاتی ہے، اعصابی حس معطل ہوجاتا ہے، سر میں چکر معلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات انسان بے ہوش بھی ہوجاتا ہے۔ بہر حال ہوا میں پرواز کرنے والے کے جسم اور دماغ میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان کا حال ہی میں تجربہ کیا گیا ہے اور اس کے بہت دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں)۔

خون کے اندر معمولی حالت میں فی مکعب سرخ قسم کے پچاس ہزار ذرات ہوتے ہیں۔ زیادہ بلندی پر یہ تعداد بہت زاید ہوجاتی ہے اور سفید ذرات کی تعداد زیادہ نہیں بڑھتی۔ پرواز کے دوران میں سانس لیتے وقت جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ زیادہ قابل توجہ ہیں۔ سانس کے لئے آکسیجن کی ضرورت ہے اور بہت بلندی پر جاکر یہ ناکافی ثابت ہوتی ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ رگوں کی قوت کم ہوجاتی ہے اور زیادہ بلندی پر کام کرنے سے عموماً تھکن پیدا ہوجاتی ہے اور کاہلی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کام کرنا بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے قوت سامعہ میں فرق آجاتا ہے، کانوں میں کھٹ کھٹ کی آواز سُنائی دیتی ہے، قوت باصرہ میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور قوت احساس میں کمی آجاتی ہے۔

کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر پہونچنے کی سعی کے دوران میں اِن تغیرات کا مزید تجربہ کیا گیا تھا اور ہر صورت میں یہ معلوم کیا گیا کہ ان رگوں میں جن سے خون جاتا ہے آکسیجن کی مقدار بہ مقابلہ سطح سمندر کے کم ہوجاتی ہے۔ سمندری سطح پر خون کی نالیوں میں ۹۵ سے ۱۰۰ فیصدی تک آکسیجن کا اجتماع ہوتا ہے لیکن ۴۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ۸۰ سے لیکر ۹۰ فیصدی تک رہجاتا ہے۔

یہ مختلف اثرات، اکثر لوگوں میں وہ بیماریاں پیدا کرتے ہیں جن کو ہوائی جہاز یا غبارہ کی بیماریاں کہا جاتا ہے اور جو پہاڑی بیماریوں کی ہم پلہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان بیماریوں میں سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے زبان کا مزہ بگڑ جاتا ہے اور رگوں میں جمود پیدا ہوجاتا ہے۔ اور درد سر و غنودگی طاری رہتی ہے۔

ہوائی جہازوں کی تازہ ترین ساخت میں ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے کہ پرواز کے دوران میں جو سخت امراض لاحق ہوجاتے ہیں وہ نہ ہونے پائیں چنانچہ معمولی پرواز میں جہاز کو بہت زیادہ بلندی پر نہیں لیجایا جاتا پھر بھی زیادہ بلندی پر پہونچکر جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ طبی رو سے یقیناً دلچسپ ہیں۔

دُمدار ستارہ

دنیائے سائنس کے لئے کسی جدید دمدار ستارہ کا انکشاف ہمیشہ باعث دلچسپی رہتا ہے۔ حال ہی میں پروفیسر باڈی (PROF. BADDE) آف ہمبرگ نے اعلان کیا تھا کہ انھوں نے (CYGNUS) ستاروں کے جھنڈ میں ایک نیا دمدار ستارہ کا وجود دریافت کیا ہے۔ یہ ستارہ بہت دھندلا ہے اور دوربین کی مدد کے بغیر نہیں دکھائی دیتا مگر اس کی روشنی میں ترقی ہو رہی ہے اور وہ جب سے دریافت ہوا ہے اُس وقت سے لیکر اسوقت تک اُس کے قد و قامت میں برابر ترقی ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ستارہ بھی نظام شمسی کے قریب جلد پہونچ جائے گا۔

دُمدار ستاروں کی تیزی رفتار کا سوال قابل توجہ ہے۔ ان میں سے اکثر ستارے فی گھنٹہ دس لاکھ میل کی رفتار سے چلتے ہیں۔ بعض صد ہا برس کے بعد ایک مرتبہ دکھائی پڑجاتے ہیں مگر موجودہ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ وہ صدیوں برس پہلے سے یہ بتا سکتی ہے کہ ایک خاص دمدار ستارہ اب کب، کس دن اور کس گھنٹہ میں نمودار ہوگا۔

دمدار ستارہ کے عموماً تین حصہ ہوتے ہیں:۔ (۱) سر (NUCLEUS) (۲) جو (COMA ، کے گرد رہتا ہے (۳) دُم (TAIL)۔ (NUCLEUS) اس کا خاص روشن حصہ (COMA) غلاف کی طرح ہوتا ہے جس سے (NUCLEUS) ڈھک جاتا ہے۔ دُم مشتمل ہے چمکتی ہوئی گیس پر جو بعض اوقات کروروں میل تک چمک دکھاتی ہے۔

سویڈن کے پروفیسر ارہنیس (ARRHENIUS) نے دُمدار ستاروں کی بابت ایک دلچسپ حقیقت دریافت کی ہے۔ عرصہ ہوا یہ دیکھا گیا تھا کہ دُمدار ستارہ کی دُم بالعموم آفتاب کے رخ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے یعنی جب ستارہ آسمان پر چلتا ہوتا ہے تو اُس کی دُم اس طرح گھومتی ہے کہ وہ ستارہ ہمیشہ آفتاب کی سمت سے الگ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب سے جو شعاعیں نکلتی رہتی ہیں وہ ایک خاص دباؤ ڈالتی ہیں اور یہ دباؤ دمدار ستارہ کی دم کے گیس والے اجزا کو اُس سے دور ہٹا دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ستارہ کی دم سورج سے الگ جا رہی ہے۔

دُمدار ستارے بیضاوی طریقہ سے سفر کرتے ہیں۔ وہ خلا کی گہرائیوں سے آفتاب تک آتے ہیں اور اس دوران میں ان کی رفتار بہت تیز رہتی ہے، پھر جب وہ آفتاب کے قریب پہونچتے ہیں تو اپنی دُم

پہنچ جاتے ہیں اور جہاں سے وہ نکلے تھے وہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ دُمدار ستارہ کے راستہ کا خم معلوم کرکے پتہ لگا یا جاتا ہے کہ ستارہ کی رفتار کیا رہی ہے اور اسی حساب سے وہ اُن کی آیندہ آمد کی تاریخ بھی بتا دیتے ہیں۔

ان دُمدار ستاروں سے ہم کو عمر انسانی کی کوتاہی کا بھی اندازہ لگ جاتا ہے بعض دُمدار ستارے کئی ہزار برس کے بعد واپس آتے ہیں۔ چند برس گزرے اسی قسم کا ایک ستارہ دکھائی پڑا تھا۔ اس سے قبل روم و یونان کی تہذیب سے پہلے، اور اہرام مصر بننے کے قبل وہ نظر آیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل مدت ہزاروں قوموں کا عروج و زوال، کروروں لڑائیاں، عجیب و غریب انقلابات زمانہ دیکھ چکی ہوگی مگر فضائے بسیط میں یہ عرصہ دراز دُمدار ستارہ کا محض ایک چکر ہے!

کیا مریخ پر کوئی آبادی ہے؟

'چاند' کے بعد 'مریخ' ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے اور یہ جاننا ہمارے لئے یقیناً باعث دلچسپی ہوگا کہ اُس میں کوئی آبادی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر اُس میں کوئی آبادی ہوئی تو بہت ممکن ہے کہ لاسلکی کی ایجاد کے بعد ہم مریخ کے بسنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکیں۔

مریخ کی "نہروں" پر کافی عرصہ تک مباحثہ رہا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہاں موسم سرما کے دوران میں قطبین پر برف کے کھیت جم جاتے ہیں۔ اور گرمی میں پگھلتے ہیں چونکہ مریخ میں پانی کی قلت بتائی جاتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ آب پاشی کرنے کے لئے مریخ والوں نے بڑی بڑی نہریں بنائی ہیں جو برفاب کے اس ذخیرہ کو ان کی دنیا کی سطح تک پہونچا دیتی ہیں۔ اور اس طرح مریخ والے اس پانی سے اپنے آپ کو فایدہ پہونچاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ جو چیز دکھائی پڑتی ہے وہ نہریں نہیں ہیں بلکہ ترکاریوں کے بڑے بڑے قطعات ہیں جو ان نہروں کے دونوں طرف واقع ہیں لیکن اکثر ماہرین فلکیات اس نقطہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ ہم یہ سب چیزیں مطلق دیکھ ہی نہیں سکے ہیں۔

بہرحال یہ سوال کہ آیا ہماری طرح جاندار لوگ مریخ کی سطح پر رہتے ہیں اس جستجو کا محرک ہوا ہے کہ وہاں پر کسی قسم کی زندگی ممکن بھی ہے یا نہیں؟ ۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے لئے پانی، حرارت، اور ایک خاص قسم کی فضا کی ضرورت ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ چیزیں مریخ میں موجود ہیں یا نہیں۔

سب سے پہلے حرارت، کا مسئلہ لیجئے۔ زندگی صرف چند حدود کے درمیان منحصر ہے اور یہ حدود پانی

کے نقطۂ انجماد و نقطۂ حارہ ہیں۔ زمین کا اوسط درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بہت زیادہ اوپر ہے۔ اور مریخ میں اس سے بہت کم۔ نیز گرمی کے زمانہ میں بھی سب سے زیادہ حرارت جو ہوتی ہے وہ بھی نقطۂ انجماد (FREEZING POINT) سے کچھ ہی اوپر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر مریخ کے باشندے اپنی طویل سردی کی رت میں اپنے آپ کو گرم رکھنا جانتے ہیں تو وہ اس کی سطح پر ضرور رہ سکتے ہیں۔

مریخ پر پانی بہت ہی کم ہے۔ اور چونکہ وہ ہماری زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اس لئے وہ زیادہ خشک ہو گیا ہے اور اسی لئے یہ "نہریں" (اگر واقعی ان کا کوئی وجود ہے) بنائی گئی ہیں۔ مریخ کی سطح پر بہت بڑے بڑے ریگستانی صحرا ہیں جن کی وجہ سے مریخ کا رنگ سُرخ نظر آتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اگر پانی کے استعمال میں وہاں کفایت کی جائے تو زندگی کے لئے کافی ہو۔

بہر حال مریخ میں زندگی کا امکان ضرور ہے اور چونکہ قدرت ہر امکان کو بیکار جانے نہیں دیتی اس لئے وہاں آبادی ہونا چاہئے۔

زلزلہ کیا ہے

تمام مظاہر فطرت میں، زلزلہ ہی وہ چیز ہے جس سے انسان کی حد درجہ لاچاری اور بے بسی ظاہر ہوتی ہے۔ عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے سخت چھلکے میں کچھ خفیف تغیرات ہونے کی وجہ سے زلزلہ آجاتا ہے زمین برابر سکڑ رہی ہے اور جب وہ سکڑتی ہے تو کرۂ ارض کے پانی اور خشکی کے قطعات میں تغیرات ہوتے ہیں جب سمندر میں زلزلہ آتا ہے تو ہم کو بہت کم معلوم ہوتا ہے لیکن خشکی کے زلزلے چونکہ بہت زیادہ تباہی اور بربادی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اس لئے ان کا علم ہم کو حاصل ہو جاتا ہے۔

کرۂ ارض کے بعض حصے اکثر زلزلہ کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً جاپان اور مغربی و جنوبی امریکہ میں زلزلے کے جھٹکے زمین پر مختلف رفتار سے پڑتے ہیں اور اس رفتار کو ایک آلہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے جسکو "سیسموگراف" (SIESMOGRAPH) کہتے ہیں۔ بعض وقت یہ جھٹکے ہلکے ہوتے ہیں اور ایک محدود رقبہ تک محسوس کئے جاتے ہیں اور بعض وقت وہ بہت سخت ہوتے ہیں اور تمام زمین کی سطح سے گزرتے ہیں۔

خشکی کے زلزلے جو ساحل سمندر کے کنارے آتے ہیں یا سمندری زلزلہ جو ساحل کے قریب آتے ہیں سب سے زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں اور ان زلزلوں کے بعد نہایت زبردست جوار بھاٹے کی لہریں اٹھتی ہیں ۱۸۹۹ء میں الاسکا میں ایک زلزلہ آیا جس میں ہر چند منٹ کے بعد لہریں ۸۰ — ۸۰ فٹ تک چڑھ جاتی تھیں

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح سمندر سے ۰۰ فٹ اوپر تک تباہ کاریوں کا سلسلہ پہونچ گیا۔
۱۹۲۳ء میں ساحل چیلین (CHILEAN) میں ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ سمندر خلیج سے ہٹ گیا اور سطح سمندر کے تقریباً ۵۰ فٹ تک کے بالو کے کنارے دکھائی پڑنے لگے۔ اس کے بعد ایک لہر پانی کی سب سے اونچے نشان سے بھی ۰۰ فٹ زیادہ اونچی آئی اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے گئی۔ اس کے بعد اسی طرح برابر لہریں اٹھتی رہیں جو ایک دوسرے سے زیادہ اونچی ہوتی تھیں اور یہ حالت تین دن تک قائم رہی، یہ جھٹکے ۲ ہزار میل کے فاصلے تک معلوم ہوئے تھے، وسط بحر الکاہل میں ان کی وجہ سے زبردست سیلاب آ گئے تھے اور تمام سمندر اپنی تہ میں تھرا رہا تھا۔
واشنگٹن کے ادارۂ کارنیگی (CARNEGIE INSTITUTION) نے ساحل چیلین میں اس طرح کے زلزلہ آنے کے وجوہات دریافت کرنے کے لئے باقاعدہ تحقیقات شروع کی تھی اور مغربی ساحل امریکہ کے سمندر کی تہ کا نقشہ مرتب کرنے کے لئے دو جہازوں کو تازہ ترین آلات مہیا کرکے اس کام پر مامور کیا تھا۔

کیا قوت کشش کا راز منکشف ہو گیا ہے؟

قوت کشش، تمام قوتوں سے زیادہ پراسرار سمجھی گئی ہے۔ وہ خلا کے کروڑوں میل کے رقبہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مادی ذرات کو مجتمع کئے ہوئے ہے جو اتنے چھوٹے ہیں کہ ایک سوئی کی نوک پر اربوں کی تعداد میں جمع ہو سکتے ہیں۔
ابھی تک ایسا کوئی مادہ دریافت نہیں ہوا ہے جو قوت کشش کو روک سکے۔ بیچ میں ایک پردہ حایل کر دینے سے انسان گرمی یا روشنی کو روک سکتا ہے مگر قوت کشش کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا۔ مثلاً شیشہ سے روشنی گزر سکتی ہے مگر بجلی نہیں جا سکتی۔ لوہے کی ایک چادر روشنی کو روک سکتی ہے مگر بجلی اس سے گزر سکتی ہے، لیکن قوت کشش کو روکنے کے لئے کوئی پردہ کام نہیں دے سکتا۔
قوت کشش کا اصلی راز ابھی تک نہیں ظاہر ہو سکا ہے اس کے بارہ میں مختلف نظریات پیش کئے جا چکے ہیں مگر سب پر اعتراض کئے گئے۔ کچھ عرصہ ہوا کلیفورنیا کے پروفیسر ٹی۔ جے۔ جے سی J.J.SEE نے ایک جدید نظریہ پیش کرکے دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے قوت کشش کا راز معلوم کر لیا ہے۔
وہ نظریہ یہ ہے کہ قوت کشش مشتمل ہے بجلی اور مقناطیسی لہروں کے ایک خاص سلسلہ پر یہ لہریں گرمی اور روشنی کی لہروں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں مگر مقناطیس سے ان کا نزدیکی تعلق۔ یہ خلا میں ان

لہروں کی رفتار بھی، روشنی کی لہروں کی رفتار کے برابر ہے یعنی فی سکنڈ ۱۸۶۰۰۰ میل فی گھنٹہ۔ یہ لہریں ایک مادی شے کے چاروں طرف سے نکلتی رہتی ہیں۔

اب پروفیسر موصوف کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لہریں ایک دوسرے میں ملی ہوئی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ اس طرح اجرام فلکی، ان ملی ہوئی لہروں کی بدولت ایک دوسرے کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہماری زمین پر شمالی اور جنوبی قطب میں مقناطیسی طاقت برابر کی نہیں ہے۔ یعنی نصف کرۂ جنوبی میں قوت مقناطیسی بہ نسبت نصف کرۂ شمالی کے بہت زیادہ ہے۔

بغیر گرمی کی روشنی

یہ چیز ہر شخص کو معلوم ہے کہ آدمی کی پیدا کی ہوئی کوئی روشنی ہو، وہ اپنے جوہر کی ایک کافی مقدار گرمی پیدا کرنے میں خرچ کر دیتی ہے۔ یہ حال بجلی کی روشنی میں بھی پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ جب کرنٹ جاری رہتا ہے تو بلب بھی گرم ہو جاتا ہے مگر فطرت ایسی روشنی پیدا کرتی ہے جو تمام روشنیوں کے برابر ہوتی ہے مگر پھر بھی اس میں گرمی نہیں پائی جاتی۔ سائنس میں اس روشنی کو "سرد روشنی" کہتے ہیں اور یہ روشنی جگنو اور بعض مچھلیوں سے نکلتی ہے۔

حال میں اس سرد روشنی کے متعلق تحقیقات ہونا شروع ہوئی ہے کیونکہ اگر اس کا راز معلوم ہو جائے تو تجارتی نقطۂ نظر سے بہت فایدہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں نے ان کیڑوں کی تحقیقات بھی شروع کی ہے جو سرد روشنی پہونچاتے ہیں اور اس تحقیقات سے بہت کچھ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ فلاڈلفیا کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ای نیوٹن ہاروے نے ایک کانفرنس میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ جگنو کی سرد روشنی، ہوا کی آکسیجن اور ایک خاص مادہ سے ملکر پیدا ہوتی ہے۔ یہ مادہ بعض خاص غدود سے پیدا ہوتا ہے جنھیں فطرت نے اسی کام کے لئے بنایا ہے۔ یہ درحقیقت چھوٹی چھوٹی لالٹینیں ہیں جن میں خاص قسم کے شعاعیں پھینکنے والے شیشے ہوتے ہیں مگر جگنو میں درحقیقت اس قسم کا کوئی ایسا شیشہ نہیں ہے جو شعاعیں پھینک سکے۔

جگنو کی روشنی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے پیدا ہوتی ہے جن کے آگے ECTOPLASM (ایک قسم کا زندہ مادہ) پایا جاتا ہے۔ اس روشنی کے لئے ہوا اور پانی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

کیڑوں کی یہ روشنی خطرہ کا نشان بھی ہے تاکہ دوسرے کیڑے اس کو آکر کھا نہ جائیں، نیز ایک فایدہ یہ

کہ ان کیڑوں کے جوڑے ایک دوسرے کو پہچان کر قریب آجاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اس روشنی سے کیڑوں کی راہ پرواز متعین ہوجاتی ہے۔ بہرحال اگر اس سر روشنی کا راز منکشف ہوجائے تو سال میں کروروں روپیہ کا فایدہ ہر ملک کو ہوسکتا ہے۔

نظریۂ "اضافیت" (RELATIVITY)

پروفیسر انشٹین (PROF. EINSTEIN) کا نظریۂ "اضافیت" (RELATIVITY) بہت مشہور چیز ہوچکی ہے لیکن چونکہ اس کی حقیقت کم لوگ جانتے ہیں اس لئے اس کی تشریح دلچسپ ہوگی۔

اگر تم کسی بچہ کو امرود یا کسی پھل وغیرہ کی ایک قاش دو تو ممکن ہے کہ وہ اُس قاش کو ایک "بڑی" قاش سمجھے لیکن جب کسی دوسرے بچہ کو اُسی کے سامنے پہلی قاش سے زیادہ بڑی قاش دے دوگے تو وہ فوراً سمجھ لیگا کہ میری قاش چھوٹی ہے یعنی "نسبتاً" دوسری قاش کے مقابلہ میں پہلی چھوٹی معلوم ہوگی۔

پروفیسر انشٹین نے یہ بتایا ہے کہ ہماری دنیا میں "حرکت" کا احساس بالکل اضافی و نسبتی چیز ہے یعنی اُس کی رفتار کسی قائم نقطہ سے نہیں ناپی جاسکتی کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی مستقل نقطہ ہی نہیں جہاں سے اُسے ناپا جاسکے۔ ہماری زمین جس پر ہم رہتے ہیں خود اپنے محور پر گھومتی ہے اور یہ "محور" ارتعاش کرتا رہتا ہے۔ علاوہ بریں زمین سورج کے گرد بھی تقریباً ۱۸ میل فی سکنڈ کے حساب سے چکر لگاتی رہتی ہے اور یہ تمام نظام شمسی خلا میں ایک لامعلوم رفتار سے چکر لگاتا ہے۔

فرض کرو ایک آدمی ہے جو ایک متحرک جہاز پر تختہ کے اوپر نیچے چڑھ رہا ہے، پھر وہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرتا ہے جو ایک دوسرے جہاز پر (جو مخالف سمت جارہا ہے) اسی طرح اوپر نیچے اُترتا چڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ہم کو اس حالت میں ایسا کوئی مستقل نقطہ نہ ملیگا جہاں سے کچھ ناپا جاسکے۔

اس لئے پہلی بات یہ ہوئی کہ تمام حرکت صرف حرکت نسبتی ہے۔ انشٹین نے یہ بھی ثابت کیا کہ مختلف اجسام پر جو مختلف رفتار سے حرکت کررہے ہوں وقت یکساں نہیں گزرتا یعنی کسی ایسی چیز پر جو بہت تیزی سے حرکت کررہی ہو ایک گھنٹہ کا اتنا ہی وقت نہیں ہوتا جتنا ایک سست رفتار چیز کے گھنٹہ کا۔ گویا وقت بھی حرکت کی طرح صرف "نسبتی" چیز ہے۔

اس نظریہ کی وجہ سے فلکیات کے بعض ایسے مسائل بھی حل ہوگئے ہیں جو پہلے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ کئی برس ہوئے ایک تجربہ کیا گیا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ایک ستارہ سے آتی ہوئی روشنی

کی شعاع سورج کی قوت کشش کی وجہ سے دب گئی ہے۔

وہ تجربہ یوں ہوا تھا۔ جب سورج آسمان پر موجود نہ تھا تو آسمان کا ایک نقشہ اُتارا گیا اور یہ معلوم کیا گیا کہ بعض ستاروں کی بعض خاص جگہیں ہیں۔ اس کے بعد جب ایک مرتبہ سورج گرہن پڑا تو پھر آسمان کی تصویر کھینچی گئی اور دونوں نقوش کو ملایا گیا ان سے معلوم ہوا کہ پہلے نقشہ میں جن ستاروں کی تصاویر لی گئی تھیں ان کی جگہیں دوسرے نقشہ کی جگہوں سے مطابقت نہیں کرتیں۔ اس سے یہ ثابت کیا گیا کہ جو روشنی ان ستاروں سے آ رہی تھی وہ سورج کی کشش کی وجہ سے دب گئی تھی۔

چوتھا بُعد کیا ہے؟

دُنیا میں تین ابعاد ہیں یعنی طول، عرض اور اونچائی۔ کسی دئے ہوئے نقطہ سے ایک لکیر کھینچی جائے تو وہ "طول" ہوگا۔ کسی چپٹی سطح پر اس لکیر کے زاویۂ قائمہ بنائے جائیں تو مربع بن جائے گا یعنی طول کے ساتھ عرض بھی ہو جائے گا۔ اس مربع کے زاویۂ قائمہ بنائے جائیں تو مکعب کی شکل ہو جائے گی جس میں اونچائی بھی علاوہ طول و عرض کے ہوگی۔ اصولاً اب اس مکعب کے بھی زاویۂ قائمہ بنائے جاسکتے ہیں اور نئی شکل چوتھا بعد رکھنے والی شکل ہوسکتی ہے۔

کوئی نقطہ لو تو ایک دوسرے پر زاویۂ قائمہ بناتی ہوئی دو لکیریں اس نقطہ سے کھینچی جاسکتی ہیں لیکن اگر اسی نقطہ پر ایک تیسری لکیر کھینچنا ہو جو پہلی دونوں لکیروں پر زاویۂ قائمہ بناتی ہو تو اُسے خود کاغذ پر زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے کھینچنا پڑے گا گویا وہ ہوا میں کھڑا ہوا ہے۔ اب اسی نقطہ پر اور ان تینوں لکیروں پر زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے چوتھی لکیر کیسے کھینچی جاسکتی ہے۔ یہ چیز چوتھا بعد ہوگی۔

ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ بُعد ممکن ہے اور اقلیدس کی چار جسامتیں رکھنے والی شکلوں کے متعلق بہت کچھ لوگوں کو علم ہے۔ ڈاکٹر माننگ (DR. MANNING) نے اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ لیکن ہمارے لئے اپنے دماغ میں اس بُعد کی شکل متعین کرنا تقریباً ناممکن ہے البتہ اسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً داہنے ہاتھ کا دستانہ بائیں ہاتھ میں نہیں آسکتا لیکن اگر اُسے اندر سے اُلٹ دیا جائے تو آجائیگا اسی طرح یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ربڑ کا گیند اندر سے الٹ کر چوتھا بُعد بنایا جاسکتا ہے۔

کسی دھاگے میں دو رخ سے گرہ نہیں بندھ سکتی۔ ایک سرے کو دوسرے سرے پر تیسرے رخ

میں اُٹھانا پڑے گا۔ اور ہمارے سہ رخی خلا میں یہ ناممکن ہے کہ ایسے تاگے میں گرہ باندھی جائے جس کے دونوں سرے پکڑلئے گئے ہوں۔ لیکن پروفیسر زولنر (ZOLLNER) نے ایسی گرہیں لگائیں اور اسی وجہ سے اُن کو چوتھے بُعد کا یقین آگیا تھا۔

انشٹین کی رائے ہے کہ وقت، چوتھا بُعد ہے گرحقیقتاً وقت کوئی جسامت نہیں رکھتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "غیب دانی" اسی چوتھے بُعد سے متعلق ہے۔ مثلاً ایک صندوقچہ ہے جس میں انگوٹھیاں رکھی ہیں۔ اب جب تک تمھاری آنکھوں کی سطح کے برابر صندوقچہ رکھا ہے تم ان انگوٹھیوں کو نہیں دیکھ سکتے ہو لیکن اگر تم آنکھیں اُٹھاؤ یا صندوقچہ کو نیچا کرکے اوپر سے اُسے دیکھو تو اندر کی انگوٹھیاں تم کو نظر آئیں گی۔ یعنی تیسرے بُعد کی مدد سے تم وہ چیز دیکھ سکے جو اس سے قبل تم نہ دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح چوتھے بُعد کی مدد سے "بند" کمرہ یا "بند" صندوقچہ کی چیز بھی ہم دیکھ سکتے ہیں، اور اسی کا نام لوگوں نے "غیب دانی" رکھا ہے۔

برف کا پانی کس طرح گرم کیا جائے کہ برف نہ پگھلے

بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ حقیقت ہے اور ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر مل سکے تو بازار سے ایک (BUNSEN BURNER) اور چند فٹ ربڑ کا ٹیوب لاؤ۔ (BUNSEN BURNER) ایک قسم کی گیس آلود ٹونٹی ہوتی ہے جس میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے ہوا کی ایک خاص مقدار اندر آکر گیس سے مل جاتی ہے جب کہ وہ جلتی ہوتی ہے۔ اس طرح سے گیس کے چولھے کی طرح ایک چھوٹا نیلا سا گیس کا شعلہ بن جاتا ہے جو گرم اور نیلا ہوتا ہے۔ اب اُس گیس کے ٹیوب کو اس گیس سے لگا کر جلاؤ۔

ایک (TEST TUBEO) (امتحانی ٹیوب) تقریباً آٹھ انچ لانبا اور نصف انچ چوڑا بھی تمھارے پاس ہونا چاہئے۔ برف کا ایک ٹکڑا نصف انچ چوڑا اور ٹیوب میں آجانے کے قابل لانبا بھی لاؤ۔ کچھ چھوٹی چھوٹی گولیاں بھی ہوں اور (TEST TUBES) کو پکڑنے کے لئے ایک ہینڈل بھی رکھ لو۔

اب اس برف کو ٹیوب میں رکھ دو اور گولیوں کو اُس پر چھوڑ دو۔ پھر اُسے ٹھنڈے پانی سے بھر دو۔ یہ گولیاں برف کو ٹیوب کی تہ میں ہی رکھیں گی اور اُسے پانی کے اوپر نہ آنے دیں گی۔ اس کے بعد (T. TUBES) کو ۴۵ ڈگری زاویہ سے گیس کے شعلہ پر ہینڈل کے ذریعہ سے اس طرح رکھو کہ شعلہ پانی کی سطح سے ایک انچ نیچے ٹیوب کے کنارے پر لگے۔ ٹیوب کی تہ کو جہاں برف رکھی ہے نہ گرم کرو۔ بہتر یہ ہے

کہ شیشہ کو ٹوٹ جانے سے بچانے کے لئے ٹیوب کو شعلہ کے پاس کئی مرتبہ آہستہ آہستہ لیجاؤ۔

اگر اس طرح سے عمل کیا جائے تو تم دیکھوگے کہ پانی کا اوپری حصہ بالکل گرم ہوگیا ہے حتیٰ کہ اس میں سے بھاپ نکل رہی ہے اور نیچے کا حصہ اُسی طرح ہے اور اگر پانی انڈیلو تو برف اُسی طرح صحیح سالم نکل آئیگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹھوس چیزیں (CONDUCTION) کی وجہ سے گرم ہوجاتی ہیں اور رقیق چیزیں (CONVECTION) سے گرم ہوتی ہیں۔ (CONDUCTION یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کو اپنی گرمی منتقل کرنا۔ CONVECTION یعنی رقیق چیزوں کا دورہ) اس صورت میں اُس جگہ سے نیچے جہاں گرمی پہونچائی گئی تھی کوئی دورہ ہوتا ہی نہیں اور اس لئے ٹیوب کے نیچے کا حصہ ٹھنڈے کا ٹھنڈا رہتا ہے۔

زندگی معلوم کرنے کا ایک نیا امتحان

ایک نئی ترکیب کی ایجاد سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ایک درخت، پودہ، پتی یا بیج میں جان ہے یا نہیں زندگی کی دو علامتیں ہیں۔ ایک ہنگامۂ برقی (ELECTRIC DISTURBANCE) اور دوسری علامت کیمیاوی (CHEMICAL SIGN) موخرالذکر کی ایجاد پروفیسر سٹیئر ونے کی ہے۔ پروفیسر موصوف کے مطابق یہ علامت، (CARBON DIOXIDE کاربن ڈائکسائڈ) کا نتیجہ ہے جو ہر جانور میں پایا جاتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ایک آلہ بھی ایجاد کیا ہے جس سے یہ کاربن ڈائکسائڈ معلوم ہوسکتا ہے۔ اس آلہ کا نام انھوں نے بایومیٹر BIOMETER رکھا ہے کیونکہ اُس سے مختلف چیزوں کی زندگی کی مقدار معلوم ہوسکتی ہے۔ اس آلہ کی مدد سے یہ دریافت کیا گیا کہ رگیں سانس لیتی ہیں یعنی وہ ہماری طرح آکسیجن لیتی ہیں اور کاربن ڈائکسائڈ پھینکتی ہیں۔ اسی طرح بیج وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن جب کوئی چیز مردہ ہوجاتی ہے تو پھر کاربن ڈائکسائڈ نہیں پھینک سکتی۔

انسانی ہالہ کیا چیز ہے؟

ہر شخص کے چاروں طرف ایک خاص فضا یا "ہالہ" ہوتا ہے جس سے کچھ دور تک شعاعیں نکلتی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ چیز سر کے چاروں طرف زیادہ دکھائی پڑتی ہے۔

بیرن رشن بیچ (BARON REICHENBACH) نے گزشتہ صدی کے وسط میں اس موضوع پر تحقیقات کی تھی اور ایک کتاب بھی لکھی تھی مگر اس نے شرف قبولیت نہ پایا۔ اُس کے بعد ڈاکٹر کلنر (DR. KILNER) نے اسے اچھی طرح ثابت کیا کہ ہر آدمی کے گرد ہالہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کلنر نے سلائڈ یا پردوں کا ایک سلسلہ تیار کیا جن کی مدد سے یہ ہالہ ہر شخص کے گرد دکھائی دے سکتا ہے۔ تارکول کی قسم کی ایک چیز جسے (DICYANIN) کہتے ہیں آنکھوں کو ایسی تیلی رگیں دکھا سکتی ہے جو عام طور سے نظر نہیں آسکتیں۔ اگر ان سلائڈ کے ذریعہ سے کوئی آدمی دیکھا جائے تو اُس کا ہالہ دکھائی پڑسکتا ہے بشرطیکہ ایک نصف اندھیرے کمرے میں سیاہ دیوار کے پیچھے اُسے کھڑا کر دیا جائے۔

اس دھندلی فضا کی تین تہیں دکھائی پڑیں۔ پہلی تہ ایک سیاہ خاکہ ہوتی ہے جسے ڈاکٹر موصوف نے "ہمزاد آسمانی" ETHERIC DOUBLE کا نام رکھا۔ اس سے دو تین انچ کے فاصلہ پر دوسری زیادہ گہری تہ ہوتی ہے جسے "اندرونی ہالہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور تہ ہوتی ہے جسے "بیرونی ہالہ" کہا جاتا ہے۔

یہ ہالہ، مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں زیادہ بڑھتا ہے اور انسان کے وقتی تاثرات قلبی، دماغی و جسمانی کے مطابق اُس میں کمی بیشی ہوا کرتی ہے۔ بدن کے کسی بیمار حصہ پر جب ہالہ آتا ہے تو اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس ہالہ کی اصلیت ابھی تک پوری طرح نہیں ہوسکی ہے۔

مردہ آدمیوں کے جسم کے چاروں طرف ہالہ نہیں ہوتا جس کے معنی یہ ہیں کہ ہالہ زندگی پر منحصر ہے، جتنی زیادہ قوت انسانی ہوگی اتنا ہی ہالہ جسم سے دور پھیلے گا۔ تجربات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ دونوں مقناطیسی قطب، ہالہ کو کھینچ سکتے ہیں۔ جب آدمی کے بدن میں بجلی لگائی جائے تو ہالہ غائب ہو جائے گا مگر جب کرنٹ ہٹا لیا جائے تو پہلے سے بڑا ہالہ نمودار ہوگا۔ بہر حال اس کے متعلق مزید تحقیقات جاری ہیں۔

آسکر وائلڈ کے خطوط

سارہ کے نام

یورپ کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ نے جس کی زندگی کا انجام بہت المناک ہوا ہے، سارہ برنہارٹ (مشہور ایکٹرس) کو جو خطوط لکھے تھے وہ اپنی انشاؤ ادبیت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ اکٹویو مربونے اس برطانوی شاعر اور دنیا کی اس مشہور ترین عورت کی ملاقات کا اسطرح ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ تھیٹر میں پہلے ایکٹ کے اختتام کے بعد وہ ایک (قہوہ خانہ) میں آئی، اسوقت وہ اپنے تھیٹر کے لباس پر ایک لانبا لبادہ پہنے ہوئے تھی جس قہوہ خانہ میں وہ داخل ہوئی، وہاں اتفاق سے میں اور آسکر وائلڈ پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر سارہ نے خادم سے کچھ طلب کیا۔ اس کی آواز اتنی شیریں تھی کہ ہم دونوں بے اختیار اسی طرف متوجہ ہوگئے جب میں نے یہ دیکھا کہ بولنے والی سارہ ہے تو میں نے اس کا آسکر وائلڈ سے اس طرح تعارف کرایا:-
"سارہ! میں تم سے مشہور برطانوی شاعر آسکر وائلڈ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں"۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقعہ پر وائلڈ نے اس سے یہ کہا تھا۔ "اے خاتون، آپ کی آواز میں کتنا سماوی لحن پوشیدہ ہے"۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، یعنی سارہ تھیٹر کے اسٹیج پر اور ہم دونوں تھیٹر ہال میں اپنی اپنی کرسیوں پر۔

دو برس اس کے بعد جب ان دونوں میں کافی دوستی پیدا ہوگئی تو سارہ نے مجھ سے وائلڈ کی بابت اتنے اشتیاق سے باتیں کیں کہ میں نے اس سے کہا پھر تم اس سے شادی ہی کیوں نہیں کر لیتیں۔ اس نے جواب دیا کہ "یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس سے اس قدر محبت ہے کہ شادی کا ذکر بیکار ہے۔ جب دو محبت کرنے والوں میں شادی ہو جاتی ہے تو محبت ختم ہو جاتی ہے۔ محبت سے زیادہ دوستی پائدار شے ہے، اور محبت کرنے سے زیادہ مشکل چیز دوستی کرنا ہے۔"

سارہ کے مشیر قانونی نے لکھا ہے کہ جیسے ایک اسفنج پتھر نہیں ہوسکتا، اسی طرح آسکر وائلڈ کا دل محبت کرنے کا اہل نہ تھا۔ جیسا کہ اس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے وہ دنیاوی مسایل کے متعلق جو کچھ لکھتا الکل

سارہ کی حسب منشا ہوتا تھا اور درحقیقت زندگی کے بارہ میں ان دونوں کے نظریے تقریباً بالکل ایک تھے۔ کئی برس کے بعد سارہ نے پری برٹن کو ایک خط لکھا کہ میں " جب بھی لندن میں ہوتی ہوں آسکر وائلڈ مجھ پر بہت مہربانی کرتا ہے، وہ اتنی زبردست شخصیت کا مالک ہے کہ اگر وہ کسی سے کہدے کہ میں " آپ سے مل کر بہت خوش ہوا" تو اُس آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خود ملکہ نے اُس سے یہ کہا ہے کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ جن باتوں پر اُس کا اعتقاد نہیں ہوتا انھیں نہایت خوبصورتی سے کہنے کا اُسے اسقدر ملکہ حاصل ہے کہ مجھے یہ یقین کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ میرے ملک کا باشندہ نہیں ہے۔"

وائلڈ اور سارہ میں عرصہ تک خط وکتابت ہوتی رہی اور سارہ نے اُس کے ہر خط کو محفوظ رکھا۔ وائلڈ کے خطوط کے بعض حصے بالکل ترجمہ کرنے کے قابل نہیں ہیں مگر جو خط وکتابت ہوئی ہے وہ عجیب وغریب انشار کا نمونہ ہے۔

وائلڈ لکھتا ہے:-

"ہمارے خیالات بھی ہم سے کس قدر مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا، سڑک پر کسی پرانے دُھن کا گانا، کسی دور کی پہاڑی پر سے ہوا کا جھونکا جو اپنے دامن میں بکاین یا پکے امرودوں کی بو لئے ہوئے ہو یا ماہ اپریل کی بارش بغیر کسی اطلاع کے بھی ان میں وحشیانہ رنگ پیدا کر دیگی۔"

"ایک نیک آدمی (وہ جو دنیا میں "نیک" کہلایا جانا چاہتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے خصوصاً مذہبی آدمی) وہ ہے جو ہر اُس بات پر دھیان دھرتا ہے جسے عام آدمی کہیں اور ہر اُس چیز میں مداخلت کرتا ہے جتنے خوبصورت آدمی کریں۔"

"خوبصورتی کو محض سطحی چیز کہا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ حُسن، دنیا میں سب سے زیادہ لازوال شے ہے، یہی مسرت ایک ایسی چیز ہے جس کو زمانہ کوئی ضرر نہیں پہونچا سکتا۔ فلسفے کے اُصول ریگ کے ذرات کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں، عقائد تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن جسے حُسن کہتے ہیں وہ ایک ابدی مسرت اور غیر فانی ملوکیت ہے۔"

وائلڈ نے سارہ کی ملاقات سے قبل DIVINE SARAH "قدسی سارہ" کا فقرہ اختراع کیا تھا۔ اُس نے اس فقرہ کو مشہور نقاد جولیس لمیٹر کے ایک خط میں اس طرح استعمال کیا تھا۔

"اگر میں بادشاہ ہوتا تو میں اپنی نصف سلطنت، اپنا نصف عصائے شاہی اور اپنا نصف تاج محض "قدسی سارہ" کو جاننے کے لئے بخش دیتا۔ اُسے تمام دنیا سے روشناس کرا دیتا۔"

"اگر لوگ واقعی کبھی محبت کرتے ہیں تو ان میں عورتیں تو کانوں سے محبت کرتی ہیں اور مرد نظروں سے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جو کچھ سنتی ہیں اُس سے مسحور ہو جاتی ہیں اور مرد جو کچھ دیکھتے ہیں اُس سے۔"

آسکر وائلڈ نے اپنی نظموں کی ایک نئی کتاب کے ایک صفحہ میں یہ لکھا تھا:۔

"ان میں سے ایک نظم تمھارے نام معنون کی گئی ہے ۔ تمھارا نام آج اس کو زینت دے رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ ایک دن تمھاری ملکوتی آواز کے نغموں میں ان اشعار کو سنوں گا۔"

"تاوقتیکہ ایک مصنف، نقاش بھی نہیں ہوتا، نقاشی کی صناعیوں کے پراسرار قوانین اُس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر متعدد آرٹ ہیں مگر در اصل آرٹ دنیا میں ایک ہی ہے۔ نظم، تصویر، مجسمہ اور ڈرامہ، ان سب کی روح ایک ہے، جس کو ان میں سے ایک فن معلوم ہے وہ سب سے واقف ہے۔"

جب سارہ برنہارٹ کی شادی اُسی کے تھیٹر کے ایک ساتھی جیکوس ڈیمالا سے ہونے لگی جو ایک یونانی دیوتا کی طرح خوبصورت تھا تو سارہ نے وائلڈ کو ایک خط لکھا کہ اس تقریب پر صرف چند ہی آدمی آنے والے ہیں اور ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ وائلڈ نے لکھا:۔

"کیا یہ صحیح واقعہ ہے کہ تم شادی کر رہی ہو۔ میرے لئے ایک ناممکن چیز پر یقین کر لینا بالکل قدرتی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایک بعید از امکان چیز پر مجھ کو کبھی یقین نہیں آتا۔ میں نے سنا ہے کہ "وہ" بہت خوبصورت ہے۔ اکثر عورتیں اس لئے شادی کرتی ہیں کہ دوسری عورتیں حسد کریں مگر تم ایسا کبھی نہیں کر سکتیں۔ تم معمولی عورت سے کہیں زیادہ بلند چیز ہو۔ تھورو کہتا ہے کہ سچ کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ جو سچی بات کہے اور دوسرا وہ جو اُسے سنے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح تنہا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ روح کی تمام پاکیزگیاں مثلاً مختلف قسم کی قدرتیں اور زبردست جذبات وغیرہ، زندگی میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب دو روحیں ملتی ہیں ان کا اتحاد ہی زندہ طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جس طرح ہر افتراق میں کوئی برائی ہوتی ہے اُسی طرح ہر حقیقی اتحاد میں ایک خوبی ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ عورت کو شادی کرنے میں مرد سے کم خطرہ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد وہ زندگی کو زیادہ سمجھ سکتی ہے۔ شادی اسے زیادہ آزادی بخش دیتی ہے اور خواہ وہ کسی بیمار یا تندرست یا امیر یا غریب سے شادی کرے اُسے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔"

عورتیں تصویر ہوتی ہیں اور مرد معمہ، اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ عورت کا واقعی کیا مطلب ہے تو اُس کی طرف دیکھو، اُس کی سنو نہیں۔

عورتیں بغیر خوبصورت ہوئے بھی دلکش ہو سکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی مشہور ترین عورتوں میں کوئی نہ کوئی جسمانی نقص رہا ہے۔ میڈم رولینڈ اور میڈم اینٹونٹ دونوں کے دانت نہیں تھے۔

گفتگو کا آرٹ یہ ہے کہ وہ چیز نہایت خوبصورتی سے کہی جائے جسے نہ کہنا چاہئے۔

اپنے آپ کو عورتوں میں ہر دلعزیز بنانے کا آرٹ یہ ہے کہ غیر فطری باتوں کو نہایت فطری طریقہ سے کہا جائے یعنی معمولی باتیں غیر معمولی انداز میں کہی جائیں۔ عورت کو اپنی شیشی ادائیں دکھانے کا موقع جتنا خوش کرتا ہے اس سے زیادہ اور کوئی چیز اُسے خوش نہیں کرتی۔

نیک آدمی عموماً غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور اگر وہ نیک نہیں ہوتے تو عموماً دلچسپ ہوتے ہیں انسان یا تو غیر دلچسپ ہوتے ہیں یا دلچسپ۔ دنیا میں یہی دو قسمیں ہیں۔

اگر عورت میں مرد سے زیادہ تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے تو اسی طرح اس میں اظہار مسرت کی بھی اہلیت ہے۔ وہ مسرت جو زیادہ پائدار اور زندگی میں زیادہ مستقل درجہ رکھتی ہے صرف عورت کے لئے مخصوص ہے۔ یہی وہ مسرت ہے جو سب سے زیادہ غیر فانی تصاویر کے چہروں پر دکھائی پڑتی ہے اور یہی وہ راز ہے جس کا کبھی انکشاف نہیں ہوا۔ یہ وہی مسکراہٹ ہے جو پُرانے اطالوی مجسموں کے چہروں پر کھیلتی ہے۔ اور یہ مسرت اکثر اُس عورت کے چہرہ پر بھی دکھائی پڑتی ہے جو اُس آدمی کی اولاد کو گود میں لئے ہوتی ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ ایک مفکر کے نزدیک موت بجائے خود شادی سے کم اہم ہوتی ہے۔ پرانا پودا اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ نئے کو پھولنے پھلنے کا موقعہ ملے زمین پر آنسوؤں کے چند قطرے گرتے ہیں اور اُس میں کلیاں نکل آتی ہیں۔ اس لحاظ سے موت صرف ایک وقفہ ہے۔ لیکن شادی، آنے والی پشتوں کی ایک طویل فہرست کھول دیتی ہے۔ بعض میں تندرستی ذکاوت اور عزت کے الفاظ لکھے ہوتے اور بعض میں بیماری، بدنامی اور حماقت کے۔"

جب ڈنالا سے سارہ برنہارٹ کی شادی ناکامیاب ثابت ہوئی تو آسکر وائلڈ نے اُسے لکھا:-

"تم نے شاید دنیا میں سب سے زیادہ فیاضانہ جذبات سے کام لیا ہے۔ اکثر عورتیں جب شادی کرتی ہیں تم ایسا ہی کرتی ہیں۔ وہ شادی کو ایک ایسے آدمی کی امداد کے لئے بطور اک آلہ کے استعمال کرتی

ہیں - جو اُن کے نزدیک اتفاق سے کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے۔ لیکن مری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ بجائے اُن سے شادی کرنے کے اُنھوں نے اُس کے نام ایک گرانقدر رقم کا چک کیوں نہ بھیج دیا۔ یا کسی نگراں کو کیوں نہ مقرر کر دیا۔ جب میں نیویارک آیا تو مجھے رپورٹروں کی بدولت بڑی پریشانی اُٹھانا پڑی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض خیالی گھوڑا دوڑانے والوں نے جو مجھے مشہور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں یہ خبر پھیلادی کہ میں نہایت نفیس (شب خوابی کا لباس) پہن کر سوتا ہوں۔ اسی لئے جب کسٹم افسروں نے میرے بکس کھولنے کا حکم دیا۔ تو مجھے اُن کے چہروں پر غیر معمولی قسم کا استعجاب معلوم ہوا۔ جب اُن کو کوئی خاص خبر نہ ملی تو اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کسی اور چیز کا نام لینا چاہتے ہو؟ میں نے اس پر یہ جواب دیا۔ "اپنی ذکاوت کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں"۔ اس واقعہ کے بعد اخباروں میں خوب خوب لکھا گیا۔

سارہ برنہارٹ نے دوسرے خط پر یہ تحریر لکھی تھی کہ آسکر وائلڈ کے پچھلے خط اور اس خط میں تقریباً ساڑھے چار برس کا وقفہ گزرا تھا میرے امریکن دورہ کی طرح اُس کا دورہ بھی نہایت کامیاب رہا۔ مگر جب میں یہاں تھی تو وہ وہاں تھا اور جب میں وہاں تھی تو وہ یہاں تھا۔ اُس کے بعد ایک دن مجھ سے اور اُس سے لندن کی ایک سڑک پر ملاقات ہوگئی، پہلے اُسی نے مجھے دیکھا اور کہا خدا کی قسم یہ تو قدسی سارہ ہے، مجھے اُس سے ملکر بڑی خوشی ہوئی اور ہم دونوں دو گھنٹہ تک ساتھ رہے اور دوسرے دن اُس نے مجھے یہ خط لکھا:-

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اُس رشتہ کو بھول جاؤ جو ہم دونوں کو منسلک کئے ہوئے ہے یا یہ کہ اُس کے معنی اور اُس کی قیمت کا احساس نہ رکھو۔ صرف تمھاری ہی وہ ہستی ہے۔ جس کے ساتھ دوستی قایم رکھنے کے لئے میں ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا، جدائی کے اتنے برس کے بعد تمھاری ملاقات سے مجھے بیحد مسرت ہے۔

ہمارے محور انفرادی اور متعدد ہیں، ہم ستاروں کی طرح ایک دوسرے کی زندگی کے افق سے غائب ہوجاتے ہیں مگر خدا کی قدرت اور اُس کی مرضی سے ہم کو کوئی چیز مثل اُن دو چشموں کے جو الگ الگ ہوکر بہتے ہیں۔۔ ایک تو سرسبز و شاداب جنگل سے اور دوسرا ایک کھیت سے۔ اور پھر دونوں ایک بلند قہقہہ کے بعد آکر مل جاتے ہیں، ایک دوسرے کے گلے لگتے ہیں، ایک دوسرے کی تکالیف میں حصہ لیتے ہیں اور پھر ایک ابدی سمندر تک ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔۔ یا مثل اُن دو ستاروں کے جو مخملی رات میں ایک ہی لہر پر ہوتے ہیں۔ اور اپنی سنہری زلفوں کو سپیدۂ صبح سے ملاتے ہیں اور جدا ہوجاتے ہیں مگر ملادیتی ہے۔

اس طرح سے دو مسرور ہستیوں کو کسی جگہ ساتھ چلنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور پھر سڑک کے گھومنے پر اُن میں کا تیز چلنے والا نظروں سے غائب ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد ایک چاند یا سات چاند یا ستر چاند چمکتے ہیں اور پیلے پڑ جاتے ہیں اور ایک روشن گھنٹہ تک خوب روشنی دکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی غیر منضبط نظام کے ماتحت وہ پھر ملجاتے ہیں"۔

آسکر وائلڈ نے ایک پارٹی کا بھی نہایت تفصیل سے تذکرہ لکھا ہے۔ جس میں بعض مشہور شخصیتوں کے عادات وخصائل تفصیل سے لکھنے کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"کل گرینڈ بلوارڈ میں مجھ سے ایک حبشی شاہزادہ سے ملاقات ہوئی اور پھر آج ایک فیشن ایبل ہوٹل میں جہاں میں مدعو تھا یہاں مانٹی کارلو میں اُس سے پھر ملا۔ وہ دلکش آدمی تھا، اس کا جسم چہرہ ایک نہایت خوبصورت ہاتھی دانت کے زیور کے مانند تھا جو موتیوں سے مرصع ہو۔ اور تمہاری آواز کے بعد تمام دنیا میں میں جن لوگوں سے ملا ہوں اُن سب سے زیادہ بہتر اُسکی آواز تھی تمہیں اُس سے ملاقات کرنے کے لئے وہاں ہونا چاہئے تھا۔ اور مجھے یہ تصور ہوا تھا کہ جیسے میں تمکو اُسکے قوی بازوؤں پر وہاں کے بڑے ہال کے اندر ہوا میں دو اجنبی پھولوں کی طرح جھکے ہوئے اور رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

ایک مرد عورت کو یہی سکھاتا ہے کہ اُسے ایک بیوی کیسے بننا چاہئے۔ اور ایک عورت مرد کو یہ سکھاتی ہے کہ اُسے ایک اچھا شوہر کیسے بننا چاہئے"۔

آسکر وائلڈ کی زندگی کا ایک راز تھا جو اُس نے سارہ برنہارٹ کے سوا کسی کو نہیں بتایا اور وہ راز یہ تھا کہ آسکر وائلڈ ایک عورت ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ برنہارٹ کو لکھتا ہے۔

"تم اسے سمجھ جاؤگی کیونکہ تم میں عورتوں کی ایک خاص صفت یعنی سمجھ موجود ہے۔ اور جس طرح میں سونے کی صراحی سے شراب اُنڈیلتا ہوں اُسی طرح تم پر اپنا راز عیاں کرتا ہوں"۔

چنانچہ اُس نے اُس راز کا اُس پر انکشاف کیا اور ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"جب میں بہت چھوٹا تھا اُسی وقت سے اپنی بہن کا لباس پہن کر ہاتھ میں پنکھا لئے ہوئے، ایک طویل آئینہ میں اپنی صورت دیکھا کرتا۔ میں نے اپنے خوابوں میں اپنے آپ کو اکثر جولیٹ کا پارٹ کرتے ہوئے اور کوٹھے پر تاروں کی رُپہلی روشنی اور چاند کی کرنوں میں جو میرے دل میں چمک اور مسرت پیدا کرتی

تھیں اپنے آپ کو رومیو کے آغوش میں دیکھا ہے۔ میری یہ ہمیشہ تمنا رہی کہ کاش میں عورت پیدا ہوا ہوتا عورتوں کو اس دنیا میں مردوں سے زیادہ آرام ہے "

آسکر وائلڈ کی نسبت ابھی تک کوئی صحیح بات نہیں لکھی گئی ہے۔ اُس کے جتنی سوانح حیات ہیں وہ سب اُسکی زندگی کے اہم واقعات پر متفق نہیں ہیں اور جن لوگوں کو اُس سے کماحقہ واقف ہونے کا دعوے تھا وہ بھی اُسکے رازوں اور اُس کی فطرت کو نہیں سمجھ سکے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں آسکر وائلڈ امریکہ گیا۔ اُس زمانہ میں اُس نے برنہارٹ کو ایک خط میں لکھا کہ:۔

" مجھے شہر کے میر نے آبشار نیاگرہ دیکھنے کی دعوت دی۔ جس طرح ایک ملکہ اپنے محل کی چھت پر سے کسی چیز کا معائنہ کرے اور نیچے سڑک پر اُس کی غریب رعایا کھڑی ہوئی ہو اُسی طرح میں نے اُس عظیم الشان آبشار کو دیکھا، بیس یا اُس سے زیادہ رپورٹر میرا فیصلہ سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ کہا کہ حضرات یہ نہایت شاندار منظر ہے مگر ذرا خیال کیجئے کہ اگر پانی مخالف سمت سے بہتا ہوتا تو یہ منظر کتنا زیادہ موثر اور خوبصورت ہو جاتا۔ میئر کو اس پر سخت استعجاب ہوا"

ایک اور خط میں امریکہ کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

" وہاں آبشار نیاگرا ہی صرف ایک قدرتی منظر ہے، ورنہ وہاں جو کچھ بھی ہے وہ اسٹیج کی سینری ہے پھر ظاہر ہے جہاں عمدہ ایکٹنگ ہو وہاں دلکش سینری کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ایکٹنگ اچھی نہ ہو تو البتہ سینری کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایکٹنگ کبھی خراب نہ ہونا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں اس کا اتنا ہی احساس ہوگا جتنا مجھے ہے۔

امریکہ کی عورتوں کے بارہ میں وہ لکھتا ہے:۔

:.... امریکہ کی عورتیں نہایت شوخ، چالاک اور دنیا پرست ہوتی ہیں۔ ان میں حاضر جوابی، پسندیدہ خودداری اور اپنی شخصیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ہمارے طبقۂ امرا کو اتنا پسند کرتی ہیں کہ جمہوریت کے اُصولوں کو بھی نظر انداز کر جاتی ہیں۔

مردوں کو مسرور بنانے میں وہ فطرتاً اور تعلیماً دونوں حیثیتوں سے بہت ہوشیار ہیں۔ ایک امرکین عورت ایک افسانہ، مطلب کی بات بھولے بغیر سنا سکتی ہے اور یہ ترکیب انگریز عورتوں کو ابھی تک اچھی طرح نہیں معلوم ہو سکی۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں دلچسپی کی کمی ہے اور ان کی آوازیں سخت ہوتی ہیں۔ خصوصاً جب وہ پہلے پہل انگلستان آتی ہیں۔ مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ان سایہ پوش جھلاووں سے جو ہماری اعلیٰ سوسائٹیوں

میں آزادی سے محسوس ہوتی ہے۔ اب وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہر چیز کے لئے موزوں بنا لیتی ہے۔ ان میں سے بعض نے تو چند ہی ماہ میں فیشن ایبل انگریزی گانا بھی سیکھ لیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک زمانہ میں کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا اور پھر اسے امن و امان کی حالت میں چھوڑ آیا۔ مگر امریکنوں نے یورپ کو دریافت کرنے کے بعد اُسے اپنی حرکات سے عالم اضطراب ہی میں رکھا۔"

فڈورا (FEDORA) کے مصنف اور سارہ کی محبت کے بعد سارہ کی دوسری محبت کا مشہور واقعہ پیری برٹن (PIERRE BERTON) کے ساتھ اُس کا افسانۂ عشق ہے۔ سارہ کو اُس سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ ایک مرتبہ اُس نے برٹن کو یہ لکھا تھا کہ اور لوگ تو میری زندگی میں ماہ اپریل کی بارش کے ایک چھینٹے کی طرح رہے لیکن تم میرے لئے اتوں سمندر ہو۔ سارہ نے برٹن کی کئی کتابیں اور ڈرامہ شائع کرائے اور پھر اُس نے برٹن کی ایک کتاب کی نقل آسکر وائلڈ کے پاس اس امید میں بھیجی کہ اگر ادب کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم سارہ کی دوستی کی خاطر وہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر دیگا۔ برٹن کے ڈرامہ کے بارہ میں آسکر وائلڈ نے برنہارٹ کو یہ خط لکھا:-

"ستاروں کی آواز رکھنے والی حیرت انگیز ہستی! تم نے پیرس میں جو کاغذات مجھے دئے تھے انکو میں واپس کر رہا ہوں۔ میں نے ان کو نہایت مسرت سے پڑھا ہے، محض اس لئے کہ تم نے اُس پر سانس لی ہوگی، محض اس لئے کہ تمھارے ہاتھوں نے ان کو مس کیا ہوگا اور ان پر تمھاری ملکوتی آواز کی صدائے بازگشت باقی رہ گئی ہوگی، ٹھیک اسی طرح جیسے تاروں کی روشنی سمندر کے تاریک پانی پر رات کی عظمت کا کچھ نشان چھوڑ جاتی ہے۔

میرے خیال میں لوگوں نے ڈو ماریر (DU MAURIER) کی تصانیف پڑھی ہوں گی اور اس بیان کو بھی پڑھا ہوگا کہ "جو شخص حسن اور عقل دونوں کے ساتھ شادی کرتا ہے وہ گویا عقد ثانی کا مجرم ہے۔" انھوں نے وہ صفحہ بھی پڑھا ہوگا جس میں ڈرامہ کی خاتون اُس آدمی سے جسے وہ پسند کرتی ہے یہ دریافت کرتی ہے کہ تمہارے نزدیک میری کیا عمر ہے؟ اور اس کے جواب میں وہ اُسکے غازہ اور پوڈر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ تمہاری عمر مجھے معلوم نہیں مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ جتنی آپ کی عمر ہے اتنی معلوم نہیں ہوتی۔ اس مسودہ میں جسے میں واپس کر رہا ہوں یہ باتیں نہیں ہیں مگر اس میں ڈو ماریر کا یہ خیال البتہ پایا جاتا ہے کہ دوشیزگی عقل کا ایک جزو یا اُسکی ایک حلیف ہے۔" تمھارا آسکر وائلڈ۔

وائلڈ کا دوسرا خط حسبِ ذیل ہے:۔

"مائی ڈیر سارہ برنہارٹ،

میں نے اپنی نظموں کے پروف کے آخری صفحات کو ابھی ابھی صحیح کیا ہے۔ ان نظموں کو یہاں ڈیوڈ بوگ شائع کر رہے ہیں۔ اور جس طرح میرے ایک ڈرامہ کی طرح ان میں سے ایک نظم کے عنوان کو تمہارا نام زینت دے رہا ہے اسی طرح مجھے اُمید ہے کہ تمہاری آواز بھی اپنے ملکوتی نغموں سے اُسے عزت بخشے گی۔ میں نے ناشر کو ہدایت کر دی ہے کہ پریس سے نکلتے ہی کتاب کی ایک کاپی تمہارے پاس بھیج دے اور وہ تم کو اب ایک یا دو ہفتوں میں مل جائے گی۔ تمہارا نام، تمہارا اعلیٰ اور تمہارا پُراثر نام ایک نظم کے مطلع پر اُسی طرح لکھا ہوا ہے۔ جیسے ایک صحرا میں اہرام یا کسی معبد کے دروازہ پر ایک نگہبانی کرنے والا ایک شیر۔ دنیا کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ اشعار تمہاری وجہ سے دماغ سے نکلے ہیں مگر دنیا یہ نہیں جانتی جو میں اب تم سے بتا رہا ہوں یعنی یہ کہ تمہاری ہی نے کتاب کی تقریباً نصف نظموں کو مجھ سے کہلایا ہے اور یہ کہ ان میں سا کی بہترین نظمیں تمہارے نغموں کی صدائے بازگشت ہیں۔

مجھے اس خیال سے مسرت ہوتی ہے کہ میرے گانوں میں جو درحقیقت گانے نہیں بلکہ تصاویر ہیں تم سے زیادہ کسی اور کو ہمدردی نہ ہوگی۔ میری تصنیف پر تمہاری تنقید میرے دلی شکریہ کو الفاظ کی صورت میں ابھاریگا۔ ہمارے کام اور ہمارے مقاصد تقریباً ایک ہی ہیں۔ میں نے اس فیصلہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ صرف ایک شاعر ہی شعر کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ البتہ میرا یہ خیال ضرور ہے کہ صرف ایک مصور ہی آرٹ کا بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ یہ اس سے بہت مختلف چیز ہے۔ اگر کوئی شاعر صرف شاعر ہے تو اُسے قافیہ اور ردیف کے متعلق ہی گفتگو کرنے کی اجازت دینی چاہئے۔ مصورانہ تخلیق کے پُراسرار قانون اُس پر اُسی وقت عیاں ہو سکتے ہیں جب وہ مصور بھی ہو کیونکہ آرٹ متعدد نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہے۔ نظم، تصویر، قطعہ وغیرہ سب ایک چیز ہیں اور جس کو یہ ایک چیز معلوم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں اپنی غزل کا دستخطی مسودہ مع متعدد ترمیمات کے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تم اپنی کاپی میں اس کو لکھ لوگی اور وہ اشعار جن جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اُسے نہ بھولوگی۔ تمہارا دوست آسکر وائلڈ"

"مکرر آنکہ جب میں پیرس آؤں گا تو ہم دونوں جلد ساز کے پاس چلکر غزل کے مسودہ کو کتاب کے ساتھ سرخ رنگ میں مجلد کرا دیں گے۔"

سارہ برنہارٹ نے ۱۸۸۲ء میں جیکوئس ڈمالا سے شادی کر لی، اُس نے وائلڈ کو لندن میں شادی کے موقع

پر شرکت کے لئے لکھا تھا مگر وائلڈ نے شریک ہونے سے مجبوری کا اظہار کیا تھا مگر جب نیویارک پہونچ کر وائلڈ کو اس شادی کی تصدیق ہو گئی تو اس نے ایک خط پھر لکھا :-

"مائی ڈیر لیڈی -

چونکہ موجودہ قانون نے شادی کی حیثیت کو اسقدر بدل دیا ہے کہ ایک آدمی کو اپنی بیوی کے متعلق یہ یقین کرنا کہ وہ اُس کی ہے اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنے لڑکے کے باپ ہونے کے متعلق، اس لئے اب جبکہ تمھارے جلد باز ارادے حقیقت کا جامہ پہن چکے ہیں میں یہ سوچ کر اپنے کو تسلی دے لیا کرتا ہوں کہ تم نے اپنی آزادی نہ کھو دی ہوگی شاید تم نے دنیا بھر سے زیادہ فیاضانہ جذبات کی وجہ سے یہ کام کیا ہے امریکا کی اکثر عورتیں جب شادی کرتی ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ شوہر کی امداد کرتی ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کرنے کے بجائے وہ اس کے نام ایک گرانقدر رقم کا چک کیوں نہیں بھیج دیتیں۔ بغیر شادی کئے ہوئے بھی ایک آدمی کی امداد ممکن ہے۔ اگر دو عورت کی آمدنی میں حصہ بٹاتا ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ عورت مرد کے نام میں حصہ بٹائے۔ یہ وحشیوں کا جنگلی پن ہے۔ امریکن (جیسا کہ وہ کہے جاتے ہیں) فطرتاً غیر مہذب نہیں ہیں بلکہ غیر مہذب ہو گئے ہیں اور یہ امتیاز غور کرنے کی چیز ہے اس براعظم میں ہر انگریز قوم غیر مہذب ہو گئی ہے۔ کناڈا کے رہنے والے فرانسیسی غیر مہذب "ہیں" اس لئے کہ یہاں آنے سے قبل وہ ہمیشہ کسان ہی رہے تھے ...

جب میں بندرگاہ پہونچا تو رپورٹروں نے خود میرا ناطقہ بند کر دیا ایک یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں انڈا ایک طرف سے نیم برشت کر کے کھاتا ہوں یا دونوں طرف سے !- ایک نے یہ دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہو کہ میں اپنے ناخنوں کو اسی طرح رنگتا ہوں جس طرح مکہ وکٹوریہ رنگتی ہیں ؟- ایک دوسرے نے پوچھا "آپ صبح کئے بجے سوکر بیدار ہوتے ہیں ؟" ایک اور نے سوال کیا کہ آپ اپنے غسل خانہ میں کس حد تک گرم پانی پسند کرتے ہیں، اُس نے مجھ سے یہ بھی بتایا کہ اُسے یہ اطلاع ملی تھی کہ میں نہانے سے قبل رنگین عطریات سے پانی کو رنگین کر لیتا ہوں۔ یہ خبر بھی اُڑادی تھی کہ میں نہایت بیش قیمت لیس دار گوون پہن کر سوتا ہوں چنانچہ جب کسٹم افسر میرا سامان دیکھ رہے تھے تو ہزاروں متعجبانہ نگاہیں میرے اوپر پڑ رہی تھیں۔

مکرر یہ کہ ایک مفکر کے لئے موت شادی سے بھی کم اہم چیز ہے۔ پُرانا پودا اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ نئے کو پروان چڑھنے کی جگہ ملے۔ موت کوئی صدمہ کی چیز نہیں ہے حتیٰ کہ اُسے اختلاج قلب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف ایک وقفہ ہے۔ لیکن شادی آنے والی نسلوں کی ایک طویل فہرست

ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے جن میں سے بعض میں تندرستی، ذکاوت اور عزت کے الفاظ لکھے ہیں اور بعض میں بیماری، حماقت اور بدنامی کے۔"

دوسرے سال وائلڈ نے مانٹی کارلو سے دو خط اور لکھے۔ اس اثنا میں وائلڈ اور سارہ دونوں عرصہ تک پیرس میں رہ چکے تھے۔

"مائی ڈیر سارہ۔

تمھارے دونوں خط آج مجھے ملے کیونکہ میں تقریباً ایک ہفتہ سے سینٹ سبسٹین میں تھا اور چونکہ امید یہ تھی کہ ہر روز آجایا کروں گا اس لئے ہوٹل میں اپنے خطوط بھیجنے کا پتہ نہیں دے گیا تھا۔ تمھارے یہاں ملنے کا خیال میرے لئے بہت مسرت کن ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ بھی کی ہوتی تب بھی مجھے اس سے آگاہی ہو جاتی کیونکہ میں یہ دیکھ رہا ہوں تم نے ہر اخبار کو اس معاملہ میں اپنا رازدار بنا لیا ہے۔ کل ایک اخبار نے تمھاری ایک بڑی تصویر شائع کی تھی اور اُسی اخبار میں آج "گسمنڈہ" کے ڈرامہ کی" اور لیڈی آف دی پام " کی حیثیت سے تمھاری جو تصویر مسیحا نے بنائی ہے وہ چھپی ہے میں اس تصویر کو دیکھ کر ہنستا ہوں اور مجھے گنولیو آرڈ کے اس جملہ کا خیال آجاتا ہے کہ "کسی صوبجاتی اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک ہی ایکٹریس کی تصویر دو دن متواتر شائع ہوتے دیکھ کر تو مجھے ایڈیٹر کی بیوی کا خیال آجاتا ہے کیونکہ مجھے بھی شوہر کی بے وفائی کا تجربہ اور اُس کی تکلیف کا اندازہ ہو چکا ہے۔

مسز بجبن کو یہاں آئے ہوئے تقریباً دو ہفتہ ہو چکے ہیں۔ امریکن کالونی کے تمام لوگ پیرس سے یہاں چلے آئے ہیں۔ وہ غالباً تمھاری دعوت کرے۔ میرے سینٹ سبسٹین جانے سے ایک روز قبل اُس نے میرے اعزاز میں ایک ڈنر دیا تھا اور اُس موقع پر ہر غیر مہذب ملک کا کم از کم ایک نمائندہ ضرور موجود تھا۔ امریکہ کے ایک سے زیادہ تھے اور اسپین کے چار یا پانچ۔ اب کی سال یہاں بہت سے اسپینی آئے ہوئے ہیں۔ بڈھا بیرن ــــ اپنے چینی کے برتن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جب اُس نے ہنسنے کے لئے منہ کھولا تو ہم سب کو اُس کی کائنات معلوم ہو گئی۔ پادریوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ اُن کے علاوہ ایک بے تاج کا بادشاہ، چند بے بچوں کی مائیں، چند بے شوہر کی بیویاں، چند طوطے کی سی ناک والی بیوائیں اور ایک ماہر فراست الید یا ماہر امراض الید بھی تھا۔

آج اُس حبشی شاہزادے سے جس سے میں کل گرینڈ بولیوارڈ میں مل چکا تھا پھر ملاقات ہوئی۔ ایلا انگریزی بولنے والے شخص کی زبان سے میں نے اس سے قبل ایسا ترنم ریز لہجہ نہیں سنا تھا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک

گفتگو کرتے رہے۔ اُس کا وطن افریقہ کے مغربی ساحل لیجز میں ہے۔ اُس نے مجھے وہاں آنے کے لئے مدعو کیا ہے اور درحقیقت وہ نہایت پُراسرار ہستی ہے۔ اُس کی بندش الفاظ بہت مکمل اور اُس کا لہجہ نہایت دلچسپ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس سے تم بھی مل لو۔ اُسے فرانسیسی نہیں آتی مگر جو چیز وہ فرانسیسی زبان میں سوچتا ہے اُسے نہایت حسن و خوبی سے انگریزی میں ادا کرتا ہے۔ ایسے موقع پر جب دو شیریں آواز رکھنے والے مجتمع ہوں مجھے ترجمان بننے میں خاص مسرت ہوگی۔ اُس کی گفتگو کا درجہ (CLASSIC) کلاسک کے بعد ہی ہے اور میرے اس پرانے قول کی تائید کرتا ہے کہ اگر "زندگی" شاعرانہ نہیں ہے تو "نحوی" ضرور ہے۔ مثلاً بغیر محبت کی زندگی بغیر "اسار صفت" رکھنے والی زبان کے ہے اور محبت کے ساتھ زندگی اُس زبان کے مشابہ ہے جس میں بہت سے ضمائر ہوں۔ مرد مجرد کی زندگی اُس زبان کی طرح ہے جس میں "علامت" بہت ہی کم ہوں۔ جب کوئی بڑھی دوشیزہ شادی کرتی ہے تو اس کی زندگی سوالیہ اور ندائیہ نکات کا ایک مجموعہ بن جاتی ہے۔ بے شک! اگر زندگی شاعرانہ نہیں ہے تو نحوی ضرور ہے اور اس چیز کو ایک حبشی سے سیکھنا یقیناً ایک اہم چیز ہے۔ "حقیقت" اکثر بے واسطہ ذرائع سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک کسان ایک شاہزادہ کو نہایت اچھی طرح سے اخلاق سکھا سکتا ہے۔ اسپینی بلجیم میں پہلے فرانسیسی زبان کو لے گئے اور ہالینڈ والوں نے اپنی بولی بانٹنے والی گلے سے نکلی ہوئی آوازوں سے انگریزی زبان کو وہ الفاظ دیئے جو اُس کی خوبی کا باعث ہیں، کسی شہر کے پادری وہاں کے عیوب اور بدکاریوں کے متعلق بہترین اسناد ہیں اور جب کسی گرجے کے متعلق کوئی بدنام کن بات مشہور ہو تو اُس کی صحیح اور مکمل تفصیلات ایک طوائف کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

آسکر وائلڈ"

وائلڈ نے دوسرے دن حسب ذیل خط لکھا:۔

"مائی ڈیر سارد ۔ یہاں کے ہوٹل کے منیجر کی بدتہذیبی پر مجھے پھر وہ چیز یاد آگئی جو میرے کل کے خط کا خاص منشا تھا اور اب مجھے یاد آیا ہے کہ تمہارے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔

مائی ڈیر! یہ ہوٹل نہایت ناقابل اطمینان جگہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے کبھی نہ پسند کروگی۔ تم نے جیسا لکھا ہے میں نہایت خوشی سے کمروں کو تمہارے لئے مخصوص کرا لوں گا لیکن اگر تم کو آخر میں آرام نہ پہونچے تو میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اگر تم ادھر اُدھر تلاش کریں تو باوجودیکہ ہر مقام پر آدمیوں کی کثرت ہے لیکن پھر بھی اس سے زیادہ اچھی جگہ مل سکتی ہے۔ یہ نہایت بیہودہ جگہ ہے اور مجھے

یہ خیال کر کے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں آجاؤ اور ہم دونوں ایک ساتھ دیکھ لئے جائیں کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں یہ سمجھنے لگیں کہ ہم بھی اسی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں جس مطلب سے وہ سب آئے ہیں۔ مجھے اپنے آنے سے اطلاع دو۔ میں پلیٹ فارم پر تم سے ملنے اور حتی الامکان تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اکیلی آ رہی ہو۔ تمہارا — وائلڈ"

وائلڈ کو اپنے ڈراموں سے کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ اپنی زندگی نہایت عیش و عشرت سے گزارتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی حقیقی بدنامی سے پہلے ہی لوگ اُس کو بدنام کرنے لگے تھے اسی زمانہ میں اُس نے سارہ کو سب ذیل خط لکھا تھا:—

"میں حال میں خیرات دینے کے لئے لوگوں کے گھروں کو جانے لگا تھا۔ تم اسے غیر ضروری بات تصور کرو گی مگر میں یہ کہوں گا کہ نیکی بے معاوضہ نہیں ہوتی ہے۔ مجھے تو جو بدنامی ہوئی اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل حق بجانب ہے کہ میں گلیوں میں خیرات بانٹ کر کفارہ ادا کروں۔ چنانچہ کل میں ایک ویران مکان کی طرف گیا جو رہنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا اور دروازہ کھٹکھٹا کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ کوئی شخص باہر نکلے اور جو روپیہ میرے پاس ہے اُسے قبول کرے۔ کچھ دیر تک کسی نے مجھے جواب نہیں دیا تو میری توجہ اوپر کی کھڑکی کی طرف منتقل ہوئی جہاں سے ایک بڑھی عورت جس کے صرف ایک دانت رہ گیا تھا کہہ رہی تھی "نہیں - جناب! آپ اپنی روح ہمارے اوپر مسلط کرنے نہ آئیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب آپ آئندہ ہفتہ یہاں آئیں گے تو ایک شخص آپ سے یہ دریافت کرے گا کہ آپ سو بہترین تماشوں کی ایک فہرست تیار کر دیجئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ جواب ضرور دیں گے کہ سو تماشوں کا نام بتانا ناممکن ہے کیونکہ اس وقت تک آپ نے صرف ۱۰ ڈراموں ہی میں کام کیا ہے۔

مائی ڈیر سارہ! کچھ "ہو جانا" معمولی بات ہے مگر کچھ "رہنے" کے لئے سلیمان کی عقل کی ضرورت ہے۔ تمہارا آسکر وائلڈ"

آسکر وائلڈ کے ہر خط میں اُس کی زندگی کے بارہ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا اگر کسی شخص کو اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے نام کے خطوط اشاعت کے لئے دیدیتا کیونکہ اُسے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ خود نہ بدنام ہو جائے چنانچہ آسکر وائلڈ کے خطوط عرصہ تک پوشیدہ رہے۔ اُس کے خطوط کا بھی اُس کے مکالموں اور اُس کی نثر کی

ایک طرح ایک خاص اسلوب بیان تھا۔ وائلڈ کے خطوط اُس کے خیالات کا آئینہ تھے اور ایک مرتبہ اُس کی ماں نے ان خطوں کے بارے میں کہا تھا کہ میں نے وائلڈ کے خطوط پڑھنے کے بعد اُس کے مزاج کو زیادہ اچھی طرح سمجھا ہے۔ وائلڈ نے امریکن مصنف کلائڈ فچ کو جو خطوط لکھے اُس میں ڈرامہ کے ہر پہلو پر بحث کی ہے مگر سارہ برنہارٹ کے نام جو خط ہیں ان میں اُس نے اپنی زندگی پر بحث کی ہے۔ ان خطوں سے اس کے اصلی خط و خال ظاہر ہوتے ہیں۔ سارہ کے نام کے جو خطوط ہیں وہ بہت شاعرانہ ہیں اور اُس کی زبردست شخصیت اور متنوع زندگی پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب سے زیادہ اس کے یہ خطوط اُس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۸۸۷ء میں وائلڈ ایک ماہوار رسالہ "عالم النسواں" (دی وومنس ورلڈ) کا جو لندن سے نکلنا شروع ہوا تھا اڈیٹر ہو گیا۔ اس رسالہ کے بارہ میں خود آسکر وائلڈ نے یہ لکھا تھا کہ "یہ رسالہ آج کل کی تعلیم یافتہ خواتین کے اظہار خیال کے لئے نکالا گیا ہے"۔ اس سلسلہ میں اُس نے سارہ کو بھی ایک خط لکھا کہ وہ بھی رسالہ میں اپنا مضمون بھیجے۔ وہ خط یہ ہے:۔

"مائی ڈیر سارہ — تم اسوقت تک اُس رسالہ کے جس کی میں ادارت کر رہا ہوں دو نمبر دیکھ چکی ہوگی۔ میں نے حکم دیدیا تھا کہ اڈیٹر کا سلام لکھ کر انھیں تمھارے پاس بھیجدیا جائے اور اب وہی اڈیٹر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم نے رسالہ کو کیسا پایا۔ جب تک میں اس رسالہ کا اڈیٹر ہوں یہ پرچہ دور حاضر کی تعلیم یافتہ خواتین کے اظہار خیال کے لئے وقف ہے اور رہیگا۔ مگر ابھی تک بدقسمتی سے یہ گویا تقریباً خانگی معاملہ ہی رہا ہے کیونکہ اس کے کالم بھرنے کے لئے اپنے ذاتی دوستوں ہی پر بھروسہ کئے بیٹھا رہا۔ لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہو سکتا اور میں تم سے کئی مضامین کی درخواست کروں گا۔ تم ڈرامہ کے متعلق جو کچھ بھی لکھو گی اُسے اشاعت کے لئے قبول کر لیا جائے گا۔ اسی طرح تمھاری رنگین داستان کے بھی دو ایک باب نہایت خوشی سے قبول کئے جائیں گے۔ کیا تم میرے لئے سفر امریکہ اور امریکہ کے باشندوں کی نسبت اپنے تاثرات کو ایک مضمون میں قلمبند کر سکتی ہو۔ میری خواہش تو یہی ہے کہ یہ مضمون تمھارے ہی قلم سے ہو لیکن اگر تم اُسے نہ لکھو تو کیا تمھیں اس پر اعتراض ہوگا کہ میں اُسے لکھوں اور تمھارے نام سے شائع کر دوں؟ بہرحال رسالہ کو اُس کے نام کے مطابق شائع ہونا ہے اور اُس کے مضامین نگاروں میں بھی خواتین ہی کو ہونا چاہئے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ تم یہ مضمون ضرور لکھو گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے ناظرین کو امریکنوں کی تعریف پسند نہ ہوگی اس لئے انھیں بالکل مہذب بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل برطانیہ کو اہل امریکہ کی تہذیب سے زیادہ ان کی بدتہذیبی میں دلچسپی ہے۔ تم ان کی فرانسیسی زبان کے بارہ میں مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ اُسکو بھی لکھ دو۔

تم مضمون کا اس طرح افتتاح کر سکتی ہو "کولمبس نے امریکہ کو ایک دفعہ دریافت کیا اور پھر آہستہ آہستہ امن کی حالت میں چھوڑ کر چلا آیا۔ مگر امریکہ والوں نے فرانس ایک دفعہ دریافت کیا اور اُس وقت سے ابھی تک اُسے دریافت کیا کرتے ہیں انھوں نے انگریزی تو سیکھی نہیں اور فرانسیسی بکنا شروع کر دی۔ وہ ہمارے ملک میں اپنے کبھی نہ ختم ہونے والی آمد کی تشریح یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ وہ یہاں اپنی تعلیم کی تکمیل کیلئے آتے ہیں۔ اور ہمیں ان کی باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو اتنے دلچسپ غیر منطقی ہیں کہ جس چیز کے شروع کرنے کی ہمت انھیں اپنے ملک میں نہیں ہوتی دوسرے ملک میں جا کر اُس کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں جو تمہیں اس کا جواب مل جائے گا میں اس معاملہ میں تمہارے اوپر بھروسہ کر رہا ہوں — تمہارا سچا دوست آسکر وائلڈ

وائلڈ نے ۱۸۹۶ء میں حسب ذیل خط لکھا تھا جس ڈرامہ کا اس میں تذکرہ ہے وہ "سالومی" ہے۔

" مائی ڈیر سارہ — میں تمہارے خط کا باوجود اس کے کہ وہ کچھ نہ ہونے کی حد تک مختصر ہے۔ ممنون ہوں تم لکھتی ہو "شاید آپ کارنیوال دیکھنے کے لئے آئیں" میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جہاں گرامر کی رو سے ایک وقفہ کی ضرورت ہے وہاں تم سوالیہ نشان کیوں بناتی ہو۔ واللہ تم بالکل فرانسیسی ہو۔ ہمیشہ اُس چیز کو پیش کرتی ہو جہاں دوسری ہونا چاہیئے۔ میں بھی عادتاً فرانسیسی ہوں مگر چونکہ میں فرانس میں نہیں پیدا ہوا اس لئے شاید مجھے اور کہیں دار الخلافہ چاہیئے۔ ہم لوگوں کا یہ سب تکلف اُس سنہری زنجیر کی کڑی ہے جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ میری اندرونی زندگی کا پردہ اکثر لوگوں نے اُٹھانا چاہا اور پھر یہ معلوم کرکے کہ اُس میں صفات سبعہ نہیں پائے جاتے اپنے ارادہ سے باز آگئے ہیں۔ مگر تم ان چند میں سے ایک ہو جو اُس مقدس جگہ میں داخل ہوئے اور میری روح کے موتی کو ایک جام شراب میں ملا ہوا دیکھا۔ یہاں میرے دن سست گھونگھے کی طرح رینگ رینگ کر آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ میں فرانسیسی زبان میں ایک تماشہ لکھ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جب ہماری پھر ملاقات ہوگی تو تمہارے سنانے کے لئے اُسے مکمل کر چکا ہوں گا۔ افسانہ زمانہ قدیم کا ہے مگر جس چوکھٹے میں میں یہ تصویر لگاؤں گا وہ بالکل نیا ہوگا۔ وہ درحقیقت اس قدر جدید ہوگا کہ اگر اُس پر احتساب نہ کیا جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

ایک مصور کے لئے ماضی بہت کچھ ہے۔ وہ مستقبل کو سائنس کے لئے چھوڑ سکتا ہے۔ اور نقاشوں میں ایک مصور ماضی کی قدر سب سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ کہ تخیل کے اگلے سرے کو حاصل کرنے کے لئے

شاعری کو ماضی کی طرف اشارہ کرنا چاہئے بلکہ ان حقیقت ہے جسے لوگ بہت قیمتی سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری گزشتہ شاعری وعدہ، پیشین گوئی اور تفکر کی شاعری ہے اور ہر معاملہ میں مستقبل کا اشارہ کرتی ہے۔ نیز یہ بھی سمجھتے ہوئے کہ ایک شخص نے جس نے ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی غلطی نہیں کی یہ کہا تھا کہ انگریزی شاعری عنصرِ مستقبل کے لئے پیدا ہوئی۔

میں نے بیسیوں دواوین اُلٹ ڈالے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ماضی سے انھیں کتنا تعلق ہے۔ میرے ذوق کے لحاظ سے وہ نظمیں جن کا تعلق ماضی یا مٹی ہوئی سلطنتوں یا شکستہ محلوں یا ختم شدہ محبت سے ہو دوسری نظموں سے زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔

اسی طرح نثر میں بھی میرا ذوق یہی ہے۔ مجھے تو کسی زمانہ میں سے پرانے فقرے میں تازگی کا ایک ابدی چشمہ نظر آتا ہے اور جب کوئی کتاب الہامی میں یہ پڑھتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ ہوگا۔ تو اس تلخ فرمان میں اُسے جلال بقیہ سے دیکھنے سے قبل ہی ایک ...... انسانی پڑتی ہے، جیسے تلواروں کی ٹیک یا دانتوں کی کٹکٹاہٹ ہو۔

ٹینی سن نے زمانۂ "ماضی" میں بعض نہایت ...... تشبیہات کھینچی ہیں۔ زمانۂ "حاضر" میں تخیل بہت آسانی سے دکھائی جا سکتی ہے۔ پرشوکت آبشاریں نظر آتی ہیں، صحرائی چشمے ابل رہے ہیں، ناہموار پہاڑوں کی وادیوں میں پھول اُگ رہے ہیں۔ غرض اس قسم کی تشبیہات اُس کی تحریر میں بہت زیادہ ہیں۔ مگر یہ سب فطرت کی تصویریں ہیں اور ٹینی سن کی خصوصیت اسی میں ہے۔ یہ تصویر دوسرے کنارہ کو نہیں چھوتی۔ شاعری کا دوسرا کنارہ ایک غیر مرئی چیز ہے۔ جب ٹینی سن کو تخیل کا دوسرا سراہاتھ ل گیا تو پھر زمانۂ "ماضی" ہی کے پروں پر اس نے پرواز کی۔

شاعری کے طلبا کو، اُس کے پیغام کا آخری مقصد معلوم کرنے کے لئے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو استوار، مکمل، وسیع، پرزور، حساس، لچکدار اور ہر موقع کے لئے مناسب ہو۔ یہ بات صاف ہے کہ مستقبل کی ان چیزوں کی شاعری جو ابھی تک ہمارے ذہن میں نہیں آئی ہیں یا اگر آئی بھی ہیں تو اچھی طرح سے نہیں، ان جذبات کے ظاہر ہونے کا زیادہ موقع دیتی ہیں بہ نسبت ان چیزوں کے جو بن چکی ہیں یا جن کی آزمائش ہو چکی ہے کوئی سمجھدار آدمی اس کی تردید نہ کرے گا اور نہ وہ شاعری میں ماضی کیلئے اس غیر مشروط دلچسپی رکھنے کے لئے انکار کرے گا۔

آج کل یونان اور روما میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے متعلق کچھ سننا تکلیف دہ چیز ہے۔ ان کے مستقبل کو سوچ کر بھی ہم میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوتا مگر جب ہم شاعری کے زمانۂ "ماضی" میں ان کی نسبت

جو پڑھتے ہیں تو وہ بہت زبردست چیز معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے "وہ عظمت جو کبھی یونان کی تھی"
"وہ شوکت جو کبھی روم کو حاصل تھی"۔
مائی ڈیر سارہ ۔ مجھے شکستہ مندروں اور گزری ہوئی محبت سے عشق ہے۔ زندگی میں جو لمحات
رہنے کے قابل ہیں وہ وہی ہیں جو بسر کئے جا چکے ہیں۔ تمہارا ہمیشہ پیارا دوست آسکر وائلڈ"

آسکر وائلڈ نے آخری خطوط جو سارہ کو لکھے ہیں ان میں پیرس آنے، چائے پارٹی پر مدعو کرنے وغیرہ کی معمولی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ہر خط میں کوئی نہ کوئی خاص بات ہوتی تھی اس لئے ان میں بھی کہیں نہ کہیں ظرافت کی چاشنی موجود ہے۔

جب رنج و غم نے وائلڈ کو پژمردہ کر دیا اور بقول اسی کے انھوں نے "اسے اپنے دو پاٹوں کے بیچ میں لے لیا" تو وہ خود ہی اپنی تحریروں کے معائب تلاش کرنے لگا۔ گر وہ انجیل کے ان ولیوں کی طرح تھا جن کے گناہ ہی انھیں اس درجہ پر پہونچا دیتے ہیں۔ ایک خط میں اس نے ہیبل اجرس کی تعریف کی تھی جس نے ایک مرتبہ قانون کشش زمین پر چند اشعار لکھے تھے۔ اسی کے آگے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

"یہ اشعار قابل تعریف نہ ہوں مگر ورڈسورتھ الباغیب داں کبھی اس پر توجہ نہ کرے گا کہ سائنس کی ایک کتاب کے لئے چند شیریں مگر بے معنی باتیں لکھدے۔ اس کا آسمان رفیع تر، اس کا میدان وسیع تر اور اس کی نظر عمیق تر ہے۔ شاعر، سائنس سے پہلے رموز فطرت کو سمجھ لیتا ہے اور ورڈسورتھ کے یہ چار اشعار سائنس کی لاکھوں تجربہ گاہوں کے سینکڑوں برس کا کام ہیں:-

"پھول اپنی جگہ پر تیرے سامنے ہنستے ہیں
اور خوشبو تیرے قدموں کے نیچے چلتی ہے
تو ستاروں کو غلطی کرنے سے روکتی ہے
اور پرانے آسمان تیری ہی وجہ سے مستحکم بنے ہوئے ہیں"

"ملٹن بھی، جو شیکسپیر سے زیادہ آرٹ کو سمجھتا ہے ورڈسورتھ ایسی دل آویز ہستی کو نمایاں نہیں کرتا"

جب وائلڈ کا ڈرامہ "سلومی" شائع ہوا تو انگریزی نقادوں نے اس پر اعتراضات کئے اور یہ کہا جانے لگا کہ یہ ڈرامہ سارہ کے لئے لکھا گیا ہے۔ وائلڈ یہ نہیں گوارا کر سکتا تھا کہ اسے ادبی وہ دو سمجھا جائے جو دوسروں کی فرمائش پر انشا پردازی کرتا ہے خواہ وہ فرمائش سارہ برنہارٹ ہی کی ہو چنانچہ اس نے "لندن ٹائمس" کو حسب ذیل خط لکھا

جس کی ایک نقل اُس نے سارہ کو بھی بھیجدی۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے :-

"جنابمن! میری توجہ اُس ریویو کی طرف منعطف کرائی گئی ہے جو آپ کے اخبار میں گزشتہ ہفتہ شائع ہوا ہے۔ میری ایک فرانسیسی تصنیف پر انگریزی نقادوں کی تنقید بہت کم وقعت رکھتی ہے۔ میں آپ کو یہ محض اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس ریویو میں ایک غلط بیانی ہوگئی ہے اُس کی صحت ہو جائے۔ یہ واقعہ کہ دور حاضر کی سب سے زیادہ مشہور ٹریجک ایکٹرس کو میرے اس ڈرامہ میں اتنا حسن نظر آیا کہ وہ اس میں ہیروئن کا پارٹ کرنے پوری نظم کو اپنی شخصیت سے منور کرنے اور میری نثر کو اپنی بانسری کی سی موسیقی عطا کرنے کے لئے بیتاب ہوگئی میرے لئے فخر و مسرت کا باعث تھا اور رہیگا اور مجھے اس بات سے بہت مسرت ہوگی کہ میڈم برنہارٹ پیرس میں جو آرٹ کا زبردست مرکز ہے اور جہاں مذہبی ڈرامے کھیلے جاتے ہیں میرے ڈرامہ کو پیش کریں۔ مگر میرا یہ ڈرامہ اس زبردست ایکٹرس کے لئے نہیں لکھا گیا تھا میں نے کبھی کوئی ڈرامہ کسی ایکٹر یا ایکٹریس کے لئے نہیں لکھا اور نہ کبھی ایسا کرونگا۔ یہ کام ادبی مزدور کا ہے نہ کہ ایک آرٹسٹ کا"۔

نادرات

اس حد تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے نہ صرف وائلڈ کی سیرت اور سارہ کے ساتھ اس کے غیر معمولی شغف کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کی ادیبانہ عظمت و ذہانت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

وائلڈ اپنے طرز بیان کے لحاظ سے ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ یوروپ کی تاریخ ادبیات میں کوئی دوسرا شخص اس کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ آرٹ کا صحیح ذوق اور اسی کے ساتھ قوت نقد۔ ان دونوں کے امتزاج نے اس کے لٹریچر میں ایسی دلکشی پیدا کر دی ہے جو دوسری جگہ نظر نہیں آتی اور غالباً بے محل نہ ہوگا اگر اس کی چند مثالیں قارئین نگار کے سامنے پیش کر دیجائیں :-

محبت کا راز، موت کے راز سے زیادہ عظیم الشان ہے

عورتیں اس لئے بنی ہیں کہ اُن سے محبت کی جائے، نہ اس لئے کہ اُن کو سمجھا جائے

دنیا میں معصومیت سے ترقی پیہ تر کوئی چیز اگر ہے تو صرف حماقت

سوالات میں کبھی حمق نہیں پایا جاتا، لیکن جوابات اکثر احمقانہ ہوتے ہیں

مرد زندگی کو بہت جلد بیان لیتے ہیں اور عورتیں بہت دیر میں - یہی فرق ہے مرد و عورت کا

اگر کوئی خاتون اپنی غلطیوں میں دلکشی پیدا نہیں کر سکتی تو وہ صرف عورت ہے

دُنیا کے بدترین کام ہمیشہ بہترین نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں

ایک بات صرف اس بنا پر صحیح قرار نہیں دیجا سکتی کہ کسی نے اس کے لئے جان دیدی ہے

ہم کرتے ہیں غلطیاں اور اس کا نام رکھتے ہیں "تجربہ"

انسان کی تکمیل اس میں نہیں کہ وہ کیا رکھتا ہے بلکہ اس میں کہ وہ کیا ہے

عورتوں کے سامنے کوئی فلسفۂ حیات نہیں ہے - وہ جذبات پر جیتی ہے اور صرف جذبات کے لئے۔

جب تک جنگ کو بُرا سمجھا جاتا ہے اسکی دلکشی ہمیشہ باقی رہیگی لیکن اگر ہم اسے ذلیل سمجھنے لگیں تو آپ ختم ہوجائے

اگر کوئی شخص اچھا گانا گاتا ہے تو لوگ سنتے نہیں اور جب کوئی برا گاتا ہے تو بولتے نہیں۔

وہ لوگ جو زندگی میں صرف ایکبار محبت کرنے کے قایل ہیں، نہایت سطحی لوگ ہیں۔ جس چیز کو وہ وفاداری و استواری سے تعبیر کرتے ہیں اسے میں ذہانت کا فقدان کہتا ہوں۔

گلاب کے پھول کو دور سے دیکھ کر مسرور ہونا اس سے بہتر ہے کہ خوردبین کے نیچے رکھکر اس کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ شخصیتیں ہی ہیں جو زمانہ کو ہلادتی ہیں نہ کہ اصول

انسانوں کی تفریق میں یہ کہنا کہ فلاں نیک ہے اور فلاں بد، مہمل سی بات ہے۔ انسان دلچسپ ہوتا ہے یا غیر دلچسپ

بعض گانے والے بھی عجیب بیوقوف ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ ایک شخص بہرا ہو جانے کی آرزو کرتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ یہ گونگا بن جائے۔

اس عورت پر کبھی بھروسہ نہ کرو جو اپنی عمر صحیح صحیح بتا دے۔ کیونکہ ایک عورت جو یہ کہہ سکتی ہے وہ کچھ نہیں چھپا سکتی۔

ماضی بھی غیر اہم چیز ہے اور حال بھی۔ کیونکہ ماضی نام ہے اس کا جو لوگوں کو نہ ہونا چاہئے تھا اور حال اُس کا جو نہ ہونا چاہئے۔ اصل چیز مستقبل ہے اور اسی سے ہم کو واسطہ رکھنا چاہئے کیونکہ وہ آرٹ ہے اور آرٹ کی دُنیا۔

آجکل ہر شخص ہوشیار ہے، ہم کوئی جگہ ایسی نہیں ڈھونڈھ سکتے جہاں کسی نہ کسی ہوشیار سے تصادم ممکن نہ ہو۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ امنِ عام میں خلل ڈالنے والی چیز کوئی اور ہو سکتی ہے

ایک انسان کے لئے اس احساس سے زیادہ خطرناک بات کوئی اور نہیں کہ وہ اسوقت تک ہمیشہ سچ ہی بولتا رہا ہے

جس چیز کا نام عدمِ صداقت ہے وہ ذریعہ ہے ہمارے لئے اپنی شخصیت میں تعدّد پیدا کرنے کا

ایک معبد میں ہر چیز کو سنجیدہ ہونا چاہئے سوائے اس کے جس کی پرستش مقصود ہے۔

ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں تمام غیر ضروری چیزیں ضروریات میں داخل ہو گئی ہیں۔

سوسائٹی ایک مجرم و خطاکار کو بخش سکتی ہے لیکن اسے معاف نہیں کر سکتی جو صرف خیالی پلاؤ پکایا کرتا ہے

مصیبت سے ہمدردی کرنا آسان ہے لیکن خیال سے ہمدردی کرنا بہت دشوار ہے

دُنیا میں سب سے زیادہ خطرناک عورت وہ ہے جس سے ہم کبھی سیر نہ ہوں

خلوص ہر حال میں بُرا ہے۔ جب تک تھوڑا ہے خطرناک ہے اور بڑھ جائے تو مہلک۔

وقت کی پابندی، وقت کی چوری کرنا ہے

اگر اُپج خطرناک نہیں ہے، تو اُپج کہلانے کے قابل ہی نہیں ہے

جب کوئی عورت دوبارہ شادی کرتی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ پہلے شوہر سے متنفر تھی اور جب مرد دوسری شادی کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ پہلی بیوی سے محبت کرتا تھا۔ عورت کا دوسری شادی کرنا قسمت آزمائی ہے اور مرد کا خطرہ میں پڑنا۔

مرد چاہتا ہے کہ وہ ایک عورت کی اولین محبت کا موجب قرار پائے، عورت اس سے بہتر چاہتی ہے، وہ مرد کا آخری رومان بننا چاہتی ہے۔ اور یہ اس کی انتہائی ذہانت ہے۔

ہماری سوسائٹی کو جُرم سے اتنا نقصان نہیں پہونچتا جتنا مُجرم کو سزا دینے سے

ایک شادی شدہ مرد کی مسرت کا انحصار ان عورتوں پر ہے جن سے اس نے شادی نہیں کی

دُنیا کو دُنیا بنایا ہے بیوقوفوں نے لیکن اس میں بسنے کے دعویدار ہیں عقلمند لوگ

انسان بجائے خود ایک تکمیل ہے

ادبیات و صحافت میں کیا فرق ہے؟ صرف یہ کہ اُسے کوئی پڑھتا نہیں اور یہ پڑھنے کے قابل نہیں۔

ایک متقی و گنہگار میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ماضی میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ مستقبل میں

عورتیں صرف تصویریں ہیں اس لئے اُن سے لطف اُٹھانے کی صورت یہ ہے کہ انھیں صرف دیکھو اُن کی سنو نہیں

میں بہیمانہ قوت کا تو متحمل ہو سکتا ہوں لیکن بہیمانہ استدلال میری برداشت سے باہر ہے

خوبصورت عورتوں کے بدصورت شوہر حقیقتاً مجرم طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں

سوائے بھلا دئے جانے کے "بھولا دینے سے" یا وہ دلکش کوئی چیز نہیں

لندن میں دو ہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ کہر یا سنجیدہ لوگ۔ لیکن یہ پتہ نہیں کہ کہر نے سنجیدہ لوگ پیدا کئے ہیں یا سنجیدہ لوگوں نے کہر پیدا کیا ہے۔

شادی کی یہ خصوصیت کس قدر عجیب ہے کہ وہ مکر و فریب کی زندگی کو دونوں کے لئے ضروری بنا دیتی ہے

تعلیم اچھی چیز ہے، لیکن کبھی کبھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دُنیا کی کوئی چیز جو واقعی سیکھنے کے قابل ہے کبھی سکھائی نہیں جا سکتی

انتہائی حماقت کا کام وہی ہے جو انتہائی شریفانہ جذبہ سے متعلق ہوتا ہے

جھوٹ کا مقصود صرف دلکشی و مسرت پیدا کرنا ہے۔ اس لئے ایک جھوٹا انسان مہذب سوسائٹی کی بنیاد ہے

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حُسن سطحی چیز ہے۔ لیکن غالباً اس قدر سطحی نہیں جتنا اُن کا خیال

تجدیدِ شباب کی تدبیر صرف یہ ہے کہ انسان اپنی جوانی کی حماقتوں میں پھر مبتلا ہو جائے۔

کتابوں کے متعلق یہ رائے دینا کہ وہ اخلاقی ہیں یا غیر اخلاقی بالکل مہمل بات ہے۔ ان کے متعلق صرف یہی تنقید ہو سکتی ہے کہ وہ اچھی لکھی گئی ہیں یا بُری۔

میں انتخاب کرتا ہوں :۔

اپنے دوستوں کا ان کی خوبصورتی کے لحاظ سے
اپنے ملاقاتیوں کا ان کے حُسنِ سیرت کے لحاظ سے ——— اور
اپنے دشمنوں کا اُن کی ذہانت کے لحاظ سے

میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ میں وہاں پاکیزگی اخلاق پاؤں جہاں مجھے اس کے وجود کی توقع ہی نہ ہو۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ریشم ہاتھ میں لوں اور دفعتاً سوئی چُبھ جائے۔

اگر ہمارے اخلاق پاکیزہ ہیں تو ہمیں لوگوں کو آگاہ کر دینا چاہئے

کہنے کے قابل حقیقتاً وہی چیزیں ہوتی ہیں جنھیں ہم بُھلا دیتے ہیں

جس طرح بعض لوگ صرف آنسو چھپانے کے لئے ہنستے ہیں اسی طرح بعض ایسے بھی ہیں جو اپنا جہل چھپانے کے لئے دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں۔

صدائے بازگشت اکثر و بیشتر اصل آواز سے زیادہ دلکش ہوتی ہے

عورتیں اپنے کان کے بھروسہ پر محبت کرتی ہیں اور مرد اپنی آنکھوں کے اعتماد پر۔۔۔ اگر مرد واقعی کبھی محبت کرتا ہے

خوبصورت ہونا نیک ہونے سے بہتر ہے، لیکن بدصورتی کے مقابلہ میں بہتر ہونا ہی غنیمت ہے۔

وہ بدنصیبیاں جو خارج سے لاحق ہوتی ہیں برداشت ہوسکتی ہیں، لیکن خود اپنی ہی غلطیوں کو بھگتنا سخت تکلیف دہ ہے۔

اپنے دوست کے مصائب پر ہمدردی کرنا تو معمولی بات ہے، ہر شخص کرسکتا ہے، لیکن اسکی کامیابیوں سے ہمدردی کرنا بہت بلند فطرت کا کام ہے۔

وہ شخص جو شادی کرنا چاہتا ہے، اُسے یا تو سب کچھ جاننا چاہئے یا کچھ نہیں۔

زندگی کے سبق ہمیں اسوقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لئے بیکار ہوتے ہیں۔

نوٹس مطابق قانون جدید

نمبر مقدمہ ۱ سنہ ۱۹۳۶ء

بعدالت اسپشل جج درجہ دوم گورکھپور

۱- گنگا بخش ... پسران گیتا رستوار کیدار - کملا پسران دیا دیو ستوار مسماۃ رج رانی زوجہ کیدار - دیونرائن ولد گنگا بخش - نریندر بہادر نابالغ ولد کیدار بولایت کیدار - اودھ بہاری نابالغ ولد کملا بولایت کملا - ساکنان موضع مسول چھ حسن پرگنہ انول ضلع گورکھپور۔ سائلان

ہرگاہ سائلان نے درخواست دفعہ ۴ ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء عدالت ہذا میں ذریعہ جناب کلکٹر صاحب بہادر ضلع گورکھپور گزرانی ہے اور منجانب اپنے بیان تحریری حسب دفعہ ۸ قانون مذکور عدالت ہذا میں داخل کردیا ہے لہذا جملہ اشخاص کو جن کا کوئی پرائیوٹ قرضہ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ متذکرہ سائل / سائلان کی ذات و جائداد کے خلاف ہوئے وہ اندر تین ماہ تاریخ شایع ہونے گزٹ سے اپنا بیان تحریری نسبت اپنے قرضہ کے داخل کریں ورنہ کوئی عذر بعد میں قابل سماعت نہ ہوگا اور درخواست بلغیر حاضری قرضخواہان ایکطرفہ مسموع اور فیصل ہوگی۔

بحکم

آر - ڈی - ورما
منصرم عدالت

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیرفطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دُنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعۂ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائکلوپیڈیا کی ہے قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایکروپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- مادئین کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲) کم

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری۔ شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عگا)

علاوہ محصول

SHAHI

REG.

BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY



SPECIFIC FOR :-
anaemia,,
asthma,,
tuberculosis,,
&
female troubles.,

جملہ اقسام کے یونانی مرکبات
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو

فہرست دواخانہ

مُفت طلب فرماویں

دماغی اور اعصابی کمزوری

کے لئے " شاہی " لاجواب اور دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔
خون کی کمی (انیمیا) کو دفع کرنے اور خون کی افزائش کے لئے " شاہی " کو دنیا کی تمام ادویات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ افزائش خون کے تمام اجزا اس میں موجود ہیں۔
دمہ و کھانسی اور سل و دق کے لئے نہایت مفید ہے۔
عورتوں کے جملہ امراض ہسٹریا (اختناق الرحم) لیکوریا (سیلان الرحم)، عام جسمانی کمزوری کے دفع کرنے میں " شاہی " بیحد مفید ثابت ہوئی ہے۔
مزید معلومات کے لئے مفت رنگین رسالہ مفت طلب کریں

طبی دواخانہ یونانی

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
ٹیلیفون نمبر ۳۶۹۸۳

نگار

نمبر

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمار (۲)	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۳۷ء	جلد (۳۱)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری　　　معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	فروری سنہ ۳۷ء	شمار (۲)

ملاحظات

حال و مستقبل

کوہ آتش فشاں کا اندرونی گھلا ہوا آتشیں مادہ جوش میں آکر دفعتًا باہر نہیں نکلتا۔ جو آبادیاں اس کے دامن میں بستی ہیں وہ جانتی ہیں کہ فطرت کی اس قہرمانی قوت کے ظہور سے قبل کیا کیا علامات رونما ہوتی ہیں۔ پہلے شب کی تنہائیوں میں انھیں گرج کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے ہلکا ہلکا دھواں نکلنا شروع ہوتا ہے، پھر وہ زیادہ کثیف ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک سینہ دہلا دینے والی آواز کے ساتھ جابجا زمین شق ہونے لگتی ہے اور آتشیں مادہ ایک عفریت کی طرح بل کھاتا ہوا باہر ابل پڑتا ہے اور چاروں طرف تباہیاں و بربادیاں پھیلا جاتا ہے۔

اس وقت دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی جوالا مکھی آتش فشانی کے لئے طیار ہو اور اس کی علامتیں روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہوں۔

اس وقت کوئی ملک ایسا نہیں جو امن وسکون کے اعلان میں انتہائی بلند آہنگی سے کام نہ لے رہا ہو لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ پکار جو سینوں سے نکل رہی ہے ان کے اندر کیسا ہیجان برپا ہے اور وہ مایوسی کس قسم کی ہے جو منزل مقصود کے ذکر کے سوا اور کوئی سہارا اپنے پاس نہیں رکھتی۔ گویا پانی نایاب ہے اور صرف اس کا نام لے لیکر پیاس بجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دنیا میں جب امن وسکون کی اشاعت کا دعویٰ نہیں کیا جاتا تھا۔ تو وہ بغیر کوشش کے ہمیں حاصل ہو جاتی تھی اور اب کہ زمانہ کو ہر ہر منطق سے اس کا یقین دلایا جارہا ہے۔ اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

اس سے قبل دسمبر کے نگار میں، مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے سیاسیات یوروپ میں برطانیہ کے پوزیشن کو میں نے واضح کیا تھا اور بتایا تھا کہ جنگ حبش نے یوروپ کے سیاسی توازن کو جو غیر معمولی صدمہ پہونچایا ہے اس سے نہایت سخت بے چینی دول مغرب میں پیدا ہو گئی ہے اور اس نے مستقبل کی جنگ کو ہم سے اسقدر قریب تر کر دیا ہے کہ اس کی زہر آلود گیس کی بو ہم کو محسوس ہونے لگی ہے۔

آج کی صحبت میں، مختصراً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ مغرب کی قومیں ایک دوسری کی طرف دست محبت دراز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کے دل کی دھڑکن کا کیا عالم ہے اور جنگ کے لئے وہ اندرونی طور پر کیا کیا طیاریاں کر رہی ہیں۔

اس وقت یوروپ میں تین سلطنتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سوائے انگلستان کے سب کے متعلق ہمیں یہ علم حاصل ہے کہ وہ کن اصول پر حکمرانی کرنا چاہتی ہیں اور ان کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ روس ملوکیت وسرمایہ داری دونوں کا دشمن اور (NIHLISM) کا حامی ہے اور فرانس کی اشتراکیت پسندی بھی چھپی ہوئی چیز نہیں اسی طرح جرمنی اور اطالیہ کے متعلق یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ وہ سرمایہ داری کے حامی اور ڈکٹیٹر شپ کے قایل ہیں۔ لیکن برطانیہ عظمیٰ ہی ایک ایسی سلطنت ہے جس کے متعلق ہم کو آجتک نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی حکومت کس نوع کی حکومت ہے اور اس کا منتہائے نظر کیا ہے۔ بادشاہ کا وجود وہاں ضروری، لیکن ملوکیت کا پتہ نہیں، پارلیمنٹ اور نیابت وانتخاب وغیرہ سبھی کچھ موجود مگر جمہوریت کا کہیں نشان نہیں، کابینہ میں صرف وزیر اعظم ایک ایسی ہستی ہے جو تمام نظم ونسق پر حاوی ہے مگر ڈکٹیٹر شپ سے اظہار بیزاری۔ سرمایہ داری پر اسکی تمام طمطراق ارسٹاکریسی قایم، لیکن مزدور جماعت کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے ہر وقت طیار۔

الغرض حکومت برطانیہ اس وقت تمام دنیا کی سلطنتوں میں بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو مذہبی دنیا میں "لاادریت" والوں کی ہے اور اسی لئے یوروپ میں جب کوئی ہنگامہ سیاسی ہلچل پیدا ہوتی ہے تو برطانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کا ساتھ دے اور کس کو چھوڑ دے اور [illegible] کا نباہنا دشوار ہے

جنگ حبش کے دوران میں اس نے چاہا کہ اطالیہ اور حبش دونوں کو خوش رکھ سکے اور نتیجہ اس کے بالکل برعکس یہ نکلا کہ حبش اور بحیرۂ روم دونوں جگہ سے اس کا اقتدار اٹھ گیا۔

جرمن کے مقابلہ میں برطانیہ بظاہر ہمیشہ فرانس کی طرف مایل رہا لیکن جس وقت جرمنی نے حدودِ فرانس پر ارضِ ممنوعہ کی طرف قدم بڑھایا تو فرانس کا کوئی احتجاج برطانیہ کی رگ اخوت میں حرکت نہ پیدا کر سکا۔ بالشیوک اصول سے جو نفرت برطانیہ کو ہے، کسی سے مخفی نہیں لیکن اس سے تجارتی بھائی چارہ قایم کرنے میں اس نے مطلق پس و پیش نہیں کیا۔ الغرض دول یورپ میں برطانیہ کا پوزیشن سب سے نرالا واقع ہوا ہے اور اسی لئے اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہاں کسی اور ملک کو نہ ہونا چاہئے، لیکن جب اس کی کوئی توقع باقی نہ رہے تو پھر اس کی مشکلات کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد آیندہ خطرہ جنگ کو ضعیف کرنے کے لئے دو چیزیں پیدا کی گئی تھیں۔ ایک لیگ اقوام اور دوسرے اسلحہ بندی کی روک تھام۔ یعنی خاص خاص ملکوں کو ایک خاص حد تک اسلحہ و سامان حرب رکھنے کی اجازت دیجائے اور اگر کوئی نزاع باہم پیدا ہو جائے تو اس کا تصفیہ لیگ کے ذریعہ سے چاہا جائے۔ اگر ان تحریکوں میں تمام سلطنتیں واقعی نیک نیتی سے حصہ لیتیں تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون بڑی حد تک دوبارہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ہر سلطنت اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنا چاہتی تھی اور ٹھیک اسی وقت جبکہ وہ ہاتھ میں "نشترِ فصاد" کی نمایش کر رہی تھی، آستین میں دشنہ لئے ہوئی تھی، اس لئے یہ تحریک مطلق کامیاب نہیں ہوئی۔ پہلی ضرب اس کو جاپان نے پہونچائی اور رہا سہا اقتدار اس کا مسولینی نے مٹا دیا۔

بالکل یہی حال (DISARMAMENT) کی تحریک کا ہوا کہ کسی قوم نے بھی اس کے قایم کردہ حدود کا احترام نہ کیا اور ہر سال طیاری اسلحہ کا بجٹ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اب دنیا کی تقریباً وہی حالت ہوگئی ہے جو ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم سے قبل پائی جاتی تھی[1] اور آہستہ آہستہ تمام ممالک اسی نقطہ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں

---

[1] روس کی سرخ افواج کی تعداد تیرہ لاکھ تک پہونچگئی ہے کیونکہ بھرتی ہونے کی عمر اکیس سے انیس سال کر دی گئی ہے۔ اسوقت کم از کم ۵۰۰۰ ہوائی جہاز اس کے پاس ہیں اور دس ہزار ٹینک (دبابہ)۔ جرمنی کی عسکری قوت سات لاکھ سپاہ تک پہونچگئی ہے اور ایک ہزار سے زیادہ جنگی ہوائی جہاز اس کے پاس موجود ہیں اور ۸۰ کرور پونڈ سالانہ اس کا فوجی خرچ ہے۔

فرانس نے چند ماہ کا عرصہ ہوا اپنے فوجی مصارف ۸۰ کرور تک بڑھا دئے ہیں۔ اطالیہ کی فوجی قوت کا صحیح علم نہیں ہے لیکن ایک سال قبل مسولینی نے بیان کیا تھا کہ دس لاکھ مسلح سپاہ اس کے پاس موجود ہے۔

جاپان کا فوجی بجٹ ۱۹۳۲ء کے مقابلہ میں اب دو چند ہے اور امریکہ نے اس سال سات کرور تیس لاکھ پونڈ اور زیادہ اپنے فوجی بجٹ میں منظور کئے ہیں۔ اسی طرح برطانیہ کے فوجی مصارف میں پانچ کرور انتی لاکھ پونڈ کا اضافہ ہوا ہے۔ الغرض اس وقت بہ نسبت ۱۹۱۴ء کے تمام ممالک کا فوجی خرچ پانچ گنا زیادہ ہوگیا ہے۔

جہاں پہونچکر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوجانا ناگزیر ہے۔

اسلحہ وسامان حرب کے متعلق سب سے زیادہ پابندی جرمنی پر عاید کی گئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی نے سب سے زیادہ اس کی خلاف ورزی کی اور اب نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ یا تو کھلم کھلا اس سے دوستی کے تعلقات قایم کئے جائیں یا پھر "ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گو،" پر عمل کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ جنگ میں جرمنی کے بہت سے مستعمرات اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، لیکن یہ بھی جرمن قوم کی جرأت وہمت کا اعجاز ہے کہ نچے ہوئے پر وبال کی جگہ پھر نئی کلیاں پھوٹ آئیں اور اس میں پہلے سے زیادہ قوتِ پرواز عود کر آئی۔

نہ صرف اندرونِ ملک میں بلکہ ہر جگہ جہاں اس کا قبضہ ہے غیر معمولی حرکت وعمل نظر آتی ہے اور اس نے سب سے زیادہ جس قوم کو مشوش بنا رکھا ہے وہ برطانیہ ہے۔

بحر شمال کے سواحل پر (ساحل انگلستان سے صرف ۵۰ میل کے فاصلہ سے) جرمنی کے متعدد جزائر پائے جاتے ہیں اور ان میں ہر جگہ ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ فوجی طیاریاں عمل میں آرہی ہیں — جزائر JUIST, NORDERNEY اور WANGEROOG میں استحکامات قلعہ بندی اور ہوائی جہازوں کی فرودگاہ بنانے کے لئے لاکھوں ٹن کنکریٹ بچھائی جارہی ہے۔ اسی طرح جزیرۂ SYLT میں ڈنمارک کی سرحد تک قلعہ بندیوں کا کام نہایت وسیع پیانہ پر تکمیل کو پہونچ رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مقام یوروپ کا سب سے زیادہ وسیع ومستحکم مرکز بحری وہوائی قوت کا بننے والا ہے۔ اسی کے ساتھ جو اور اندرونی طیاریاں تمام آبادی کو اسلحہ بند فوج بنانے کی ہو رہی ہیں اور جس دیوانگی وبیدردی کے ساتھ سامان حرب، زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی طیاری پر روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس تاریک وہولناک مستقبل نے دنیا کو لرزہ براندام بنا رکھا تھا وہ اب دور نہیں ہے اور کسے تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہ اچانک کسی وقت سامنے آجائے۔

جرمنی کے علاوہ یوروپ کے اور ممالک بھی اس آنے والی "قیامت" کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام ممکن ذرایع سے کام لے رہے ہیں، چنانچہ روس، فرانس اور اطالیہ کی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ جنگی طیاریوں ہی میں صرف ہو رہا ہے اور یہی حال مشرق میں جاپان کا ہے۔

دول یوروپ میں برطانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے بجائے اسلحہ کے ہمیشہ اپنی تدبر ودلیسی پر زیادہ اعتماد رکھا، لیکن کب تک ؟ آخر کار وہ بھی مجبور ہوگیا کہ سیلاب کا رخ دیکھ کر اپنی رفتار بدلدے۔ چنانچہ وہاں بھی بحری وہوائی طاقت کو بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور زہریلی گیس سے بچنے کے لئے نئے انداز کے لباس

ومکان طیار کئے جا رہے ہیں۔

یقیناً برطانیہ جنگ مستقبل کے اندیشہ کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو بھاری بھرکم ظاہر کرنے کے لئے وہ کبھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لایا، لیکن اب کہ تلوار کی دھار ہڈی تک پہونچتی نظر آرہی ہے، منہ سے چیخ کا نکل جانا ناگزیر ہے اور ہاتھ پاؤں ہلانا لازم۔

مسٹر لائڈ جارج نے جو تقریر حال ہی میں بہ مقام ناٹنگھم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کس خطرۂ عظیم کے مقابلہ کا سوال انگلستان کے سامنے ہے۔

مسٹر لائڈ جارج نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ :۔ "حالت بہت نازک ہے اور نازک تر ہوتی جارہی ہے اور اسی لئے باوجود ضعف وانحطاط کے مجھے باہر نکل آنا پڑا تاکہ اپنی رہی سہی قوت ملک کی خدمت کے لئے وقف کردوں۔ اب وقت صاف صاف کہنے کا ہے اور اس لئے مجھے کہدینا چاہئے کہ جن تلخ حقیقتوں سے اٹلی اور جرمنی کو دوچار ہونا پڑا ہے، انھیں کا مقابلہ ہمیں بھی کرنا ہے اور اگر ہم نے غیر معمولی ہمت وجرأت سے کام نہ لیا، تو کامیابی کی کوئی توقع نہیں"۔

اسوقت دول یوروپ میں ایک دوسرے کے ساتھ جو معاہدے ہو رہے ہیں وہ امن وسکون سے زیادہ پامنی کے امکانات اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ ایک طرف جرمنی اور آسٹریا کا باہمی معاہدہ (جس میں یقیناً اطالیہ بھی شریک ہوگا)، دوسری طرف روس اور زیکوسلوکیا کا۔ تیسری طرف برطانیہ کی یہ کوشش کہ وہ یوروپ کے مخالف سیاسی عناصر سے ساز باز بھی رکھے اور کسی کا ساتھ بھی نہ دے۔ ان سب نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا آیندہ نقشۂ جنگ کی صورت کیا ہوگی۔ آسٹریا، جرمنی اور اطالیہ اگر خود اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار نہ ہوئے تو اس میں شک نہیں کہ اشتراکی حکومتوں کے لئے اس میں سخت خطرہ پنہاں ہے اور فرانس مجبور ہوگا کہ وہ روس کے دامن میں پناہ لے۔ لیکن، روس کی معیت جس نے زیکوسلوکیا سے صرف اس لئے معاہدہ کیا ہے کہ جنگ کے وقت اسے اپنی ہوائی طاقت کا مرکز قرار دے، کبھی برطانیہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بلقان کی تمام ریاستوں کے اندر بھی اختلاف پیدا ہوگا اور بالکل وہی نقشہ سامنے آجائے گا جو گزشتہ جنگ عظیم کے وقت پیش آیا تھا۔ الغرض یوروپ کا کوئی ملک ایسا باقی نہ رہیگا جو جنگ میں حصہ لینے پر مجبور نہ ہوا ہو۔ اس طرح عالمگیر ہلاکت وخونریزی بالکل یقینی ہے۔

پھر چونکہ کسی ملک کی آبادی اس کے لئے تو آمادہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے، اس لئے ہر سلطنت اندرونی انقلاب کی طرف سے بھی خائف ہے، اور بالکل ممکن ہے کہ اس طرح تمام دنیا میں اشتراکی لہر دوڑ جائے۔

یہ تو ہوئے وہ حقایق وواقعات جن کی بنا پر آیندہ جنگ کا واقع ہونا لازم خیال کیا جاتا ہے اور جسکی طیاری میں ہر ملک مصروف ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جو رد بلا کے امکانات پر غور کر رہی ہیں اور موجودہ سیاسی اُلجھنوں کے اسباب کو سمجھکر ان کے دفع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم اہل مذہب کی جماعت ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہونچی ہے نہایت عجیب وغریب ہے۔

اس کے نزدیک موجودہ اضطراب کا سبب نہ اقتصادی دشواری ہے، نہ تجارتی حرص وطمع، نہ ضرورت سے زیادہ صنعتی پیداوار سے بے چینی پیدا ہوئی ہے نہ اس بات سے کہ آدمیوں کی جگہ مشینوں نے لیکر انھیں بیکار بنادیا ہے، بلکہ اس کا تنہا سبب ان کی رائے میں دہریت والحاد ہے اور انجیل مقدس کی پیشین گوئی کی بنا پر وہ اس جنگ کو ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ نزولِ مسیح کی یہی علامت انھیں بتائی گئی ہے۔

بہر حال آیندہ جنگ کا سبب مادی ہو یا روحانی، دہریت والحاد ہو یا نزولِ مسیح، ہے بالکل اٹل اور اس بلا کا ایک بار اور دنیا میں نازل ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک دنیا سے بلند وپست اور نشیب وفراز کے دھبے نہ مٹیں گے امن وسکون کا دور کبھی نہ آئے گا۔

ایک خاص اطلاع نگار کے اجراء کو پندرہ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس سال سے سولھواں سال شروع ہوتا ہے۔ اس دوران میں تقریباً پندرہ ہزار صفحات، قارئین نگار کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور اگر آپ پورے فایل کو دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں نصف سے زاید صفحات میرے دماغ وقلم کا نتیجہ ہیں۔ یقیناً یہ کوئی معجزۂ ادب وانشا نہیں ہے اور دنیا میں متعدد ہستیاں ایسی موجود ہیں جو اس سے زیادہ طویل فردِ عمل اپنے پاس رکھتی ہیں، لیکن شاید اس سے انکار ممکن نہ ہو کہ عمر وزمانہ کے مقابلہ میں کبھی نہ کبھی انسان کو سپر ڈالدینا ہی پڑتی ہے اور قوا کا اضمحلال نسبتاً زیادہ آرام وسکون چاہتا ہے۔

ہر چند بحمد اللہ ابھی تک نہ مجھے اپنے قوا ظاہری سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے، نہ دل ودماغ ادائے فرض سے قاصر نظر آتے ہیں، لیکن بہر حال اسوقت کا آنا ناگزیر ہے جب یہ سب کچھ ہوکر رہیگا اور ایک ایسے شخص کی ضرورت نگار کو ہوگی جو اس کی قایم کردہ روایات کو پیش نظر رکھکر اُسے کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔

چنانچہ کچھ عرصہ ہوا میں نے اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی صاحب میرے ساتھ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو اطلاع دیں۔ اس کے جواب میں متعدد حضرات نے اپنی خدمات پیش کیں، لیکن جو خصوصیات میں چاہتا تھا وہ کسی ایک میں بھی نہ تھیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جلیل الرحمان صاحب اعظمی سے ملاقات ہوئی اور ان کے اکتسابات علمیہ ورجحانات ذہنی میں بہت سے "امکانات" مجھے نظر آئے۔

اعظمی صاحب عربی و فارسی کے فاضل ہیں اور ان دونوں زبانوں میں ماہرانہ و ادیبانہ نظر رکھتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ صحافت کے لئے جس خاص ذوق کی ضرورت ہے وہ بھی ان میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لئے میں اسے فال نیک سمجھتا ہوں کہ نگار کو ان کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں اور اس طرح اب میں بعض ان اہم تصانیف کی طرف متوجہ ہو سکوں گا، جو عرصہ سے میرے پیش نظر ہیں اور جن کی تکمیل کی فرصت مجھے نصیب نہ تھی۔

ہر چند اعظمی صاحب "مذہبیات" کے باب میں میرے ہمنوا نہیں ہیں تاہم آزادی کے ساتھ سوچنے کا میلان ان میں پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچیں جو میرے سامنے ہے۔ بہر حال جب تک وہ میرے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے طیار نہ ہوں نگار کے اس حصہ سے انھیں کوئی واسطہ نہ ہوگا اور تمام اس نوع کے مباحث خواہ وہ ملاحظات میں درج کئے جائیں یا باب المراسلہ و باب الاستفسار میں میرے ہی قلم سے ظاہر ہوں گے ۔

باب الانتقاد کو میں زیادہ وسیع کرنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اس مقصد کی تکمیل میں مجھے ان سے زیادہ مدد ملیگی ۔ اسی کے ساتھ وہ علمی، ادبی مضامین بھی لکھیں گے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں میں میرا ہاتھ بٹائیں گے ۔

اعظمی صاحب کے جتنے مقالے ہوں گے وہ انھیں کے نام سے شایع ہوں گے، اور جو میرے قلم سے ہوں گے ان پر حسب دستور سابق کسی کا نام نہ ہوگا۔

آیندہ ماہ میں شواعر العرب کے عنوان سے ان کا ایک ادبی مقالہ شایع ہوگا اور اس کے بعد بھی ہر مہینے ان کے مفید و دلچسپ مضامین نگار میں درج ہوتے رہیں گے ۔

سُنّی علما کرام سے جنوری ۱۹۳۶ء کے نگار میں جو مقالہ مسئلۂ خلافت و امامت پر شایع ہوا ہے وہ شیعی نقطۂ نظر سے ایسا صاف و روشن مقالہ ہے کہ اگر اسکو سامنے رکھ کر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی اُلجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اٹھایا ہے اور جس خصوصی انداز کے دلایل پیش کرنیکی پابندی میں نے عاید کی ہے اس نے گفتگو کی نوعیت کو بالکل بدل دیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہونچنے کے لئے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہ گئی ہے یعنی یہ کہ سنی علمار کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیقات پیش کریں ___ میں خود اسوقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک فریق ثانی کو اظہار خیال کا موقعہ نہ دیا جائے، اس لئے امید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد توجہ فرمائیں تا کہ جولائی تک مجھے بھی اظہار خیال کا موقعہ مل سکے ۔

مذہب کی شکست علم کے مقابلہ میں

تاریخ مذہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کا وجود بہت کچھ ماحول اور اقوام عالم کے امیال و عواطف سے متعلق رہا ہے، کوئی چاند سورج کو پوجنے لگا کوئی آب و آتش کو۔ کوئی دیوتاؤں کے روبرو سربسجود ہوا، اور کوئی سنگین مجسموں کے روبرو۔ کوئی مافوق الفطرت ہستی کے روبرو جھک گیا، اور کوئی غیر معمولی شخصیت کے روبرو۔

پھر چونکہ ہر گروہ کا یہ عقیدہ ہوتا کہ صرف میری ہی عبادت کا طریقہ صحیح ہے اس لئے ہر مذہب کا پیرو اپنی اپنی طرف مختلف طریقوں سے انسانوں کو کھینچنے لگا۔ لالچ کے ذریعہ، قید و بند کے ذریعہ، قتل و خونریزی کے ذریعہ، غرضکہ دھوکے و فریب کا کوئی پہلو، جہالت و شقاوت کا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ اپنے اپنے معتقدات کی ترویج و اشاعت میں بقدر ہمت حصہ نہ لیا ہو۔ یہاں تک کہ [illegible] انسانوں نے اپنی اپنی جداگانہ سلطنتیں قائم کرلیں۔ مذہب عقیدت کے اس خیال میں کہ جس قدر انسانوں کو ہم اپنے مذہب کا پیرو بنالیں گے اسی قدر ہمارا دیوتا یا خدا ہم سے خوش ہوگا۔ بے شمار انسانوں کا خون بہایا گیا اور بہایا جاتا ہے۔ اور دنیا اور اہل دنیا ہزار ہا سال سے انھیں آلام و مصائب میں مبتلا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی کا نام تہذیب و صداقت ہے۔

اس اختلاف شدید نے ایسا گروہ پیدا کردیا، جو کہنے لگا کہ دنیا میں بجز مادہ کے کوئی حقیقت نہیں، نہ باطنی زندگی کا کوئی وجود ہے، نہ روح کا۔ بلکہ یہ سب انسانوں کے قائم کردہ حدود ہیں، جو کہ بالکل اعتباری [illegible] ہیں۔ نیز یہ کہ یہ تمام باتیں اعتبارات کے تحت میں ہیں۔

چنانچہ ارسطو نے ایک کلیہ قائم کیا جو نہایت پرشکوہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ:

"تماشہ گاہ فطرت میں جو مختلف صورتیں نظر آتی ہیں، یہ حالات و کیفیات [illegible] حالات و کیفیات [illegible] تو صورت و شکل میں بھی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ [illegible] کا ایک غیر منقطع سلسلہ [illegible] حیوانات سے ہوتا ہوا انسانوں تک پہونچا ہے۔ اور [illegible] اسی طرح قسم بہ قسم تبدیلی ہوتی ہوئی یہ انضمام کبھی ختم نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد فلسفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کا جو یہ غیر منقطع سلسلہ قائم ہے [illegible]

یہ از خود پایا جاتا ہے، اور اس لئے مذہب کا وجود توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔

زینو ایتھنز کا ایک نامور حکیم جو قبرس یا فنیشیا سے یونان کے پایۂ تخت میں آکر رہنے لگا تھا، اس کا فلسفہ یہ تھا۔

"جس طرح ہمیشہ آبشار کی ایک ہی صورت رہتی ہے لیکن جس پانی سے وہ مرکب ہے وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مادہ کا ایک سیل ہے جو ہر وقت و ہر لحظہ بہتا رہتا ہے، اور اسی لئے کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تغیر ہے۔ ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ ایک غیر مرئی جوہر کے وجود میں کوئی شبہ نہیں مگر اس میں کلام ہو کہ ایک ایسا شخصی یا ذاتی خدا موجود ہے جو انسانی صورت رکھتا ہے، اور جو بات سے لبریز ہے وحی و الہام کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں جس شئے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے، اسے ایک غیر معلوم علت کا معلول سمجھنا چاہئے۔ کائنات ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے اور نظام کی رگ و پے میں جو طاقت جاری و ساری ہے جہلا اسے خدا کہتے ہیں۔"

اپیمینڈا (؟) کی رائے ہے کہ ممکن ہے کہ تمام فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں جس سے ہم ان کی جانچ کر سکیں۔

دیمقراطیس کہتا ہے کہ "حقائق بھی ہمارے ذہن میں تیقن کا اقتضا نہیں کر سکتے۔"

پیرو کی رائے ہے کہ "چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں، اس لئے ہمیں ہر شئے کی نسبت کے اظہار رائے میں تامل کرنا چاہئے۔"

زنوفینز کا دعویٰ ہے کہ "یہ ناممکن ہے کہ ہم حق بات کا بھی یقینی تصور کر سکیں۔"

پارمینائیڈیز کا قول ہے کہ "انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔" چنانچہ اس فلسفہ سے جماعت متشککین کی بنا پڑ گئی، اور خیال کیا جانے لگا کہ ہم کوئی دعوے نہیں کرتے۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعوے کرتے ہیں۔

اپیکورس اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دیا کرتا تھا کہ حق کا انکشاف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔

آرسیسیلیس کو معلومات یقینیہ و [illegible] دونوں سے انکار تھا۔

ارسطو نے اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دی کہ "اور [illegible] ہستی کہیں ایک قسم کا [illegible] تعلق ہے جس کا اثر انسان کے نظام [illegible] پر مترتب [illegible] ہے۔"

فیثاغورث فرقہ کے لوگ یہ کہتے تھے کہ کوئی چیز یقینی نہیں ہو سکتی کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا۔ کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا، تو اسے حسیہ [illegible] دیں، تو اسے عقلیہ [illegible] رہیں، اور [illegible] ملتا [illegible]۔

غرضکہ یونانی فلسفہ جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ تھا کہ انسانی حواس کی شہادت ناقابل اعتبار ہے، اس لئے ہم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت نے ملک میں آگ لگا دی، اور تشکیکین کا ایک علحدہ مذہب قایم ہو گیا۔

برخلاف اسکے مذہبی فلاسفروں کی ایک جماعت نے جو گویا علم کلام کی بانی تھی۔ ایک جدید مذہب "فلسفہ اشراقیہ جدیدہ" کے نام سے اسکندریہ میں قایم کیا۔ اس مذہب کا مدعا یہ تھا کہ ایمان و عقل میں توافق پیدا کیا جائے۔ خدا کی ہستی کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ناممکن تھا، لہذا فلسفہ اشراقیہ جدیدہ کے بانیوں نے مکاشفے کے مسلک کو رواج دیا۔ یعنی حصول علم خارجی اشیاء کے ادراک سے ناممکن ہے، البتہ یہ تجلا النفس و تزکیۂ باطن سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں مسیحی دنیا کے بڑے بڑے علما و فلاسفہ اس نکتے کے حل کرنے میں منہمک تھے کہ نظم عالم کس طرح اور کیونکر چل رہا ہے؟

غرضکہ ایک طرف مذہب عیسوی میں توہم پرستی کا زور تھا، اور دوسری طرف فلسفیانہ عقائد کی نشر و اشاعت کا غلبہ۔ قسیسی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل اور مذہب و فلسفے میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا، جنھوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔

چوتھی صدی عیسوی میں جب مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی و ضروری ہو گئی، اور احکام کا نفاذ بزور شمشیر ہونے لگا۔ اس سے کلیسا کا زور بڑھ گیا۔ مشہور مورخ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں قسیسی عہدوں پر جاہلوں اور عامیوں کے مامور ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی۔ وحشی و بے علم جماعت جو علم و فلسفے کی دشمن تھی مجالس مذہبیہ کی صدر کی گویا مالک تھی، اور جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر مذہب کو جھوٹ بولنے سے، یا دغا و فریب کرنے سے کوئی فائدہ ہو سکتا تھا تو اس حال میں بھی سب کچھ جایز تھا۔

اسی کے ساتھ ایسی عدالتیں بھی قایم ہو چکی تھیں جو ملزم کے خطا وار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ انواع و اقسام کی جسمانی ایذاؤں کے ذریعہ سے کرتی تھیں، اور اس فیصلہ کو منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ چھ سو سال تک ان عدالتوں کے معیار حق سمجھنے کا یہ طریقہ رہا کہ ملزم کو آگ میں ڈالکر تحقیق کیا جاتا تھا کہ یہ گنہگار ہے یا بیگناہ؟۔ یا پھر اس کو تالاب میں ڈالدیا جاتا تھا کہ اگر یہ قصوروار ہے تو ڈوب جائے گا ورنہ بچ رہیگا۔ یا پھر لوہے کی سرخ دہکتی ہوئی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں دیجاتی تھی کہ وہ اس سے بچتا ہے یا نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرھویں صدی عیسوی سے چاروں طرف بداعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ یہاں تک کہ

صرف ایک کثیر گروہ اس امر پر متفق ہو گیا کہ جس چیز کا نام مذہب ہے وہ صرف اغلاط و اوہام کا مجموعہ ہے۔ جب اس محکمہ نے ہوا کا رُخ پھیر بدلتے دیکھا۔ اس نے ملاحدہ و زنادقہ کی چپے چپے اور گوشہ گوشہ میں سراغ رسانی کرا کے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ چند سال کے اندر تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں، جن میں سے بتیس ہزار نفوس کو زندہ جلا دیا۔ اس مجلس تعذیب نے یہ سب کچھ حکومت برقرار رکھنے کے لئے کیا تھا۔

چوتھی لٹیرن کونسل منعقدہ ۱۲۱۵ء کے فیصلے نے اس محکمہ کے اقتدار میں ایک اور خوفناک اضافہ کر دیا۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنی پوشیدہ سے پوشیدہ بات اور اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف اپنے حلقے کے پادری کے روبرو کیا کرے۔ چنانچہ حلقے کے پادری کو یہ قدرت حاصل ہو گئی کہ خاوند و بیوی آقا و ملازم کے خانگی راز بھی معلوم کر لیتا تھا۔ اس سے جاسوسی کا ایک اچھا خاصا محکمہ قائم ہو گیا۔ اور اس آڑ میں معصوم و خاطی ہر شخص کو طرح طرح کی ایذا پہونچائی جانے لگی۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ قانون جو نافذ ہے مذہبی قانون نہیں ہو سکتا۔ اور یقیناً کلیسا پاکیزگی و تقدس سے منزلوں دور ہو گیا ہے۔ اس گروہ نے تذکرۂ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی۔ اور تذکرۃ الغفران سے مراد یہ عقیدہ تھا کہ مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کہ جس قدر خون باقی ہے وہ صلیب پر گرا تھا وہ پاپائے روم کے ترکے میں ملا ہے۔ تاکہ اس نجات کی دستگیری ہو۔ تذکرۃ الغفران سے مطلب معصیت پر خط عفو کھینچنے کے لئے مغفرت کا نسخہ فروخت کیا جاتا تھا۔ بعض ان تبرکات کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو بوسہ دینے پر مجبور کرتے تھے اور پھر ان سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ بعض اشتہار دے کر روپیہ کثیر حاصل کرتے تھے۔ غرضکہ طرح طرح سے لوگوں کو اس وہم پرستی کی طرف مائل کیا جاتا تھا اور جو کوئی اس کے خلاف آواز اٹھاتا تھا تو اس کا سر کچل دیا جاتا تھا چنانچہ ... وقت دو دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا گیا۔ حبس دوام کی سزاؤں اور شکنجے کی ایذاؤں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

لارنٹ جو انکویزیشن کا مورخ تھا، لکھتا ہے کہ ٹارکوئی میڈا اور اس کے شرکا نے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس اشخاص کو زندہ جلایا۔ چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی صورتیں بنا کر جلائیں۔ اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو مختلف سزائیں دیں۔ نیز چھ ہزار قیمتی و کارآمد کتابوں میں آگ لگا دی۔ اکثروں کو ملک بدر کر دیا۔ اور بہتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا۔ جنھوں نے انکار کیا ان کو سزائے موت دی گئی۔ یہودیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو جلا وطن کیا گیا۔ بہت سے یہودی اٹلی، افریقہ، اور ٹرکی چلے گئے۔ اور اکثر بے یار و مددگار خوف کی وجہ سے ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے۔ غرضکہ نوع انسانی پر وہ وہ بلائیں نازل کی گئیں جن کا بیان کلیجوں کے ٹکڑے اڑا دیتا ہے۔

حضرت مسیح کی ولادت سے چار سو سال قبل یونان علم و حکمت کی طرف مائل تھا۔ اور قدیم مذہب کے خیالات ان کے دلوں سے محو ہو رہے تھے۔ فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کے مقابلہ میں اولمپس کے دیوتا انھیں حقیر و ذلیل نظر آنے لگے۔

قدیم روایات جو قرنہا قرن سے رائج چلی آتی تھیں اور جن کی صداقت خوش عقیدہ لوگوں کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی تھی عجیب و غریب تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جزائر بحر روم عجائبات سے آباد ہیں۔ یعنی وہاں جادوگر جادوگرنیاں، دیو، بھوت، چڑیلیں، پردار سانپ، نصف انسان اور نصف گھوڑے کا دھڑ رکھنے والی بلائیں۔ اور یک چشم عفریت آباد ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کے متعلق عام خیال تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے۔ جس میں سب سے بڑا دیوتا جیوپیٹر دوسرے دیوتاؤں اور ان کی بیویوں کے حلقے میں دربار کرتا ہے۔ اور آسمانی آبادی جذبات بہیمہ و اعمال سیئہ میں انسانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ جب یونانیوں کو جہاز رانی، جغرافی اکتشافات اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے جہاز بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم نیز ان کے قرب و جوار کے سمندروں کا گشت کرنے لگے۔ تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں تو کوئی عجیب الخلقت چیز موجود نہیں ہے اور جب زیادہ تجسس سے کام لیا گیا تو انہیں کا سرے سے وجود ہی نہ ملا۔ مگر محکمۂ احتساب عقاید نے ان متشککین کے شبہات پر لامذہبیت کا فتویٰ دے دیا۔ ان کا مال ضبط کر لیا۔ اور ان کو جلا وطن کر دیا۔ کیونکہ مذہبی گروہ کا یہ دعویٰ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزارہا برس سے مانتے چلے آتے ہیں وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب مخالف شہادت اسقدر زبردست ہو گئی کہ جس کا جواب مذہبی لوگوں کے پاس نہ تھا تو ان کے خیالات میں بھی تزلزل پیدا ہونے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جس عقیدے کا پابند ہوتا ہے، تو اول اول اس کو حرمت کی نظر سے دیکھتا ہے، مگر اس کے بعد جب انسانی دماغ کچھ ترقی پذیر ہوتا ہے تو اس میں شبہات و شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں اس کے بعد تاویل کا دور آتا ہے، اور پھر انکار کا۔ چنانچہ فلاسفہ و مورخین کے ساتھ ساتھ شعرا و انشا پردازوں کے خیالات بھی تبدیل ہونے لگے۔ یورپیڈیز پر فاسد العقیدہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ یہ ڈرامہ نویس تھا اور ہر مضمون کا خاتمہ حسرت و یاس پر کیا کرتا تھا۔ یہ فلسفہ و طبیعیات میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ اسے شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی اور یہ ارسطو کے زمرۂ احباب میں سمجھا جاتا تھا۔

اسقلس کفر بکنے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ یہ بھی ایک مشہور و معروف ڈراما نویس تھا یہ بعض جنگوں میں بھی شریک کیا گیا تھا، اور غالباً اس کی شرکت اس لئے ضروری سمجھی جاتی تھی کہ اس کی طرز نگارش نہایت زود اثر تھی۔ الغرض اس عقلی ہلچل کے آثار ادب و انشا کے ہر شعبے میں نظر آنے لگے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محسوس کرنے لگے کہ انسانوں کے پاس حق و صداقت اور نیکی و بدی کا کوئی معیار نہیں

جو ایک ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے وہی بات دوسرے ملک میں بُری خیال کی جاتی ہے گویا اچھائی برائی محض اعتباری چیز ہے۔ اب یونان کی حالت بالکل بدل گئی، اور ان کی آزاد خیالی پولٹیکل معاملات میں بھی حصہ لینے لگی اور آئے دن کی خانہ جنگیوں سے یونان تباہ ہونے لگا۔ ایرانی رعونت کی قربان گاہ پر یونانی مقاصد کی قربانی کی جانے لگی۔ یونان کا جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو ایران کا باجگزار بننے سے انکار کر دیا لیکن ایشائی یونان اس کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ ایران یورپین یونان کو ہمیشہ ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن جب کبھی ایران نے یونان پر فوج کشی کی ہمیشہ شکست ہوئی۔ اس لئے کہ یونان کا یورپین حصہ نہایت جنگجو و بہادر تھا۔ اس لئے ہر چند ایران اپنی دولت کے ذریعہ سے ایشیائی یونان کو گرویدہ کر چکا تھا لیکن سکندر یونانی کی جرأت کا وہ حریف نہ بن سکا یہاں تک کہ کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آ گیا اور اس طرح یونانیوں کی دماغی ترقی میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے بابل کی شہر پناہ کو دیکھا جس کا دور ساٹھ میل سے زیادہ تھا، اور جو باوجود تین صدیاں گزر جانے کے ابھی تک قایم تھی۔ بعل بک کے سر بفلک مندر کے کھنڈر دیکھے جو زبان حال سے پکار پکار کر اپنی گزشتہ شان و عظمت کا حال بیان کر رہے تھے۔ وہ رصدگاہ دیکھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار ہیئت داں راتوں کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشن و تابناک ہستیوں سے ہمکلام ہوا کرتے تھے۔ معلق باغات کو دیکھا۔ اور اُن کلوں کو دیکھا جن کے ذریعہ ان میں پانی پہونچایا جاتا تھا غرضکہ دنیائے ایشیا کے عجائبات دیکھ کر یونانی سائنس کو بہت تقویت پہونچی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسکندر نے جو شہر اپنے نام سے بسایا وہ آگے چلکر علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور علمی تحقیق کا سمندر موجیں مارنے لگا۔

ارشمیدس نے کرہ اور استوانہ کی ماہیت پر کتابیں لکھیں۔ زینو نے حقیقت مطلق کے ادراک کی مشکلات پر بہت کچھ لکھا۔ اقلیدس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سے، دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا اس نے نہ صرف ریاضی کی شاخوں پر لکھا، بلکہ علم الاصوات، اور علم مناظر و مرایا پر بھی بعض رسائل لکھے۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیا کے توازن سے مرکز ثقل پر بحث کی۔ ایک آتشی شیشہ ایجاد کیا جس سے سایرا کیوز کے محاصرے میں اس نے اہل روما کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا۔

ان تمام علمی ترقیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے عقائد کافور ہونے لگے۔ اولمپس کی پر اسرار چوٹیوں سے دیوتا غائب ہو گئے۔ ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پردۂ تصور سے محو ہونے لگا۔ ایشیائے کوچک کے سبز صحراؤں، سایہ دار نشیمنوں، اور بہتے ہوئے دریاؤں سے دیوتا اور دیویاں رخصت ہونے لگے۔ روایات الہام کا اثر مٹ گیا۔ یورپین علم الاصنام کے افسانے۔ ایشیائی الہامات کی روایتیں، مصری کاہنوں کے قدیم عقائد ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ اسوقت تک مذہب کے ذریعہ سے جو معلومات انسان کو حاصل ہوئی تھیں یہ تھیں کہ خدائے قیوم

ایک نہایت شاندار قوی الجثہ انسان کے مشابہ ہے۔ زمین مسطح ہے جس پر آسمان ایک شاندار گنبد کی طرح قائم ہے، یا بقول سینٹ اگسٹائن چھلنی کی طرح کھنچا ہوا ہے۔ آسمان پر چاند، سورج اور ستارے اس غرض سے متحرک ہیں کہ انسانوں کو شب و روز روشنی پہنچتی رہے۔ زمین اس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا تھا، ان تمام حیوانات و نباتات کے جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ بہشت آسمان کے اوپر ہے۔ اور دوزخ زمین کے نیچے ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے۔ اور باقی تمام اجسام فلکی و غیر فلکی اس کے تابع ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا ہے۔ اول اول وہ تنہا تھا، مگر بعد میں اس کی ایک پسلی سے عورت کو بنایا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے مگر فردوس میں شجر ممنوعہ کھا کر اس نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی اس بنا پر اسے محنت و مشقت اور موت کی سزا دی۔ مگر آدم کی اولاد کو اس سے کچھ عبرت نہ ہوئی، اس لئے خدا نے مجبوراً اس کے تباہ کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور پانی کے ایک طوفان عظیم کے ذریعہ سے جس میں پہاڑ تک غرق ہو گئے انسانوں کو ڈبو دیا۔ جب یہ طوفان سب کو غارت کر چکا تو ایک ہوائے تند چلی جس سے پانی خشک ہو گیا۔ اس آفت سے حضرت نوح اور ان کے تین بیٹے ہام سام اور یافث مع اپنی بیویوں کے کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو آباد کیا ہام نے افریقہ کو اور یافث نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت پادری صاحبان کے الہام ربانی میں کچھ نہ تھی، اس لئے وہاں کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات علمی کے مقابلہ میں ان روایات کو دنیا کس طرح تسلیم کر سکتی تھی۔ آخر کار مذہب کو علم کے سامنے شکست کھانا پڑی اور رفتہ رفتہ اس کی جگہ عقل نے لے لی۔

امام اکبر آبادی

انقلابی

ماسٹر گبرائیل اینڈرسن اسکول کے باغ کے کنارہ تک گیا اور وہاں پہونچکر سوچنے لگا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے دور فاصلہ پر دو میل کے قریب ، خاالص برفیلے کھیت پر درختوں کی شاخیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے کسی سفید چادر میں نیلی لیس ٹانک دی گئی ہو۔ دن بہت خوشگوار تھا سفید برف اور باغ کے لوہے کے جنگلہ کی سلاخوں پر سبز رنگ کی جھلک نظر آتا تھا ۔ ہواؤں میں وہ لگاوٹ تھا جو صرف موسم بہار میں پایا جاتا ہے۔ اینڈرسن نے جنگل میں چہل قدمی کے لئے اپنے قدم اس نیلی لیس کی طرف موڑ دیئے۔

"میری زندگی میں دوسری بہار" - اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے اور اپنے چشمہ کے شیشوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اینڈرسن کی طبیعت میں جذباتی شاعری پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ پشت پر رکھے ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اُسے باغ کے دوسری طرف سڑک پر سواروں کی ایک جماعت دکھائی پڑی۔ ان کی بھوری سیاہی مائل وردی سفید برف میں بالکل الگ نظر آرہی تھی۔ اینڈرسن بہت متعجب تھا کہ یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں کہ یکایک ان کا مقصد اُس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ کسی مکروہ کام کے لئے نکلے ہیں۔ یہ خیال کسی خاص بنا پر نہیں بلکہ ایک اندرونی تحریک سے اُس کے دل میں آیا۔ کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ ہونے والا ہے اور اسی تحریک نے اُسے مجبور کیا کہ وہ سپاہیوں سے پوشیدہ ہو جائے۔ وہ جلدی سے بائیں طرف گھوما، گھٹنوں کے بل جھکا اور برف پر رینگتا ہوا ایک گھاس کے گٹھے تک پہونچ گیا جس کے پیچھے سے وہ اپنی گردن اُٹھا اُٹھا کر یہ دیکھ سکتا تھا کہ سپاہی کیا کر رہے ہیں۔

سپاہی تعداد میں بارہ تھے۔ ان کا افسر ایک جوان آدمی تھا جو خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا اور کمر میں ایک چمڑے کی پیٹی لگی تھی۔ اُس کا منھ اتنا سرخ تھا کہ اینڈرسن نے دور سے اُس کی آگے نکلی ہوئی مونچھوں اور ابروؤں کی سفیدی مائل چمک کو اُس کے جلد کے رنگ کے مقابلہ میں دیکھ لیا۔ اُس کی بھاری آواز کا شکستہ لہجہ اُس جگہ صاف سنائی پڑ رہا تھا جہاں ماسٹر چھپا ہوا لیٹا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کس کام کے لئے آیا ہوں ۔ مجھے کسی کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے " افسر نے چلا کر کہا اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اد سپاہیوں میں کسی کی طرف دیکھا ۔ " رہ تو سہی بتاؤں گا تجھے کہ باغی ہونے کا کیا مزہ ملتا ہے ۔ سور کہیں کا "

اینڈرسن کا دل اچھلنے لگا ۔ " اللہ توبہ !" اس نے خیال کیا ۔ " کیا یہ ممکن ہے ؟" وہ اپنے سر میں سردی محسوس کرنے لگا ، گویا ٹھنڈک کی ایک لہر آکر ٹکرا گئی ہو ۔

" افسر صاحب !" ایک خاموش ، تھمی ہوئی مگر صاف آواز سپاہیوں کے حلقہ سے آئی " آپ کو کوئی حق نہیں ہے —— عدالت یہ فیصلہ کر سکتی ہے —— آپ جج نہیں ہیں —— یہ صاف قتل ہے ۔ نہ کر —— "

" چپ !" افسر گرج کر بولا ۔ اُس کی آواز غصہ کے مارے بیٹھی جا رہی تھی ۔ " میں تمہارے لئے عدالت قایم کئے دیتا ہوں ۔ " آلو نو ! آگے جاؤ "

اس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا اور آگے بڑھ گیا ۔ اینڈرسن نے یہ بھی دیکھا کہ گھوڑا اپنے راستہ پر کیسی ہوشیاری سے چل رہا تھا اور اس کے قدم ایسی نزاکت سے اُٹھ رہے تھے گویا ناچ کے لئے اُٹھائے جاتے ہوں اور اُس کے کان ہر آواز سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے ۔ سپاہیوں میں اُس وقت تھوڑی دیر کے لئے ایک تباہی پیدا ہو گئی اور پھر وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہوئے ۔ ان کے پیچھے تین آدمی کالے کپڑے پہنے رہ گئے جن میں دو لانبے تھے اور ایک بہت پستہ قد اور دبلا ۔ وینڈرسن چھوٹے قد والے آدمی کے سر کے بال دیکھ سکتا تھا ۔ یہ بہت ہلکے تھے ۔ انڈرسن نے اُس کے کان بھی دیکھ لئے ۔

اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے ۔ لیکن یہ بات اس قدر غیر معمولی اور خوفناک تھی کہ اُسے یہی خیال ہوا کہ وہ شاید خواب دیکھ رہا ہے ۔۔

" کتنا صاف مطلع ہے ! کتنا خوبصورت —— برف ، کھیت ، جنگل آسمان ۔ ہر چیز پر بہار چھائی ہوئی ہے ۔ مگر پھر بھی لوگ قتل ہونے والے ہیں ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ناممکن !" اس کے خیالات پریشان ہو گئے اور وہ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرنے لگا گویا یکایک اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے

یہ تینوں آدمی جنگلے کے پاس ایک دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے تھے ، دو تو بالکل ہی قریب تھے اور ایک کچھ دور تھا ۔

" افسر !" ان میں سے ایک شخص ناامیدی کے لہجہ میں بولا —— اینڈرسن یہ نہ دیکھ پایا کہ وہ کون تھا " خدا ہم سب کو دیکھ رہا ہے —— افسر !"

آٹھ سپاہی، اپنی تلواریں بھدے طریقہ سے پکڑے فوراً گھوڑوں سے اُترے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں اور چوری سے کوئی کام کر رہے ہیں۔

کئی سکنڈ خاموشی میں گزر گئے جس کے بعد سپاہی، ان سیاہ پوشوں سے چند فٹ کے فاصلہ پر قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ان کی طرف نشانہ باندھا۔ مگر اس وقت ایک سپاہی کی ٹوپی سر سے گر پڑی۔ اُس نے اسے اٹھا کر برف صاف کی اور پھر اُسے پہن گیا۔

افسر کا گھوڑا ابھی تک ایک جگہ ناچ رہا تھا۔ اُس کے کان اُسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے گھوڑے بھی جن کے تیز کان ہر آواز کو سننے کے لئے اُٹھے ہوئے تھے، اپنی جگہ پر خاموش کھڑے انھیں سیاہ پوشوں کو دیکھ رہے تھے۔

"کم از کم بچے کو تو چھوڑ دو" ایک دوسری آواز یکایک فضا میں گونجی۔ "پاجی۔ بچہ کو کیوں مار رہا ہے۔ اس نے کیا قصور کیا ہے؟"

"آتو لو! جو کچھ میں نے تمھیں حکم دیا ہے وہ کرو" افسر نے اس طرح چلا کر کہا کہ دوسری آواز اسمیں گم ہو گئی، اس کا چہرہ سرخ فلالین کی طرح لال بھبوکا ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ایسا منظر دکھائی پڑا جو اپنی شقاوت میں انتہائی وحشیانہ اور نفرت انگیز تھا۔ ایک تو سیاہ پوش نے بچوں کی طرح ایک چیخ نکالی اور ایک طرف گر پڑا۔ مگر فوراً ہی دو یا تین سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ لڑکا ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور دوسرے سپاہی دوڑ پڑے۔

"اُو۔ اُو۔ اُو۔ اُو" لڑکا چیخنے لگا۔ "مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ او۔ او" اس کی چیخ ہوا میں اس طرح گونجنے لگی، جیسے کسی ذبیحہ کی چیخ جو پوری طور سے ہلاک نہ کیا گیا ہو۔ یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ یقیناً کسی شخص نے اُس کا خاتمہ کر دیا ہو گا۔ ایک خلاف توقع اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ لڑکا آگے کو ڈھکیلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک کان پھاڑ دینے والی آواز آئی۔ اینڈرسن کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے صاف طور سے۔ گویا ایک خواب کی طرح — دونوں آدمیوں کو زرد چنگاریوں کی چمک، اور ایک صاف، چمکیلی فضا میں گرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ سپاہی ان لاشوں کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ اُس نے ان کو کیچڑ سے بھری سڑک پر گھوڑے سرپٹ دوڑاتے دیکھا۔ ان کے ہتھیار بج رہے تھے اور ان کے گھوڑوں کے سم سے کٹاکٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اُس نے یہ سب بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ وہ یہ خود نہ سمجھ سکا کہ وہ گھاس کے گٹھے کے پیچھے سے کب اور کیوں کود کر باہر نکل آیا تھا۔ اُس کا چہرہ پسینہ سے تر تھا اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم

کی جسمانی تکلیف اُس کو ستا رہی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس کی یہ حالت کیوں ہے۔ اُس کی حالت ایک سخت بیمار کی طرح تھی بلکہ اُس سے بھی زیادہ تکلیف دہ

جب سپاہی جنگل میں غائب ہو گئے تو گولی چلنے کی جگہ پر لوگ جلدی جلدی پہونچنے لگے اگرچہ گولی چلنے تک ایک آدمی بھی نہیں دکھائی پڑا تھا۔

لاشیں، جنگلے کے دوسری طرف سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ برف بکھری ہوئی تھی اور صاف فضا میں چمک رہی تھی۔ یہ لاشیں تین انسانوں کی تھیں۔ دو آدمیوں کی اور ایک بچہ کی۔ لڑکے کی لانبی نرم گردن برف پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکے کے قریب جو آدمی تھا اُس کا چہرہ چھپا ہوا تھا وہ اوندھے منہ خون کے ایک تالاب میں پڑا ہوا تھا۔ مقتول اچھے قد و قامت کا آدمی تھا اس کی داڑھی سیاہ اور بازو مردانہ تھے وہ لمبا لمبا پڑا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ خون آلود برف پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس تنگ سڑک کے کنارہ جہاں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی ان کے اس طرح خاموش پڑے رہنے میں جو خوف معلوم ہوتا تھا اُس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا!

اُس رات کو اینڈرسن نے اپنے اسکول کے کرہ میں حسب معمول اشعار نہیں کہے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا کہر آلود نیلے آسمان پر اپنے سے دور چاند کے زرد ہالہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اس کے خیالات منتشر ڈراؤنے اور ایسے خوفناک ہو گئے تھے کہ اُس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا گویا وہ اب بھی انھیں تینوں آدمیوں کو جن کو گولی ماردی گئی تھی۔ دیکھ رہا ہے۔ جو کھیت میں پڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے چاند کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"کبھی وہ زمانہ آئے گا" اُس نے خیال کیا "جب دوسروں کے ہاتھوں سے لوگوں کا قتل بالکل ناممکن چیز ہو جائے گا۔ وقت آئیگا جب ان سپاہیوں اور افسروں کو جنھوں نے ان تینوں آدمیوں کو مارا ہے پتہ چل جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا ہے اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کے لئے انھوں نے ان کو قتل کیا ہے وہ ان کے لئے بھی ایسی ہی ضروری، اہم اور عزیز ہے۔ جتنی ان کے لئے جنھیں انھوں نے مار ڈالا ہے۔

"ہاں" اس نے زور سے اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھیں پر آب تھیں، "وہ وقت آئیگا" چاند کا زرد ہالہ اُس کی آنکھوں کی رطوبت کی وجہ سے داغدار معلوم ہونے لگا۔

ان تینوں مظلوموں کے لئے اُس کا دل رنج سے بھر آیا۔ اُس کے دل میں غصہ کی ایک لہر موجزن ہو گئی۔ مگر پھر اُس نے اپنے دل پر قابو حاصل کیا اور آہستہ سے کہا:-

"وہ جو کچھ کر رہے ہیں جانتے ہیں"۔۔ اس پرانے فقرہ نے اُسے اپنے غصہ پر قابو رکھنے کی قدرت دیدی۔

(۲)

مطلع اُسی طرح صاف اور خوشگوار تھا مگر بہار کے دن زیادہ گزر چکے تھے۔ بھیگی ہوئی زمین سے بہار کی خوشبو آرہی تھی۔ برف کے نیچے سے صاف اور ٹھنڈا پانی ہر جگہ بہتا تھا۔ درختوں کی شاخیں بہار کا نقشہ پیش کررہی تھیں اور لچکدار ہوگئی تھیں۔ میلوں تک زمین کے صاف اور نیلگوں قطعات پھیلتے چلے گئے تھے لیکن گاؤں میں بہار کی صفائی اور خوشی نہ تھی۔ یہ چیزیں گاؤں کے باہر جہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا پائی جاتی تھیں ــــ یعنی کھیتوں۔ جنگلوں اور کہساروں میں۔ گاؤں میں ہوا۔ دم بند، بھاری اور ڈراؤنی تھی جیسے کسی خواب میں ہو۔

اینڈرسن سڑک پر ایک پریشان دماغ لوگوں کے مجمع کے قریب کھڑا ہوا تھا اور سات کاشتکاروں کو کوڑے مارنے کیلئے جو انتظامات کئے جارہے تھے ان کو گردن آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

وہ برف میں کھڑے ہوئے تھے۔ اینڈرسن کو معلوم ہوگیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وہ عرصہ سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس خوفناک اور شرمناک چیز کی بدولت جو ان پر گزرنے والی تھی، وہ لوگ تمام دنیا سے جدا کردئے گئے تھے اور اسی لئے وہ اس چیز کا احساس نہیں کرسکتے تھے جس کا اینڈرسن کرتا تھا اور اسی طرح اینڈرسن وہ چیز نہیں سمجھ سکتا تھا جو ان کے دلوں میں تھی۔ ان کے چاروں طرف سپاہی بڑے بڑے گھوڑوں پر نہایت خوبصورتی سے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ گھوڑے اپنے سر ہلا رہے تھے، اپنے چہرے ادھر اُدھر گھماتے تھے اور اینڈرسن کو نظر حقارت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ عنقریب اس ظلم وستم کو دیکھیگا مگر کچھ نہ کرسکیگا اینڈرسن کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا اور اس کے آتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا نفرت اور شرمساری نے برف کے دو ٹکڑوں میں اُسے دبوچ لیا ہے۔

سپاہیوں نے ایک کاشتکار کو پکڑا۔ اینڈرسن نے اُس کی مترحم نظریں دیکھیں۔ اس کے لب سے کوئی لفظ نہیں سنائی دیا اور اُس کی آنکھیں ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ان میں اس قسم کی چمک پائی جاتی تھی، جیسی پاگل کی آنکھ میں ہوتی ہے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کے چہرہ سے فراست اور پاگل پن دونوں اس قدر عیاں تھے کہ جب سپاہیوں نے اسے برف پر اُلٹا لٹا دیا اور بجائے ان آتشیں آنکھوں کے اُس نے اس کی ننگی پیٹھ چمکتی ہوئی دیکھی (جو ایک نہایت خوفناک اور شرمناک منظر تھا) تب جا کر کہیں اُسے اطمینان ہوا۔

ایک سپاہی جس کا چہرہ سرخ اور بڑا سا تھا اور جو ایک سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اُس کی طرف بڑھا اور اُس کے بدن کی طرف بہت خوش خوش دیکھنے کے بعد پکار کر صاف آواز میں کہا؛

"اچھا۔ خدا کی مہربانی سے اُسے جانے دو!"

انڈرسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ نہ سپاہی کو دیکھ رہا ہے، نہ گھوڑے کو اور نہ مجمع کو۔ اُسے نہ سردی معلوم ہو رہی تھی، نہ خوف اور نہ شرم، نہ وہ فضا میں کوڑے کی آواز سُن سکا اور نہ درد و رنج کی تکلیف دہ کراہ۔ اُس نے صرف ایک آدمی کی ننگی پیٹھ کو پھولتے اور اُس پر کوڑوں کے سفید اور زرد نشان دیکھے۔ رفتہ رفتہ اس ننگی پیٹھ کی صورت بدل گئی خون جسم سے اُچھل رہا تھا اور سفید برف کو رنگین بنا رہا تھا۔

انڈرسن کی روح خوف سے کانپنے لگی، اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اُس نے انھیں پھر کھولا تو دیکھا کہ چار اور سپاہی جو سرخ لباس میں ملبوس ہیں ایک دوسرے آدمی کو برف پر پٹک رہے ہیں اس کے بعد انھوں نے پھر اُسی بے شرمی، بدتمیزی اور بہیمیت سے اُس کی پیٹھ کو عریاں کیا —— کس قدر پُر درد نظارہ تھا!

اس کے بعد تیسرے کی باری آئی، پھر چوتھے کی اور یوں ہی ساتوں کی۔

اینڈرسن بھیگے ہوئے برف پر یوں ہی کانپتا، تھرتھراتا اور اپنی گردن بلند کرتا کھڑا رہا اور اس تمام اثنا میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اُس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ نکل رہا تھا۔ وہ اسوقت شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ اُسکے لئے یہ چیز نہایت شرمناک تھی کہ وہ اس ڈر سے سامنے نہیں آیا کہ کہیں وہ لوگ اُسے بھی نہ پکڑ لیں اور برف پر لٹا کر اُسے ننگا کر دیں۔

سپاہی بڑھتے گئے، گھوڑے اپنا سر ادھر اُدھر جھٹکتے رہے، کوڑے کی آواز فضا میں اسی طرح گونجتی رہی اور عریاں انسانی گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا، اُس کا خون بہایا اور اُس کا بدن سانپ کی طرح اینٹھایا جاتا رہا۔

اینڈرسن نے پھر پانچ آدمیوں کے چہرے ٹاؤن ہال کے زینوں پر دیکھے۔ یہ چہرے ان آدمیوں کے تھے جن کو اس شرمناک حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیر لیں، یہ دیکھنے کے بعد ایک آدمی کو مر جانا چاہئے، اُس نے خیال کیا۔

(۳)

وہ لوگ سترہ تھے۔ ۱۵ سپاہی، ایک نائب اور ایک بے ریش افسر۔ یہ افسر آگ کے سامنے لیٹا ہوا شعلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہی ہتھیاروں کو ٹھیک کر رہے تھے۔

یہ لوگ سیاہ پگھلنے والی زمین پر خاموشی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے اور کبھی کبھی دہکتی ہوئی آگ میں سے جو لٹھے نکلے ہوئے تھے ان سے لڑ جاتے تھے۔

اینڈرسن اپنا اوورکوٹ پہنے اور اپنی چھتری اپنی پشت پر لئے ان کے قریب آیا ماتحت (ایک موٹا تازہ مونچھوں دار آدمی) اُٹھ بیٹھا اور آگ کی طرف سے اپنا منھ ہٹا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا!

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" اس نے بڑی جلدی جلدی دریافت کیا۔ اُس کے لہجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ضلع میں جہاں وہ ہلاکت تباہی اور بربادی پھیلاتے جاتے ہیں، سپاہی ہر ایک سے خوف کھاتے ہیں۔

"افسر!" اُس نے کہا۔ "یہاں ایک آدمی ہے جسے میں نہیں جانتا"

افسر نے اینڈرسن کی طرف بغیر کچھ بات کئے دیکھا۔

"افسر صاحب!" ایک باریک آواز میں کہا "میرا نام نکلسن ہے۔۔ میں یہاں کا تاجر ہوں اور تجارت ہی کے سلسلہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ شاید مجھے کوئی اور سمجھ لیا جائے۔ مجھے آپ!

"تو تم یہاں کیا بکواس لگائے ہوئے ہو؟" افسر نے غصہ ہوکر کہا اور منھ پھیر لیا۔

"ہوں۔ تاجر ہیں!" ایک سپاہی نے نہایت حقارت سے کہا۔ "اُس کی تلاشی لینا چاہئے، اس تاجر کی جو رات کو ادھر اُدھر پھرتا رہے۔ اُسے شاید اس کی ضرورت ہے کہ اُس کے جبڑے پر ایک مکا دیا جائے۔"

"یہ مشکوک آدمی ہے، افسر!" نائب نے کہا: "آپ کی کیا رائے ہے، ہم اسے گرفتار کرلیں ۔ جی؟"

"نہیں" افسر نے سستی سے جواب دیا۔ "میں ان لوگوں سے عاجز آگیا ہوں ۔۔ مارو گولی"

اینڈرسن، بغیر کچھ اور کہے وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے میں آگ کے پاس عجیب طرح سے چمک رہی تھیں۔ اور اس پستہ قد، صاف اور مضبوط جسم والے انسان کو رات کے وقت سپاہیوں میں اپنا اوورکوٹ اور بید لئے اور آگ کی روشنی میں اُس کی عینک کے شیشے چمکتے ہوئے دیکھنا عجیب منظر تھا۔

سپاہیوں نے اُسے یونہیں رہنے دیا اور آگے بڑھ گئے۔ اینڈرسن تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اُسکے وہاں سے ہٹ آیا اور جلدی سے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ ہوا سرد ہونے لگی تھی اور جھاڑیوں کی نوکیں زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھیں اینڈرسن پھر فوجی چوکی گیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ چھپ گیا اور جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے جھکے جھکے آگے

جانے لگا۔ اس کے پیچھے آہستہ آہستہ اور خاموشی سے جھاڑیوں کو چھانٹتے اور سایہ کی طرح خاموشی سے چلے آرہے تھے۔ گبرائیل کے قریب اُسکی داہنے طرف ایک طویل آدمی اپنے ہاتھ میں ریوالور لئے ٹہل رہا تھا۔

پہاڑی پر سپاہی کی ایک شکل عجیب طرح سے کھڑی دکھائی پڑی اور بالکل غیر متوقع طور پر۔ وہ سپاہی اُس جگہ نہ تھا جہاں وہ اُسے دیکھ رہے تھے۔ بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں اس کی شکل دھندلی دھندلی دکھائی پڑتی تھی۔ اینڈرسن سپاہی کو پہچان گیا۔ یہ وہی تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ اس کی جامہ تلاشی لی جائے اُسے دیکھ کر اینڈرسن کے دل میں کوئی تلاطم نہیں برپا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوتے ہوئے آدمی کی طرح سرد اور بے حرکت تھا۔ آگ کے چاروں طرف بجز نائب کے جو اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور تمام سپاہی سو رہے تھے۔

اینڈرسن کے داہنے پر جو لانبا دبلا سا آدمی تھا اُس نے ریوالور اٹھایا اور لبلبی دبادی۔ ایک عارضی اندھا بنا دینے والا شعلہ — ایک زوردار کان کے پردہ پھاڑ دینے والی آواز!

اینڈرسن نے دیکھا کہ گارڈ نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پھر زمین پر اپنا پیٹ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سے چنگاریاں چمکیں اور ایک زبردست دھماکا پیدا ہوا نائب کھڑا ہوگیا اور آگ میں گر پڑا۔

بھورے سپاہی بھوت کی طرح ہر طرف دوڑنے لگے، اپنے ہاتھ پٹکنے لگے اور سیاہ زمین پر گر گر کر لوٹنے لگے۔ نوجوان افسر اینڈرسن کے پاس دوڑا۔ وہ اپنے ہاتھ ایک اجنبی اور خوفزدہ چڑیا کی طرح ہلا رہا تھا۔

اینڈرسن نے اپنا بید اُٹھایا اور اپنی پوری قوت سے اس نے افسر کے سر پر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب پر "پھٹ" سے آواز ہوتی تھی۔ افسر دوسرے وار کے بعد چکر کھا کر گھوما اور جھاڑی سے ٹکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جیسے بچے کرتے ہیں۔ کوئی اس طرف دوڑا اور گولی چلا دی جو ایسا معلوم ہوا گویا اینڈرسن کے ہاتھوں سے چلی ہے۔ افسر لڑکھڑایا اور زمین پر سر کے بل گر پڑا۔ اسکے پاؤں کچھ دیر تک جھٹکا کھاتے رہے اور پھر وہ خاموش ہوگیا۔

گولیاں چلنی بند ہوگئیں۔ کالے آدمی جن کے چہرے سفید تھے سپاہیوں کی مردہ لاشوں کے درمیان چل رہے تھے اور کارتوس وغیرہ لے رہے تھے۔ اینڈرسن یہ سب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جب سب ختم ہوگیا تو وہ اوپر گیا، نائب کے پیر پکڑے اور کوشش کی کہ جسم کو آگ سے نکال لے مگر وہ اس کے لئے بہت بھاری تھا چنانچہ اسے اس نے وہیں چھوڑ دیا۔

(۴)

اینڈرسن، ٹاؤن ہال کے زینہ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اس نے

بہت بری بات کی، اگر پھر بھی اُس کے دل میں نہ رحم تھا، نہ شرم اور نہ افسوس۔ اگر اُسے آزاد کر دیا جائے تو وہ سمجھتا تھا کہ وہ پھر وہی کرے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنا معائنہ کرے، اور دیکھے کہ اُس کی روح کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس کے خیالات بہت منتشر تھے۔ بعض وجوہ کی بنا پر اُس کے لئے ان تین آدمیوں کے متعلق سوچنا جو برف پر پڑے ہوئے اپنی مردہ اور بے نور آنکھوں سے دور دراز چاند کے زرد ہالہ کو دیکھ رہے تھے اُس مردہ افسر کے متعلق سوچنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا جس کے سر پر اس نے دو بھدے وار کئے تھے۔ اپنی موت کا وہ خیال نہیں کر رہا تھا اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسنے ہر چیز کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُسے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ کوئی شے مر گئی ہے، چلی گئی ہے اور اُسے خالی چھوڑ گئی ہے اور اسے اس کی نسبت خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

پھر جب وہ اُسے گھسیٹ کر لیجانے لگے تو وہ کھڑا ہو گیا لوگ جلدی سے اُسے باغ سے لیجانے لگے جہاں کے لئے اپنے خشک سر اُٹھائے ہوئے تھے تو اس کے دل میں ایک خیال بھی نہ آیا۔

اُسے سڑک پر لیجایا گیا اور جنگلہ کے پاس ایک سلاخ سے پشت لگا کر کھڑا کر دیا گیا اُس نے اپنی عینک لگالی ہاتھ پیچھے کر لئے اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر تھوڑا سا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ آخری لمحہ میں اس نے اپنے سامنے نظر کی اور دیکھا کہ رائفلوں کی نالیاں اس کے سر، سینہ اور پیٹ کی طرف ہیں، اس کے بعد اُس نے یہ بھی صاف صاف دیکھا کہ ایک رائفل جو اُس کی پیشانی کے مقابلہ میں تھی یکایک جھک گئی۔

اینڈرسن کے دماغ میں ایک پراسرار خیال جو دنیاوی نہ تھا یکایک آیا۔ اُس نے اپنے چھوٹے قد کو پوری طرح سے تان دیا اور فخر کے ساتھ اپنا سر سیدھا کر دیا۔ طاقت اور فخر کا ایک پراسرار خیال اس کی روح میں موجزن ہو گیا اور اُس کے نزدیک ہر چیز ـــ سورج، آسمان، زمین، انسان اور موت ـــ معمولی دو راز کار اور بیکار نظر آنے لگی ـــ گولیاں اُس کے سینہ، اُس کی بائیں آنکھ، اُس کے پیٹ اور صاف کوٹ پر پڑیں، اُس کی عینک ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی، اُس نے ایک مرتبہ چکر کھایا اور گر پڑا۔ اُس کی ایک آنکھ اب بھی بالکل کھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کو پکڑنے لگا جیسے وہ کسی چیز کا سہارا لے رہا ہو۔ افسر اُس کی طرف دوڑا اور اُس کی گردن پر ریوالور رکھ کر دو فائر اور کئے۔۔ اینڈرسن زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

سپاہی اُسے چھوڑ کر جلدی سے چلے گئے مگر اینڈرسن زمین پر پڑا رہا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی دس سکنڈ تک تڑپتی رہی۔

(ماٹھکیل۔ پی۔ آرٹز بشو)

سوئٹزرلینڈ کا آئینِ وفاق

حکومتِ عوام از عوام

گزشتہ صحبت میں حکومت عوام کے پہلے جزو یعنی ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اب ہم دوسرے عنصر یعنی قانون سازیِ عوام کو لیتے ہیں۔

وفاقی حکومت میں عوام کے مطالبہ پر دستور اساسی میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں بشرطیکہ یہ مطالبہ پچاس ہزار شہریوں کی طرف سے ہو۔ مطالبہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یا تو اسمبلی کے پاس کوئی ترمیم بھیج دی جاتی ہے جسے اسمبلی عوام میں نشر کر دیتی ہے یا اسمبلی سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک متعینہ اصول کو پیش نظر رکھ کر کوئی ترمیم کرے اس صورت میں اسمبلی عوام کے سامنے پہلے یہ سوال رکھتی ہے کہ آیا اسمبلی کو ترمیم تیار کرنی چاہئے یا نہیں؟ عوام کی منظوری حاصل ہو جانے پر ترمیم تیار کر کے رائے عامہ سے منظور کرا لیتی ہے۔

جنیوا کے سوا باقی سب کینٹونوں میں شہریوں کی ایک مقررہ تعداد دستور اساسی پر نظر ثانی کا مطالبہ یا چند مخصوص ترمیمیں پیش کر سکتی ہے۔ لوزان، فری برگ اور ویلائس ان تین کینٹونوں کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ کے باقی سب کینٹونوں میں شہریوں کی ایک معینہ تعداد یا تو بذات خود کوئی نیا قانون تجویز کر سکتی ہے یا کینٹون کی کونسل کے پاس قانون کا بنیادی اصول ارسال کر کے قانون کی تشکیل کی درخواست کر سکتی ہے۔ الغرض کینٹوں کی کاؤنسل بھی عوام سے دریافت کر لینے کے بعد قانون بناتی ہے اور ان کی منظوری اس پر حاصل کر لیتی ہے۔ اگر کاونسل سے بالا بالا کوئی مسودۂ قانون عوام تک پہونچا دیا جائے تو دستور کی رو سے کاونسل اس کی مخالفت کی مجاز ہے اور وہ بھی اپنی طرف سے ایک متوازی مسودۂ قانون تیار کر کے عوام کے سامنے حصول رائے کی غرض سے رکھ سکتی ہے۔ بعض کینٹونوں میں کاونسل کبھی کبھی مطالبۂ قانون سازی کی مخالفت بھی کرتی ہے اور اس کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے اپنی رائے کی نشر و اشاعت کا بندوبست کرتی ہے۔

سیاسی پارٹیاں جس طرح سوئٹزرلینڈ کا آئین اپنی ترتیب اور شکل کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے؛ اسی طرح سوئٹزرلینڈ کی سیاسی فضا بھی حیرت انگیز طور پر سکون پسند ہے۔ مذہب،

زبان اور نسل کے گوناگوں اختلافات کے باوجود بھی نظامِ حکومت کا سفینہ ملکی سیاسیات کے سمندر میں جوار بھاٹا اور مدوجزر کے بغیر چلا جاتا ہے۔ جہاں تک نسلی اور لسانی اختلافات کا تعلق ہے سوئٹزرلینڈ میں یورپ کے کسی زیادہ سے زیادہ منقسم ملک سے زیادہ جماعتی انتشار ہونا چاہیئے تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں پارٹی بندی اور جماعتی کشمکش ایک سرے سے بالکل مفقود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چار پانچ پارٹیاں ملکی سیاسیات کا جزو ہیں اول انتہاپسند پارٹی دوسری مرکزی پارٹی، تیسری کیتھولک پارٹی، چوتھی سوشلسٹ پارٹی اور پانچویں جمہوریت پسند پارٹی مگر یہ چیز اہلِ ہند کے لئے تعجب کا باعث ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک پارٹی کی تشکیل بھی نسلی امتیاز یا فرق کے اصول پر نہیں ہوئی۔ انتہاپسندوں کی طاقت کا دارومدار زیادہ تر جرمن زبان بولنے والے اور پروٹسٹنٹ کینٹنوں پر ہے مگر یہ فرانسیسی زبان بولنے والے کینٹنوں کی امداد سے بھی محروم نہیں ہوتے اسی طرح کیتھولک پارٹی کو جرمن زبان بولنے والے کینٹنوں سے بھی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے باشندے پارٹی سسٹم پر نظامِ حکومت چلانے کے قائل نہیں ہیں، وہ بہتر دماغ کے افراد پر بھروسہ کرتے ہیں اور انھیں کو ملک کی سیاسیات کی باگ سونپ دیتے ہیں، فرانس اور دولت برطانیہ میں اگر کوئی پارٹی لیڈر انتخابات میں ناکامیاب ہوجائے تو مخالف جماعت غلغلۂ مسرت سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے مگر سوئٹزرلینڈ میں مخالفین عمداً ایسی نازک صورت حال کی پیش بندی کرتے ہیں اور مخالف پارٹی کے ناکامیاب لیڈر کو کسی عنوان بھی سیاسیات سے دستکش نہیں ہونے دیتے۔

یہ کہ سوئٹزرلینڈ کی سیاسی پارٹیوں کی تہ میں جماعتی امتیاز کارفرما نہیں ہے، یوں بھی ثابت ہوتا ہے کہ دیگر جمہوری ممالک میں خوشحال طبقوں کے افراد عموماً رجعت پسند یا لبرل پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مزدوروں اور متوسط طبقے کی ہمدردیاں عام طور پر انتہاپسندوں کو حاصل ہوتی ہیں مگر سوئٹزرلینڈ میں انتہاپسند پارٹی کے متعدد افراد ایسے بھی ہیں جو باعتبار حیثیت امیر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مرکزی پارٹی میں انتہاپسند افراد کی کافی تعداد شامل ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کو کسی حد تک جماعتی امتیاز کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس میں بھی بہت سے کم تنخواہوں کے سرکاری نوکر اور جمہوریت پسند شامل ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی سیاسیات میں پارٹیوں کو اتنی اہمیت کیوں حاصل نہیں ہے؟ اس کا جواب کئی عناصر پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نصف صدی گذری کہ جمہوریت کا نظامِ حکومت پورے طور پر مستحکم ہوچکا ہے اور شہری حقوق کے اعتبار سے سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو مکمل جمہوریت حاصل ہے۔ چونکہ کسی بنیادی سیاسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، جماعتی کشمکش کی گنجائش ہی نہیں نوآبادیوں کے انتظام کے سوال کو بھی آئینِ حکومت میں کوئی دخل نہیں خارجی حکمتِ عملی دستوراً ہمیشہ سے

غیر جانبدارانہ رہی ہے، اس سلسلہ میں بھی کوئی نئی چیز رونما نہیں ہوتی دوسرے لفظوں میں سیاسی طور پر سوئٹزرلینڈ بالکل مطمئن ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اقتصادی اعتبار سے ملک میں کسی قسم کی بے چینی نہیں ہے، عام طور پر مزدور اور متوسط طبقے اپنی زندگی کی روش سے مطمئن ہیں اور نظام حکومت میں کوئی ترمیم ضروری نہیں سمجھتے۔

تیسرے مذہبی اختلافات گو بالکل مفقود نہیں مگر نہونے کے برابر ہیں۔ وفاقی حکومت میں مذہبی مساوات کا دور دورہ ہے تاوقتیکہ وہ جائز حدود سے تجاوز نہ کریں، کیتھولک کینٹونوں کو اپنے قول و فعل میں مکمل آزادی حاصل ہے۔ جائز حدود سے یہ مطلب کہ پروٹسٹنٹ کینٹونوں کے مذہبی احساسات کو ٹھیس نہ لگے۔

چوتھے تنفر انگیز جماعتی امتیاز کا نام و نشان نہیں۔ مالی اعتبار سے سب مساوی نہیں ہیں مگر اس طرح دولت کی نمائش نہیں کی جاتی کہ غریبوں کا جذبۂ حسد برانگیختہ ہو جائے۔

پانچویں اہل الرائے میں خودکوشی اور لیڈری کا جذبہ بہت کم ہے کیونکہ سوئٹزرلینڈ کے باشندے طبعًا شخصیت پرستی سے متنفر ہوتے ہیں وہ قابلیت کو سراہتے ہیں اور جن لوگوں کی ایمانداری اور اولوالعزمی کا یقین ہو جائے، ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ مگر بطل پرستی سے اُن کی فطرت بہت دور ہے۔

چھٹے سیاسیات کو وہ لوگ بازیٔ طفلاں نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک سیاسیات اتنی ہی اہم اور سنجیدہ چیز ہے جتنی تجارت جو اُن کی زندگی کی کفالت کرتی ہے۔

ساتویں کسی پارٹی کے رکن کو اُس پارٹی کے رکن ہونے کی حیثیت سے کبھی کوئی ذاتی فایدہ پہونچنے کا امکان نہیں ہوتا اور وہ کسی منصب یا اعزاز کا اس بنا پر مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ وہ کسی خاص جماعت کا رکن ہو۔

سوئٹزرلینڈ میں پارٹی سسٹم کمزور ہونے کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ اُن معاملات کا جو ملکی سیاسیات کے لئے مرگ و زلیست کا حکم رکھتے ہیں رائے عامہ آزادانہ فیصلہ کرتی ہے اس لئے اسمبلی میں کسی پارٹی کا غلبہ ہو بھی جائے تو انجام کار اُس کے لئے سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔

آخری وجہ یہ ہے کہ حب وطن (وہ حب وطن جس کی رو سے قوم کے مجموعی مفاد کو اصولاً تمام اندرونی جھگڑوں پر فوقیت حاصل ہے) سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو متفق اور متحد رکھتا ہے۔

کانفڈریشن کی بہ نسبت کینٹونوں میں سیاسی زندگی زیادہ متحرک رہتی ہے۔ زرعی علاقوں میں لوگوں کی توجہ زیادہ تر مقامی معاملات پر مرکوز رہتی ہے۔ صنعتی کینٹونوں میں بھی سیاسی جماعتیں مختلف قسم کے سیاسی سوالات کے تصفیہ میں منہمک رہتی ہیں جیسی سیاسی پارٹیاں کانفڈریشن میں کام کرتی ہیں، ضروری نہیں کہ کینٹونوں میں بھی بعینہ ویسی ہی پارٹیاں ہوں۔ کیونکہ کینٹونوں میں انتخابات کا مقابلہ ملکی سے زیادہ مقامی مسایل

میں ہوتا ہے۔

جہاں تک کانفڈریشن کا سوال ہے اُس کی سیاسی فضا خارجی حکمت عملی کے سلسلہ میں تو یکساں رہتی ہے، کیونکہ خارجی پالیسی دستور اساسی کی رو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر جانبدارانہ قرار دیجا چکی ہے۔ اندرونی معاملات میں عام طور پر ملکی مفاد اور کفایت زر مدنظر رہتی ہے۔ معاشرتی اصلاح کے معاملوں میں پیش شدہ اسکیم کے حسن و قبح کو دیکھا جاتا ہے اور عام طور پر محتاط پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ مذہب البتہ تحریک جذبات کا باعث ہوتا ہے اور اُن کینٹونوں میں جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ تعداد میں برابر برابر ہیں، اُن ابتدائی مدارس کے معاملہ میں جہاں ابتدائی مذہبی تعلیم کا سوال ہوتا ہے، پوری شدت سے دونوں فرقوں میں رسہ کشی ہوتی ہے تمام داخلی مسائل میں اقلیتوں کی نمایندگی کا مسئلہ ہی تنہا ایسا مسئلہ ہے جو خالص جماعتی زاویۂ نگاہ سے زیر بحث آتا ہے کیونکہ اس کے تصفیہ کا پارٹی کی قوت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ انتہا پسند جن کو نظام حکومت میں غلبہ حاصل تھا یقین رکھتے تھے کہ فرقہ وار نمایندگی اسمبلی اور اکزیکیٹو کے محکموں میں حکومت کے ہاتھ کو کمزور کردے گی کیونکہ اس طرح اسمبلی میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور ایسی اکثریتیں کم ہو جائیں گی جو نظام حکومت کو استحکام بخشتی ہیں۔ دوسری طرف سوشلسٹ اور کیتھولک اور لبرل پارٹیاں تھیں۔ نیشنل کاونسل میں انکی نمایندگی اُس تناسب سے کم تھی جو حلقہ ہائے نیابت کی رو سے انھیں پہونچتا تھا اس لئے یہ پارٹیاں تناسب کے لحاظ سے نمایندگی کی موید تھیں کیونکہ اس طرح انھیں اپنی قوت میں اضافہ ہوتا نظر آتا تھا چنانچہ ۱۹۱۸ء میں فرقہ وار نمایندگی قانوناً تسلیم کر لی گئی اور ۱۹۱۹ء کے انتخابات میں اس پر عمل درآمد ہوا۔

اس اعتبار سے کہ پارٹی سسٹم کمزور ہے اور اختلافی مسائل پر جماعتی ہیجان کا بہت کم اظہار ہوتا ہے، یہ بات کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں نظام عمل کے اعتبار سے سیاسی جماعتیں اتنی پختہ اور منظم نہیں ہوتیں جتنی انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا میں۔ صرف سوشلسٹ ایک مقررہ پروگرام اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنے مقاصد کی تائید میں کافی پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

جماعتی تنظیم کے لحاظ سے سوشلسٹوں کے بعد کیتھولک پارٹی ہے۔

سیاسی پارٹیوں کی اہمیت کی کمی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ پارٹیوں کے پاس پارٹی فنڈ نہیں ہوتے، جب پارٹی کے سامنے تنظیم اور عمل کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ کام ہی نہ ہو جس کے لئے رائے پیدا کرنے جلسہ منعقد کرنے، لٹریچر بانٹنے وغیرہ کے لئے روپئے کی ضرورت ہو تو پارٹی فنڈ کی ضرورت ہی کیا۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ سیاسی زندگی میں افراد کا مطمح نظر ذاتی منفعت نہیں ہوتا۔ سوئٹزرلینڈ میں کسی سیاسی پارٹی کی

کامیابی سے اُس پارٹی کے لیڈر یا کسی رُکن کو کسی خاص فایدہ کی توقع نہیں ہو سکتی۔ ایک سیاسی پارٹی کے وجود سے کوئی شخص زیادہ سے زیادہ فایدہ یہ اُٹھا سکتا ہے کہ اپنے، اپنے رُفقا اور مؤیدین کے لئے حکومتی عہدے حاصل کرلے مگر سوئٹزرلینڈ میں سرکاری عہدوں کی تنخواہیں اسقدر کم ہیں کہ وہ باعث تحریص نہیں بن سکتے فیڈریشن میں الکشن کے بعد عہدیداروں کی تبدیلی ضروری نہیں، کینٹونوں کے عہدے اتنی اہمیت نہیں رکھتے کہ اُنکے لئے جماعتی جنگ لڑی جائے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ایک سیاسی پارٹی کا اثر اُن سیاسی اداروں پر کیسا پڑتا ہے جن کے ذریعہ عوام اپنی حکومت چلاتے ہیں۔ یہ ادارے مندرجہ ذیل ہیں:۔ (۱) انتخابات۔ (۲) مجلس لیجسلیچرول میں پارٹیوں کا طرز عمل (۳) ریفرنڈم، اور قانونسازی حوام کے سلسلہ میں عوام کا طرز عمل (یعنی حق رائے دہی کا استعمال)، (۴) اکزیکیٹو کا طرز عمل جو کینٹونوں میں چھوٹی کاؤنسل اور وفاقی حکومت میں فیڈرل کاؤنسل ہے۔

(۱) انتخابات:۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی سیاسی پارٹیاں ملکی انتخابات ہی میں اپنا زور دکھاتی ہیں، سوئٹزرلینڈ میں ان ممالک کی بہ نسبت کہیں زیادہ انتخابات ہوتے ہیں بلکہ بعض ایسے سرکاری عہدوں کے سلسلہ میں بھی جو دوسرے ملکوں میں نامزدگی سے پُر کرلئے جاتے ہیں، سوئٹزرلینڈ میں افسران کا تقرر عام انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ کانفڈریشن کے ممبران قومی کاؤنسل اور کینٹونوں کی بڑی کونسلوں کے ممبران بھی عام انتخاب سے تقرر پاتے ہیں، بہت سے کینٹونوں میں بھی چھوٹی کاؤنسل کے ممبر اور جج اور دیگر افسران کو رائے عامہ مختصر عرصہ کے لئے منتخب کرتی ہے۔

مگر انتخابات کی اسقدر زیادتی کے باوجود بھی باشندے اور پارٹیاں انتخابات میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے بعض سیاسی پارٹیاں تو انتخابات میں زیادہ آرا حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرتیں وجہ یہ ہے کہ انتخابات میں رائے عامہ کے غلطی کرنے کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ غلط انتخاب کے وجوہ تین ہی ہو سکتے ہیں اول یہ کہ رائے دہندہ کو خوف دلاکر غلط نمایندہ کے حق میں اُس سے رائے حاصل کی جائے۔ دوسرے رشوت دیکر رائیں خریدی جائیں، تیسرے دھوکہ بازی سے کام لیکر شمار آرا میں بددیانتی کی جائے۔ سوئٹزرلینڈ میں ان تینوں وجوہ کے وقوع کا کوئی امکان نہیں وہاں ساہوکار زمیندار طبقہ بالکل نہیں ہوتا جو اپنی رعیت پر ناجائز دباؤ ڈالے۔ باقی رہے کارخانوں کے مالک اور پادری لوگ، ان کا اثر مزدوروں اور عام مذہب پرستوں پر اتنا نہیں کہ یہ اُنھیں خوفزدہ کرکے کسی غلط نمایندہ کے حق میں اُن کی رائیں حاصل کرسکیں۔ رشوت ستانی اور رشوت دہی عنقا ہے کیونکہ اول تو نمایندے مالی حیثیت سے اس بار کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے، دوسرے اگر وہ رشوت دینے کے قابل ہوں بھی تو اُنھیں اپنی سیاسی زندگی

میں اس کے بدل کی توقع ہی کیا ہوسکتی ہے۔

انتخابات کے اخراجات بھی بہت مختصر ہوتے ہیں، انگلینڈ، فرانس وغیرہ ممالک کے نمایندوں کی طرح سوئٹزرلینڈ کے نمایندے مالی اعتبار سے کسی طرح زیر بار نہیں ہوتے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں نمایندے الکشن قریب آنے پر اپنے حلقہ کی ضرورتوں پر کافی روپیہ خرچ کرتے ہیں تاکہ رائے دہندگان اُن کی بناوٹی فیاضانہ ہمدردی کا سے اثر قبول کریں۔ انگلینڈ میں گزشتہ تیس چالیس برس میں یہ دستور مسلمہ سیاسی روایات میں سے ہوگیا ہے مگر سوئٹزرلینڈ میں سیاسی زندگی میں داخل ہونا صرف اپنا قیمتی وقت ملکی معاملات میں صرف کرنے کے مرادف ہے، کسی کی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہوتا۔

الکشن میں پارٹی کا کام اس طرح شروع ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنا نمایندہ پسند کرتی ہے، یہ عمل سوئٹزرلینڈ میں اتنا دشوار نہیں ہے جتنا انگلینڈ یا امریکہ میں ہے۔ ویسے ہر شہری بلا کسی دعوت کے اپنے آپ کو نمایندگی کے لئے پیش کرسکتا ہے مگر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مقامی شاخ کی کمیٹی ایک مناسب آدمی چن لیتی ہے اور اُس کا نام ممبران کے ایک جلسہ میں پیش کردیتی ہے۔ اس جلسہ میں اور نام بھی پیش ہوسکتے ہیں مگر عام طور پر کمیٹی کے نامزد افراد ہی نمایندے تسلیم کرلئے جاتے ہیں۔ دوبارہ الکشن چاہنے والے ممبران کی خواہش کو شاذ ہی رد کیا جاتا ہے بشرطیکہ اُن کی ذاتی کیرکٹر یا پارٹی سے اُن کی وفاداری مشتبہ نہو اور رائے دہندگان بھی ایسے شخص کو دوبارہ منتخب کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کرتے۔

نمایندگی کے معاملہ میں اُس شخص کو ترجیح دیجاتی ہے جو مقامی ہو یا کسی مقامی خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ ایک کینٹون کا شہری کسی ایسے حلقۂ نیابت کی طرف سے نیشنل کاؤنسل کا ممبر نہیں بنتا جو کسی دوسرے کینٹون میں واقع ہو مگر یہ "مقامیت" امریکہ کی بہ نسبت سوئٹزرلینڈ میں کم ہے، ہر پارٹی اپنی طرف سے اچھے نمایندے کھڑے کرنے کی کوشش کرتی ہے اگر ایک شخص کا اُس کے کیرکٹر اور قابلیتوں کی بنا پر احترام کیا جاتا ہو تو انتخاب میں وہ لوگ تک اُس کے حق میں رائے دیتے ہیں جو اُس کے سیاسی زاویۂ نظر سے متفق نہیں ہوتے، یہ کہ سوئٹزرلینڈ میں پارٹی اسپرٹ کتنی کم ہے اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حلقہ ہائے نیابت میں کافی تعداد ایسے حلقوں کی ہے جہاں سے نمایندہ متفقہ طور پر منتخب ہوکر آتا ہے اور بعض سال ایسے گزرے ہیں کہ نیشنل کونسل کی نصف سے زاید نشستیں ایسے نمایندوں سے پُر ہوئیں جو اپنے اپنے حلقہ ہائے نیابت سے بلا مقابلہ منتخب ہوکر آئے تھے۔

(۴) لیجس لیچروں میں پارٹیوں کا طرز عمل :- پارٹی فیلنگ لیجس لیچروں میں بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ عموماً ایک ہی پارٹی کا بہت زیادہ مدت تک غلبہ رہتا ہے اور دوسری پارٹیوں کے افراد غالب پارٹی

کی آئینی فوقیت کو مسلم مان کر کام کرتے ہیں، ریفرینڈم کے ذریعہ سے کسی بل کو نامنظور کرانے کے لئے بعض اوقات کئی پارٹیاں ملکر ایک ہوجاتی ہیں، یہ صورتِ حال مستقل نہیں کہی جاسکتی اس میں تبدیلی بھی ممکن ہے، جب کوئی ایسا سوال سامنے آتا ہے جس کے سلسلہ میں پارٹی کے متفقہ قدم اُٹھانے کی ضرورت ہو تو پارٹی کا (برائے نام) لیڈر، ممبران کے نام کوئی حکمنامہ جاری نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے میٹنگ طلب کرتا ہے کہ پارٹی کے ممبران کس طرح ووٹ دیں۔ اُن کے علاوہ جو دستورِ اساسی اور اُس کی تبدیلیوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، باقی سب مسودۂ قوانین ملکی مفاد کی کسوٹی پر سختی کے ساتھ پرکھے جاتے ہیں اس بات کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا کہ ان کی منظوری یا نامنظوری کا پارٹی پر کیا اثر پڑے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں پارٹی کا مفاد کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا کیونکہ جہاں تک منظوری یا نامنظوری کا تعلق ہے آخری لفظ صرف عوام ہی کا فیصلہ ہے۔

(۳) عوام کا طرزِ عمل :۔ اس کا تذکرہ مفصل طور پر پہلے آچکا ہے۔ جہاں کہیں مناسب معلوم ہوتا ہے پارٹیاں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتی ہیں لیکن ایسے معاملوں میں کامیابی ہوجانا بھی کسی پارٹی کی پختگی پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ سوئٹزرلینڈ کا ووٹر ہر معاملہ پر خود غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتا ہے۔

(۴) اگزیکٹو کا طرزِ عمل :۔ اگزیکٹو فیڈرل کاؤنسل سوئس اور ملٹری تقریروں میں کبھی کبھی پارٹی کے جذبہ کے ماتحت کام کرتی ہے مگر اُس کا روزانہ طرزِ عمل پارٹیوں سے بہت کم متاثر ہوتا ہے۔ گو اس کے فرائض وہی ہیں جو فرانس یا برطانیہ کے کابینوں کے ہیں مگر اس میں اصابتِ رائے کی وہ پختگی نہیں ہے جو مندرجہ بالا ممالک کے کابینوں کا خاصہ ہے۔ وحدت سب آپس کے اختلاف کے باوجود بھی اسکے ممبران سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اکثریت کی رائے کونسل کی رائے ہوتی ہے خواہ لیجس لیچر میں کاؤنسلر فرداً فرداً کچھ ہی کہیں۔

لیجس لیچر کے ممبران سوئٹزرلینڈ میں لیجس لیچر کے ممبران کے لئے سیاست میں پڑنا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے کیونکہ لیجس لیچر میں نشست حاصل کرنے سے کوئی ایسا فایدہ حاصل نہیں ہوتا جو معاش کی طرف سے بے نیاز کردے۔ زیادہ سے زیادہ اسمبلی کا ممبر فیڈرل عہدے حاصل کرسکتا ہے مگر یہ عہدے اول تو بہت کم ہیں اور پھر پرانے عہدہ دار دوبارہ سہ بارہ منتخب ہوتے رہنے سے یہ عہدے خالی بھی کم ہی ہوتے ہیں۔

کینٹونوں میں بھی یہی کیفیت ہے گو بعض کینٹونوں میں اسمبلی کی نشست کو ذاتی ترقی کے لئے استعمال کرنے کے مواقع میسر آجاتے ہیں مگر اس کے باوجود بھی بحیثیت مجموعی یہی کہا جائے گا کہ سوئٹزرلینڈ میں سیاسیا

کوئی منفعت بخش مشغلہ نہیں ہے۔ ہر ممبر اسمبلی کے پاس اپنے گزارے کے لئے معقول نجی ذرائع ہوتے ہیں۔

ایک نمایندہ بعض اوقات دولت کے بل بوتے پر بھی منتخب ہو جاتا ہے مگر عام طور پر اسکی مقامی حیثیت، چال چلن اور قابلیت ہی اُسے کامیاب بناتی ہے۔ ہر جماعت کے افراد اسمبلی میں آتے ہیں، امراء زیادہ تر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں اور اس لئے بہت کم بطور امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ بیشتر ممبران اسمبلی متوسط طبقوں کے افراد ہوتے ہیں۔ کانفڈریشن اور کینیڈا دونوں جگہ ممبران پر اعتماد اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ اگر ایکبار ایک شخص غیر دیانتدار ثابت ہو تو اس کی سیاسی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ۱۰۰۰ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب، نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے ان میں تقریباً ۱۰۰ مسائل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:-

مسئلۂ جبر و اختیار خواب کی حقیقت معاد و خلود طبقۂ نسواں اور غزلگوئی برج بابل خناس سٹ عدۂ سامری کون تھا باغ ارم کی حقیقت فلسفۂ محبت بھوت پریت اصحاب کہف سالویشن آرمی ہالہ کا سبب معجزہ و کرامات فرقۂ معتزلہ مذہب و عقل طوفانِ نوح یاجوج ماجوج۔ برہمو سماج طبقۂ نسواں اور تعلیم مریخ کی حقیقت منصور حلاج چند الفاظ کی تحقیق اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔ قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے للعہ ۔ غیر خریداران سے ۹ سے

منیجر نگار لکھنؤ

بنارس کی بیوہ

(فسانہ)

تجرد کی زندگی پُرامن ہو تو ہو، لیکن پُرکیف کبھی نہیں ہوتی۔ ابتدا میں بیوی بچوں کا جنجال بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں یہی چیزیں سرمایۂ نشاط بن جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ہر سمت سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ اُس کی آزادیاں اُس سے چھین لیجاتی ہیں اُسکے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اُس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تمام تکلیفیں اپنے اندر ایک خاص لذت بھی رکھتی ہیں اور سچ پوچھئے تو زندگی نام ہی "کشمکش حیات" کا ہے اگر یہ نہ ہو تو زندگی، زندگی نہیں، موت ہے۔ تجرد کی زندگی بسر کرنے والے دوسروں کی نظر میں خواہ کتنے ہی مسرور وشادماں نظر آتے ہوں لیکن خود انھیں سے پوچھئے کہ اُن کی زندگی کتنی بے کیف بسر ہوتی ہے شروع میں تجرد کی زندگی گزارنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو کم، لیکن بعد میں اُنکی زندگی ایسی تلخ ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں۔ جمود و تعطل کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ امن وسکون جس کے حصول کے لئے خدا معلوم کتنی روحیں سینہ چین ومضطرب ہیں کیا اُن کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ آفتاب کا طلوع وغروب کتنا پُرکیف ہوتا ہے۔ شبِ ماہ کی خنک راتیں کس قدر نشاط انگیز ہوتی ہیں۔ چڑیوں کا ترنم کس طرح روح کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ دریا کی روانی کیسی حیات پرور ہوتی ہے۔ لیکن فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ یہی چیزیں اگر دوامی شکل اختیار کرلیں اور ان میں کوئی تغیر وتبدل نہ ہو، تو پھر ان میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے۔ اُسے امن وسکون کی دنیا میسر آئے۔ دنیاوی کلفتوں سے اُسے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد تجرد کی زندگی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بہت جلد انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اُن کا فیصلہ قوانین قدرت کے خلاف ہے۔ اور جس موہوم شئے کی اُنھیں تلاش وجستجو ہے، وہ چیز اُن سے بہت دور ہے۔

یہی چیز تھی جس نے بالآخر سرت چندر کو ازدواجی زندگی میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ تعلیمی مشاغل کے

دوران ہی میں اُنھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی گزار دیں گے۔ اب اُنھیں ریلوے میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطافت کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطافت کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ایسا شخص سوسائٹی میں بھی مقبول ہوتا ہے۔ دوستوں کی کمی نہ تھی۔ شام ہوئی، یہ دفتر سے لوٹے اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ دس ساڑھے دس بجے تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے گھر واپس ہوئے کیسا اطمینان کتنی فارغ البالی اور کس قدر امن و سکون کی زندگی تھی۔ پورے دس سال اسی طرح گزر گئے لیکن اب سرت چندر کے لئے اس زندگی میں کوئی لطف نہ تھا۔ وہی صبح، وہی شام، وہی دفتر، وہی دوستوں کا جمگھٹا، وہی بے سر و پا باتیں، وہی بزمِ نشاط، وہی قہقہے وہ سب ان کی نظر میں بے کیف تھے۔ دوستوں سے انھیں کلفت ہونے لگی۔ لوگ انھیں بداخلاق کہنے لگے۔ لیکن سرت چندر کی زندگی اب انقلابی صورت اختیار کر رہی تھی۔ فطرت سے جنگ اب اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُن کا آخری قطعی فیصلہ اب متزلزل ہو چکا تھا۔ اُنھیں اب اس کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ زندگی اُس وقت تک زندگی نہیں، جب تک انسان ازدواجی زندگی میں قدم نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملازمت میں آنے کے کامل دس سال کے بعد اُنھوں نے بنگال کے ایک غیر معروف گاؤں میں اپنی شادی کر لی۔

(۲)

مالتی شکل و صورت کے لحاظ سے کوئی نمایاں عورت نہ تھی۔ لیکن اُسے بدصورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اُس کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا نہیں بلکہ سیاہی مائل تھا۔ لیکن اُس کے چہرہ میں ایک کشش تھی، بلا کی کشش۔ وہ ایک پیکرِ معصوم تھی۔ دنیا کی آلودگیوں سے یکسر بے خبر، اُس کے ذہن میں گناہ و معصیت کا کوئی تخیل بھی نہ تھا۔ یہ اثر تھا دیہات کی سادہ معاشرت کا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اپنے شوہر کو خوش رکھے۔ اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھے۔ سرت چندر کو اب معلوم ہوا کہ مالتی کی ایک محبت بھری نظر اُس کی گزشتہ زندگی کی تمام مسرتوں سے کہیں زیادہ پرکیف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت یہ بھی تھی وہ یہ کہ کامل دس سال کی مجرد زندگی نے سرت چندر کو بعض ایسی باتوں کا بھی عادی بنا دیا تھا کہ جن کا ترک کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اور یہ اُن کی زندگی کا ایک بہت ہی پردرد افسانہ تھا۔ مالتی بھی اسے دیکھتی لیکن وہ غریب اس معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔ سرت چندر کی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ تو ضرور ہر ماہ کلنر کمپنی کے نذر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے اُنھیں اس کا بھی پورا احساس تھا کہ مالتی اُن کی اس روش کو پسند نہیں کرتی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ

مالتی کو خوش رکھیں اور اُس کے جذبات کو پامال نہ ہونے دیں۔ لیکن شام کو جب تھکے ماندے وہ دفتر سے واپس ہوتے تو دن کا یہ تمام قول و قرار آیندہ کل کے لئے ملتوی ہو جاتا۔

(۳)

داناپور اسٹیشن کے پاس ہی سرت چندر نے ایک کرایہ کا مکان لے لیا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لیکن پختہ اور صاف۔ کل دو آدمی تھے۔ ایک سرت چندر دوسرے مالتی۔ بڑی دقت تھی۔ سرت چندر باہر کے آدمی تمام دن اُنہیں اپنے "مال گودام" سے کہاں فرصت تھی۔ مالتی کی تنہائی کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے ایک بوڑھی ملازمہ کی خدمت حاصل کر لی تھی جسے ایسا روپیہ دیا وہ صرف اس بات کے لئے دیتے تھے کہ وہ تمام دن گھر میں موجود رہے۔ مالتی کے لئے سوائے "بھجوائی مائی" کے (وہ اسی نام سے پکاری جاتی تھی) کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ "بھجوائی مائی" بنگلہ زبان سے قطعی ناواقف تھی اور مالتی کو ہندوستانی زبان میں گفتگو کرنے کی بہت ہی کم عادت تھی۔ اس لئے مالتی کیلئے بھجوائی مائی کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر تھا۔ مالتی کے لئے تمام دن کی تنہائی ناقابل برداشت تھی۔

(۴)

جاڑے کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔ مالتی کمرہ میں بیٹھی بیٹھی اکتا گئی تھی۔ وہ سائبان میں آئی، بھجوائی مائی اپنی عادت کے بموجب کمبل میں لپٹی خراٹے لے رہی تھی۔ مالتی نے آپ ہی آپ کہا۔ "اس کے سونے کی بھی کوئی حد ہے۔ خدا معلوم اس کی نیند کو کیا ہو گیا ہے۔"

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی — "بابو جی..... اے جی بابو جی"

مالتی لپک کر دروازہ کے قریب گئی۔ ایک نو وارد عورت دروازہ پر کھڑی تھی جس کا سامان قلی لئے تھا اور قلی آواز دے رہا تھا۔

مالتی دوڑ کر سائبان میں آئی اور اُس نے بھجوائی مائی کو زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار وہ اُٹھی باہر گئی اور نو وارد کو لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

نو وارد ادھیڑ عمر کی ایک بنگالی عورت تھی۔ اور ملبوس سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بیوہ ہے۔ اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی نے خیال کیا کہ شاید وہ اُس کے شوہر کی کوئی عزیزہ ہو۔ لیکن پھر کسی کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع تو نہ تھی۔ مالتی سوچتی رہی اور اس بات کا بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ اُسے پرنام کرے یا نہ کرے۔

"یہ سرت بابو کا مکان ہے؟" نو وارد نے دریافت کیا۔

"ہاں"

"تم اُن کی بیوی ہو ؟"

مالتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور اُس سے پوچھا۔ "آپ کہاں سے آرہی ہیں ؟"

"میں بنارس سے آرہی ہوں" نووارد عورت نے کہا "میں اپنے وطن جارہی تھی۔ لیکن میرا ٹکٹ کہیں گم ہوگیا۔ اور ریلوے کے ملازموں نے مجھے یہیں اُتار دیا۔ اب مجھے یہاں سے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ اُس گاڑی سے میں جا نہیں سکتی تھی اور دوسری گاڑی شب کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے۔ اتنی دیر میں کیا کرتی۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں نزدیک ہی ایک بنگالی خاندان ہے۔ اور میں وقت گزارنے کے لئے یہاں چلی آئی۔ میرا آنا تمھارے لئے کوئی تکلیف کا باعث تو نہیں ہے ؟"

"بالکل نہیں" مالتی نے خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ بیٹھئے"

مالتی کے اشارہ پر بھجو اکی مائی نے زمین پر دری بچھا دی۔ مالتی نے بھجو اکی مائی کو فوراً ایک روپیہ دیا اور کہا کہ جلد بازار سے جا کر ناشتہ کی چیزیں لے آئے۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے" نووارد عورت نے کہا "میرے پاس ٹوکری میں پھل موجود ہیں لیکن اگر تمھیں زحمت نہ ہو تو مجھے تھوڑا چاول کا دو۔ میں نے کل شام سے چاول نہیں کھایا ہے"

"ٹھیک ٹھیک۔ میں تو بالکل ہی بھول گئی" مالتی نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ "مائی فوراً آگ جلاؤ جلدی کرو"

ملازمہ نے مالتی کو روپیہ واپس دیا اور باورچی خانہ میں جاکر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

نووارد اور مالتی دونوں دری پر بیٹھکر باتیں کرنے لگیں۔

"تمھارا نام کیا ہے بیٹی ؟" نووارد نے پوچھا

"مالتی"

"تمھاری دادھیال کہاں ہے ؟"

"اُتر پارا"

"تمھارے ماں باپ زندہ ہیں ؟"

"میرے باپ تو میرے پیدا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کرگئے۔ اور ابھی میں بالکل کمسن ہی تھی کہ ماں بھی مرگئیں"

یہ کہتی ہوئی مالتی خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔ بھجو اکی مائی ابھی آہستہ آہستہ چیزوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ رہی

تھی ۔ مالتی نے اُسے اس کی سستی پر ملامت کی اور خود ہی جلد جلد کاموں کو انجام دینے لگی ۔
اس کے تھوڑی دیر بعد مالتی اپنے مہمان کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور نووارد اُس کے بغل میں بیٹھی اُس سے باتیں کر رہی تھی ۔

"تمھاری شادی کب ہوئی" بنارس کی بیوہ نے دریافت کیا

"اسی بیساکھ کے مہینہ میں"

"صرف ! تم یہاں کب سے ہو ؟"

"تقریباً دو ماہ سے"

"تمھارے شوہر دفتر کب جاتے ہیں ؟"

شوہر کا نام سن کر مالتی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا ۔

"نو بجے صبح کو" اُس نے شرم سے نظر کو نیچی کرتے ہوئے کہا

"اور وہ واپس کب آتے ہیں ؟"

"چھ بجے اور کبھی سات بجے بھی"

(۵)

سرت چندر آج خلاف معمول دفتر سے کچھ سویرے لوٹے ۔ مالتی نے مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کیا "آج بہت سویرے آئے"

سرت چندر مسکرا دئے ۔ بولے ۔ "میں نے خیال کیا تم تنہا گھبراتی ہوگی اور اس لئے میں نے جلدی کی"

مالتی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں ۔ بولی "لیکن آج میں تنہا نہیں ہوں ۔ سوچو کون آیا ہے ؟"

سرت چندر نے تعجب سے پوچھا ۔ "کون ہے"

"ایک بنارس کی بیوہ خاتون ۔ بنارس سے وہ اپنے مکان جا رہی تھیں کہ راستہ میں اُن کا ٹکٹ کہیں گم ہو گیا اور ریلوے والوں نے انھیں یہیں اُتار دیا"

"بنارس سے آ رہی ہیں وہ ؟ تنہا ہیں یا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہے ؟ اُن کی عمر کیا ہوگی"

"تنہا ہیں، اُن کی عمر ۴۰ - ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی"

سرت چندر کو مالتی کے تخمینہ پر ہنسی آ گئی ۔ "تمھیں چالیس پچاس میں اُس وقت تک فرق نہ معلوم ہوگا جب تک تم خود چالیس کی نہ ہو جاؤ" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"یعنی ؟"

"یعنی یہ کہ جس کی عمر سولہ سال کی ہے، اُس کے نزدیک چالیس اور پچاس میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس کی عمر چالیس سال کی ہے اگر اُسے پچاس سال کا کہا جائے تو یہ اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے"

لیکن سرت چندر کی ہنسی دیرپا نہ تھی۔ اُنھوں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"اس جگہ تو بنگالی خاندان کئی ایک ہیں۔ وہ خاصکر یہیں کیوں تشریف لائیں"

"تمھیں کوئی عذر ہے؟" مالتی کا چہرہ افسردہ ہو گیا

"یقیناً۔ کیا وہ حسین بھی ہیں؟"

مالتی کو سرت چندر کا یہ سوال ناگوار گزرا۔ اُس نے مُنھ بناتے ہوئے کہا "تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"کیوں نہیں؟ مجھے بہت شبہ ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسی عورت ہیں۔ بنارس سے آرہی ہیں اور پھر بالکل تنہا"

مالتی اپنے شوہر کے مفہوم کو سمجھ گئی۔ بولی۔ "نہیں نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔ وہ ایک شریف عورت ہیں"

"جیسے تم جانتی ہی ہو" سرت چندر نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "اور وہ جائیں گی کب؟"

"میں نے نہیں پوچھا"

"دوسری گاڑی رات کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے"

"لیکن وہ رات کو اکیلی جائیں گی کیسے؟"

"تمھیں اس کی کیا فکر ہے؟ میں خود اسٹیشن پر جاکر انھیں سوار کرادوں گا۔ جس قدر جلد وہ یہاں سے جائیں اُسی قدر بہتر ہے"

مالتی بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ سرت چندر نے مالتی کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا

"لیکن تم آخر ملول کیوں ہوئی جاتی ہو؟"

"بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی واپسی کی نسبت کچھ کہا نہیں۔ پھر میں کس طرح اُنھیں گھر سے نکالدوں"

سرت چندر بولے "تم اگر دقت محسوس کرتی ہو تو میں خود اس کا انتظام کرلوں گا۔ اُن کا یہاں زیادہ قیام مناسب نہیں ہے"

یہ کہکر سرت چندر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ شغل کا سامان موجود تھا۔ تھوڑی دیر میں سرت چندر بالکل دوسرے تھے۔ دن کی تمام کلفتیں دور ہو چکی تھیں۔ مالتی سے اب وہ انتہائی خوش طبعی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

اسی دوران میں بنارس کی خاتون باہر سے آئیں اور کمرہ کے دروازہ پر آکر کھڑی ہو گئیں۔ سرت چندر جلدی سے باہر آئے اور اُنھوں نے بہت ہی مودبانہ طریقہ سے خاتون کو "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی" بنارس کی بیوہ چپ رہیں سرت چند پھر لجاجت کے ساتھ بولے "آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"آجکل میں بنارس میں رہتی ہوں"

"آپ کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ لیکن راستہ میں میرا ٹکٹ کہیں کھو گیا"

"ہاں، ہاں" سرت چندر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے۔ آپ بالکل اطمینان سے رہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جس گاڑی سے آپ آئی ہیں کل اسی گاڑی سے آپ جائیں تو زیادہ بہتر ہے"

"تمہارا بہت شکریہ۔ لیکن ایک گاڑی رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی تو روانہ ہوتی ہے"

"جاتی تو ہے۔ لیکن جانے کی آخر جلدی کیا ہے۔ سردی سخت ہے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ رات کی گاڑی سے جانا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اور پھر میں آپ کو جانے کب دیتا ہوں" اور یہ کہکر انھوں نے ایک فرمایشی قہقہہ لگایا۔

سرت چندر شال اوڑھ کر دوستوں سے ملنے چلے گئے۔ شب کو وہ واپس ہوئے تو رات کافی ہو چکی تھی نشہ میں مخمور تھے۔ مالتی نے پوچھا۔

"اتنی دیر کیوں ہوئی؟" انھوں نے مالتی کے ایک چٹکی لی۔ بولے۔ "آج بہت ہی اچھی خبر ہے؟"

"کیا؟" مالتی نے جواب کا انتظار کرتے ہوئے کہا

"میرا تبادلہ تاری گھاٹ ہو گیا"

"اور تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہوا؟"

"ہاں"

مالتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

سرت چندر بولے۔ "تین چار دن میں ہلوگوں کو وہاں چلا جانا ہوگا"

(۶)

صبح کو سرت چندر اُٹھے تو بنارس کی بیوہ موجود تھیں۔ انھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر پوچھا۔ یہ رات کی گاڑی سے گئی نہیں؟"

"عجب آدمی ہو۔ وہ تو جانے کے لئے تیار ہی تھیں۔ تمھیں نے تو زبردستی اُنھیں روکا"

"ہاں؟" سرت چندر نے آزردہ ہو کر کہا۔ "اچھا، میں دوپہر کے وقت خلاصی بھیجدوں گا تاکہ وہ

انھیں اسٹیشن پہونچادے۔ اور ہاں دیکھو۔ برتنوں۔ سے ذرا ہشیار رہنا"

مالتی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے صرف اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شوہر کے اس شبہ کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔

ناشتہ کے بعد مالتی اور بنارس کی بیوہ دھوپ میں دری بچھائے گفتگو میں منہمک تھیں۔ زمانہ کے بعد مالتی کو ایسی صحبت میسر آئی تھی۔ بجوا کی مائی سے ہندوستانی میں گفتگو کرتے کرتے وہ عاجز ہوگئی تھی۔ دو بج چکے تھے، تانگہ کا انتظار تھا۔ بنارس کی بیوہ نے اپنی چیزوں کو یکجا کر لیا تھا اور جانے کے لئے تیار تھیں"۔

ڈھائی بج گئے۔ خلاصی نہ آیا۔ مالتی نے کہا "فرض کیجئے اگر آج آپ نہ جائیں اور دو ایک دن یہاں اور قیام کریں تو کوئی مضائقہ ہے؟ آپ کے آجانے سے میری طبیعت بہت بہل گئی ہے۔ تنہائی میرے لئے مصیبت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں بعض وقت میری طبیعت تو ایسی چاہتی ہے کہ زور زور سے رونے لگوں"

بنارس کی بیوہ نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ لیکن تمھارے شوہر کو شاید میرا زیادہ قیام پسند نہ آئے"

"نہیں نہیں" مالتی نے جواب دیا، ہرچند اُسے اس کا پورا احساس تھا کہ اُن کا شبہ بالکل ہی ٹھیک ہے اس نے سوچنا شروع کیا۔ "وہ تو تمام دن دفتر میں رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ شام کو دوست احباب کے ہاں بھی اُن کا جانا ضرور۔ اُن کی طبیعت تو ہر وقت بہلتی رہتی ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ میں تمام دن کیسے کاٹتی ہوں۔ اب تو تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بجوا کی مائی کمبخت تمام دن پڑی سوتی رہتی ہے۔ اُس کا رہنا نہ رہنا، دونوں میرے لئے مساوی ہے۔ اتفاق سے یہ آگئی ہیں دو چار دن انھیں میں ضرور ٹھہراؤں گی۔ بگڑیں چاہے کچھ کریں۔ میں اُن سے صاف صاف کہدوں گی تمھیں میری خوشی کا کچھ بھی خیال نہیں......"

مالتی سوچتی رہی۔ اُسے سرت چندر سے بڑی محبت تھی۔ لیکن اسوقت وہ جذبات سے مغلوب ہوکر ایسا خیال کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالتی کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی اس تنہائی سے اکتا جاتی۔ ایک دو دن کی یہ مصیبت نہ تھی۔ صبح سے شام تک نہ کسی سے بات چیت، نہ ہنسنا نہ بولنا شام کو سرت چندر آئے بھی تو ناشتہ پانی کرنے کے بعد ٹہلنے چلے گئے۔ اب مالتی دس گیارہ بجے رات شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ مالتی کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔

تین بج گئے تھے، وقت آیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ گاڑی کے جانے کی آواز دیر تک کانوں میں آتی رہی۔ مالتی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے اس وقت کتنا سکون تھا۔ مہمان ہے۔ اب وہ خوش خوش باتیں کر رہی تھی۔

شام کے وقت مالتی نے سرت چندر سے کہا کے لئے بازار سے ناشتہ منگانا چاہا۔ بنارس کی بیوہ نے کہا:—

"تم یہ تمام چیزیں بازار سے کیوں منگاتی ہو۔ خود ہی گھر پر کیوں نہیں بنا لیتیں"

مالتی نے کہا۔ "کون یہ جھگڑا کرے"

"جھگڑا کیا ہے؟" بیوہ عورت نے کہا "اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو یہ تمام چیزیں خود ہی پکا لیا کرتی۔"

مالتی خاموش رہی۔ عورت نے کہا۔ "آؤ آج ہم تم مل کر پکائیں۔ دیکھو گھر کی چیز کتنی اچھی اور پھر کس قدر کم دام میں تیار ہوتی ہے۔"

(۳)

سرت چندر آج دفتر سے کچھ دیر میں واپس ہوئے۔ جب اُن کی نظر بنارس کی بیوہ پر پڑی تو وہ چلا اُٹھے۔ مجھ سے کیا بھول ہوئی۔ اللّٰہ ...... خیال ہی نہ رہا کہ مجھے گاڑی کے وقت خانہ پر پہنچا ہے۔ "مجھے آپ سے ندامت وشرمندگی ہے" اُنھوں نے بنارس کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بہرحال چونکہ آپ نے دو دن یہاں تکلیف کی ہے ایک دن ہم لوگوں کے خیال سے اور ٹھہر جائیے۔ مجھے کل کام پر جانا نہیں ہے۔ میں خود ہی کل آپ کو گاڑی میں سوار کرا دوں گا"

وہ کمرہ میں گئے۔ مالتی نے دیکھا کہ اُن کے منھ سے شراب کی بہت زیادہ بو آرہی ہے۔ اس سے ڈر گیا ...... بولی۔ "تمہاری حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ تاری گھاٹ میں جب تم زیادہ کماؤ گے تو اور اپنی حالت خراب کر لوگے۔"

سرت چندر نے لاپرواہی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ وہاں کیا کوئی کلب کمپنی ہے۔ تاری گھاٹ، شہر سے باہر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ وہاں یہ چیزیں کہاں میسر۔ وہاں پہونچتے ہی میں اشنان کروں گا اور پھر "یکدم" چھوڑ دوں گا"

"یکدم" کے لفظ پر اُنھوں نے کافی زور دیا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"کل دفتر جاؤ گے؟" مالتی نے پوچھا۔

"نہیں۔ آج میں نے تمام کام ختم کر دئے اور کام سمجھا بھی دیا۔ پرسوں میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں اپنے دوستوں کو چا پر مدعو کیا ہے۔ اور کل مجھے اس کے متعلق تمام انتظامات کرنے ہیں"

اس کے بعد سرت چندر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ آج، خلاف معمول، دسترخوان پر انواع واقسام

کی چیزیں موجود تھیں۔ انھوں نے مالتی سے پوچھا "آج یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟" مالتی نے بتایا
سرت چندر بولے "میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے۔ اگر یہ پرسوں تک یہاں ٹھہر جائیں تو ہم لوگوں کو دعوت کے انتظام میں بہت زیادہ سہولت ہوگی"

"لیکن تم خود ان سے کہو تو بہتر ہے" مالتی نے مسرت کے ساتھ کہا۔

"لیکن اس حالت میں، میں ان کے پاس جاؤں کیسے؟"

"بیوقوف!" مالتی نے کسی قدر ملامت آمیز لہجے میں کہا "کیا تم نے ایک دفعہ بھی آج ان سے گفتگو نہیں کی ہے؟"

"ہاں ہاں؟" سرت چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں یاد آیا۔ بولے "ہاں ہاں، ٹھیک کہتی ہو، میں نے ان سے باتیں کی تھیں"

مالتی نے شوہر کا پیام، بنارس کی بیوہ تک پہنچا دیا۔ انھوں نے خوشی سے منظور بھی کر لیا۔

(۸)

اتوار کا دن تھا۔ سرت چندر آج ہی تاری گھاٹ روانہ ہونے والے تھے۔ بنارس کی بیوہ نے مالتی سے کہا "میں نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ اب میرا خیال بنگال جانے کا نہیں ہے۔ میں بنارس ہی واپس جاؤں گی"

مالتی بولی "تو پھر کیا اچھا ہوتا اگر آپ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلتیں اور دو ایک دن تاری گھاٹ میں بھی قیام کرتیں۔ تاری گھاٹ، بنارس سے تین چار اسٹیشن تو ہی ہے"

اسی دوران میں سرت چندر باہر سے آئے اور بازار کا سامان حاصل کرنے کے لئے انھوں نے مالتی سے تیس روپئے طلب کئے۔

"تیس روپئے؟" مالتی نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن روپئے ہیں کہاں؟"

"کل ہی میں نے تمھیں اسی روپئے لاکر دئے ہیں۔ کیا وہ سب خرچ ہوگئے؟"

"دیکھتی ہوں" مالتی بولی "لیکن دعوت ہی کے لئے تم نے یکمشت مجھ سے پچاس روپئے لئے تھے۔ اور پھر کل شام کو دوستوں کے لئے شراب منگانے کو تم نے کئی بار باہر سے روپئے منگائے" یہ کہتی ہوئی مالتی گئی اور اس نے اپنے بکس کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کل دو روپئے چودہ آنے باقی ہیں۔

سرت چندر مضمحل ہوگئے۔ "اب میں کیا کروں؟" انھوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی اس کے ذمہ دار ہو" مالتی نے قدرے سکوت کے بعد کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھارے

یہ عادت تمھیں ایک دن تباہ و برباد کر کے چھوڑے گی۔ تمھیں کل کا خیال بالکل ہی نہیں رہتا۔ روپے کو کسقدر بے پرواہی سے خرچ کرتے ہو!"

سرت چندر نے مالتی کے وعظ و پند پر کوئی توجہ نہ کی اور یہ کہتے ہوئے باہر جانے لگے کہ دیکھو کہیں سے انتظام کرتا ہوں۔

بنارس کی بیوہ یہ تمام باتیں باہر سے سن رہی تھیں۔ انھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر کہا: تمھارے شوہر کو مجھ سے روپیے لینے میں کچھ تامل ہوگا، چونکہ اب میں مکان نہیں جارہی ہوں اس لئے اسوقت مجھے روپے کی ضرورت بھی نہیں ہے"

مالتی نے سرت چندر سے جاکر کہا۔ لیکن وہ بولے "نہیں ایسا کیونکر ممکن ہے اُن سے کس طرح قرض لے سکتے ہیں؟"

بنارس کی بیوہ خود ہی نزدیک آگئیں۔ بولیں "تمھیں مجھ سے قرض لینے میں کیا تامل ہے؟"

سرت چندر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے۔ لیکن اگر آپ ہلوئوں کے ساتھ تاری گھاٹ چلیں تو میں پانچ چھ دن میں آپ کے روپیے ادا کر دوں گا۔"

"کیوں؟ روپیے ادا کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ جب تمھارے پاس روپیے ہوں مجھے واپس دیدینا اس وقت تمھیں کتنے کی ضرورت ہے؟ صرف تیس کی؟ میرے پاس روپیے موجود ہیں۔ اگر زیادہ کی بھی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو۔ آخر تم سوچتے کیا ہو؟ اس میں زحمت کیا ہے؟"

"جی ہاں تیس روپیے میں کام چل جائے گا۔ لیکن آپ کی بہت نوازش ہے"

بنارس کی بیوہ نے اپنا بکس کھول کر دس دس روپیے کے تین نوٹ سرت چندر کے حوالے کئے۔

اُسی دن رات کی گاڑی سے سرت چندر تاری گھاٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔ بنارس کی بیوہ ساتھ تھیں۔ بھجو اکی مائی کو سرت چندر اپنے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ تاہم اُس نے چلتے وقت کافی واویلا مچایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو اس جدائی کا بڑا قلق ہے کہ اس کا اثر کبھی زائل ہی نہیں ہوسکتا۔

مالتی چاہتی تھی کہ بنارس کی بیوہ کسی صورت سے تاری گھاٹ میں بھی دو چار دن قیام کرے۔ وہ اُن سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اُس نے گاڑی میں بھی اُن سے بہت اصرار کیا لیکن انھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ صبح کے وقت سرت چندر کو دلدار نگر میں دوسری گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ وہاں انھوں نے بنارس کی بیوہ کو الوداع کہا۔

(۹)

صبح ہوتے ہی یہ لوگ تاری گھاٹ پہونچ گئے۔ یہاں ریلوے کا کوارٹر تھا۔ وہیں ان لوگوں نے قیام کیا۔ چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کے بعد سرت چندر اپنے نئے رفیقوں سے ملنے باہر چلے گئے۔ مالتی نے غسل کرنے کے لئے ایک صندوق کھول کر اپنے لئے ایک ساری نکالنی چاہی۔ یہ وہ صندوق تھا جس میں وہ عموماً اپنے زیور کا چھوٹا بکس رکھا کرتی تھی۔ لیکن اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسنے دیکھا کہ زیور کا بکس صندوق میں موجود نہیں ہے۔ اُسنے آپ ہی آپ کہا " یقیناً یہ کسی دوسرے صندوق میں ہوگا" اور یہ کہکر وہ ایک ایک صندوق کو کھول کھول کر دیکھنے لگی لیکن بکس کسی میں موجود نہ تھا۔

" نہیں نہیں یہ کہیں ضرور ہوگا" مالتی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر اُس نے ایک ایک صندوق کا جائزہ لیا۔ لیکن بکس کا کہیں پتہ نہ تھا"

بالآخر زمین پر وہ بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سرت چندر واپس ہوئے تو انھوں نے مالتی کو اس حال میں دیکھکر پوچھا " کیا ہے؟"

مالتی نے ہچکی لے لے کر تمام واقعات سرت چندر سے دہرائے۔ سرت چندر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انتہائی غم و افسوس کے ساتھ وہ ایک کرسی پر گر پڑے اور پوچھا۔

" تم نے تمام سامان دیکھ لیا ہے؟"

" ہاں"

" سب سے آخر مرتبہ تم نے بکس کو کب دیکھا تھا؟"

" مجھے یاد ہے، میں نے کل داناپور میں اسے بڑے صندوق میں رکھا تھا"

" تمھیں یاد ہے، تم نے کوئی چیز نکالنے کے لئے صندوق کو گاڑی میں کھولا بھی تھا؟"

" ہاں۔ ایک مرتبہ۔ مجھے بہت سردی معلوم ہو رہی تھی تو شال نکالنے کے لئے میں نے ایکبار کھولا تھا"

" ہوسکتا ہے کہ تم نے بکس کو باہر نکالا ہو اور پھر رکھنا بھول گئی ہو"

" نہیں" مالتی نے یقین کے ساتھ کہا۔ " شال تو اوپر ہی تھی۔ میں دوسری چیزوں کو کیوں الٹ پلٹ کرتی"

" اس کے بعد تم نے کنجی کہاں رکھی؟"

" کنجی کو میں نے اپنے کمربند میں باندھ لیا تھا"

" اور پھر تم اس کے بعد سو گئیں"

"ہاں" مالتی نے اپنے شوہر کے چہرہ پر خاموش نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا" سرت چندر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ " یہ اُسی اجنبی عورت کا کام ہے۔"

مالتی نے اس کی تردید نہ کی۔ خاموش رہی۔ سرت چندر پھر بولے۔" جب تم سو گئی ہو گی تو اُس نے آہستہ سے کنجی تمھارے کمربند سے کھول لی ہوگی۔ تم نام جانتی ہو؟"

"نہیں۔ میں اُن سے اُن کا نام کیونکر پوچھتی۔ وہ تو مجھ سے عمر میں بہت کافی بڑی تھیں"

"وہ، بنارس میں رہتی کہاں ہیں؟"

"کسی مٹھ میں"

"کسی مٹھ میں؟ وہاں تو سیکڑوں مٹھ ہیں"

اب سرت چندر برہم ہو چلے تھے۔ بولے "میں نے تمھیں پہلے ہی متنبہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں پر اعتماد و یقین نہ کرنا چاہئے۔ یہ بنارس کی عصمت فروش عورتیں، ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں" سرت چندر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بولے "اُس نے اپنے تیس روپے سے اچھا سودا کیا"

"لیکن مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہوگا۔ ممکن ہے میں نے خود ہی داناپور میں اسے چھوڑ دیا ہو" مالتی نے قدرے یقین کے لہجہ میں کہا۔

لیکن سرت چندر نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ "تمھیں دُنیا کا بہت کم تجربہ ہے۔ تم کیا جانو کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے" یہ کہتے ہوئے سرت چندر پولس کو اطلاع دینے کیلئے باہر چلے گئے۔

(۱۰)

پندرہ دن گزر گئے۔ زیوروں کا غم دن بدن کم ہوتا گیا۔ اب پھر سرت چندر اور مالتی خوشی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ سرت چندر کا موجودہ کام کافی نفع بخش تھا۔ اس نے ان لوگوں کے غم کو غلط کر دیا تھا۔

خبر پاتے ہی دلدار نگر کے جمعدار اُسی دن تار گھاٹ پہونچ گئے تھے۔ انھوں نے سرت چندر کا بیان قلمبند کر لیا تھا اور زیوروں کی ایک مکمل فہرست بھی مانگ لی تھی۔ لیکن اب تک پولس کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سرت چندر دفتر گئے ہوئے تھے۔ مالتی دن کا کھانا کھا رہی تھی کہ دلدار نگر سے گاڑی آئی۔ مالتی کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی تو وہ دوڑ کر کھڑکی میں چلی جاتی اور اسٹیشن کی چہل پہل کو غور سے دیکھا کرتی۔ گاڑی کے آنے پر پلیٹ فارم پر کیسی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مالتی کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اسے غور سے دیکھتی اور بہت لطف حاصل کرتی۔

اس وقت بھی وہ کھانا چھوڑ کر دریچہ کی طرف دوڑ گئی۔ بالکل غیر متوقع منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بنارس کی بیوہ گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئیں۔ قلی ان کا سامان اتارنے لگا۔ مالتی نے دیکھا کہ انھوں نے قلی سے کچھ دریافت کیا اور قلی نے اس کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چند لمحوں میں چوری کے الزام میں ماخوذ ہونے والی ہے۔ وہ دوڑ کر واپس ہوئی۔ بچے ہوئے کھانے کو اس نے جلد ہی جلدی علٰحدہ رکھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔ اس کی حالت غیر ہوئی جاتی تھی۔ خیالات کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آرہا تھا۔ "خدا کرے انھیں اسکی واقفیت نہ ہوئی ہو کہ میرے شوہر نے ان پر چوری کا شبہ کیا" جانے کتنے معصوم جذبات کے ساتھ وہ خدا سے دعائیں کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مالتی اب تک بنارس کی بیوہ کو اس معاملہ میں قطعاً بے گناہ سمجھتی تھی۔ اور اب تو اسے یقین کامل ہو گیا کہ یہ انکا کام نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر انھیں آنے کی یہاں دوبارہ جرأت کیسے ہوتی۔

چند لمحوں کے بعد بنارس کی بیوہ مالتی کے سامنے تھیں۔ مالتی نے انھیں "پرنام" کرتے ہوئے کہا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ تشریف لائیں" بیوہ نے مالتی کے سر پر محبت کا ہاتھ دھرا اور آہستہ آہستہ دعائیں دیں۔ مالتی نے چاہا کہ کھانے کا انتظام کرے لیکن بیوہ نے روکا اور کہا۔ "نہیں اس کی زحمت نہ کرو۔ آج ایکادشی ہے اور میں برت سے ہوں۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ مالتی نے دیکھا کہ اس کے مہمان کا چہرہ بالکل اترا ہوا ہے شگفتگی نام کو بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ پر کوئی بوجھل چیز رکھی ہے اور وہ حد درجہ ملول اور افسردہ ہے۔ مالتی نے کہا۔ "کیوں، آج آپ کچھ ملول نظر آتی ہیں"

"تمھیں تو اس کی وجہ جاننی چاہئے" بیوہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" مالتی کی زبان سے نکلا اور وہ جواب کا لرزتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

"تمھیں شبہ ہے کہ میں نے تمھارے زیور چرائے۔ تم نے پولیس کو میرے پیچھے دوڑایا اور پھر تم مجھ سے دریافت کرتی ہو کہ میں کیوں ملول نظر آتی ہوں"

مالتی کی زبان تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئی۔ انتہائی شرم و ندامت کے لہجہ میں وہ صرف اتنا کہہ سکی "آپ کو یقین ہے کہ میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا شبہ اپنے دل میں پیدا کیا ہوگا؟"

"لیکن تمھارے شوہر نے تو ایسا کیا" بنارس کی بیوہ نے ذرا تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

مالتی معذرت کے ساتھ پھر بولی۔ انھیں یقین نہ تھا کہ پولیس آپ کو تلاش کر سکے گی۔ آج ہی صبح کو وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بنارس میں بے شمار مٹھ ہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ کسی گمنام ہستی کو ان تمام

مٹھوں میں سے تلاش کیا جائیگا۔"

"لیکن پولیس نے بہر حال مجھے تلاش کر ہی لیا اور انھوں نے مجھے اس قدر پریشانیوں میں مبتلا کیا کہ بالآخر مجھے دو سو روپیہ دے کر اُن سے اپنی جان چھڑانی پڑی۔ یہ تم لوگوں سے دوستی کا انجام ہے مجھے سخت افسوس ہے"

تھوڑی دیر تک کامل خاموشی رہی۔ پھر اُس بیوہ عورت نے کہا "تمھارے شوہر واپس کب ہوتے ہیں؟"

"رات تک۔"

آسمان پر ابر کے ٹکڑے دوڑتے ہوئے۔ آفتاب بادلوں میں چھپ گیا۔ بنارس کی بیوہ نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش کے آثار معلوم ہوتے ہیں"

"کیوں؟" مالتی نے پوچھا

"مجھے آج ہی جانا ہے۔"

"آج ہی؟" مالتی نے طفلانہ سادگی سے پوچھا۔ "کیوں، ایسی جلدی کیا ہے؟"

بیوہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم آیا اور انھوں نے کہا۔ "بیوقوف لڑکی۔ تیرے شوہر مجھے ڈاکو تصور کرتے ہیں اور تو چاہتی ہے کہ تیرے ہاں اور ٹھہروں۔ نہیں مجھے آج ہی ڈھائی بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔ میرے مٹھ کی بہت سی عورتیں جاترا کے لئے جا رہی ہیں اور مجھے بھی اُن لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔"

"آپ وہاں کیا زیادہ دنوں تک رہیں گی؟" مالتی نے پوچھا

"کیوں پوچھتی ہو؟" بیوہ نے آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ پھر ہم تم نہ مل سکیں گے؟"

بیوہ کا دل بھر آرہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں غم و الم کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد عورت نے کہا "میری بچی کیا تو مجھے خوش کرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں" مالتی نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے پاس یہاں کچھ زیور ہیں۔ کیا تم انھیں میری خواہش سے پہن سکتی ہو" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک صندوق کو کھولکر ایک اعلیٰ درجہ کا بکس نکالا۔ بکس بہت خوشنما تھا۔ اُنھوں نے بکس کا ایک بٹن دبایا جس سے اُس کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا۔ سونے کے زیور ہیرے، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھروں سے مزین۔ مالتی کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

عورت نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "یہ چیزیں میں اپنی طرف سے تمھیں دیتی ہوں" تھوڑی دیر کیلئے مالتی ششدر اور مبہوت ہو کر رہ گئی۔ پھر اُس نے کہا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں میں ان چیزوں کو نہیں

قبول کر سکتی۔"

"کیوں نہیں" عورت نے شکایت کے لہجہ میں پوچھا

"کیوں؟ میں یہ تمام چیزیں آپ سے کیوں لوں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی ہیں"

"لیکن میں تو اپنی خوشی سے یہ چیزیں تمہیں دے رہی ہوں۔"

"ہو۔ لیکن مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں انھیں لوں۔ نہیں، میں نہیں لوں گی۔"

آسمان بہت زیادہ ابر آلود ہو گیا تھا۔ طوفان کے بھی علامات نظر آرہے تھے۔ دن کی روشنی تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔

عورت نے دھیمی آواز میں لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا۔ "فرض کرو کہ تمھیں اسکا حق حاصل ہے"

"مجھے اس کا حق حاصل ہے؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" مالتی نے حیرت واستعجاب کے لہجہ میں پوچھا"

بیوہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں۔ "ہاں میں تم سے کہوں گی۔ اور اسی لئے آج میں تمھارے پاس آئی بھی ہوں۔"

مالتی کا دل کسی غیر متوقع خطرے سے دھڑکنے لگا۔ اس نے عورت کی طرف مضطربانہ نگاہ ڈالی۔

"کیا واقعی تمھاری ماں مر چکی ہے؟" عورت نے پوچھا۔

"لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں" مالتی نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں جواب دیا۔

"تو پھر تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ہی تمھاری بدقسمت ماں ہوں" لیکن اتنا کہکر وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مالتی کی حالت اسوقت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ اپنی ماں سے علٰحدہ ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دماغ میں یک بیک ایک واقعہ کی یاد تازہ ہوئی جو آج سے چند ماہ پہلے پیش آیا تھا۔ داناپور آنے سے پہلے وہ اپنی دادھیال میں تھی۔ ایک دن شب کے وقت وہ سو رہی تھی۔ اور بغل ہی میں اس کی چچی اور ایک ضعیفہ جس کا نام مکشودھا تھا اور جسے مالتی "دادی دادی" کہکر پکارتی تھی سوتی تھیں۔ شب کے وقت مکشودھا، اس کی چچی سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن مالتی کی نیند ٹوٹ چکی تھی اور مکشودھا کو اس کی خبر نہ تھی کہ مالتی جاگ رہی ہے۔ مکشودھا ابھی ایک طویل تیرتھ سے واپس آئی تھی۔ مالتی نے جو کچھ سنا اُس سے ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا کہ مالتی کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اُسے بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں جسے آج تک وہ مردہ سمجھ رہی تھی دراصل مری نہیں ہے اور مکشودھا سے اتفاقیہ طور پر اُس کی ماں سے ایک تیرتھ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سب سے عظیم صدمہ

جو مالتی کو ہوا وہ یہ جان کر ہوا کہ جس ہستی کی مقدس یاد وہ اپنے دل میں آج تک تازہ رکھتی آرہی تھی وہ دنیا کی نظروں میں ایک "بدچلن عورت" ہے۔ مالتی کو جیسی روحانی تکلیف اُس رات کو ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔" اور یہ عورت جو اُس کے سامنے کھڑی ہے وہ اُس کی وہی ماں ہے!"

اُس کی ماں اب تک زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی ایک بارش تھی جو کسی طرح نہ رکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی طبیعت کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میرے داماد کو بھی اس کی خبر ہے؟"

"نہیں۔ اُنھیں نہیں معلوم"

"تمھیں اس واقعہ کی اطلاع کب ہوئی"

"شادی کے بعد"

"مکشودھا چچی سے سنا ہوگا؟"

"ہاں"

"مجھے بھی اُنھیں سے معلوم ہوا کہ تمھاری شادی اب ہو چکی ہے۔ اور تمھارے شوہر داناپور میں مال بابو ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم آسوں کے مہینہ داناپور جاؤ گی"

مالتی نے اپنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ محض اتفاقیہ طور پر آپ داناپور نہیں آئی تھیں۔ لیکن آپ آئیں کیوں؟" مالتی کے لہجہ میں اب ذرا سختی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کبھی وہ ایسے مجرم کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتی۔

غریب ماں پر پھر رقت طاری ہوئی اور اُس نے اُسی عالم میں رُک رُک کر کہا۔ "کیا کوئی اپنی اولاد کو بھی بھول سکتا ہے" لیکن اتنا کہتے۔ کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اب مالتی کو بھی رونا آرہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک نووارد عورت سے وہ کیونکر پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ مانوس ہو گئی تھی۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ محض خون کی کشش تھی، کوئی اور بات نہ تھی۔

"تو آپ نے اپنے کو کیوں ظاہر کیا؟" مالتی نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن میں اپنے آپ کو روک نہ سکی"۔

"مالتی یہ کہنے ہی کو تھی کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس راز کو مجھ پر ظاہر کر دیا ورنہ میں اپنی ماں کو کیسے پہچانتی" لیکن فوراً ہی دل کی آواز نے اُسے پکارا "کیا سوجھتی ہے؟ ایسی ناپاک ماں۔ بہتر تھا کہ اس کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی جاتی"

مالتی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بالکل اُسی طرح جیسے پاگلوں کی آنکھیں بعض وقت چمکنے لگتی ہیں۔ وہ تلخ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

گاڑی کا وقت قریب آگیا تھا۔ قلی، جیسا کہ پہلے طے پاچکا تھا، سامان لینے کے لئے آیا۔

"آپ ان جواہرات کو لیتی جائیں۔ میں انھیں نہیں پہن سکتی" مالتی نے کہا

بیوہ نے مالتی کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ اُس نے معلوم کیا کہ اسوقت اس کے دماغ میں کس نوع کی باتیں چکر لگا رہی ہیں۔

"جیسا تم خیال کرتی ہو، وہ بات نہیں ہے۔ تم اِن چیزوں کو بلا تامل استعمال کرسکتی ہو۔ اگر ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی تو میں انھیں تمھیں دینے کے بجائے دریا میں پھینک دیتی۔ اپنی زندگی کے صرف ایک گناہ کی پاداش میں، میں نے یہ تمام اذیتیں جھیلی ہیں اور کامل چودہ سال میں نے اس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ یہ جواہرات میری سیاہ کاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔ میرے باپ ایک دولتمند آدمی تھے اور انھوں نے شادی کے وقت مجھے یہ چیزیں دی تھیں"

"لیکن پھر بھی میں شوہر سے دریافت کئے بغیر انھیں نہیں استعمال کرسکتی"

"ہاں۔ تم اُن سے پوچھ لو۔ اگر بالفرض وہ تمھیں اس کی اجازت نہ دیں تو تم ان چیزوں کو فروخت کرکے کسی مندر میں اس کے روپئے دیدینا"

ماں جانے لگی۔

مالتی کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ خون کے جوش سے وہ بالآخر مجبور ہوگئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے ماں کے قدموں کو پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسی عالم میں اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل سکے۔ "ماما۔ پھر آنا"

"خوش رہو۔ خدا تمھیں عافیت دے، اور چین سے زندگی گزارو" ماں نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ موجود نہ تھی۔

(ماخوذ از بنگلہ)

پربھت کمار مکرجی　　　ظہیر الدین حیدر، نیر آروی

لامذہبیات

یعنی

(مذہب ایک لامذہب کے نقطۂ نگاہ سے)

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اسے فطرت کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہل علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہل مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شئے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے۔ کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو۔ الغرض اہل علم و اہل مذہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلاف نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اس لئے اہل مذاہب بزور شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادر مطلق کے بجائے Almighty Dollar کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہل کلیسہ حیران ہیں کہ وہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قایم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رو کافی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن اسوقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

اہل مذہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے، وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انہیں یہی معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلائل کی بناء پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں۔

امریکہ وغیرہ میں تو اہل مذہب اُن کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں، لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہل مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلہ کے لئے کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسایل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے، لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کی اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بہرا ہی سمجھا جائے گا۔ پھر چونکہ پیروان اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اس لئے اس کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پُرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پُرانے اعتراضات کو بھی کبھی دفع کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہل مذہب واقعی الحاد کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ اُن کے دلایل کا کوئی مسکت جواب اُن سے ممکن ہے یا نہیں۔ صرف گالیاں یا بددعائیں دینے سے کام نہیں چلتا، چنانچہ میں آج کی صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک لامذہب (انگرسول) کا زاویۂ نگاہ مذہب کے باب میں کیا ہے اور یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رہیگا تاکہ اہل مذہب کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے۔ ضرورت ہے کہ ملحدین کے ان شکوک و اعتراضات کو دور کیا جائے جو اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے اگر اس دوران میں کوئی جوابی و اصلاحی مقالہ کسی کی طرف سے موصول ہوا تو وہ بھی ساتھ ہی ساتھ شائع ہوتا رہیگا۔ مجھے امید ہے کہ قارئین نگار نہایت ٹھنڈے دل سے بغور اس سلسلہ کا مطالعہ کریں گے۔

مذہب کیا ہے ——

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے

خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے۔"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے ماتحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے، چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا اُن کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا، اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آیندہ کے لئے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے اب اہم اعتقادات کو پیش نظر رکھ کر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی اور چونکہ اسوقت تک اہل مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:۔

کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے؟

کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے؟

کیا واقعی خدا ہمارا تمہارا خالق ہے؟

کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

(۱) اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست۔

مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراستِ کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقایص تخلیق کی کوئی معقول توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے؟

(۲) اگر خدا تمام اُمور عالم کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟

کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بیگناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

کیا وہ دورِ غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا کر کر کے قتل و ذبح کر دئے گئے۔

کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بیگناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علحدہ کر دینے پر مشتمل تھے۔

خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں۔

خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقعہ دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سل ودق، سرطان وخناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے جن سے نہ معصوم بچے بچ سکتے ہیں نہ بڑے ... ان۔

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا۔ زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا، اور خدا کا کچھ نہ کہنا، عجیب معمہ ہے۔

کیا اس نے ناخن وچنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اسنے پر وبال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور دبکیں آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بناکر اپنی بھوک مٹاتے رہیں۔

کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو، اور کیا تدبیر عالم یہ آہ اور کراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات وحالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا — ایک خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں — اطاعت، فرمانبرداری نفس کشی، صبر وتحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرات واقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا۔

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہے ہیں لیکن سوائے جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا اُن کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا، اُن کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے۔ بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے۔ مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دیکر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے بادسموم کے اُن جھونکھوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں۔ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہ کاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملیگا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلے و طوفان، قحط و وبائی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے۔ تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے۔ لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی، ان کو ایذائیں پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا، نوعِ انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دیگا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، اور کتنی ماؤں کے دل اُن کے بچے جدا کر کے تڑپائے گا۔ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا۔

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دیدیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں

وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقعہ نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروا یا گیا، وہ بیشمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا۔ اور وہ لاتعداد بدکار، ظالم انسان جنھوں نے دُنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں ۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنیوالے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور کیا یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اسنے جو قدم اُٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کرکے چل پڑتا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کرکے منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اسی قوت نے دیا یا خود اس کے تجربہ نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والا ہے، یہ قوتِ ادراک و ارادہ سے بالکل معرّا ہے، اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس، اخلاق کے وجود کو، وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان طبعاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خاندانوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے۔ پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی و عائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کیے گئے، اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں برا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے برے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے

رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی ما فوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ اگر سوال عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فایدہ پہونچایا جب اس کا اقتدار قایم تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا۔ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ پر کیا ہوا۔ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فایدہ اس سے حاصل ہوا۔ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ، و اسکاٹلینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا۔ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو تھے تو کیا وہ خراب ہو گئے تھے۔ اگر ٹورکیمڈا، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہوتا۔ کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا، کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قایل نہ ہوتے، کیا جان ناکس اور زیادہ بُرے اخلاق کا ہو جاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشس کا ماننے والا ہوتا۔

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت و اُلفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قایل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفاتِ مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہوا و ل کا رخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی

ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہوسکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اُصول مرتب نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اسکے لئے چند بنیادی حقایق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہوسکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علحدہ نہیں ہوسکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کے وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی فوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں جسے مدبر کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ مکنات میں تھا وہ واقع ہوا، جو مکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہیگا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا جو کچھ نہیں ہوا ہے وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اور جو ہوچکا ہے اس کا ہونا لازم تھا۔ سیاروں کی تخلیق و گردش سے ایک رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ، الہامات و معجزات، کلیسا و خانقاہ، قید خانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، فوجکشیاں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی، الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہیں وہ خیالات اس زمانہ کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں، رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے

تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کے اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں الجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اسکی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت ہے اس مذہب روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوائے بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہیگی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات، اخلاقی اصول عامہ کو پس پشت ڈالکر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہ تبلیغ قایم کرے وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا۔ اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل ارگنائزیشن" کی حیثیت نہ دیجائے۔

"نگار" کے پرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت ملسکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:-
(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر — سنہ ۲۳ء مئی ۴ر — (سنہ ۲۴ء) جنوری - فروری و اگست ۴ر فی پرچہ (سنہ ۲۶ء) جنوری جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۲۷ء) اپریل - مئی و جون ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی - اگست - ستمبر - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر — فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری - جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۴ء) فروری تا مئی و اکتوبر ۶ر فی پرچہ — (سنہ ۳۵ء) جنوری (اردو شاعری نمبر) عہ ر —

منیجر نگار لکھنؤ

سائنس کے اکتشافات جدیدہ

۱

صدہا سال سے یہ خیال علماء میں رائج چلا آرہا ہے کہ مادہ تین صورتوں میں پایا جاتا ہے یعنی وہ رقیق ہوگا یا منجمد یا دُخانی (گیسی) حالت میں۔ لیکن فلکیات کے ماہرین کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ مادہ کی چوتھی صورت اور بھی ہے، یعنی یہ کہ اس کے ذرات بھُربھُری حالت میں بھی پائے جاتے ہیں جس کا نام انھوں نے "سفوفی ذرات" رکھا ہے۔

فضا میں جتنے سیارے اس سفوفی حالت میں پائے جاتے ہیں وہ دریافت ہوچکے ہیں جن کا نام انھوں نے سفید بونے یا "اقزام سفید" (WHITE DWARFS) رکھا ہے۔ اس تسمیہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹے ہیں اور شعاعوں کی کثرت سے بالکل سفید معلوم ہوتے ہیں۔

ان میں غیر معمولی حرارت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی اس سلسلہ کا ایک سیارہ دریافت ہوا ہے اس کی بالائی سطح کا درجۂ حرارت ۱۱۰۰۰ ڈگری ہے یعنی آفتاب کی حرارت سے بھی دوچند۔

ان میں سب سے چھوٹا سیارہ وہ ہے جسے امریکہ کے مشہور ہیئت داں کوپر نے گزشتہ سال دریافت کیا ہے۔ اس کی جسامت کو سورج کی جسامت سے وہی نسبت ہے جو ایک کو ۸۰ لاکھ سے ہے۔ اس کا ثقل پانی سے ۳۶۰۰۰۰۰ گنا زاید ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے ایک مکعب انچ کا وزن ۶۲۰ ٹن ہے۔ اگر سوئی کی نوک کے برابر اس کا ایک ذرہ کسی انسان پر گر پڑے تو سُرمہ کرکے رکھ دے۔

اس کا درجۂ حرارت ۲۸۰۰۰ ڈگری ہے اور اسی لئے اس کے ذرات سے پیدا ہونے والی گیس اتنی وزنی ہوتی ہے کہ اگر ٹینس کا ایک گیند اس سے بھر دیا جائے تو اس کا وزن ایک ہزار ٹن ہو جائے۔ اس کی کشش ثقل اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اس زمین کا ایک انسان جس کا وزن گیارہ اسٹون کا ہے وہاں پہونچکر ۲۵۶۲۵ ٹن کا ہو جائے گا اور یہ کشش ثقل اتنی زبردست ہے کہ وہ فوراً پانی کی طرح رقیق ہو کر رہ جائے گا۔

سورج کے ہر مربع انچ سے پچاس گھوڑوں کی طاقت ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے لیکن اس سیارہ کے ہر مربع انچ سے ۳۰ ہزار گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔

ان سیاروں کی قوت آہستہ آہستہ گھٹتی رہتی ہے یہاں تک کہ ان کا اشعاع (RADIATION) زایل ہوجاتا ہے اور وہ ایک بڑے تاریک ذرہ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

۲ ـــــ حال کی تحقیقات سے بعض ماہرین سائنس اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہم 'نبتاً خلا کے ایک بہت خالی کونے میں زندگی بسر کررہے ہیں اور ستاروں کا قریب ترین جھنڈ، کرۂ زمین سے ۲۶ ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے پیچھے ہٹتا جارہا ہے۔

انشٹین کا سابق نظریہ کہ خلا میں چونکہ انحنا پایا جاتا ہے اس لئے لامتناہی نہیں ہے، معرض بحث میں آگیا ہے یہاں تک کہ خود انشٹین بھی مشتبہ ہوگیا ہے۔ اگر انشٹین کا یہ نظریہ صحیح ہو تو خلا کی وسعت صرف آٹھ گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے لیکن جدید تحقیقات سے یہ وسعت اور زیادہ پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس لئے وہ فضا میں انحنا کے خیال سے ہٹتے جاتے ہیں۔

کائنات کی عمر کے متعلق بھی جدید اکتشافات ہوئے ہیں۔ کچھ زمانہ قبل بعض نے یہ خیال قایم کیا تھا کہ سیاروں کی عمر کا اندازہ کروروں نہیں بلکہ ارب اندر ارب سالوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ کرۂ زمین کی عمر کا پتہ چٹانوں سے چلایا جاتا ہے اور اس طرح اس کی عمر دو ارب سال معلوم ہوتی ہے لیکن جو شہاب ثاقب زمین پر آکر گرتے ہیں ان کے امتحان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمین بلکہ تمام نظام سیارگان کی عمر اتنی ہی ہو۔

۳ ـــــ زمین کا گزشتہ کارڈ اس وقت تک جتنا معلوم ہوا ہے وہ صرف ۱۶۰۰۰ سال قبل کا ہے یعنی اسوقت تک کا جب ڈنمارک، جرمنی اور پولینڈ اول اول برفستان سے نمودار ہوئے لیکن علماء طبقات الارض برابر تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔

عہد ثلجی (برف) ایک ایسی دیوار ہے جس سے آگے بڑھنے کی کوئی صورت اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ گرین لینڈ کے اوپر جو غلاف برف پڑا ہوا ہے اس کی چھان بین سے بھی کوئی زیادہ مفید مطلب بات معلوم نہیں ہوئی۔

مصنوعی زلزلے پیدا کرکر کے اس غلاف برف کا عمق معلوم کیا جارہا ہے۔ اور اس طرح اندر کی طرف جن چٹانوں کا پتہ چلا ہے ان میں مختلف لچک پائی جاتی ہے۔ بعض چٹانیں بالکل خشک دریافت ہوئی ہیں اور بعض بالکل تر۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین کے اندر فراہمی آب کے خزانے کہاں اور کن صورتوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اصحاب علم و سیاست دونوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔

بعض تحقیقاتی پارٹیاں جو نیوگانما اور پاپوا کی طرف اسی سلسلہ میں گئی تھیں وہ اتفاقاً بعض [illegible]

سے بھی دوچار ہوئیں جو ہنوز عہد حجری کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

چار مہمیں قطب جنوبی کی طرف حال ہی میں روانہ ہوئی تھیں۔ ان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی ایسی بیماریاں جو کرۂ ارض کے آباد علاقوں میں ناقابل علاج سمجھی جاتی ہیں یہاں از خود دور ہو جاتی ہیں۔ یقیناً وہ زمانہ دور نہیں ہے جب قطب جنوبی کے بادصے انسانی آبادی کے لئے کھل جائیں گے اور وہاں زندہ رہنے کے ذرائع ہاتھ آجائیں گے۔

۴ ــــ علمائے نفسیات کی یہ جدید ترین تحقیق بہت حیرت سے دیکھی جائے گی کہ بعض ایسی بیماریاں جو صحت انسانی کو بالکل غارت کر دینے والی ہیں۔ مثلاً۔ سوءہضم۔ غدودِ حلق کی خرابی۔ پائیریا وغیرہ۔ ان کا کوئی اثر انسان کی ذکاوت و ذہانت پر نہیں پڑتا۔

انسان کا ذہنی و دماغی نشو ونما جسمانی نشو ونما سے بالکل علحدہ ہوتا رہتا ہے اور جب تک نظام عصبی کو متاثر کرنے والی بیماری پیدا نہ ہو ذہنی نشو و نما بدستور ہوتا رہتا ہے۔

دوسری عجیب تحقیق یہ ہے کہ سال کے جس موسم میں انسان پیدا ہوا ہو وہی موسم اس کی دماغی حالت پر بہت اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ سترہ ہزار لڑکوں کی جانچ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بچے جاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ نسبتاً کم ذہین ہوتے ہیں۔

دنیا نظریہ "تاثر عادیہ" (CONDITIONED REFLEXES) سے واقف ہو چکی ہے جس نے پاؤلو، روس کے سائنس داں کو مشہور کر دیا۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ عادتاً جو باتیں ہوتی رہتی ہیں اس کا اثر بعض حالات بدلجانے کی صورت میں بھی وہی باقی رہتا ہے۔ مثلاً اگر کتا کھاتے وقت کسی گھنٹی کی آواز سننے کا عادی ہو گیا ہے۔ تو پھر کھانا سامنے ہو یا نہ ہو محض اس گھنٹی کی آواز سنکر اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس طریق سے جانوروں کو بیماری سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے اگر کسی جانور میں گھنٹی یا بگل بجا بجا کر دافع زہر دواؤں میں پہونچانے کے بعد زہر کی پچکاری دینے کی عادت ڈالدیجائے تو چند دن بعد یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ دافعِ زہر دوا دیجائے یا نہ دیجائے محض گھنٹی یا بگل کی آواز ہی زہر کے اثر کو دور کرنے والی ثابت ہوگی۔

ایک دوسرا انکشاف ماہرین نفسیات نے یہ کیا ہے کہ سیکھنے کی قوت انسان میں ۲۰ سال کے بعد کم ہونے لگتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تجربہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر مطالعہ کے بعد دیر تک گہری نیند لیجائے تو جو کچھ پڑھا ہے وہ حافظہ میں محفوظ رہتا ہے، اسی لئے رات کا مطالعہ ہمیشہ مفید سمجھا گیا۔

حافظہ خواہ وہ شعوری ہو یا نیم شعوری انسان کی زندگی پر بہت کچھ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک لڑکے کو اس کی ۱۵ ماہ کی عمر سے یونانی زبان کا ایک ڈرامہ سنایا جانے لگا اور تین سال تک برابر یہی عمل جاری رہا۔ چھ سال بعد وہی حصے ڈرامے اس کو پڑھائے گئے جو اس کے سامنے دُہرائے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حصے اس کو بہت جلد یاد ہوگئے اور جو حصے اس کے سامنے دہرائے نہیں گئے تھے ان کے یاد کرنے میں اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔

لیکن وہ کیا چیز ہے جو انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہے، دماغ کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر کام کرتا ہے۔ ایک شخص کیوں فوراً اپنے اعضاء میں وہی جنبش پیدا کرسکتا ہے جو اس کا ارادہ ہے۔ یہ باتیں ہنوز زیرِ تحقیق ہیں اور ماہرینِ نفسیات کے ساتھ اطبار و کیمیادان بھی نظامِ عصبی کے اس عمل پر غور کررہے ہیں۔

اسوقت تک اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ ایک عصب (NERVE) کی کیفیت بالکل برقی تار کی سی ہے اور جب دماغ کوئی حکم کسی خاص عضو کو دینا چاہتا ہے تو عصب کے ذریعہ سے مثل برقی تار کے اس عضو تک پہونچتا ہے لیکن درمیان میں اس حکم کو کئی اسٹیشنوں سے گزرنا ہوتا ہے اور ہر اسٹیشن پر ایک خاص کیمیاوی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ان تغیرات کا کافی مطالعہ ہوچکا ہے یہاں تک کہ ماہرین کہہ سکتے ہیں کہ ہر اسٹیشن پر کیا کیا کیمیاوی تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔

مکتوبات نیاز

صدیقی۔

کرمنا - ملا - آئیے۔ شوق سے تشریف لائیے، لیکن یہ احسان رکھنے نہ آئیے کہ یہ زحمتِ سفر آپ نے صرف میری وجہ سے اختیار کی ہے۔ یہ تو اس سے کہئے جو آپ کی فطرت سے واقف نہ ہو۔

دل جائے دیگرست و نگہ جائے دیگرست

اور ہاں، یہ دوسرے صاحب آپ کے ساتھ کون ہیں۔ میں ان سے بالکل واقف نہیں ۔۔ دوست کا دوست دوست بھی ہو سکتا ہے اور دشمن بھی۔ اب خدا جانے مجھے ان کی پذیرائی دوست کی حیثیت سے کرنا ہوگی یا دشمن کی حیثیت سے ۔ بہرحال اگر بر بنائے تکلف، ان کو یہاں قیام میں کوئی تکلیف ہوئی تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

کرمفرمائے نیازمنداں۔

گرامی نامہ کے جواب میں غیر معمولی تعویق ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔ میں کل ہی ایک طویل سفر سے واپس آیا ہوں اور آج صبح سب سے پہلے جو کام کیا ہے وہ یہ تحریر معذرت ہے۔

آپ نے جس مسئلہ میں میری رائے دریافت فرمائی ہے وہ اتنی پیچیدہ تو نہیں ہے کہ مجھے زیادہ غور کرنے کی ضرورت لاحق ہو، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ پہلے اعتکاف کروں اور پھر نماز استخارہ پڑھکر خواب میں ملہم غیب کی ہدایت کا منتظر رہوں۔ کیونکہ جب تک میں کوئی ایسی مافوق الفطرت سند پیش نہ کروں آپ کیوں ماننے لگے

قبلہ، آپ کس وہم میں پڑے ہوئے ہیں، میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ اس باب میں زیادہ پس و پیش کی ضرورت نہیں۔

ختم رسالت کے بعد فرشتے تو اب اس دنیا میں آنا ہو گئے ہیں بند، اس لئے لامحالہ آپ کو انھیں گنہگار آدمیوں میں سے کسی نہ کسی کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ پھر زیادہ سے زیادہ آپ یہی فکر کر سکتے ہیں کہ جس سے کم معصیت کی ہو وہ آپ کے ہاتھ آجائے ۔۔۔ حالانکہ دنیا میں عقل معصیت ہی سے بڑھتی ہے۔

سو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میں کیا یقین دلاتا ہوں خود ان کی حماقتیں آپ کو باور کرادیں گی کہ وہ کافی سے زیادہ معصوم واقع ہوئے ہیں۔

میرا نظریہ اس باب میں آپ سے بہت مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوہر بننے کی صلاحیت انسان میں چالیس کے بعد پیدا ہوتی ہے جب وہ تمام گناہوں سے سیر ہو چکا ہو۔ صورت کا سوال چنداں اہم نہیں آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ خوبصورت بھی ہو، جوان بھی ہو اور اس پر طلب محال یہ کہ خیال و تصور میں بھی اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ سو، حضت، آپ کو ایسے نوجوان تو مل جائیں گے جو صائم الدہر بھی ہوں، تہجد گزار بھی ہوں دلایل الخیرات کا بھی ورد رکھتے ہوں، لیکن اس کا یقین کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ جذبات شباب سے خالی الذہن ہو کر کر رہے ہیں۔

آپ ایک فطری رسم ادا کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فطرت سے جنگ بھی کر رہے ہیں۔ عجیب تماشہ ہے۔

بہت زمانہ ہوا جب تھوڑی سی بے اعتدالی اُن سے ہوئی تھی، لیکن جب سے وہ "ہاروت" بنانے والی "زہرہ" غروب ہو چکی ہے، پھر کوئی اور اطلاع اس قسم کی کانوں تک نہیں پہونچی۔ پھر اس سے زیادہ بجھے ہوئے دل کا آدمی آپ کو اور کہاں ملیگا، زیادہ چھان بین نہ کیجئے اور اس فرض سے سبکدوش ہو کر ہجرت کر جائیے۔ تاکہ اس احتساب کے عذاب سے آپ کو نجات ملجائے۔

یہ تم شعر سمجھنا چاہتے ہو یا اس پر جرّاحی کرتے ہو۔ شاعری نہ اقلیدس کا مقالہ ہے نہ حدیقۂ حکیم سنائی کہ "دو ا . دو چار" کے سے حقایق اس میں نہ پائے جائیں تو درس اخلاق ضرور ہو۔

نقش و نگار سے لطف اُٹھانے کے لئے صرف نگاہ سے کام لینا چاہئے، تم نے اگر ان کو کھرچ کر یہ دیکھنا چاہا کہ ان کے پیچھے کیا ہے تو سوائے بے آب و رنگ کاغذ کے اور کیا ملیگا؟

غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے:۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کردی کہ غالب کانچ گلانے کے فن سے کب واقف تھا، یا یہ کہ اُس وقت بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انھوں نے آبگینے پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈالنے کے بعد کانچ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جا سکتا، یا یہ کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا تھا۔ تو سوائے

اس کے کہ سننے والا اپنا مُنہ پیٹ لے اور کیا کر سکتا ہے۔

جن اشعار کا تم نے مضحکہ اُڑایا ہے ان سے لطف اُٹھانے کی اہلیت تم میں ہئی نہیں۔

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمھاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ فی نفسہٖ "شباب" کی بھی توہین ہے۔

ایک شعر سے لطف اُٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوئے نفس سے کام لینا چاہئے۔ اور اسے بھی جانے دو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار۔ اس کا تمھیں کیا حق حاصل تھا، جبکہ "کشودِ نقاب" کی تعیین خود اس کے منافی پڑتی ہے۔

ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز یہاں موجود ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے:۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انھوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ دُنیا جانتی ہے میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔

بولو قایل ہوئے کہ نہیں۔ اب آؤ گے تو میں تمھیں انھیں کا شاگرد کرا دوں گا۔ ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔

میرے عزیز دوست۔

آپ کی داستانِ درد سُن کر سخت تکلیف ہوئی لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ جو شخص مصائب کو خود دعوت دے، اُسے شکوہ و شکایت کا کیا حق حاصل ہے۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ دیکھئے اس سے بچئے۔ ایسی مردم فریب صورت یا تو اسوقت نظر آئی تھی جب آدم اس کے مشورہ پر عمل کر کے عدن سے نکالے گئے یا اب اس شخص کو ملی ہو

لیکن آپ نہ مانتے اور آخر کار وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

میں نے ایک شاعر کے متعلق اپنے تصور کو ہمیشہ بہت بلند پایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اصولاً شاعر سے بہتر اخلاق کسی اور کا نہ ہونا چاہئے۔ لیکن یہ بدنصیبی صرف ہندوستان کے حصہ میں آئی ہے کہ جو شخص جتنا اچھا شعر کہتا ہے اتنا ہی زیادہ بداخلاق ہے۔

بہرحال اب بھی کچھ نہیں گیا۔ جرأت سے کام لیکر ان سے صاف صاف کہدیجئے کہ آیندہ مہربانی کی ضرورت نہیں۔ ورنہ سچ کہتا ہوں وقت وہ آنے والا ہے جب آپ خودکشی کے لئے زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوں گے اور وہ دیکھ کر مسکرا رہا ہوگا۔

بہرحال مجھے آیندہ کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں خود سن لوں گا آپ کا کیا حشر ہوا۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

جیبی —— آپ سے یوں تو تقریباً روزانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا ہے لیکن آج تحریری گفتگو کو جی چاہتا ہے اور ضرورت بھی ہے۔ ممکن تھا کہ جو کہنا چاہتا ہوں آپ سے کسی صحبت میں زبانی کہتا مگر اس خیال سے کہ میں گفتگو شروع کرتا اور کوئی صاحب تسلیم یا اسلام علیکم کہکر اپنا قصہ شروع کر دیتے اور میں اپنا سا منھ لیکر رہ جاتا اور آپ کا دل و دماغ دوسری طرف بٹ جاتا پریشان ہو جایا کرتا تھا یہاں تک کہ بہرائچ چلا آیا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ شاید آپ کی روانگی سے پہلے میں بہرائچ چلا جاؤں۔ اس لئے بغیر ملے ہوئے چلے جانے کا عذر قبول فرمائیے۔

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ واقعہ معلومہ کے بعد مجھ ایسے "فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فروگزار" کے تحت پر ایک اچھا خاصہ ڈھیر خطوط کا جمع ہوگیا جس کو آپ تعزیت نامہ یا پرسا کہہ سکتے ہیں ان احباء و اعزا کے خطوط میں سوا بجز اس کے کہ "خدا صبر جمیل عطا فرمائے" اور کچھ نہیں ہے اور یہی مہمل جملہ لوگوں سے سنتے سنتے تنگ آ گیا ان میں ایک شخص بھی آپ کی طرح "درسور نوحہ خواں نہ بزم عزا برقص" کا مصداق نہ ملا۔ غرض وحشت برابر بڑھتی گئی خدا انوری صاحب کو زندہ سلامت رکھے جنھوں نے مجھے زبردستی یہاں کھینچ بلایا اور ہر ممکن سامان میرے غم غلط کرنے کا بہم پہونچایا۔ آج کسی قدر میں اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہوں اس لئے اپنا مختصر سا واقعہ زندگی بیان کرنے کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے چونکہ آپ نفسیات کے ماہر ہیں اور میں آپ کا ارادتمند ہوں خدا کے لئے بتائیے کہ لوگوں کو کیا جواب دوں اور اس حالت کو کیا کہوں۔

صاحب — پہلا واقعہ میرے والد کا واقعۂ مرگ ہے۔ جس کا غم مجھے کافی ہونا چاہئے تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا اور اس عالم میں تھا کہ خدا بھی یاد نہیں آتا پھر بندہ کا جینا مرنا کیا یعنی میرا شباب اور ایک ایرانی خاتون کی شبانہ روز شریک زندگی کی حیثیت سے صحبت۔ ہاں اب خاتون کی موت کو میری زندگی کا پہلا واقعہ کہئے جس کے بعد خیال کرتا تھا کہ اس سے بڑھکر دوسرا غم نہ ہوگا۔

دوسرا واقعہ ایک ہفتہ کے اندر یعنی طاعون میری والدہ کا انتقال اور ۲۲ برس کے بھائی کا مرنا اور بہن کے بارہ برس والے بچے کا انتقال۔

تیسرا واقعہ مولانا رعب کا مرنا جو میرے استاد اور محب تھے۔

چوتھا واقعہ یوسف علی کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو ایک شاعر بہتر سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے میں ان واقعات پر ایک مصرع بھی موزوں کرنے کے قابل نہیں رہا۔ جب کوشش کی قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑا دماغ مختل ہوگیا۔ حالانکہ اردو فارسی سیکڑوں تاریخیں میری ان واقعات کے علاوہ موجود ہیں میرا یہ خیال ہے کہ میں نے جن کی تاریخیں لکھی ہیں اُن کا غم صحیح معنوں میں مجھے نہ تھا اور جو کچھ لکھا وہ محض شاعری تھی یا قادر الکلامی آپ بتائیے کہ یہ کیا حالت ہے شاعری کیوں بر سرکار نہیں آتی۔ کیوں ان واقعات پر قلم نہیں اُٹھتا یہ غم نہیں ہے یا وہ رنج نہیں تھا جس پر زور شاعری صرف کیا گیا احباب کہتے ہیں کہ جو شخص سیکڑوں مادۂ تاریخ نکال چکا ہو وہ بیٹے کے مرنے کی اطلاع سندے کیا قہر ہے خدا کے لئے اس کا جواب لکھئے

امید صاحب — گرامی نامہ بالکل خلاف امید پہونچا۔ اچھا کیا اس وقت آپ لکھنؤ سے چلے گئے میں خود بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لکھنؤ چھوڑنے کو کہوں تو کہاں جانے کا مشورہ دوں۔ — بہرائچ کے اس "مردِ غیب" کا علم نہ تھا بہرحال آپ نے خوب کیا کہ چند دن کے لئے اس ماحول کو چھوڑ دیا جس کا ایک ایک ذرہ آپ کے لئے "یادگارِ غم" ہے۔

مولانا، غم والم ہو یا مسرت ونشاط، سب انسانی چیزیں ہیں۔ "اضافی" — بمعنی اس کے کہ وہ خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتیں بلکہ پیدا ہوتی ہیں ان حالات وواقعات سے جن سے ایک شخص مسرور یا فطرتاً متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ کیفیتیں گھٹتی بھی ہیں بڑھتی بھی ہیں، فنا ہوتی ہیں اور پھر از سرِ نو آتی ہیں۔ کہتے ہیں اگر کوئی شخص کوشش کرے کے پتھر کا دل بنا لے — اور آپ شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کی ترکیب مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے — تو احساسِ غم کم ہو جاتا ہے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ غم غم میں بھی بڑا فرق ہے۔ غالب نے اس کی صرف دو تقسیمیں کی ہیں:— غمِ عشق وغمِ روزگار۔ کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار صرف دو تمناؤں پر تھا ایک (مصروفِ برائے گفتن) وہ جسے "وہ بیار بستر ونور وزِ آغوش" کا چیلا کہنا چاہئے۔ اور دوسری زوال حقیقی وہ جو "جام بدستے وسبوئے بدست" کی حد تک کُھل کھیلنا چاہتی تھی — ان کے علاوہ اسے کچھ نہ سمجھتا۔

دنیا میں "بینوائیاں اور بے برگ وباریاں" کس کس طرح انسان پر مسلط ہوتی ہیں اور ان کی تڑپ میں کتنا فرق پایا جاتا ہے۔

نفسیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ جب کسی ناگوار تاثر کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو فطرت انسانی ان کو دفع کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اسی کا دوسرا نام "تنکے کا سہارا ڈھونڈھنا" ہے۔ خواہ وہ مستقبل کی امید موہوم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن چونکہ اس کوشش میں زیادہ تر انسان کی قوت ارادی کام کرتی ہے اور قوت ارادی خود ماحول سے متاثر ہونے والی چیز ہے، اس لئے کوئی کلیہ قاعدہ اس باب میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ "ہر کارسے و ہر مردے" تو آپ نے سنا ہی ہوگا، اگر اعمال نفس و ارادہ کو بھی "کام" میں شامل کرلیا جائے تو یہ فقرہ پوری طرح اس نفسیاتی نظریہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ خود اپنے ہی حالات کو ملاحظہ فرمائیے۔

جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ نہ صرف یہ کہ جوان تھے، بلکہ جیسا آپ خود لکھتے ہیں، پوری طرح داد جوانی دے رہے تھے۔ اس لئے اس کا احساس قدرتاً آپ کو بہت کم ہونا چاہئے تھا۔ البتہ ایرانی رفیق حیات کی موت کا غم لازم تھا کیونکہ آپ کی تمام کارگاہِ نشاط اس پر منحصر تھی، لیکن اس کا دیر پا رہنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی مقاومت کے لئے آپ کے پاس اگر اور ذرائع موجود نہ ہوتے تو بھی آپ کا شباب ہی کافی تھا جس سے زیادہ حیلہ جو چیز کاروبار محبت میں اور کوئی نہیں۔

اس کے بعد والدہ، بھائی اور بھانجے کا یکے بعد دیگرے ایک ہفتہ کے اندر انتقال کرجانا اور آپ کے استاد مولانا رُعب کا جدا ہوجانا۔ سو اس میں کلام نہیں کہ یہ تمام واقعات و حادثات دل ہلا دینے والے تھے لیکن چونکہ اسوقت آپ کی عمر اور خود آپ کے ذاتی حالات "ضبط و تحمل" کے اسباب سے معرّا نہ تھے اس لئے انھیں بھی جھیل گئے۔ اب کہ آخر وقت میں دل و دماغ بھی جواب دے چکے ہیں اور شکستہ ناخنی نے آیندہ گرہ کشائی کی امید بھی باقی نہیں رکھی، جوان بیٹے کی موت پر آپ کا اسقدر متاثر ہونا بالکل قدرتی بات ہے لیکن "وچارۂ بیداد" نہ آج تک کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔

آپ تو خیر مرد ہیں اور بحمد اللہ کسی کے محتاج بھی نہیں۔ اس کو آپ کیا کہیں گے کہ ایک محتاج بڑھیا کا اکلوتا جوان بیٹا دو وقت کے فاقوں کے بعد لکڑی کا گٹھا بیچکر گھر واپس آتا ہے کہ اپنی ضعیف ماں کی فاقہ شکنی کا سامان فراہم کرے اور ٹھیک اسوقت جبکہ وہ اس کا انتظار کررہی ہے ایک شخص یہ خبر آکر سناتا ہے کہ "تیرے بیٹے کو توسانپ نے ڈس لیا"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ قدرت اس سے زیادہ اور کیا سخت صورت "شکر و شکایت" کے سدباب کی اختیار کرسکتی ہے۔ لیکن مذہب کے اس فیصلہ کو ملاحظہ فرمائیے کہ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد "الحمد اللہ" کہنا تو واجب اور

جب دل و جان کی شنوائی چھین لیجائے تو شکایت کرنا کفر۔

الغرض میرے نزدیک شکر و شکایت دونوں لغو ہیں۔ آپ نے اگر ایرانی خاتون کی معیت کا زمانہ بغیر شکر کے بسر کر دیا تھا تو اب "یوسف" کی گم گشتگی پر بھی شکایت نہ کیجئے۔ نہ ادائے شکر سے اُس خاتون کی عمر بڑھ سکتی تھی، اور نہ شکایت سے اب آپ کا اُجڑا ہوا دل دوبارہ آباد ہو سکتا ہے۔ قدرت کے ناخن و چنگال دونوں خون سے رنگین ہیں اور اپنا یہی "سبھاؤ" اسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے دوسروں کے واقعات مسرت و غم پر سیکڑوں تاریخیں کہہ ڈالیں اور خود اپنی بیتی پر آپ کے دماغ نے کام نہ دیا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ تاریخگوئی صنایع و بدایع کی ایک قسم ہے جس کا تعلق جذبات و تاثرات سے نہیں ہے۔ آپ کسی اور کے حادثہ پر تو تاریخگوئی کی موشگافیوں میں پڑ سکتے ہیں، لیکن اپنے صدمات پر یہ تصنع و تکلف بالکل خلاف فطرت ہے۔ ایسی حالت میں ایک شاعر مرثیہ تو لکھ سکتا ہے لیکن ریاضی کی مشق نہیں کر سکتا۔

کچھ آپ کی شاعری جس ذوق سے متعلق ہے وہ مرثیہ گوئی کے بھی منافی پڑتی ہے۔ آپ کا فطری میلان شوخی و رنگینی کی طرف ہے، اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ غم میں بھی کوئی پہلو لطف و انبساط کا پیدا کرلیں، لیکن آپ اپنے "آنسو بہانے" کو صرف "رونا" ہی کہیں گے، "آبشارِ غم" جاری کرنا نہیں کہہ سکتے۔

ایسے ذوق والوں کا تاثر الم ہمیشہ "غم ساذج" ہوا کرتا ہے اور حقیقی غم یہی ہے۔ جو غم "شاعری" کی طرف مایل کرے وہ غم نہیں ہے بلکہ صرف شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت آپ اس واقعہ کی بھی تاریخ لکھیں لیکن یہ اسوقت ممکن ہوگا جب امتداد زمانہ اس کی تلخی کو کم کر دیگا۔ فی الحال تو آپ کے "آنسو" دُرِ منثور" ہی رہیں گے، خواہ آپ کچھ ہی کریں۔

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

حبیبی۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو　　جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں۔ غالب

مطلب صاف ہے کہ مے و نغمہ دونوں اندوہ رُبا نہیں ہیں اور جو لوگ اس کے خلاف قایل ہیں وہ اگلے وقت کے لوگ ہیں غرض میں بھی اس سے متفق ہوں (کہ نغمہ اندوہ رُبا نہیں، بلکہ اندوہ فزا ہے کیونکہ اس کا تجربہ مجھے کافی آج کل انوری صاحب کی وجہ سے ہوا جو میرے دل بہلانے اور غم غلط کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے کوشاں ہیں باقی رہی شراب تو اس کا تجربہ نہیں اور شاید عمر بھر کبھی نہ ہو سکیگا یہ کیونکر اندوہ ربا نہیں ہوتی حالانکہ اگلے وقت کے لوگ نہیں بلکہ حال کے لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ غالب

زندہ نہیں پوچھوں تو کس سے پوچھوں۔ آپ سے پوچھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں آپ کچھ اور خیال نہ کریں اور مجھے اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے لیکن واردات قلب کا چھپانا اور پھر آپ ایسے پیر طریقت سے جس کا ہر ارشاد قلب و روح کو پیام صبر و سکون دیتا ہو کیونکر ممکن تھا کیا آپ زحمت فرمائیں گے کہ اس کا بھی جواب نگار میں کسی طریقہ سے دیں۔ مکتوبات نیاز کے متعلق آپ کے بعض کوتہ اندیش احباب کی رائے ہے کہ وہ اکثر فرضی ہیں۔ میں ان باتوں کے جوابات پر آپ کو ابھار کر کے ان کو جھٹلانا چاہتا ہوں حالانکہ آپ بفضلہ اس سے بے نیاز اور بالاتر ہیں۔

حضرت — اندوہ ربائی یا اندوہ فزائی کا تعلق صرف اپنے حال سے ہے۔ شعر و نغمہ میں یہ سلیقہ کہاں کہ وہ کسی کو مسرور یا مغموم بنا سکیں۔ اگر اپنا دل مسرور و مطمئن ہے تو میر انیس کے شیون کو بھی سنکر رگ انبساط جنبش میں آجاتی ہے، ورنہ حافظ کے "بیار بادہ" پر بھی رونے ہی کو جی چاہتا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ نغمہ کی ترکیب میں عنصر غالب "اندوہگینی" ہی کا ہے اور جب تک "دل گداختگی" کی کیفیت پیدا نہ کیجائے ہم ان کی حقیقی روح تک نہیں پہونچ سکتے۔ شراب کے متعلق، شراب پینے والے کہتے ہیں "وہ اسی کیفیت کو بڑھا دیتی ہے جس میں اس کا استعمال کیا گیا ہے" لیکن میں اس نظریہ کا قایل نہیں، شراب واقعی اندوہ ربا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ خاصکر ہماری آپ کی عمر میں کہ اسوقت تو یہ (بفتوائے شیخ بوعلی سینا) آب حیات سے کم نہیں۔

غالب کا شراب کو "اندوہ فزا" کہنا کوئی سند نہیں کیونکہ وہ شراب پیتا تھا اور ہمیشہ اس "دھڑکے" کے ساتھ کہ مبادا پھر ہاتھ نہ آئے۔ اس لئے اس کا رنج و ملال بالکل درست ویجا تھا۔ آپ انوری صاحب کے پاس ہیں (خانۂ انوری میں نہیں) اس لئے کسی بلائے آسمانی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، پیکر دیکھئے — عذاب و ثواب میری گردن پر۔

میرے مکتوبات کے متعلق یہ خیال ظاہر کرنا کہ وہ فرضی ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے (بلاتشبیہ) قرآن پاک کی آیات کے متعلق اس بحث میں پڑ جانا کہ یہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور اصل آیات کے مفہوم کو پس پشت ڈالدینا۔

میرے مکتوبات کے مخاطب فرضی ہوں یا اصلی، لیکن بہرحال ہیں وہ میرے ہی لکھے ہوئے۔ اس قسم کی بحث چھیڑنے والے وہی ہیں جو اس رنگ میں لکھنے کے لئے بیتاب ہیں، لیکن لکھنے سے معذور۔ "اعتراف عجز" کی بہت سی صورتیں ہوا کرتی ہیں اور انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

باب الاستفسار

اُردو زبان اور عربی و فارسی الفاظ کا استعمال

(جناب مرزا غفور بیگ صاحب۔ پونا)

اسوقت اُردو ہندی کے جھگڑے میں اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو کو عربی و فارسی الفاظ کے بار سے ہلکا کیا جائے، لیکن آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریک کے موافق نہیں۔ سنا ہے کہ ترکی میں بھی یہی کوشش کی جارہی ہے کہ غیر زبان کے الفاظ خارج کردئے جائیں اور ایران بھی یہی کر رہا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی پیروی نہ کریں۔ براہ کرم ذرا تفصیل سے لکھئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار) جس طرح ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ باعث ننگ امر اور کوئی نہیں کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی میں اجنبی اقوام کی محتاج ہو، اسی طرح ایک زبان کے لئے یقیناً یہ امر حد درجہ شرمناک ہے کہ وہ اظہار مدعا میں دوسری زبانوں کی دست نگر ہو۔ اس لئے اُصولاً میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی کہ اُردو کو خواہ مخواہ عربی و فارسی الفاظ سے گرانبار کیا جائے، لیکن چونکہ عملاً یہ ممکن نہیں ہے اس لئے میں اس کوشش کو عبث خیال کرتا ہوں۔

اُردو زبان کی تخلیق و تشکیل سے آپ بھی واقف ہوں گے کہ اسکی ترکیب میں بہت بڑا عنصر عربی و فارسی الفاظ کا شامل ہے اور اس لئے اگر آپ ان کو علحدہ کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی جگہ دوسرے الفاظ سے پُر کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ الفاظ کہاں سے لائیں گے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو آپ نئے الفاظ اختراع کریں جو ممکن نہیں ہے، یا پھر لامحالہ سنسکرت سے مدد لیں جیسا کہ ہندو آجکل کر رہے ہیں۔ میں اس کو گناہ نہیں سمجھتا کہ عربی و فارسی الفاظ ترک کرکے سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جائیں،

لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رسم خط بھی وہی اختیار کیا جائے۔ پھر اگر مسلمان اس کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس میں شک نہیں کہ آپس کی یہ بڑی تفریق مٹ جائے اور زبان کی موجودہ نزاع جو مذہبی نزاع کے بعد سب سے زیادہ تباہ کن نزاع ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور اس لئے عربی و فارسی الفاظ کی مخالفت سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ آپ اپنی زبان کی وسعت کو کم کرتے جا رہے ہیں اور اُردو کو بجائے علمی زبان بنانے کے صرف قصے کہانیوں کی زبان بنانا چاہتے ہیں۔

زبان ایک قوم کی تمدنی و ذہنی خصوصیات کا آئینہ ہوا کرتی ہے اور اس کے مخصوص کلچر سے متاثر ہو کر ایک مخصوص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اُردو زبان - وہی زبان جس میں عربی و فارسی کے الفاظ آپ کو زیادہ ملتے ہیں - مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت، مسلمانوں کے قومی و مذہبی جذبات اور مسلمانوں کے تمدنی رجحانات سے پیدا ہوئی ہے اور اس میں عربی و فارسی کا ہر ہر لفظ اُن کے مخصوص ذوق کی نمایندگی کرنے والا ہے، اس لئے ان کو نکال دینے کے معنے صرف یہ ہیں کہ آپ قوم کو گونگا بنا دینا چاہتے ہیں اور اس کے پر و بال نوچ کر پھینک دینا پسند کرتے ہیں۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی الفاظ ترک کر کے سنسکرت کے الفاظ اختیار کرنے پر آمادہ ہو بھی جائیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے وہ اپنے تمام اس لٹریچر کو جو ان کی صدیوں کی تہذیب و ثقافت کا نتیجہ ہے دریا بُرد کر دیں اور پھر کسی پاٹ شالہ میں جا کر "کا کھا - گا گھا" سیکھنا شروع کریں۔

اُردو زبان اپنی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ ایک مستقل رکارڈ ہے، مسلمانوں کی مذہبی روایات کا، تاریخی واقعات کا، تمدنی خصوصیات کا، رسم و رواج کا اور اُن کی روایت و درایت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس میں محفوظ نہ ہو۔ پیدایش سے لیکر جب کان میں اذان دیجاتی ہے، نزع کے وقت تک جب سورۂ یاسین سنائی جاتی ہے، مسلمانوں کا تعلق عربی و فارسی الفاظ سے ایک ایسا غیر منقطع تعلق ہے کہ ہم اس کو علحدہ کر کے اپنے قومی وجود کو قایم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہندو مسلمانوں میں یک جہتی کے پیدا کرنے کی غرض سے اُردو زبان میں یہ تغیر پیدا کرنا، یقیناً پاکیزہ خیال ہے، لیکن یکسر طلب محال۔ کیونکہ ان دونوں کے اختلاف کا حقیقی سرچشمہ صرف مذہب ہے اور جب تک یہ ایک دوسرے کو کافر و ملکش سمجھنا ترک نہ کریں گے محض زبان و رسم خط کی تبدیلی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے میری رائے میں صحیح راستہ کوشش کا وہ نہیں ہے جو اختیار کیا جا رہا ہے، بلکہ دوسرا ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے ہندو مسلمان دونوں ڈرتے ہیں۔

بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنا کلچر ترک کرکے ہندوؤں کا کلچر اختیار کرلیں تو کیا حرج ہے جبکہ ہندوستانی نژاد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے وہی تہذیب زیادہ مناسب ہے جو ہندوؤں کی ہے۔ لیکن ایسا مشورہ دینے والے حضرات یہ غور نہیں کرتے کہ کسی قوم کی تہذیب و معاشرت ایک دن میں طیار نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور ایک جُگ گزرنے کے بعد اس کا ذوق پختہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ مسلمان کوشش کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب ہوجائیں۔ میرے ایک مسلمان دوست کوشش کرکے کامل بیس سال تک نباتاتی بنے رہے لیکن آخر کار اکیسویں سال بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو کی تاب وہ نہ لاسکے اور جیسے ملکش پہلے تھے ویسی ہی پھر ہو گئے — یہ بظاہر ایک نہایت معمولی بات ہے لیکن اس پر ان تمام خصوصیات ذوق کا قیاس کیجئے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے متمایز کرنے والی ہیں اور جن کو مٹانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔

قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں کہ میں مذہبی اختلاف کو نوع انسانی کے لئے بدترین لعنت سمجھتا ہوں اور میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں کہ ہندو مسلمان مسایل مذہبی میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو برا سمجھیں اسی لئے اگر آج دنیا کے تمام مذاہب مٹ جائیں (جو زمانۂ قدیم سے لیکر اسوقت تک استخوانِ جنگ بنے ہوئے ہیں) تو میں اس کو نوعِ انسانی کی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ لیکن خصوصیات قومی کو میں خصوصیات مذہبی سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں اور ان کے مٹانے کی تائید کبھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسوقت ایک جماعت صرف "قومیات" ہی کے اُصول پر زندہ رہسکتی ہے اور اس کی زندگی یہی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو قایم رکھے۔ بہرحال اُردو زبان سے عربی و فارسی الفاظ کو نکالنا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ اس میں ہندی و سنسکرت کے درخور کو تسلیم کیا جائے اور میں اسے قومی حیثیت سے مسلمانوں کی موت سمجھتا ہوں — رضا شاہ اور کمال اتاترک بیشک فارسی اور ترکی زبان سے اجنبی الفاظ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ وہ عربی و فارسی کے الفاظ علٰحدہ کرنے میں کامیاب ہونگے کیونکہ دونوں زبانوں میں نصف سے زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور تا وقتیکہ وہ سرے سے اپنی زبان ہی کو نہ بدلدیں اس میں کامیابی محال ہے۔ افسوس ہے کہ اس عہد کے ترکی لٹریچر کا کوئی نمونہ میرے پاس موجود نہیں ورنہ میں شاید اپنی تائید میں مثالیں بھی پیش کرسکتا۔ لیکن اسوقت کا ایرانی لٹریچر آپ کے سامنے موجود ہے اسے دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ رضا شاہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے یا ہوسکتے ہیں۔

ایران میں ایک مجلس جدید فرہنگ مرتب کرنے کے لئے قایم ہوئی ہے اور اس نے بعض اصطلاحات

کو جدید فارسی کے قالب میں ڈھالا[1] ہے، لیکن زبان جس چیز کا نام ہے وہ نصف سے زیادہ عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔
اسی سال جب رضا شاہ پہلوی ایران کی جدید یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں تشریف لے گئے تو وہاں نوجوانان ایران کے سامنے ایک تقریر فرمائی جسکے جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں :۔

"دو مطلب را می خواہم بفرزندگان خود گوشزد نمایم۔ اولاً باید دانش آموز ہا ہمیشہ در صدد ترقی و تعالی خود باشند۔ زیرا سعادت افراد ست کہ سعادت جامعہ را فراہم می کند۔۔۔۔ بہ شما فرزندان خود می گویم کہ علاقہ بہ مملکت را باید بواسطہ سعی و عملی کہ بہ آزادی و استقلال کشور شما ست، نسبت بہ میہن خود صمیمی باشد و عواطف صمیمیت شما بہ میہن خود تا باید ما فوق تمام عواطف و احساسات باشد"

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ان چند فقروں میں بیس سے زیادہ عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بعض اتنے ثقیل ہیں کہ اُردو میں عام طور پر رائج بھی نہیں ہیں ـــ اسی سلسلہ میں طالبات کی طرف سے بھی ملکۂ ایران کی خدمت میں ایک ایڈرس پیش کیا گیا تھا اور اسکے جواب میں علیا حضرت نے جو کچھ فرمایا اس کی زبان بھی دیکھ لیجئے :۔

"بے نہایت مسرورم کہ می بینم خانمہا در نتیجۂ دانائی و معرفت بوضعیت خود آشنا شدہ و پے بہ حقوق و مزایائے خود بردہ اند۔۔۔۔ من معتقدم کہ برائے سعادت و ترقی ایں مملکت باید ہمہ از صمیم قلب کار کنیم"

یہ ہے وہ جدید ایرانی زبان جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عربی سے بیگانہ ہوتی جاتی ہے ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیں کہ ترکی و ایران اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو بھی ہندوستان کے لئے بطور مثال اس کو پیش کرنا درست نہیں، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت خود اپنی ہے اور وہ جو تغیر چاہیں آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں مسلمان محکوم ہیں، مغلوب ہیں اور اگر انھوں نے اپنی خصوصیات قومی کو قایم رکھنے میں ذرا بھی تساہل سے کام لیا یا کچھ بھی رواداری برتی تو پھر اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی رہی سہی اجتماعیت کو بھی کھو بیٹھیں اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی دوامی غلامی کے کاغذات پر مہر توثیق ثبت کر دیں۔

[1] بعض اصطلاحیں ملاحظہ ہوں :۔

قدیم	جدید	قدیم	جدید
مملکت	کشور	ملاح	ملوان
وطن	میہن	تحت البحری	زیر دریائی
ارتش	تشون	مدرسہ	دانشگاہ۔ دبستان۔ آموزشگاہ
ہنگ	فوج	ادارۂ تنظیمیہ	ادارۂ شاہربانی
امیر لشکر	سرلشکر	محبس	زندان
سلطان	سردان	محبوس	زندانی
		تذکرہ (پاسپورٹ)	گزرنامہ
بحریہ	نیروئے دریائی	تفتیش	دارسی۔ بازرسی

مفلسِ کی دُنیا

قضا را ایسی دنیا میں ہوا اکدن گزر میرا کہ جس کی یاد سے مجروح ہو ابتک جگر میرا
جہاں کی سرزمیں ذلت جہاں کا آسماں پستی جہاں کے وادی و کہسار افلاس و تہی دستی
جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہو جہاں ہر صورت امید نومیدی کی بانی ہو
جہاں حدِ نظر تک رنج و غم کے پُرخطر بَن ہیں جہاں کے طائروں کی بولیاں بھی آہ و شیون ہیں
جہاں کا ذرہ ذرہ دعوت آلام دیتا ہو جہاں کا چپہ چپہ دوزخوں کا کام دیتا ہے
جہاں کی صبح درد و رنج کی تمہید ہوتی ہو جہاں کی شام یکسر دشمنِ امید ہوتی ہو
جہاں کی چاندنی تاریک اور مغموم ہوتی ہو جہاں کی دھوپ ہمت سوز اور مسموم ہوتی ہو
جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ و زندگانی کا جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہو سورج جوانی کا
جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تدبیر روتی ہو جہاں آٹھوں پہر آرام سے تقدیر سوتی ہے
جہاں رہ جاتی ہو مفلوج ہو کر جرأت و ہمت جہاں ہر سو پڑی دم توڑتی ہو روحِ حمیت
جہاں ہر شوق ہو جاتا ہو صرفِ فاقہ بدمستی جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہنِ تہی دستی
جہاں جوشِ اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں جہاں احساسِ خودداری کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں
جہاں صدق و صفا کا خون پی لیتی ہو ناداری جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبورِ غداری
جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قالب بدلتی ہیں جہاں آزادیاں بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہیں
جہاں نشو و نما پاتے ہیں چوری جھوٹ، عیاری جہاں پروان چڑھتی ہو خیانت حرص و مکاری

جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایماں ڈگمگاتے ہیں　　جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھرتھراتے ہیں

یہیں بستے ہیں ننگِ زندگی وہ پیٹ کے مارے

جنھیں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تارے

زمانے بھر کے دُھتکارے خدائی بھر کے ٹھکرائے　　ذلیل و خوار۔ اپنی ہستیوں سے آپ شرمائے

مجسم آہ، سراپا زبانِ حال کے نالے　　فلک کی آنکھ کے ناسور۔ قلب دہر کے چھالے

غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں　　فنائے عزم و مرگِ ارتقا کی زندہ تصویریں

قتیلِ جہل و پستی، کشتۂ اوہام و نادانی　　امیروں کے سگِ ایواں، مگر از قسمِ انسانی

سنانِ جبر اور شمشیرِ استبداد کے گھائل　　خدا کیا؟ مالدار و نکی خداوندی کے بھی قائل

تموّل جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے　　تمدن جن کو اک انساں نما حیواں سمجھتا ہے

فقط اک خشک روٹی جنکے جسم و جاں کی قیمت ہے　　فقط اک حکم جنکے مذہب و ایماں کی قیمت ہے

مشیئت کھیلتی ہے رات دن جذبات سے جنکے　　تمسخر کرتی ہے تقدیر احساسات سے جنکے

ہوا کرتی ہیں سامانِ تفریح عصمتیں جن کی　　رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قسمتیں جن کی

ارادوں پر بھی غالب جنکے غیروں کا ارادہ ہے　　نہ جنکی اپنی مرضی ہے نہ جن کا اپنا منشا ہے

دبے ہیں جن کے جوہر اسقدر زنگِ مذلت میں　　کہ شک ہونے لگا ہے خود جنھیں اپنی شرافت میں

ہے بس لے دیکے جنکی کائناتِ زندگی ساری　　غلامی، مفلسی، فاقہ، مصیبت، بھیک، بیماری

جنھیں انساں کہتے آدمیت ہچکچاتی ہے　　جنھیں زندہ سمجھتے زندگی کو شرم آتی ہے

فضا و بحر و بر کون و مکاں کو عار ہے جن سے　　اجل کو جن سے نفرت زندگی بیزار ہے جن سے

کوئی غمخوار ہے جن کا نہ کوئی پوچھنے والا

خداوندا۔ الٰہا۔ داورا۔ اے دادرس مولا

تمکینؔ سرمست

محبت کے دو باغی

(۱)

آج دیوالی کی شب ہے، رنگِ شب صد رنگ ہے ‖ چشم خیرہ، ہوش حیراں، شادمانی دنگ ہے

لالہ زاروں سے سوا خوش رنگ دیوالی کی رات ‖ دیدنی ہے آج قندیلوں کی سڑکوں پر برات

جلوہ ہائے حسن کیف و رنگ کے ساماں لئے ‖ قمقمے، فانوس، برقی روشنی، شمعیں، دیئے

ہر طرف نظروں کے جھولوں میں شعاعوں کا ہجوم ‖ جیسے کاشی میں اُتر کر آئے ہوں ماہ و نجوم

ہر طرف گانا بجانا اور دیوالی کی رسوم ‖ ہر طرف جلووں کی بارش ہر طرف نغموں کی دھوم

آج کی شب میری قسمت بھی ہے کیسی کامگار ‖ میری نظروں میں سمٹ آئی ہے کاشی کی بہار

آج کی شب جشن میں شیاما بھی میرے پاس ہے ‖ کامراں ہیں آرزوئیں شادماں احساس ہے

(۲)

"اے مری دیوی، مری پیاری، مری روحِ حیات! ‖ زبدۂ تخلیقِ فطرت، نوبہارِ کائنات!

میری شیاما، میری دنیائے خوشی کی تاجدار ‖ میری تنویرِ جوانی کی درخشاں یادگار

آ تجھے میں اپنے سینے سے لگا لوں چوم کر ‖ اور پھر ہو جاؤں فکرِ دو جہاں سے بےخبر

تو بھی جوشِ کامیابی میں خوشی کی سانس لے ‖ بادۂ لطف و محبت خود بھی پی مجھکو بھی دے

ہائیں یہ کیا؟ رو رہی ہے میری پیاری، سر اُٹھا ‖ کچھ تو منہ سے بول ظالم ہو گیا ہے تجھ کو کیا"

(۳)

"کیا سناؤں اپنی بیتی، کیا بتاؤں اپنا حال ‖ کیا ہنسوں، کیا مسکراؤں، ہر خوشی ہے پائمال

آج تک میں دھرم کے آداب سے مجبور تھی آرزوؤں کو سلا کر میں خوشی سے دور تھی
پاک جذبے دل کے لیکن رنگ لاتے ہیں ضرور پاؤں وہم و رسم کے ہاں ڈگمگاتے ہیں ضرور
عاشقی میں مذہب و ملت کا کیا امتیاز ایک ہی ہیں عشق کے مسلک میں پوجا اور نماز
منہ کے بل گرنا ہی پڑتا ہے یہاں ہر رسم کو ٹھوکریں کھانا ہی پڑتی ہیں سماجی نظم کو
کس سے کہہ سکتی تھی میں مایوسیوں کی داستاں کون تھا گھر میں مرے، میرے غموں کا رازداں
مختصر یہ ہے کہ میں آئی ہوں سب کو چھوڑ کر توڑ کر اس ملک کی پابندیوں کو توڑ کر
آیئے پھر کیوں نہ آخر ایسی بازی کھیلئے جس سے دونوں ایک ہو جائیں ہمیشہ کیلئے
آیئے ملکر نکالیں اک نئی راہِ عمل جس پہ نازاں ہو محبت، جس سے شرمائے اجل
پیجئے یہ جام صہبا لیجئے شیاما کا نام زہر ہے گو اس میں لیکن زہر ہے امن دوام
لایئے میں بھی پیوں اور شکر کا سجدہ کروں جی میں ہے اب تو یہی بیکر مروں، مر کر جیوں

(۴)

پی لیا میں نے بھی ہنسکر سم قاتل پی لیا جی لیا میں، جسقدر جینا تھا مجھ کو جی لیا
ہو کے ہم آغوش دونوں ہو گئے پھر بیخبر کر رہا تھا زہر بھی ادراک پر پورا اثر
بھولی بھٹکی ہر نظر تھی، دھندلا دھندلا ہر خیال بے خبر عشق و محبت، بے اثر حسن و جمال
یک بیک بیہوشیوں میں روح نو پیدا ہوئی دفعتاً احساس میں بجلی کی رَو پیدا ہوئی
پھر تخیل کی پری اُڑکر ہوئی سایہ فگن جس طرف دیکھا نظر آیا محبت کا چمن
روح جاگی مادیت سے اُبھرنے کے لئے اُڑ گئے دونوں فضا میں سیر کرنے کے لئے
آخرش پورا ہوا حسن تخیل کا سراغ ہم جو پہونچے باغ نو میں عرش پر پہونچا دماغ

اک نویدِ مرحبا آئی صدائے غیب سے
اک نئی جنت ہوئی پیدا فضائے غیب سے

فطرت واسطی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیسا تھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۹ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصری سائکلوپیڈیا کی ہے قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲) خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔
۲۔ مادئین کا مذہب۔
۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانۂ حسن و عشق کی تمام نشہ بخشش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت [illegible] آنے [illegible] علاوہ محصول خریداران نگار سے دو آنہ [illegible] کم

فراست الید

مؤلفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و گمنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲) علاوہ محصول خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول



بمبئی

نرخنامہ اجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ - ۱۰۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ روپیہ
آدھ صفحہ - ۵۰ ″	۲۵ ″	۱۳ ″	۸ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۲۵ ″	۱۳ ″	[illegible]	۴ روپیہ

اُردو شاعری

یعنی جنوری [illegible] کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بعہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری [illegible] کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اسکے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے جس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول [illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین [illegible] مقالات اور افسانوں [illegible] نگارستان [illegible] قبول [illegible]

جمالستان

اڈیٹر نگار کے [illegible] ادبی [illegible] مجموعہ جس میں [illegible] تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے [illegible] مسائل کا حل [illegible] آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا [illegible] [illegible] قیمت [illegible] روپیہ [illegible]

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط [illegible] شائع [illegible] اور سلاست بیان رنگینی اور [illegible] انشاء میں بالکل نئی چیز ہے جس کے ساتھ [illegible] معلوم ہوتے ہیں [illegible] حضرت نیاز [illegible] شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی [illegible] اور اسکی انشاء [illegible] [illegible] قیمت ایک روپیہ [illegible] علاوہ محصول

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (عہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) — فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۳۷ء — شمارہ (۳)

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری — معاون: جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	مارچ سنہ ۳۵ء	شمارہ (۳)

ملاحظات

ہمارے ملک کے نوجوان اور مغرب کی بیجا تقلید

اگر کوئی شخص مجھ سے سوال کرے کہ کیا صرف ایک لفظ میں قوموں کی ہلاکت کا راز بتایا جا سکتا ہے، تو میں کہوں گا کہ "ہاں" اور فوراً لفظ "تقلید" میری زبان سے نکل جائے گا۔

ہم اگر کسی کو "غلام" کہدیں تو وہ یقیناً برہم ہو جائے گا اور غلامی کی نسبت کبھی اپنے ساتھ گوارا نہ کرے گا، ہم اگر کسی کو "جاہل و ناکارہ" کے الفاظ سے یاد کریں تو وہ اس کو یقیناً برداشت نہ کرے گا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ جائیں گے، اگر ہم کسی کو "مسلوب العقل یا فاتر الحواس" کہدیں تو وہ یہ سننا کبھی پسند نہ کرے گا اور ہم سے جنگ پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن کسقدر حیرتناک امر ہے کہ ہماری جماعت کا بڑا حصہ اپنے آپ کو خود نہایت فخر سے "مقلد" کہتا ہے، اور مطلق نہیں سمجھتا کہ یہ لفظ مجموعہ ہے ان تمام مفاہیم کا جو غلامی، جہل، حماقت فتور عقل و حواس اور اسی طرح کے بہت سے توہین آمیز الفاظ سے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

لفظ "تقلید" عربی ہے جس کا مادہ "قلد" ہے، پھر اس مادہ سے بنا ہوا عربی کا کوئی لفظ آپ لے لیجئے اس میں غلامی و بیچارگی، گرفتاری و فتادگی کا مفہوم کسی نہ کسی نہج سے ضرور پایا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اتباع دپیروی بری چیز نہیں اور نظام عالم بڑی حد تک اسی پر منحصر ہے، لیکن تقلید بصارت کھو دینے کا نام نہیں ہے، تعطلِ دماغ اور عقل کو خیرباد کہہ دینے کے مترادف نہیں ہے، اور اگر اتباع و تقلید کا مذہبی یا اخلاقی مفہوم یہی ہے تو مذہب و اخلاق دونوں انسان کے لئے بیکار ہیں

اور اگر ہماری معیشت و معاشرت کا نظام یہی بتاتا ہے تو انسان کو متمدن کہنا یقیناً انسانیت کی توہین ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر انسان سیادت و قیادت کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن اس کا یہ فطری حق اس سے کبھی نہیں چھینا جا سکتا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کو اپنا رہبر و ہادی بنا لے ۔۔۔ خدا برحق، رسول برحق، معجزہ و کرامات برحق، حشر و نشر برحق، لیکن اس سے نہیں کہ اگر میں ان سے انکار کردوں تو آپ سب مجھے آگ میں ڈالدیں گے یا میری گردن پر چھری پھیر دیں گے۔ حق نام صداقت کا ہے اور صداقت کا تعلق اُس احساس سے ہے جو جوارح ظاہری نہیں بلکہ دل و دماغ میں "کیفیت مطمئنہ" پیدا کر دیتا ہے۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اسوقت ایک شخص صرف اس خیال سے مرعوب ہوکر کہ "آپ" ایسا فرماتے ہیں، بے چون و چرا "آمنا و صدقنا" کہدے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص ایسی ہی سادہ ذہنیت رکھنے والا پیدا ہوا ہو یا یہ کہ آپ کا یہ رعب ہمیشہ اُس پر اسی طرح مسلط رہے۔ اس لئے کوئی ایسا اجتماعی نظام جس کی بنیاد صرف تمسک روایات و تقلید پر قایم ہو کبھی دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا اور حقیقتاً بدنصیب ہے وہ ملک جو یہ ذہنیت رکھتا ہو۔

ہندوستان کی آبادی میں دو بڑی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ اور اس میں شک نہیں کہ جتنی قدامت پرستی ہندؤں میں پائی جاتی ہے مسلمانوں میں نہیں ہے اور ہونا بھی نہ چاہئے، کیونکہ مذہب اسلام جن اُصول پر انسان کو کاربند کرنا چاہتا ہے وہ یکسر ذہنی آزادی کے حامی ہیں اور سب سے اہم تعلیم اس کی یہی ہے کہ انسان تفکر و تدبر سے کام لے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس تعلیم سے کتنا فایدہ اُٹھایا اور کتنے علوم و فنون اسی تعلیم کی بدولت دنیا میں رائج ہوئے، لیکن چونکہ ماحول کے اثر سے بالکل محفوظ رہنا مشکل ہے اس لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان میں آکر مسلمانوں کی یہ ذہنیت بڑی حد تک متاثر ہوئی اور ہندؤں کی تقلیدی ذہنیت کو انھوں نے خطرناک حد تک قبول کر لیا۔ پھر اگر یہ تقلید معیشت و معاشرت سے متعلق ہوتی تو ہم اس کو بُرا سمجھنے کے بجائے مستحسن قرار دیتے کیونکہ ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہندؤں کے اُصولِ زندگی یقیناً بہتر ہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ مسلمانوں نے انکی اس خصوصیت پر تو توجہ کی نہیں اور مذہبی واہمہ پرستیوں یا دیرینہ رسم و رواج کی بہت سی باتوں کو قبول کر لیا، یعنی انھوں نے صبح اُٹھکر باہر نکل جانا، میدان کی کُھلی ہوئی ہوا میں ضروریات سے فارغ ہونا، سہ پہر کو نہا کر خود کھانا طیار کرنا، نباتاتی غذا کو ترجیح دینا، رات دن میں صرف ایکبار کھانا کھانا اور سادہ زندگی بسر کرنا تو نہیں سیکھا، لیکن عورتوں کو مکانوں کے اندر مقید رکھنا، شادی و غم میں لغو و بیہودہ مراسم ادا کرنا، اور مذہب میں روایتی خرافات کو رائج کر کے اسے صنمیاتی رنگ میں رنگ دینا، یہ سب کچھ قبول کر لیا۔

خیر یہ تو ان لوگوں کی باتیں ہیں جن کو قدامت پرست اور مذہب پرست کہا جاتا ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہماری جدید نسل جو اپنے آپ کو مہذب و شایستہ، آزاد خیال و روشن دماغ کہتی ہے، اس نے بھی مغربی تعلیم اور مغربی تمدن سے وہی چیز حاصل کی جو قابل ترک تھی اور اسی خصوصیت کو ترک کر دیا جو اختیار کرنے کے قابل تھی۔

مغربی اقوام کی خصوصیات میں سب سے زیادہ نمایاں چیز ان کی قوم پرستی ہے۔ وہاں کا کوئی فرد خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق

ہو اس جذبہ سے خالی نہیں۔ اور اس کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی دنیائے مذہب میں خدا کو۔ یعنی جس طرح ایک مذہبی انسان خواہ کتنا ہی گنہگار و بداعمال کیوں نہ ہو خدا کے خیال سے منحرف نہیں ہو سکتا، اسی طرح مغربی انسان خواہ وہ کتنے ہی ذمیم خصائل کیوں نہ رکھتا ہو، وطن و قوم کا نام آتے ہی ایک خاص قسم کا جوش اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے اور ملک و ملت کے لئے وہ ہر ممکن قربانی کے لئے طیار ہو جاتا ہے ــــ یقیناً یہ چیز سیکھنے کی تھی، یہ جذبہ پیدا کرنے کے قابل تھا، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے قلوب اس سے بالکل خالی ہیں اور ہمارے نزدیک رشتۂ وطنیت و ملت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے ــ دوسری خصوصیت مغربی اقوام کی ان کے عزم و ارادہ کی پختگی ہے۔ وہ اپنا ایک نصب العین متعین کر لیتے ہیں اور اس کو حاصل کر کے رہتے ہیں، ایک منزل مقرر کر لیتے ہیں اور وہاں پہونچکر رہتے ہیں، کوئی مانع، کوئی حجاب، کوئی خلیج، کوئی پہاڑ ان کو اقدام سے نہیں روک سکتا اور جو قدم ایکبار اُٹھ جاتا ہے وہ پھر پیچھے نہیں پڑ سکتا۔ بڑھتے ہیں اور جانیں دیتے ہیں، جانیں دیتے ہیں اور بڑھتے ہیں یہاں تک کہ وہ منزل مقصود کو پالیں۔ قطب شمالی و قطب جنوبی تک پہونچنے میں کتنے افراد ہلاک ہوئے، لیکن سعی و اقدام کا وہی سلسلہ برابر جاری ہے، ہوائی جہازوں کی تباہیاں اکثر سننے میں آتی ہیں، لیکن اس سے دست کش ہونے کے بجائے برابر اسکی تکمیل میں مصروف ہیں، الغرض مغربی اقوام کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے انھیں آج اس بلند مرتبہ پر پہونچا دیا، لیکن ہم نے اس میں ان کا اتباع نہیں کیا۔ تیسری قابل ذکر خصوصیت ان کی یہ ہو کہ وہ اسوقت تک کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے جب تک خود ان کی سمجھ میں نہ آجائے، وہ ہر چیز کی حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کسی بات کا واقعی علم انھیں حاصل ہو جاتا ہے تو وہ پھر اس پر کسی دوسری چیز کی بنیاد رکھکر اور آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک سلسلہ اکتشافات و اختراعات کا پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ سائنس کے عجائب و غرائب کیمیا کے محیر العقول کارنامے، فلکیات کے اہم اکتشافات اور سیکڑوں جدید علوم و فنون کا ظہور سب اسی ذوق کا نتیجہ ہے، لیکن اسکی پیروی کا کوئی جذبہ ہمارے اندر موجزن نہیں ہوتا۔ ایک اور خصوصیت ان کی نظم زندگی اور وقت کو بیکار نہ جانے دینا ہے، جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہے اسی وقت ہوگا اور جو تقسیم اوقات متعین ہوگئی ہے اسکی پوری پابندی ہوگی، ممکن نہیں کہ ان کی زندگی کا ایک لمحہ بھی اس سوچ میں گزرے کہ اب انھیں کیا کرنا ہے اگر سیر و تفریح ہے تو اسکے لئے بھی وقت مقرر ہے اور عیاشی و لہو لعب ہے تو اسکے بھی حدود متعین ہیں، مگر ہم نے اس باب میں بھی ان کی تقلید نہیں کی ــ تقلید کی تو کس چیز میں؟ یہ معلوم کرنے کے لئے زیادہ جستجو کی ضرورت نہیں، آجکل کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں، کالج کے طلبہ اور پروفیسروں کی زندگی کا مطالعہ کیجئے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کی مغربیت کا معیار کیا ہے؟ ــــ اگر اس کا تعلق صرف ملبوس سے ہوتا تو بھی چنداں مضایقہ نہ تھا، تہذیب معیشت و معاشرت تک محدود ہوتا تو بھی گوارا تھا، لیکن قیامت تو یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے سب سے زیادہ انہماک کے ساتھ مغرب کی جس ادا کو اختیار کیا وہ وہی ہے جو خود یوروپ کے معیار انسانیت کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی جا رہی ہے۔ یعنی شراب خواری اور تمباکو نوشی ــــ آپ اسکول کے لڑکوں سے لیکر کالج کے طلبہ و پروفیسروں تک جس کو دیکھئے اس مرض میں مبتلا ہے اور ہر وہ لڑکا جو صبح کو آئینے کے سامنے بیٹھکر اپنے بالوں کو سنوار سکتا ہے یہ بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جب وہ باہر نکلے تو اسکے منہ میں سگریٹ ضرور ہو، اسی طرح ہر وہ نوجوان جو سوسائٹی میں کوئی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے لازم

ہے کہ وہ شراب پینا ضرور سیکھے۔ اب سے کچھ زمانہ قبل ہندوستان کے شریف گھرانوں میں ان دونوں کا رواج بہت کم تھا، شراب تو خیر بڑی چیز ہے، اپنے بزرگوں کے سامنے حقہ یا سیگریٹ پینا بھی نہایت مذموم خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب علی الاعلان بغیر اس خیال کے کہ کوئی بزرگ موجود ہے یا نہیں، سیگرٹ کا استعمال جاری ہے اور بھرے مجمعوں میں وسکی و برانڈی کا دور آزادی سے چلتا نظر آتا ہے۔

بعض تعلیم یافتہ حضرات سے میں نے دریافت کیا کہ کیا وہ ان دونوں کے مضرت رساں اثرات سے آگاہ نہیں ہیں، لیکن اسکا جواب انھوں نے نہایت بے پرواہی سے یہ دیا کہ اگر یہ چیزیں نقصان رساں ہوتیں تو یورپ و امریکہ کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ میں یہ سنکر حیران ہو گیا نہ صرف اس لئے کہ ان کا احساس ہی اس باب میں بالکل فنا ہو چکا تھا بلکہ زیادہ تر اس بنا پر کہ باوجود جدید تعلیم یافتہ اور تمدن حاضر سے واقف الحال ہونے کے وہ حقیقت سے اس درجہ بےخبر تھے اور وہ مطلق آگاہ نہ تھے کہ خود مغرب کا معیارِ صحت و توانائی انھیں دو مذموم عادتوں کی وجہ سے گزشتہ نصف صدی کے اندر کتنا گرتا چلا جا رہا ہے۔ امریکہ نے جس وقت گزشتہ جنگ میں شرکت کا ارادہ کیا اور فوجی بھرتی شروع کی تو امتحان سے یہ معلوم ہوا کہ چھ نوجوانوں میں صرف ایک اس قابل تھا کہ اس سے فوجی خدمت لیجائے اور بحری فوج کے لئے تو چھ میں ایک بھی اس قابل نہ نکلا۔ یکم جولائی سنہ ۴۱ء سے ۳۰ مئی سنہ ۴۲ء تک ۱۵۹۸۵۶ جوانوں نے فوجی ملازمت کے لئے درخواست پیش کی لیکن ان میں ۱۲۲۶۱۵ امتحان و معاینہ میں ناکام رہے اور صرف ۳۶۲۴۱ اس قابل سمجھے گئے کہ انھیں فوج میں بھرتی کیا جائے، حالانکہ ناکام لوگوں میں بظاہر کوئی نقص نہ پایا جاتا تھا۔

اس کے بعد جب ۲۰ ہزار سپاہیوں کی اور ضرورت ہوئی تو ۴۰ ہزار درخواستیں موصول ہوئیں لیکن ان میں صرف ۹ ہزار کامیاب ہو سکے اور بحری فوج کے معیارِ صحت کے لحاظ سے تو یہ اوسط بھی نہ رہا اور ۹۰۰۰ نوجوانوں میں صرف ۳۰ کا انتخاب عمل میں آسکا۔

اس فوجی افسر نے جو بھرتی کے کام پر مامور تھا نہایت افسوس کے ساتھ اپنا بیان شائع کرایا اور اپنے ملک کے نوجوانوں کے معیارِ صحت پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ "امسال ۱۱۰۱۲ درخواست دینے والوں میں صرف ۳۱۶ اس قابل نکلے کہ انھیں فوجی ملازمت مل سکتی" امریکہ کے امیر البحر نے اپنی تقریر میں ظاہر کیا کہ "ہمارے ملک کے نوجوانوں میں جو غیر معمولی انحطاط پیدا ہوتا جا رہا ہے وہ قوم کے لئے حد درجہ خطرناک ہے"۔ اسی طرح وہاں کی بیمہ کمپنیاں اور محکمہ حفظانِ صحت کے افسران حیران ہیں کہ یہ قبل از وقت ملک کے نوجوانوں میں انحطاطِ صحت کیوں ہے۔ ان کے اعصاب کیوں کمزور ہوتے جاتے ہیں، ان کے دماغوں میں غیر معمولی ضعف کیوں پیدا ہو رہا ہے، ان میں ولولۂ عمل کیوں مفقود ہو رہا ہے — چنانچہ اس کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کے صرف دو سبب ہیں ایک شراب خواری اور دوسرا تماکو نوشی — جنگ سے قبل انگلستان کے رنگروٹوں کے متعلق جنرل ٹلنگی نے جو بیان شایع کیا تھا اس میں بھی یہی ظاہر کیا کہ "یہ اپنی صحت جسمانی کے لحاظ سے حد درجہ خام اور ذہانت کے لحاظ سے نہایت پست ہیں"۔ افواج برطانیہ کے سرجن جنرل نے بھی اپنی سالانہ رپورٹ میں اس انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "قوم کا مستقبل صرف ہمارے ملک کے نوجوانوں پر منحصر ہے اور ان کا معیارِ صحت و توانائی روز بروز گرتا جا رہا ہے اسلئے اگر تماکو نوشی کی عادت ان سے ترک نہ کرائی گئی تو کوئی امید ہمارے زندہ رہنے کی باقی نہیں ہے"۔

چکاگو ٹریبیون میں لندن کا برقی پیام شایع ہوا تھا کہ "سیگرٹ کا استعمال افواج برطانیہ کو تباہ و برباد کرتا چلا جارہا ہے، اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو حکومت کی حفاظت گویا ان لوگوں کے سپرد کردیجائے گی، جن کے اعصاب ضعیف، دماغ کمزور، اور ہمتیں مضمحل ہیں۔ مہینوں کی تعلیم و تربیت کے بعد بھی ہمارے رنگروٹ معمولی نقل و حرکت باقاعدگی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے اور ان کا تنہا ذوق صرف یہ رہگیا ہے کہ ایک جگہ آرام سے پڑے رہیں اور ان سے کوئی کام نہ لیا جائے"۔ سر برامپٹن نے ایکبار دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ "ملک کے نوجوانوں میں سیگرٹ کے استعمال نے ایک گھُن لگا دیا ہے کہ اگر دس بارہ سال کے بعد ہمیں جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ہم کو ہزار میں ایک نوجوان بھی ملک کی حفاظت کا اہل نظر نہ آئے گا"۔ چند سال ہوئے امریکہ کی بحری اکاڈمی نے انسداد تماکو نوشی کے سوال کو اٹھایا تھا اور اس سلسلہ میں جو تحقیقات کی گئی اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو تماکو کا استعمال نہیں کرتے تھے، جسمانی و دماغی کاموں میں تماکو کا استعمال کرنے والوں سے بدرجہا فایق ثابت ہوے۔ مزید تصدیق کے لئے بعض نوجوانوں سے بہ جبر یہ عادت ترک کرائی گئی تو چند دن کے اندر ہی ان کی صحت و توانائی اور دماغی بیداری میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قانون جاری کردیا گیا کہ بحری افواج کے سپاہی تماکو کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درد سر، سوء ہضم وغیرہ کی شکایتیں نصف سے بھی کم رہگئیں، لیکن دو سال بعد یہ قانون منسوخ کردیا گیا اور پھر سپاہیوں کی وہی حالت ہوگئی۔

ڈاکٹر لارنڈ نے اپنی رپورٹ میں ظاہر کیا ہے کہ "طلبہ کی صحت اور دماغی اہلیت پر تماکو نوشی کا نہایت خراب اثر پڑ رہا ہے اور سخت ضرورت ہے کہ جبراً اسے ترک کرایا جائے"۔۔۔ لیکن اسوقت تک مغرب اس باب میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکا اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ صرف ایک امریکہ میں جہاں چند سال قبل سالانہ ۱۸ ارب (۱۸،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) سیگرٹ کا صرف تھا وہاں اب ایک کھرب سترہ ارب (۱۱۷،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) کا صرف ہے۔ کثرت تماکو نوشی کے ساتھ ساتھ اسکی نوعیت میں بھی حد درجہ خطرناک تغیر پیدا ہوتا جارہا ہے، یعنی پہلے تو صرف یہ صورت تھی کہ منھ کے اندر دھواں لیکر اسے باہر پھینک دیا جاتا تھا لیکن اب تماکو کے دھوئیں کو نگل کر سینے کے اندر پہونچایا جاتا ہے اور دیر تک اندر رکھنے کے بعد باہر پھینکا جاتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے اگر تماکو کا زہر صرف ایک مربع فٹ حصہ کو متاثر کرتا تھا تو اب ۱۰ مربع فٹ حصۂ جسم کو زہر آلود بناتا ہے۔۔۔ یہ ہے نتیجہ صرف تماکو نوشی کا اور اگر اسی میں میخواری کے نقصانات کا بھی اضافہ کردیا جائے تو پھر اس کا اظہار اعداد و شمار کے حدود سے باہر ہوجاتا ہے۔۔۔ اسوقت تماکو اور شراب کی تجارت میں جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اور جسقدر ان کے اشتہاروں پر صرف کیا جاتا ہے، اگر اس کا دسواں حصہ بھی خالص تعلیم و اقتصادی اصلاح پر صرف کیا جائے تو دنیا کا کوئی متنفس جاہل و مفلس نہیں رہ سکتا اور ممکن ہے اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہوسکے کہ یہ دونوں مذموم عادتیں نوع انسانی کو کتنا شدید نقصان پہونچا رہی ہیں۔۔۔ ہر چند یہ ظاہر ہے کہ جب یورپ و امریکہ کے مفکرین و مقننین اس کا انسداد نہیں کر سکے تو ہندوستان کی حکومت سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس طرف کوئی عملی قدم اُٹھائے گی کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن انفرادی طور پر ہر ہر شخص اور اجتماعی حیثیت سے ہر ہر خاندان کا بزرگ اور ہر اسکول و کالج کے ہیڈ ماسٹر و پرنسپل کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کرے اور ایک باضابطہ ادارہ ہر گھر اور ہر تربیت گاہ میں قایم کرکے ان دونوں کے مہلک اثرات سے

بچوں کو آگاہ کیا جائے۔ ہندوستان میں متعدد انجمنیں قائم ہیں جو انسداد مسکرات کی خدمت انجام دے رہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اسکا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوا، حکومت کی آمدنی مسکرات کی بھی بڑھ رہی ہے اور سیگرٹ کے بھی نئے نئے کارخانے قایم ہوتے جا رہے ہیں۔

کالجوں اور مدرسوں میں ہم کو وہاں کے اساتذہ کی طرف سے یہ توقع قایم کرنا چاہئے کہ وہ طلبہ کو تمباکو نوشی سے باز رکھیں لیکن یہ بیوقت ممکن ہے جب پہلے وہ خود اس کو ترک کریں اور اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے قایدین مذہب و اخلاق سے یہ امید رکھنا چاہئے کہ وہ وعظ و پند سے کام لیکر اپنے حلقۂ ادارت میں اس مذموم عادت کے اثرات لوگوں کے ذہن نشین کرائیں لیکن یہ کیونکر ممکن ہے جب تک وہ خود اس پر عامل نہ ہوں اور "خلوت" کے اس "کارِ دیگر" سے ان کا باز رہنا بالکل محال ہے۔

آصفجاہ سابع کی سلور جوبلی

۱۰ ار فروری کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۲ ار فروری کی صبح کو میں حیدر آباد پہونچا۔ اس وقت میرے یہاں آنے کی غرض صرف یہ تھی کہ جوبلی کی تقریبات میں شریک ہو کر اعلیحضرت کے ان ارشادات عالیہ کے نتائج کا مطالعہ کروں جو تفریحات جشن کو ایک مفید لائحۂ عمل میں تبدیل کرنے کا اعلان اب سے بہت قبل کر چکے تھے اور جس کا ذکر اس سے قبل نگار میں ہو چکا ہے۔ جوبلی ایک ایسی عظیم المرتبت ہستی کی ۲۵ سالہ جوبلی جو ایک طرف عہد مغلیہ کی سطوت و شوکت کی تنہا یادگار ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی ۶۰۰ ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کی مالک و مختار۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب میں جتنا ہنگامۂ مسرت و تفریح بپا کیا جاتا درست تھا، نمود و نمایش میں جتنا مبالغہ بھی کیا جاتا وہ کم تھا۔ دولت کی کمی نہیں، ولولوں میں پستی نہیں، خزانۂ شاہی مالامال، رعایا مسرور و خوشحال! اس سے زیادہ کھل کھیلنے کے لئے اور کیا چاہئے تھا، لیکن دنیا سنکر حیرت کریگی کہ باینہمہ جذباتِ مسرت و شادمانی میں نے کوئی ایک تقریب بھی ایسی نہیں دیکھی جسمیں متانت و سنجیدگی سے ہٹ کر کسی رسم کو ادا کیا گیا ہو، کوئی ایک مظاہرۂ لطف و نشاط بھی ایسا نگاہ سے نہیں گزرا جسکی بنیاد لہو و لعب پر قایم ہو۔

اعلیحضرت کی وہ فطری سادگی و سادہ روی جو اپنے اندر ایک کوہ وقار عظمت پوشیدہ رکھتی ہے، ہر جگہ اور ہر موقعہ پر چھائی ہوئی تھی اور یہ تمام تقریبات باوجود انتہائی جوش کے ایسی محسوس ہوتی تھیں گویا ایک عمان بسیط کی موجیں ہیں جو چاند کے پرتو سے جگمگا تو رہی ہیں لیکن ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر شور و ہنگامہ بپا کرنا بھول گئی ہیں۔ مراسم جوبلی کا آغاز ۱۴ ار فروری کو ہوا اور وہ اس طرح کہ بندگان عالی نے بوقت چاشت دو رکعت نماز شکرانہ باغ عامہ میں ادا کی۔ اس کے بعد فتح میدان میں افواج باقاعدہ کی پریڈ ملاحظہ فرمائی جو تمام تقریبات میں انتہائی پرشکوہ و جلال منظر تھا۔ شہ نشین پر اعلیحضرت تمام معزز مہمانوں کے ساتھ جلوہ افروز تھے اور میدان کے چاروں طرف ہجوم کا یہ عالم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ بینڈ بج رہا تھا، ہز ہائنس پرنس آف برار کی کمان میں سوار و پیادہ دستے یکے بعد دیگرے نگاہ ہایوں کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور اس ایک لاکھ سے زاید تماشائیوں کے ہجوم پر سکوت و سکون کا وہ عالم طاری تھا جسے "نظارہ ز جنبیدن مژہ گلہ دارد" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی دن رات کو ۹ بجے باغ عامہ کے جوبلی ہال میں (جو تین لاکھ کے صرف سے اسی غرض کے لئے طیار کیا گیا ہے) اعلیحضرت کے حضور میں دکن کی رعایا کی طرف سے ایک اڈریس پیش کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ تنہا یہی ایک تقریب ایسی تھی جسے تمام جشن جوبلی کا ماحصل سمجھنا چاہئے۔

یہ ایڈریس جس کے پڑھنے اور پیش کرنے کی عزت سر صدر اعظم بہادر کو حاصل ہوئی، ایک مفصل تبصرہ تھا، آصف جاہ سابع کے گزشتہ ۲۵ سال کی حکومت پر اور جس نے اس کو سنا ہے یا اخباروں میں پڑھا ہے وہ یقیناً میری ہی طرح یہ معلوم کرکے حیران رہگیا ہوگا کہ گزشتہ ربع صدی میں سلطنت آصفیہ نے جتنی ترقی کی ہے اس کی نظیر دُنیا کی کوئی حکومت پیش نہیں کر سکتی۔ قانون و عدالت، زراعت و فلاحت، تعلیم و حفظان صحت، اقتصاد و سیاست، الغرض کوئی شعبہ ایسا نہیں جس نے موجودہ فرمانروائے دکن کے عہد میں غیر معمولی ترقی نہ کی ہو اور آیندہ کے لئے وسیع تر ترقیوں کا لائحۂ عمل اپنے سامنے نہ رکھا ہو۔

اس ایڈریس کا جواب اعلیٰحضرت نے جن الفاظ اور جس لب ولہجہ میں دیا، وہ دنیائے حکومت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے۔ اعلیٰحضرت نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ماحصل یہ تھا کہ نہ صرف ان کی حکومت بلکہ ان کی ذاتی و انفرادی مساعی کا نصب العین بھی ہمیشہ خلق خدا کی ہمدردی رہا ہے اور انھوں نے اس ساعت کو جو اس فکر سے غافل گزر گئی ہے کبھی اپنی حیات کا جزو قرار نہیں دیا ــــ ممکن ہے بعض حضرات ان الفاظ کو محض رسمی و کاغذی چیز قرار دیں، لیکن وہ لوگ جنھیں اخلاق ہمایونی اور قلمرو دکن کے حالات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے، سمجھ سکتے ہیں کہ اعلیٰحضرت نے جو کچھ فرمایا وہ حقیقتاً حقیقت سے بہت کم ہے اور ان برکات کی تفصیل کے لئے جو صرف اعلیٰحضرت کے بلند و پاکیزہ اخلاق کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں، دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

۱۴ر کی شام کو ہز ہائنس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر نے افواج باقاعدہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا اور ۱۵ر کی شب میں نہایت وسیع پیمانہ پر جوبلی ہال میں شاہانہ ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ ۱۵ر کی شب میں مغربی طرز کی دعوت کی گئی اور اسی طرح مختلف رسمی تقریبات ۲۲ر فروری تک جاری رہیں گی جبکہ غالباً میں یہاں نہ ہوں گا، لیکن اسوقت تک جو کچھ جس انداز سے ہوا ہے وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ اعلیٰحضرت کا مقصد اپنی ۲۵ سالہ جوبلی سے صرف یہ ہے کہ اپنی رعایا اور عمال حکومت کے سامنے دوسری ربع صدی کے لئے کوئی نیا پروگرام پیش کریں اور گزشتہ ترقیوں کی بنیاد پر زیادہ وسیع و مستحکم ذرایع ترقی قایم کرکے ملک اور اہل ملک میں تازہ روح پھونکدیں۔ اور یہی وہ مقصد عظیم تھا جس کو سامنے رکھ کر بندگان عالی نے رقص و سرود، لہو و لعب، چراغاں و آتشبازی وغیرہ کے مسرفانہ مراسم کو بند کرکے ایک فرمان جاری فرمایا کہ جو بیس لاکھ کی فراہم شدہ رقم میں سے اکثر حصہ رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جائے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے امراض شُش کے اسپتال کا قیام ہے۔

جشن جوبلی ہمیشہ بادشاہ کی ذاتی مسرتوں کو پیش نظر رکھ منائی جاتی ہے اور اسی لئے اس میں عنصر غالب لہو و لعب اور تفریح و نشاط کا ہوا کرتا ہے، لیکن چونکہ آصف جاہ سابع کی ذاتی مسرتیں ہمیشہ انھیں کاموں سے وابستہ رہی ہیں جن کا تعلق مفاد عامہ سے ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس مقصد کے علاوہ کوئی اور مقصد بندگان عالی کے سامنے ہوتا اور ملک کا روپیہ وہ ایسے کاموں میں صرف ہونے دیتے جو اہل ملک کے کام نہ آتا ــــ الغرض ان آنکھوں نے یہاں وہ کچھ دیکھا جس کا تصور بھی ذہن میں نہ آسکتا تھا اور حقیقتاً خوش نصیب ہے وہ ملک جس کا فرمانروا اتنے بلند اخلاق رکھتا ہو۔

شعر اور عورت

(عرب)

سرزمین عرب ہزار ہا برس سے موجود ہے، اُس کا تمدن بھی کچھ نو عمر نہیں تاہم تعجب ہے کہ آج سے صدیوں قبل جبکہ اُن کے چمنستان تمدن میں غریب عورت کی آبیاری کو کچھ دخل نہ تھا اور نہ اُن کی تعلیمی و اخلاقی ارتقار کے لئے کوئی باقاعدہ نظام مقرر تھا، اُسوقت بھی کم ازکم شعر و شاعری میں جو درحقیقت ایک فطری فن ہے ایسی ایسی قابل عورتیں گزری ہیں جن کے کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

شاعری کا احساسات وجذبات سے دراصل چولی دامن کا تعلق ہے خود شاعر کے لفظی معنے صاحب شعور کے ہیں، اور شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہوتا ہے جس کا احساس قوی ہو اس اعتبار سے عورت مجسمۂ شاعری ہے، اس لئے کہ اُس کے احساسات وجذبات فطرۃً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ کسی شخص کی مصیبت کا حال اگر دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس کا اثر جس قدر صنف نازک پر ہوتا ہے مردوں پر نہیں ہوتا۔ دوست کی مفارقت، اولاد کی جدائی، گھر بار کی بربادی، ملک ومال کی تباہی ہر شخص پر اثر کرتی ہے لیکن ایک عورت اس موقع پر فرط غم سے بالکل پاگل ہو جاتی ہے، دریا کی روانی سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، صبح کی شگفتگی اور شام کی دل آویزی ایسے مناظر ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے لیکن یہی چیزیں ایک عورت پر وجد کی کیفیت طاری کردیتی ہیں جس سے وہ سرشار ہوکر جھوم اُٹھتی ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تاثر و انفعال میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہی چیز شعر کی کائنات اور شاعری کی حقیقی بنیاد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عورتوں نے شعر و شاعری میں بارہا مردوں سے مقابلہ کیا اور کبھی اُن سے پیچھے نہیں رہیں بلکہ اس میدان میں شاید ہی کوئی ایسا انعام ہو جو انھوں نے حاصل نہ کیا ہو، عربوں کے بڑے بڑے زبان آور شعرا میں خنساء کا نام ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے جو ایک عورت تھی، اسی طرح لیلیٰ الاخیلیہ ایک بڑی نامور

شاعرہ گزری ہے جو اپنے زمانہ کے بڑے بڑے شعراسے بار بار بازی لیگئی۔

یوں تو دنیا کا کوئی ایسا طبقہ نہیں جہاں ہر زمانہ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی شاعرہ نہ پیدا ہوئی ہو مگر سرزمین عرب کو اس میں غیر معمولی خصوصیت حاصل تھی۔ شعرگوئی اور انشا پردازی اہلِ عرب کے خمیر میں داخل تھی، قدرت نے جذبات کے اظہار پر اُن کو ایسی قدرت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانہ کی بڑی بڑی مہذب قومیں بھی اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھیں، وہاں کے مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب ہومر اور شکسپیر کی شان رکھتے تھے۔

حرب بسوس میں امامہ بنت کلیب کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جب اُس کے باپ کلیب کو جساس اور عمرو بن حارث نے دھوکہ سے قتل کر دیا تو وہ روتی پیٹتی اپنے چچا مہلہل کے پاس پہونچی، دیکھا تو وہ شراب کے نشہ میں مدہوش اور عیش و نشاط میں سرشار ہے اُس کو سخت غصہ آیا، مہلہل کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اُس وقت اُس نے جو فی البدیہہ اشعار کہے تھے اُن میں سے چند درج ذیل ہیں، جن سے عربوں کے فطری شاعرانہ ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ أتلهو بالملاهي والخمور ولا تدري بعاقبة الامور۔	کیا تم لہو لعب اور شراب و کباب ہی میں مشغول رہوگے اور انجام کی کچھ خبر نہ ہوگی۔
۲۔ ولا تدري بانّ كليباً ضحىٰ قتيلاً عند جساس الغدور۔	کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کلیب کو غدار جساس نے قتل کر دیا ہے۔
۳۔ فواعجبا لجساس وعمرو لقد جسرا على امرٍ نكير۔	جساس اور عمرو پر تعجب ہے کہ انھوں نے ایسے فعل قبیح پر جرأت کی۔
۴۔ ويا ويلا لجساس وعمرو لقد رميا اخاك بعنقفير۔	افسوس ہے جساس اور عمرو پر کہ انھوں نے تمھارے بھائی کو انتہائی فریب سے قتل کر ڈالا۔
۵۔ فبادر وانزعن الرمح منه فما احدٌ علينا بالجسور۔	پس جلدی پہونچو اور اسکے جسم سے نیزہ نکالو۔ کیا (اس سے قبل بھی) ہمارے مقابلہ میں کسی کو سرکشی کی جرأت ہو سکی ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب) جلد اول صـ۶

عمرہ خثعمیہ ایک بڑھیا ہے، اہل و عیال سب ختم ہو چکے ہیں، صرف دو بچے ہیں جو اسکی زندگی کا آخری سہارا ہیں جب وہ اُنکی جوان مرگی کی خبر سنتی ہے تو فرطِ غم سے پاگل ہو جاتی ہے اور درد میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہتی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ ابى الناس الا ان يقولوا هما هما ولو اننا استطعنا لكان سواهما	لوگ اصرار سے کہتے ہیں کہ وہی (میرے دونوں بچے) مرے ہیں اور اگر ہمارا بس ہوتا تو ہم کہتے کہ اُنکا نہیں بلکہ کسی اور کا انتقال ہوا ہے

۲۔ بُنَیَّا عجوزٍ حرم الدھر اھلہا
فلیس لہا الا الالہ سواھما۔

ہائے وہ بڑھیا جس کے شوہر کو زمانہ پہلے ہی مٹا چکا تھا۔
یہی دو بچے (خدا کے علاوہ) اُس کے سرمایۂ حیات تھے۔

۳۔ ھما اخوانی الحرب من لا اخالہ
اذا خاف یوماً نبوۃً فدعاھما۔

یہ دونوں معرکۂ جنگ میں اُس شخص کے مددگار ہوتے تھے جس کا کوئی نہیں ہوتا تھا۔
جب زمانہ کی ناسازگاری کا کسی کو ڈر ہوتا تھا تو وہ ان دونوں کو بلاتا تھا۔

۴۔ ھما یلبسان المجد احسن لبسۃٍ
شحیحان ما استطاعا علیہ کلاھما۔

وہ دونوں عزت و مجد کے لباس فاخرہ سے مزین تھے
اور حتی الامکان اُس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔

۵۔ شہابان منا اوقدا ثم اخمدا
وکان سناً للمجدلین ضیاھما۔

ہائے! وہ دونوں میرے چمکتے ہوئے ستارے تھے جو پہلے روشن کئے گئے اور پھر بجھا دئے گئے
ان دونوں کی آگ مہمانوں کے لئے ہمیشہ روشن رہتی تھی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۴۶)

جس ملک کے بچوں، بوڑھوں کی سحر بیانی کی یہ کیفیت ہو تو پھر قیاس کیجیے کہ وہاں جوان عورتوں کے جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا؟

جزیرۂ عرب کے اُن خانہ بدوش قبائل میں جو اپنے لطیف تاثرات اور عاشقانہ جذبات کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ایک ممتاز قبیلہ بنو عذرہ کا بھی تھا، جس کے حسن و عشق کے افسانوں نے اس درجہ شہرت حاصل کرلی تھی کہ عرب میں حُبًّا عذریًّا کا ایک لطیف محاورہ پیدا ہوگیا تھا جو آج تک ضرب المثل ہے۔ اسی مقدس سرزمین کے دو جانباز عاشق و معشوق زرعہ اور ظریفہ بھی تھے، ظریفہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ ذوق شاعری کے لحاظ سے بھی نمایاں امتیاز رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ قبیلہ کے تالاب پر ٹہل رہی تھی کہ اتنے میں زرعہ بن خالد شکار کھیلتا ہوا اُدھر آنکلا، دیکھا تو سامنے ظریفہ تھی، نگاہیں چار ہوتے ہی دل ہاتھ سے کھو بیٹھا، سر چکرایا اور بے ہوش ہوکر وہیں گر پڑا۔

ظریفہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اُٹھی اور اُس کے پاس گئی۔ ہوش میں لانے کی بہت سی تدبیریں کیں۔ لیکن جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو تالاب سے پانی لائی اور محبت بھرے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ چند منٹ میں مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو دلدار کا چاند سا مکھڑا سامنے تھا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔ ہل مقتولٌ یداویہ قاتلہ، (کیا دنیا میں ایسے خوش نصیب بسمل بھی ہوا کرتے ہیں جن کا علاج کرنے والا بھی وہی ہو جس نے ذبح کیا ہے)

ظریفہ بھی دل پر چوٹ کھا چکی تھی، مسکرا کر بولی پھر آپ کو شکایت کیا ہے؟

اب کیا تھا پیمانِ محبت اُستوار ہوا۔ زرعہ نے عشق و محبت کی شراب ناب سے مخمور ہوکر یہ اشعار

پڑھنا شروع کئے۔

۱۔ خرجتُ اصید الوحش صادفت قانصًا
من الریم صادتنی سریعًا حبائلہ۔

میں تو اس ارادے سے نکلا تھا کہ صحرائی جانوروں کا شکار کھیلونگا، لیکن وہاں ایک سفید رنگ غزال نے خود مجھی کو شکار کر لیا۔

۲۔ فلما رمانی بالنبال مصارعًا
رقانی وہل میتٌ یداویہ قاتلہ۔

پھر جب وہ تیر مار کر مجھے بے بس کر چکی تو خود ہی فکر درماں بھی کرنے لگی کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقتول کا علاج خود اُسکا قاتل کرے۔

۳۔ الا فی سبیل الحب صبٌّ قد انقضی
سریعًا و لم یبلغ مرادًا یحاولہ۔

ہاں راہ محبت میں ایک عاشق تھا جو بہت جلد ختم ہوگیا اور اُس آرزو میں کامیاب نہ ہوا جو وہ دل میں لئے ہوئے تھا

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۸)

جب ان دونوں کے عشق و محبت کا چرچہ قبیلہ میں پھیلا تو ظریفہ کے اعزہ نے غریب زرعہ کے قتل کی ٹھان لی، عشق کا مارا زرعہ جان بچا کر بھاگا، مگر چلتے چلتے چند اشعار اپنے ایک دوست کو یاد کرا دئے اور کہا کہ موقع دیکھ کر ظریفہ کو سنا دینا، اشعار کا مفہوم یہ ہے:-

"ایک مریض عشق ہے جو قبیلہ کے گھروں کے قریب ایک گوشہ میں پڑا تڑپ رہا ہے، نہ اس کی دوا ہے نہ علاج، لوگ مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ تم اُس کی عیادت کو آؤگی تو وہ جی جائے گا۔ اور جب وہ تم سے مہربانی کی درخواست کریں گے تو تم بخل نہ کروگی۔"

ظریفہ نے جب یہ اشعار سنے تو فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ زرعہ کا پیام ہے جو اس نے اس طرح مجھ تک پہونچایا ہے، دوڑتی ہوئی گھر سے باہر نکل آئی اور جواب میں اس نے فی البدیہہ یہ چند شعر کہے جو بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

۱۔ رعی اللہ من ہام الفؤاد بحبہ
ومن کدتُ من شوق الیہ اطیر۔

خدا اُس کی حفاظت کرے جس کا دل محبت میں بے چین ہے اور جس کیلئے میرا جی چاہتا ہے کہ اُڑ کر اُسکے پاس پہونچ جاؤں

۲۔ لئن کثرت بالقلب اتراح لوعتہ
فان الوشاۃ الحاضرین کثیر۔

ہر چند دل میں محبت کے شعلے بکثرت اُٹھ رہے ہیں مگر کیا کروں چغلی کھانے کی بھی کمی نہیں۔

۳۔ فان لم ازر بالجسم خیفۃ معشر
فللقلب آتٍ نحوکم فیزورُ

اگرچہ قبیلہ کے ڈر کی وجہ سے میں تم سے بظاہر نہیں مل سکتی مگر دل روزانہ تمھارے پاس جاتا ہے اور زیارت کر آتا ہے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور ص۲۷۹)

زمانہ جاہلیت میں جب اہل عرب کی شاعری بلاغت کے معراج پر پہونچی ہوئی تھی۔ سخن سنجی و شعر گوئی کا

بازار گرم تھا تو صدہا ایسی خواتین پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ادبیات کی تاریخ میں غیر فانی نقوش چھوڑ گئے۔ اس دور کی مایۂ ناز شاعرہ خنساؔ کا دیوان جس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آج بھی دنیائے ادب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ صدیوں پہلے قاصر تھی۔

سوق عکاظ میں جو زمانۂ جاہلیت میں نازک خیال اور رنگین طبع شعرا کا دنگل سمجھا جاتا تھا شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور دل کھول کر داد سخن دیجاتی تھی، اُن میں شعرا کے ساتھ ساتھ اُس زمانہ کی صاحب علم و فضل خواتین بھی شریک ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خنساؔ ہے۔ جب یہ آتی تھی تو اپنے بھائی صخر کو یاد کرکے خود روتی تھی اور سارے مجمع کو بھی رلاتی تھی، اُس کے کجاوہ پر ایک سیاہ جھنڈا نصب ہوتا تھا جو اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ وہ اہل عرب میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔

عہد بنو امیہ کے مشہور اُستاد جریر سے کسی نے پوچھا "اشعر العرب" (سب سے بڑا شاعر عرب کا کون ہے؟) اُس نے جواب دیا اگر خنساؔ نہ ہوتی تو میں کہتا کہ میں ہوں اسی طرح ایک مرتبہ عہد بنو عباس کے جلیل القدر شاعر بشارؔ نے تذکرۃً کہا کہ عورتیں جب شعر کہتی ہیں تو اُس میں اُن کی فطری کمزوری کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے کسی نے کہا کیا خنساؔ کے کلام میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، اُس نے کہا "تلک فوق الرجال" (وہ تو مردوں سے بھی بازی لے گئی ہے)

نابغہ ذبیانی جو زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر تھا، خنساؔ کا بڑا احترام کرتا تھا، جب وہ سوق عکاظ کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی تو نابغہ اُس کے لئے خاص اہتمام کرتا تھا، سرخ چمڑے کا ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں بڑی عزت کے ساتھ صدر مقام پر اُس کو بٹھایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ آئی تو حسن اتفاق سے امام فن ابو بصیر اعشیٰ، حضرت حسان اور اُس زمانہ کے دوسرے مشہور شعرا موجود تھے سب سے پہلے ابو بصیر اعشیٰ نے اپنا کلام سنایا پھر حضرت حسانؔ نے پھر اوروں نے، سب کے آخر میں خنساؔ نے اپنے دل ہلا دینے والے اشعار سنائے اور خوب خوب داد حاصل کی، نابغہ پر تو وجد کی کیفیت طاری ہوگئی بے اختیار بول اُٹھا۔

لولا انّ ابا بصیر انشدنی آنفاً	اگر ابو بصیر نے ابھی اپنا کلام نہ سنایا ہوتا تو میں یہی کہتا
لقلتُ انّک اشعر الجن والانس	کہ تم جن و انس میں سب سے زیادہ باکمال شاعرہ ہو۔

(کتاب الشعر والشعرا مطبوعہ لندن صفحہ ۱۹۸)

سلہ الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۱

حضرت حسان نے خیال کیا کہ نابغہ نے دراصل مجھ پر چوٹ کی ہے خفا ہو گئے اور کہنے لگے نابغہ تم نے کیا کہا ؟ خدا کی قسم میں تم سے، تمہارے باپ سے اور تمہارے دادا سے بھی اچھا شاعر ہوں۔

نابغہ نے حضرت حسان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا خفا ہونے کی بات نہیں، لو سنو اور انصاف کرو، پھر خنسا سے دوبارہ اشعار سنانے کی درخواست کی، اور کہا میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنسار نے یہ سنا تو ناگوار ہوا، ڈانٹ کر بولی "خوشامد نہ کرو، میں مردوں سے بھی زیادہ اچھی شاعرہ ہوں۔

خنسار کا اصلی نام "تماضر بنت عمرو بن الشرید السلیمیہ" تھا اور خنسار لقب جو بعد میں اسقدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے، اُس کے دو بھائی تھے، صخر بن عمرو اور معاویہ بن عمرو۔ صخر کو بنو اسد نے اور معاویہ کو بنو مر بن غطفان نے قتل کر دیا تھا۔ اُس کا سارا دیوان انھیں دونوں کے مرثیوں سے بھرا پڑا ہے، نمونتاً چند اشعار درج ذیل ہیں:-

۱— اعینی جودا ولا تجمدا الا تبکیان بصخر الندا	اے میری دونوں آنکھوں آنسو بہائے جاؤ اور کبھی خشک نہ ہو کیا صخر کی داد و دہش کی یاد پر تمھیں رونا نہیں آتا۔
۲— الا تبکیان الجری الجمیل الا تبکیان الفتی السیدا	کیا تم ایک بہادر وخوبرو کی جدائی پر آنسو نہیں بہاتیں ؟ کیا تم اُس نوجوان سردار پر نہیں روتیں ؟
۳— طویل النجاد رفیع العماد وساد عشیرتہٗ امردا	جس کی تلوار کا پرتلا سب سے لمبا اور جس کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند تھا اور جو لڑکپن ہی سے اپنے قبیلہ پر سرداری کرتا تھا۔
۴— اذا القوم مدوا بایدیہم الی المجد مد الیہ یدا	جب لوگ اسکی مدد طلب کرنے کے لئے دست سوال پھیلاتے تھے تو وہ عزت و شرافت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔

(کتاب الاغانی مطبوعہ مصر جلد سیزدہم صفحہ ۱۳۶)

شاعری میں کمال حاصل ہونے کے علاوہ خنسا کا شمار زمانۂ جاہلیت کی ان بہادر خواتین میں تھا جو میدان جنگ میں ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش شریک رہتی تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور مقتولین کی لاش اُٹھاتی تھیں۔ خنسار کے چار بیٹے تھے چاروں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے، خنسار نے انھیں وصیت کر دی تھی کہ وہ کسی حالت میں بھی پیٹھ نہ دکھائیں۔ چنانچہ وہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اور جب اسکی اطلاع خنسار کو پہونچی تو اُس نے کہا۔ "الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم" (خدا کا شکر ہے اس عزت پر جو مجھے انکے قتل ہو جانے سے نصیب ہوئی)[1]

---

[1] آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۲۹

خنساء کی ایک پھوپھی کا نام بھی "تماضر بنت الشرید السلیمیہ" ہے وہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی زبردست شاعرہ تھی قبیلۂ غطفان اور ہوازن کا سردار زھیر بن جدیمہ اُس کا شوہر تھا، جس کو خالد بن جعفر عامری نے جنگ نفراوات میں قتل کر دیا تھا اور اُسکے بعد اُس کے بیٹے مالک بن زہیر کو غداری سے قتل ڈالا، تماضر نے جب یہ خبر سنی تو بیٹے کی جواں مرگی پر اُس نے ایک دلدوز اور پر اثر مرثیہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱— كأنّ العين خالطها قذاها	گویا آنکھیں غبار آلود ہو گئی ہیں۔
لحزنٍ واقعٍ افنى كراها	ایک غم کی وجہ سے جس نے آنکھوں کی نیند اچاٹ کر دی ہے۔
۲— علی ولد وزین الناس طرًّا	میں ایک ایسے بچہ پر آہ وزاری کر رہی ہوں جو تمام لوگوں کیلئے زینت فخر کا باعث تھا
اذا ما النار لم ترمن صلاها۔	مہمانوں کیلئے اُسکی آگ روشن رہتی تھی جب کوئی دوسرا اُسے روشن نہ کرتا تھا
۳— لئن حزنت بنو عبس علیہ	اگر بنو عبس اُس پر رنج کریں تو کوئی تعجب نہیں
فقد فقدت بنو عبس فتاها	اس لئے کہ انھوں نے اپنے ایک نوجوان کو کھو دیا ہے۔
۴— حذيفةُ لا سُقيت من الغوادي	حذیفہ خدا کرے تو صبح آنے والے بادلوں سے کبھی سیراب نہ ہو
ولا روتك هاطلةٌ نداها	اور نہ ابر کرم کی تجھ پر کبھی بارش ہو۔
۵— کما فجعتنی بفتیً کریمٍ ،	تو نے ایک شریف نوجوان کو قتل کر کے مجھے دکھ پہونچایا ہے۔
اذا وزنت بنو عبسٍ علاها	جو اگر تمام بنو عبس کے مقابلہ میں تولا جاتا تو وہی گراں ثابت ہوتا
۶— فدمعی بعده ابداً هطول ،	میرے آنسو اُس کے بعد ہمیشہ جاری رہیں گے
ولا یرقا، من عینی بکاها	اور میری آنکھیں اُس پر آہ وزاری سے کبھی خشک نہ ہوں گی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۲۴۳)

علامہ جرجی زیدان نے زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کی شاعری اور ادیبانہ بذلہ سنجی پر ساری صنف نسواں کو ناز تھا خنساء کے بعد لیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ اور خرنق (طرفہ کی بہن) کا نام لیا ہے اور اُن کو اس دور کی باقی ماندہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والی خواتین پر ترجیح دی ہے، ذیل میں ہم ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

لیلی العفیفہ۔ لکیر بن مرہ کی بیٹی تھی، بچپن ہی میں اُس کی شادی براق بن روحان مری کے ساتھ ہو گئی تھی، براق بن روحان اور اُس کا چھوٹا بھائی غرثان بن روحان قبیلہ بنو ربیعہ کے مشہور شہسوار اور بہادر سردار تھے، غرثان اُس جنگ میں مارا گیا جو [illegible]ء میں بنو ربیعہ اور بنو ایاد ولخم کے درمیان واقع ہوئی تھی لیلی العفیفہ غرثان کی جواں مرگی پر آنسو بہاتی ہے اور اُسکو تنہا چھوڑ جانے پر بنو ربیعہ کو ملامت کرتی ہے۔

۱— لما ذکرتُ غریثاً زادنی کمدی،
حتی ہممتُ من البلوی باعلان

میں جب غریث کو یاد کرتی ہوں تو میرے دل میں رنج و غم کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے حتی کہ میں چاہتی ہوں اس مصیبت کو آشکارا کر دوں۔

۲— تربع الحزن فی قلبی فذبتُ کما
ذاب الرصاص اذا اصلی بنیران۔

غم میرے دل پر چھایا ہوا ہے اور میں رنج میں اس طرح گھل رہی ہوں جس طرح سیسہ جب وہ آگ پر رکھا جاتا ہے۔

۳— فلو ترانی والاشجان تقلقنی
عجبت براق من صبری و کتمانی

اگر تم مجھے دیکھو اس حال میں رنج و غم مجھے تکلیف پہونچا رہے ہیں تو براق تم میرے صبر و ضبط پر تعجب کرو۔

۴— یا عین فابکی وجودی بالدموع ولا
تمل یا قلب ان تبلی باشجان

اے آنکھ رو اور آنسو بہا
اے دل ملول مت ہو جبکہ رنج و الم سے تو گھلا جا رہا ہے۔

۵— فذکر غرثان مولی الحی من اسد
انسی حیاتی بلاشک وانسانی۔

غرثان کی یاد نے جو قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا مجھے اور میری زندگی کو مجھ سے بھلا دیا ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص ۳)

جلیلہ بنت مرہ، جساس بن مرہ کی بہن اور کلیب بن ربیعہ کی بیوی تھی، بدقسمتی سے جساس اور کلیب میں ان بن ہو گئی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے کلیب کہا کرتا تھا کہ "میں بزدلوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتا، مرد ہو تو میدان میں آئے" جس کا جواب جساس یہ دیتا تھا کہ "گھبراؤ نہیں میدان جنگ جلد فیصلہ کر دے گا کہ ہم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا" یہ سب کچھ شاعری میں سوال و جواب ہوا کرتے تھے مگر جب کبھی سامنا ہو جاتا تھا تو دونوں جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے، ایسے مواقع پر غریب جلیلہ بیچ میں پڑ کر دونوں کو خونریزی سے بچا لیتی تھی، مگر یہ روک تھام تابکے؟ آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ ساری تدبیریں بیکار گئیں اور قسمت کا لکھا پورا ہوا، جساس اور عمرو بن حارث نے مل کر کلیب کو قتل کر دیا۔

کلیب اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اس کی موت کوئی معمولی موت نہ تھی، قبیلہ کی جوان اور بوڑھی تمام عورتیں گریباں چاک سر پر خاک اڑائے ہوئے ماتم کر رہی تھیں کہ دفعتہً کسی کی نگاہ ناکردہ گناہ جلیلہ پر پڑی سب کے دلوں میں شعلۂ انتقام بھڑک اٹھا، انھوں نے کلیب کی بہن اسمار سے کہا۔ "ہمارے ماتم کدہ میں جلیلہ کی موجودگی ہمارے لئے باعث ننگ ہے، یہ تو کلیب کے قاتل کی بہن ہے، اسے یہاں سے فوراً نکالو"۔

اس مشورہ کی فوراً تعمیل کی گئی اور مصیبت کی ماری جلیلہ روتی پیٹتی وہاں سے چل کھڑی ہوئی اس وقت اس نے جو شعر کہے تھے ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱- یا ابنة الاقوام ان لمت فلا
تعجلی باللوم حتی تسألی
اے خاتون! اگر تم ملامت ہی کرنا چاہتی ہو تو جلدی نہ کرو اور مجھ سے پوچھ تو لو کہ کیا بات ہے۔

۲- فاذا انت تبینت الذی
یوجب اللوم فلومی واعذلی
اگر تمھیں حالات معلوم ہو جانے کے بعد میں واقعی ملامت کی مستحق ہوں تو شوق سے ملامت کرو اور برا بھلا کہو۔

۳- ان تکن اختُ امرئٍ لیمت علی
شفقٍ منها علیه فافعلی
ہاں اگر کسی کی بہن پر محض اسلئے ملامت کیجا سکتی ہے کہ اُسے اپنے بھائی سے محبت تھی تو بھی نہ دیر کرو۔

۴- یا کلیب انت لی ذخر لمنی
کنت عزی در داءٍ المسبل
کلیب! تو میری تمام آرزوؤں کا مرکز تھا تو ہی میری عزت تھا اور میرے فخر کا سرمایہ تھا۔

۵- ما انثنی الدهر یأتی مثله
فارس الحرب وحامی البطل
میں جانتی ہوں کہ زمانہ اس جیسا اب پیدا نہیں کر سکیگا۔ وہ میدان جنگ کا شہسوار اور بہادروں کا حامی تھا اور جسے وہ بچانا چاہتا تھا بچا کے چھوڑتا تھا

۶- جلّ عندی فعل جساسٍ فیا
حسرتی عما انجلت او تنجلی
مجھ پر جساس کی یہ حرکت بہت گراں گذری اور جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے اس پر افسوس کرتی ہوں۔

۷- فعل جساس علی وجدی به
قاطع ظهری ومدنٍ اجلی
ہر چند مجھے جساس سے محبت ہے مگر اسکی اس حرکت نے میری پیٹھ توڑ دی اور میری موت مجھ سے قریب تر کر دی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۱)

خرنق بنت بدر بن هفان الثعلبی زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر طرفہ بن عبد کی اخیافی بہن تھی، یہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی قادر الکلام شاعرہ تھی، اُس کے اشعار کا مجموعہ دیوان کی شکل میں بیروت میں چھپ گیا ہے اُس کا زمانہ عہد اسلام سے تقریباً ستر سال پیشتر تھا، اُس کا شوہر بشر بن عمرو بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند کا مصاحب تھا، جب اُس کا انتقال ہوا تو دنیا اُس کی نظروں میں تاریک ہو گئی وہ اُس کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئی کہتی ہے:۔

۱- الا هلک الملوک وعبد عمرو
وخلیت العراق لمن بغاها
ہاں بادشاہ ہلاک ہو گئے اور عبد عمرو بھی ہلاک ہو گیا اور عراق اُس شخص کیلئے خالی کر دیا گیا جو اُس پر دھاوا بولے

۲- فکم من والدٍ لک یا ابن بشر
تأزر بالمکارم وارتداها
اے ابن بشر تیرے باپ جیسے کم لوگ ہونگے جو سر سے پاؤں تک بزرگی کے لباس فاخرہ سے آراستہ تھا۔

۳- بنی لک مرثد وابوک بشر
علی الشمّ البواذخ من ذراها
مرثد اور تیرے باپ بشر نے تیرے مفاخر پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند کر دئے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۱)

زمانۂ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کا کلام کتب ادب و شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ خنساء، جلیلہ بنت مرہ، لیلیٰ العفیفہ، خرنق اخت طرفہ کے علاوہ اُمیمہ بنت امیہ بن عبد شمس، خالدہ بنت ہاشم، کبشہ بنت عمرو بن معدی کرب، میسہ بنت جابر، سلیمی بنت المہلہل، سلمیٰ بنت مالک بن بدر، ہند بنت حذیفہ فارعہ بنت شداد، اروی بنت حباب، صفیہ بنت عمرو، میّہ بنت ضرار، لیلیٰ بنت وھب، مریم بنت طارق وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جلیل الرحمٰن اعظمی

ضلع کا ڈاکٹر

ایک مرتبہ موسم خزاں میں جب میں ملک کے دور دراز حصہ سے واپس آرہا تھا مجھے سردی لگ گئی اور میں بیمار پڑ گیا۔ جسوقت بخار آیا خوش قسمتی سے میں گاؤں کی سرا میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ ڈاکٹر کا قد اوسط بال سیاہ اور جسم لاغر تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر ایک نسخہ لکھدیا اور جیب میں ۵ روبل کا نوٹ رکھتے ہوئے کھانسکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ جانے والا ہی تھا کہ یکایک کسی وجہ سے باتیں کرنے لگا اور بجائے جانے کے میرے ہی پاس ٹھہر گیا۔ میں بخار سے بے چین ہو رہا تھا اور اس خیال سے کہ رات کو نیند تو آنے کی نہیں اس نئے دلچسپ دوست کے ساتھ باتیں کرنے میں مجھے بھی بہت مسرت ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاء آئی اور ڈاکٹر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ وہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا بہت پر زور طریقہ سے، جس میں ایک حد تک ظرافت بھی پائی جاتی تھی۔ — دنیا بھی عجیب و غریب جگہ ہے۔ ہم سب اکثر لوگوں کے ساتھ ایک طویل مدت تک رہتے ہیں، ان سے دوستانہ تعلقات بھی ہوتے ہیں تاہم ان سے ایک دفعہ بھی آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے ملاقات ہوئے مشکل سے چند منٹ ہوتے ہیں کہ ہم یا وہ ایک دوسرے پر اپنے تمام راز دل عیاں کرنے لگتے ہیں اب میں یہ نہیں جانتا کہ اُس ڈاکٹر کو میرے اوپر اس قدر اعتماد کیونکر ہو گیا اور کیوں اُس نے مجھے ایک نہایت دلچسپ قصہ سنایا۔ بہرحال میں ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں وہ قصہ بیان کرتا ہوں :-

"تم نہ جانتے ہوگے" اُس نے ایک کمزور آواز میں کہنا شروع کیا "تم یہاں کے جج میلو بول لو یچ کو نہ جانتے ہوگے؟ .... تم اُسے نہیں جانتے ہو؟ .... خیر ہوگا" (اُس نے اپنا گلا صاف کیا اور آنکھیں لیں)

"اچھا۔ تو یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب نہٹ میں برف پگھلنے کا زمانہ آچکا تھا۔ میں اُس کے یعنی جج کے مکان پر بیٹھا "پرلفرنس" (تاش کا ایک کھیل) کھیل رہا تھا۔ جج بڑا اچھا آدمی ہے اور اُسے "پرلفرنس" کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ یکایک (ڈاکٹر اس لفظ 'یکایک' کو بہت استعمال کرتا تھا) کسی نے مجھ سے آکر کہا کہ آپ کو ایک نوکر بلا رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے، مجھے جواب ملا وہ ایک خط لایا ہے جو غالباً کسی مریض نے

بھیجا ہے"۔ میں نے وہ خط مانگ لیا اور اُسے پڑھ کر کہا کہ ہاں یہ ایک مریض ہی کا خط ہے ـــ وہ خط ایک خاتون -- ایک بیوہ خاتون کا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میری لڑکی مر رہی ہے۔ خدا کے لئے آجایئے۔ آپ کے لئے سواری بھیجدی گئی ہے ۔۔۔ مختصر یہ کہ وہ خاتون قصبہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر رہتی تھی نصف شب گذر چکی تھی اور سڑکوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اور چونکہ وہ خود غریب تھی اس لئے کسی کو اُس سے دو نقرئی روبل سے زیادہ ملنے کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی علاوہ اس کے میں تھکا ہوا تھا۔ بہر حال تم جانتے ہو فرض سب پر مقدم ہے۔ … میں نے سینے تو کیلیوین کو جو سوبجاتی کمیشن کا ممبر ہے دیدئے اور خود گھر آیا۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی معمولی بدصورت گاڑی زینہ کے پاس کھڑی ہے، گھوڑے اُس میں ایسے کسی کسان کے جتے تھے جو بہت موٹے تھے۔ گاڑی بان ادب کے مارے اپنی ٹوپی اُتارے بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں سوچا … "یہ بات تو صاف ہوگئی کہ مریض رئیس نہیں ہے"۔۔

آپ ہنس رہے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ ہم جیسے غریب آدمی کو ہر چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر گاڑیبان شہزادہ کی طرح بیٹھا رہے، اپنی ٹوپی نہ اتارے، تم کو گھور کر دیکھے اور اپنا کوڑا سر پر چلاتا رہے تو یہ یقینی ہے کہ معاملہ ۲ روبل والا نہیں ہے۔ لیکن اس … نکلا اور تھا۔ خیر، تو میں ضروری دوائیں ساتھ لے کر چلدیا اور کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچ بھی گیا۔ البتہ … جہنم کا راستہ تھا۔ چشمے بھی تھے، برف بھی تھی اور سب سے بڑی خرافہ یہ تھی کہ ایک جگہ … پہیہ ٹوٹ گیا تھا۔ بہر حال مریضہ کا گھر آگیا۔ مکان پھوس کا بنا تھا، کھڑکی میں روشنی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ میری آمد کے متوقع تھے۔ دروازہ پر ایک ضعیف اور معزز عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "اسے بچا لیجئے، وہ مر رہی ہے!" میں نے جواب دیا "پریشان نہ ہوجئے۔ مریض کہاں ہے؟"۔ عورت نے کہا "ادھر آیئے"۔ میں اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے صاف کمرے میں پہونچا جہاں پلنگ پر ۲۰ برس کی ایک لڑکی بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ اُس کا بدن پھنکا جا رہا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی … اُسے بخار چڑھا تھا۔ قریب ہی دو اور لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اس کی بہنیں تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگیں "کل تک ان کی طبیعت بالکل اچھی تھی اور اشتہا بھی کافی تھی۔ آج صبح درد سر کی شکایت ہوئی اور شام تک یکایک وہ حالت ہوگئی جو آپ دیکھ رہے ہیں"۔ میں نے ان سے بھی اس کے جواب میں یہی کہا "گھبراؤ نہیں، آپ جانئے! یہ ڈاکٹر کا فرض ہے۔" ـــ میں اُس کے قریب گیا، نبض دیکھی، لیپ لگانے کو کہا اور ایک نسخہ لکھ دیا۔ اس اثنا میں میں نے اُس کی صورت دیکھ بھی پایا تھا ـــ میں نے اُسے وہیں دیکھا ـــ واللہ، میں نے ایسا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا ـــ مختصر یہ کہ وہ حسن کا مجسمہ تھی۔ مجھے اُس پر بے انتہا

رحم معلوم ہوا ـــــ ایسے حسین خط و خال! ایسی پرکیف آنکھیں! ۔۔۔۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس کی حالت سنبھل گئی۔ اُسے پسینہ آگیا اور وہ ہوش میں آتی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے چاروں طرف دیکھا مسکرائی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھتے ہی اُس کی بہنیں جھک کر اُس سے دریافت کرنے لگیں "تم اب کیسی ہو؟" اُس نے جواب دیا "اچھی ہوں" اور یہ کہکر ان کی طرف سے گھوم گئی۔ میں نے اُس کی طرف پھر دیکھا۔ وہ سوگئی تھی ـــ میں نے اس پر ان لوگوں سے کہا "اب مریض کو تنہا چھوڑ دیا جائے"۔ اس کے بعد ہم سب لوگ خاموشی سے دوسری طرف چلے گئے اور کمرہ میں صرف ایک خادمہ احتیاطاً چھوڑ دی گئی۔ برآمدہ میں ایک میز پر پانی اور ایک شیشہ شراب کا رکھا تھا۔ ہم لوگوں کے پیشہ میں بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔ لڑکیوں نے مجھے چائے دی اور مجھ سے درخواست کی کہ رات کو وہیں ٹھہر جاؤں ـــ میں نے اسے منظور کرلیا کیونکہ اُس وقت جا ہی کہاں سکتا تھا۔ مگر وہ ضعیف عورت برابر آہ وزاری کرتی رہی تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے وہ اچھی ہو جائے گی آپ پریشان نہ ہوجئے بلکہ تھوڑا سا آرام کر لیجئے۔ اسوقت دو بجے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو مجھے جگا لیجئے گا؟ میں نے کہا "ہاں، ہاں"۔ یہ سن کر وہ چلی گئی۔ لڑکیاں بھی اپنے کمرہ میں چلی گئیں اور میرے واسطے انھوں نے برآمدہ میں بستر بچھا دیا۔ میں بھی بستر پر جاکر لیٹ گیا مگر تعجب یہ ہے کہ مجھے نیند نہیں آئی حالانکہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے مریض کا تصور اپنے دماغ سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر مجھے تاب نہیں رہی اور میں یکایک اُٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ جا کر دیکھ آؤں کہ مریضہ کیسی ہے۔ اُس کے سونے کا کمرہ برآمدہ سے ملا تھا۔ میں اُٹھا اور چپکے سے دروازہ کھولا ـــ میرا دل دھڑک رہا تھا! میں نے اندر دیکھا! خادمہ سو رہی تھی، اُس کا منھ کھلا تھا اور کمبخت خراٹے بھی لے رہی تھی! مریضہ میری طرف منھ کئے لیٹی تھی۔ میں اُس کے قریب گیا۔۔۔ مگر اُس نے یکایک آنکھیں کھول دیا اور میری طرف گھور کر چلانے لگی "کون ہے؟ کون ہے؟" میں گھبرا گیا اور آخر کار اُس سے کہا "خاتون گھبراؤ نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ دیکھنے آیا ہوں کہ اب کیسی ہو" وہ بولی "تم ڈاکٹر ہو؟" میں نے جواب دیا "ہاں، میں ڈاکٹر ہوں۔ تمھاری ماں نے مجھے قصبہ سے بلوا بھیجا۔ اب تم سو جاؤ اور خدا نے چاہا تو دو ایک روز میں تم تندرست ہو جاؤ گی۔" "ہاں۔ ڈاکٹر صاحب براہ مہربانی مجھے موت سے بچا لیجئے" "تمھیں خدا اچھا کردے تم اس طرح کیوں باتیں کرتی ہو؟" میں نے محسوس کیا کہ اُس کو پھر بخار معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اُس کی نبض دیکھی۔ واقعی اُس کو بخار پھر چڑھ آیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ "میں تم سے یہ بتاؤں گی کہ میں مرنا کیوں نہیں چاہتی ـــ میں تم سے ضرور بتاؤں گی۔۔۔ اس وقت ہم اکیلے ہیں ـــ البتہ براہ مہربانی آپ کسی سے۔۔۔ کسی سے بھی کہہ نہ دیجئے گا۔۔۔ اچھا سنئیے!۔۔۔" میں جھک گیا۔

وہ اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لے آئی۔ اُس کے بال میرے رخسار کو چھو رہے تھے ــــ میرا سر چکر کھانے لگا تھا ــــ اتنے میں وہ کچھ کہنے لگی مگر میری سمجھ میں بالکل نہ آیا........ وہ بدحواس ہوگئی تھی.... وہ کانا پھوسی کرتی رہی مگر اتنی تیزی سے کہ گویا وہ روسی زبان ہی نہیں بول رہی ہے۔ آخرکار اُس نے اپنی کہانی ختم کی اور اپنا سر تکیہ پر رکھ لیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی اُنگلی سے مخاطب کرکے مجھ سے پھر کہا "ڈاکٹر صاحب یہ راز کسی سے کہئے گا نہیں"۔ میں نے اُسے کسی طرح چپ کیا، کچھ پینے کو دیا، نوکر کو جگایا اور پھر چلا گیا"

یہاں پر ڈاکٹر نے ہلاس لی اور اُس کے بعد پھر کہنا شروع کیا:۔

"بہرحال، دوسرے روز خلافِ توقع مریضہ کی حالت اچھی نہ ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جائے۔ اور یکایک یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں رہوں گا گو میرے دوسرے مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے .... اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص اس سے بے پرواہی نہیں کرسکتا کیونکہ جو شخص ایسا کرتا ہے اُس کے پیشہ کو نقصان پہونچتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے تو میں نے یہ خیال کیا کہ مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور دوسرے میں خود اُس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اُس کا پورا خاندان اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ غریب تھے مگر پھر بھی بہت تعلیم یافتہ تھے ...... ان کا باپ بہت قابل آدمی تھا ــــ ایک مصنف! اُس کا انتقال مفلسی کی حالت میں ضرور ہوا تھا مگر اُس نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم بہت معقول دلادی تھی۔ کتابیں بھی وہ بہت بڑی تعداد میں چھوڑ گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں مریضہ کی بہت دیکھ بھال کرتا تھا، اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ گھر بھر میرا اس طرح خیال کرتا تھا کہ جیسے میں بھی انھیں کے خاندان کا ہوں.......

اس اثنا میں سڑکیں اور بھی خراب ہوگئیں۔ تمام سلسلہ رسل و رسائل منقطع ہوگیا حتیٰ کہ شہر سے دوائیں بھی بوقت نہ آسکتی تھیں ..... بیمار لڑکی بھی اچھی نہیں ہو رہی تھی........ روز بروز........ روز بروز....

لیکن..... یہاں...... (ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا) "بھئی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیسے بتاؤں!".... (اُس نے کچھ تھوڑی سی ہلاس لی، کھانسا اور ذرا سی چاء پی) "خیر! میں تم سے سیدھے سادے بیان کئے دیتا ہوں ...... کیسے بتاؤں!.... ہاں تو وہ مجھ پر عاشق ہوگئی تھی.... یا نہیں۔ وہ عاشق نہیں ہوئی تھی.... بہرحال.... واقعی، کس طرح کہوں؟" (ڈاکٹر نیچے دیکھنے لگا اور اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا) اس کے بعد جلدی سے کہنے لگا "نہیں۔ واقعی وہ عاشق ہوگئی تھی۔ انسان کو اپنے آپ کو بہت نہ بڑھا دینا چاہیئے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی، ہوشیار اور بڑی قابل، اور میں سمجھئے، لاطینی بالکل ہی بھول چکا تھا۔ رہ گئی صورت شکل (ڈاکٹر نے اپنی طرف مسکرا کر دیکھا) سو میں اس پر بھی کوئی فخر نہیں کرسکتا لیکن خداوند تعالیٰ نے مجھے بیوقوف نہیں بنایا ہے۔ میں سفید کو سیاہ نہیں سمجھتا ہوں۔ میں تھوڑا بہت

سمجھ بھی لیتا ہوں - مثلاً میں یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ الکسنڈرا ایینڈریونا [illegible] محبت نہیں کرتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک دوستانہ رغبت تھی - تعظیم [illegible] وقت وہ خود اس جذبہ کو غلط سمجھتی تھی مگر اس کا رویہ تھا ایسا ہی - اب آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں - لیکن (ڈاکٹر نے جو یہ تمام غیر مربوط جملے سانس لئے بغیر بہت گھبراہٹ میں کہے چلا جا رہا تھا اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا) مجھے تعجب یہ ہو رہا ہے -- آپ اسے نہیں سمجھ سکتے -- اچھا تو میں آپ کی اجازت سے سلسلہ وار بیان کروں گا۔"

یہ کہکر اُس نے چاء کی پیالی پی اور پھر کچھ اطمینان سے کہنا شروع کیا :-

"اچھا تو میری مریضہ کی حالت خراب ہوتی چلی گئی - آپ ڈاکٹر نہیں ہیں اور یہ نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ غریب ڈاکٹر کے دل پر خصوصاً جب اُسے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ بیماری اُس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرتی جاتی ہے کیا گزرتی ہے اور وہ خود اپنے متعلق کیا خیال کرنے لگتا ہے - انسان اتنا پژمردہ ہو جاتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ہر بات بھول گئے ہیں، مریض کو ہم پر اعتماد نہیں رہ گیا دوسروں کو بھی پتہ چلنے لگتا ہے کہ تم پریشان ہو - تمہاری طرف ان کا مشکوک نگاہوں سے دیکھنا [illegible] محسوس کرنا - اف! کسقدر تکلیف دہ چیز ہے! دل میں خیال آتا ہے کہ اس بیماری کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوگا بشرطیکہ سمجھ میں آجائے - کیا یہ واقعہ نہیں ہے - تم ایک علاج کرتے ہو -- اور پھر کہتے ہو نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے -- اصل تو یہ ہے کہ تم دوا کو اپنا کام کرنے کے لئے کافی وقت ہی نہیں دیتے ہو - - تم ایک چیز پکڑتے ہو اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسری پکڑنے لگتے ہو - مگر اس اثنا میں ایک فرد بنی آدم کی جان پر بن جاتی ہے اور کوئی دوسرا ڈاکٹر اُسے بچا سکتا ہے تو تم کہتے ہو کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا چاہئے - گویا [illegible] منھ سے یہ بھی نکلتا ہے کہ میں اپنے اوپر ذمہ داری نہیں لوں گا - ایسے موقعوں پر تم کتنے بیوقوف [illegible] ہوتے ہو مختصر یہ کہ آدمی مر جاتا ہے -- مگر اس میں تمہارا قصور نہیں ہے -- ہم نے اُس کا قاعدہ کی رو سے علاج کیا - لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تمہارے دست شفا پر دوسروں کو کامل اعتماد ہو مگر تم خود اس کا احساس کر رہے ہو کہ تم کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتے ہو - تو یہی کامل اعتقاد تھا جو ایینڈریونا کا پورا خاندان مجھ پر رکھتا تھا - وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کی لڑکی کی حالت خطرناک ہے - میں بھی انکو یقین دلایا کرتا تھا کہ کوئی بات نہیں ہے مگر میرا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جاتا تھا - آفت بالائے آفت یہ تھی کہ گاڑیبان دوا لینے کے لئے جاتا تھا تو شام تک واپس آتا تھا - میں مریضہ کے کمرہ سے باہر نہیں جاتا تھا اصلیت یہ ہے کہ میں اُس سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا تھا - آپ جانئے میں اُسے دلچسپ قصہ سنایا کرتا اور اُس کے ساتھ

تاش کھیلا کرتا تھا اور رات کو اس کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری کرتا تھا۔ بیچاری بڈھی ماں باچشم پرآب میرا شکریہ ادا کیا کرتی مگر میں اپنے دل میں خیال کرتا کہ میں شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ میں آپ سے صاف صاف اس کا اقرار کرتا ہوں —— اب اس کے چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے —— کہ میں اپنی مریضہ پر عاشق تھا۔ الکسنڈرا اینڈریونا کو بھی مجھ سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا۔ بعض وقت وہ میرے علاوہ کسی اور کو اپنے کمرہ میں آنے تک نہیں دیتی تھی۔۔ وہ مجھ سے خوب گفتگو بھی کرنے لگی اور اس قسم کے سوالات بھی کرنے لگی کہ میں نے تعلیم کہاں حاصل کی۔ میں رہتا کس طرح ہوں، میرے اعزہ کون لوگ ہیں اور میرے ملاقاتی کون کون ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے گفتگو نہ کرنا چاہیے مگر تم جانتے ہو کہ میں اسے منع نہیں کر سکتا تھا —— بعض وقت میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل سے کہتا "بدمعاش! تو کیا کر رہا ہے" . . . . مگر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی، دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی، پھر معصوم عاشق اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگتی "تم کیسے اچھے آدمی ہو!" —— اس کے ہاتھ میں بخار کا اثر معلوم ہوتا تھا —— اس کی آنکھیں کیسی بڑی بڑی اور کیسی پرکیف تھیں!! . . . . وہ کہتی ہاں —— تم بہت اچھے اور رحمدل انسان ہو۔ تم ہمارے اور ہمسایوں کی طرح نہیں ہو . . . . نہیں تم اس طرح نہیں ہو . . . . میں ابھی تک تم سے کیوں نہ ملاقات کر سکی! میں اس پر یہ جواب دیتا "اینڈریونا! اطمینان رکھو، تم پھر اچھی ہو جاؤ گی" "اور میں آپ سے یہ بھی بتا دوں" ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اور آگے بڑھ کر اپنی ابروؤں کو چڑھاتے ہوئے کہا کہ "یہ لوگ اپنے ہمسایوں سے بہت کم تعلق رکھتے تھے کیونکہ چھوٹے آدمی ان کے برابر نہیں تھے اور خودداری ان کو امیروں سے ملنے نہیں دیتی تھی —— بات یہ ہے کہ وہ نہایت تعلیم یافتہ گھر تھا اور یہ میرے لئے بہت اطمینان بخش چیز تھی —— بہرحال اینڈریونا صرف میرے ہاتھ سے دوا پیتی تھی . . . . وہ خود اٹھ بیٹھتی —— بیچاری غریب لڑکی —— میری مدد سے دوا پیتی اور میری طرف دیکھنے لگتی . . . . مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ مگر اس اثنا میں اس کی حالت برابر خراب ہوتی جا رہی تھی اور میں اپنے دل میں یہ خیال کرتا کہ وہ مر جائے گی ضرور مر جائیگی۔ آپ یقین کیجئے کہ میں خود اسکی جگہ قبر میں جانے کیلئے تیار تھا۔ اسکی ماں اور بہنیں بھی مجھے دیکھا کرتیں۔ اور اب انکا مجھ پر اعتقاد کم ہو رہا تھا وہ مجھ سے دریافت کرتیں۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟" تو میں جواب دیتا "بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔" میرے ہوش و حواس دراصل درست نہ تھے —— خیر، ایک رات میں اپنی مریضہ کے پاس اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ خادمہ بھی وہیں لیٹی تھی اور زور زور سے خراٹے لے رہی تھی۔ میں اس غریب لڑکی کو مورد الزام نہیں بناتا۔ وہ بھی بہت تھک گئی تھی۔ اینڈریونا کی طبیعت اس شام کو بہت خراب رہی تھی۔ اس وقت اسے بہت بخار چڑھا ہوا تھا۔ نصف شب تک وہ کروٹیں بدلتی رہی آخرکار ایسا معلوم ہوا کہ اس کو نیند آ گئی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ بالکل ساکت لیٹ گئی تھی

کونے میں حضرت عیسیٰ کی تصویر کے سامنے لیمپ جل رہا تھا۔ میں وہاں اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا بلکہ تھوڑا سا اونگھ بھی رہا تھا۔ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے چھوا۔ میں گھوم پڑا۔۔۔۔ ہائیں! اینڈریونا مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ اُس کے لب کھُلے ـــ اُس کے رخسار جل رہے تھے ـــ میں نے کہا:- "کیا بات ہے؟" "ڈاکٹر صاحب۔ کیا میں مرجاؤں گی؟" "نعوذ باللہ!" "نہیں۔ ڈاکٹر صاحب! نہیں مجھ سے نہ کہئے کہ میں زندہ رہوں گی ـــ ایسا نہ کہئے۔۔۔ اگر آپ جانتے ہوتے۔۔۔۔ سنئے! خدا کے لئے میری صحیح حالت نہ پوشیدہ رکھئے۔" اب اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی تھی۔ "اگر مجھے یہ یقینی طور پر معلوم ہوجائے کہ میں ضرور مرجاؤں گی۔۔۔۔ تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔۔۔ سب کچھ!" "اینڈریونا۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں ـــ" "سنئے ـ میں مطلق نہیں سوئی ہوں۔۔۔۔ میں آپ کو بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے ـ آپ بہت اچھے آدمی ہیں ـــ میں آپ سے دنیا کی تمام مقدس چیزوں کا واسطہ دلا کر پوچھتی ہوں ـــ مجھ سے سچ سچ بیان کر دیجئے۔ کاش کہ آپ یہ سمجھ لیتے کہ میرے لئے یہ کسقدر اہم ہے ـــ کیا میری حالت خطرناک ہے؟" "اینڈریونا۔ میں تم سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ تمھاری حالت واقعی خطرناک ہے ـ مگر خدا بہت رحیم ہے"۔ "میں مرجاؤں گی ـــ میں مرجاؤں گی" اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ بہت خوش ہے ـ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ میں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا مگر اینڈریونا بولی "ڈرئے نہیں ـ ڈرئے نہیں ـ مجھے موت کا خوف نہیں ہے" یہ کہکر وہ بیٹھ گئی اور اپنی کہنیوں پر جھک کر کہنے لگی "اب ۔۔۔۔ ہاں ـــ اب میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں!" میں یہ سنکر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے لئے یہ عجیب و غریب چیز تھی مگر اینڈریونا نے پھر کہا "آپ سنتے ہیں! میں آپ سے محبت کرتی ہوں" "اینڈریونا! مجھے کس چیز نے اس قابل بنایا ہے کہ ـــ" "نہیں ـ نہیں ـ تم مجھے۔۔۔۔ تم مجھے۔۔۔۔ سمجھ نہیں پائے۔۔۔" یہ کہکر اُس نے یکایک اپنے ہاتھ پھیلائے اور میرا سر پکڑ کر پیشانی چوم لی۔۔۔۔ یقین کیجئے میں اس حرکت سے قریب قریب چیخ اٹھا۔۔۔۔ میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اپنا سر تکیہ میں چھپا لیا۔ اینڈریونا خاموش لیٹی رہی اور اُس کی اُنگلیاں میرے سر کے بالوں سے کھیلتی رہیں۔ اتنے میں یکایک اُس نے رونا شروع کر دیا۔ میں اُسے خاموش کرانے اور اطمینان دلانے لگا۔۔۔۔ مگر مجھے یہ نہیں یاد کہ میں نے اُس سے کیا کیا کہا۔ "دیکھو تم اس خادمہ کو جگا دوگی ـــ اینڈریونا! میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں ـــ یقین کرو ـ پریشان نہ ہو" "بس ـ بس ـ کسی کی پرواہ مت کرو ـ اُس کو اُٹھ جانے دو ـ کمرہ میں آجانے دو ـ کچھ پرواہ نہیں ـــ میں مر رہی ہوں ـــ تم دیکھتے ہو۔۔۔۔ اور تم ڈرتے کیوں ہو؟ تمھیں کس بات کا خوف ہے ـ اپنا سر اُٹھاؤ۔۔۔۔

اچھا شاید تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں غلطی پر ہوں۔۔۔۔ یہ ہے تو مجھے معاف کر دو" "اینڈریونا تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ اینڈریونا" اس پر اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا "اچھا تو پھر مجھ کو اپنی آغوش میں لے لو!" میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر میں اُس رات کو پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میری مریضہ اپنا خاتمہ کئے ڈال رہی ہے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو موت کے قریب نہ دیکھتی تو میرا کبھی خیال نہ کرتی اور آپ خواہ کچھ بھی کہئے، مگر محبت سے آشنا ہوئے بغیر ۲۰ برس کی عمر میں مرجانا بڑی مشکل چیز ہے۔ یہ چیز۔ اُس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُسنے ناامیدی میں مجھ سے اظہار عشق کیا۔ میں نے اُس سے کہا "اینڈریونا! میرے اوپر اور اپنے اوپر رحم کرو!" "کیوں؟" وہ بولی۔ "خیال کس بات کا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں مرنے والی ہوں"۔ یہ وہ مسلسل کہتی گئی "اگر میں یہ جانتی کہ میں زندہ رہوں گی اور پھر ایک نوجوان لڑکی بن جاؤں گی تو میں شرمندہ بھی ہوتی۔۔۔۔ واقعی شرمندہ۔۔۔ مگر اس حالت میں اس کی کیا ضرورت ہے؟" "لیکن کس نے کہا کہ تم مرجاؤ گی؟" "اب چھوڑو بھی اسے! تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم جھوٹ بولنا نہیں جانتے! ذرا اپنی صورت تو دیکھو!"۔۔ "اینڈریونا تم زندہ رہو گی۔ میں تمھارا علاج کروں گا۔ اور ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔۔۔۔ اور پھر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزاریں گے"۔ "نہیں۔ نہیں۔ مجھے تمھاری بات کا یقین ہے۔ میں یقیناً مروں گی۔۔۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔۔ تم نے کہا ہے"۔۔۔۔ میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ خیال تو کیجئے کہ بعض وقت معمولی باتوں سے کیا ہو جاتا ہے۔ بظاہر معاملہ کچھ نہیں مگر ہے بہت اہم۔ اُس کے دل میں یکایک کچھ خیال آیا اور میرا نام دریافت کرنے لگی۔ میرا خاندانی نام نہیں بلکہ پہلا نام۔ میرا نام ٹرائفن بہت برا تھا مگر اب اسے کیا کروں۔ نام ہی ٹرائفن ہے گھر میں البتہ سب لوگ مجھے ڈاکٹر کہا کرتے تھے بہرحال میں نے اُس سے کہا کہ میرا نام ٹرائفن ہے۔ یہ سنکر اُسنے اپنا سر ہلایا اور فرانسیسی زبان میں کچھ کہا جو میرے خیال میں کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اسکے بعد وہ ہنسنے لگی۔ قصہ مختصر میں نے وہ تمام رات اُس کے ساتھ اسی طرح بسر کی۔ صبح ہونے سے قبل میں باہر چلا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ چاء کے بعد میں اُسکے کمرہ میں پھر گیا مگر اب اُسکی یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں بمشکل اُسے پہچان سکتا تھا جن لاشوں کو قبر میں اُتارا جاتا ہے وہ بھی اس سے اچھی حالت میں ہوتی ہیں۔ میں آپ سے قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں مطلق نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس نظارہ کو کیونکر برداشت کر سکا۔ بہرحال تین دن اور تین رات میری مریضہ اور زندہ رہی۔ مگر معاذ اللہ! کیا راتیں تھیں! نہ معلوم اُس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں۔ آخری رات میں ۔ ذرا خیال کیجئے ـــــ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوا خدا سے صرف ایک دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا اسے جلدی سے اُٹھا لے اور

اس کے ساتھ ہی مجھے بھی ! میں یہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اینڈریونا کی بڈھی ماں یکایک کمرہ میں خلاف توقع داخل ہوگئی - میں نے شام ہی کو اُس سے یہ کہہ دیا تھا کہ اینڈریونا کے بچنے کی اُمید کم ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ وہ کسی پادری کو بلا لے - لیکن بیمار لڑکی نے اپنی ماں کو دیکھتے ہی کہا " اچھا ہوا کہ آپ آگئیں - ہماری طرف دیکھئے - ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں - ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو اپنا قول دیا ہے "

" ڈاکٹر صاحب ! یہ کیا کہہ رہی ہے ؟ " میں نے جواب دیا " بخار ہے - ہذیان بک رہی ہیں " لیکن میرے یہ کہتے ہی اینڈریونا بول اُٹھی " ہائیں تم نے ابھی تو کچھ اور کہا تھا ، میری انگوٹھی بھی تم لے چکے ہو - تم بنتے کیوں ہو میری ماں بڑی نیک ہے --- وہ معاف کر دیں گی --- وہ سمجھ جائیں گی --- اور میں تو مر ہی رہی ہوں .... مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے - مجھے اپنا ہاتھ دو " - مگر میں یہ سنتے ہی کمرہ سے بھاگا اور بڈھی عورت سمجھ گئی کہ قصہ کیا ہے -

" میں آپ کی اور زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا - حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی یاد خود میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہے - میری مریضہ کا دوسرے دن انتقال ہوگیا - خدا اُس کی روح کو آرام دے " مرنے سے قبل " ڈاکٹر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " اُس نے اپنے گھر بھر سے کہا کہ سب لوگ باہر چلے جائیں اور مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اکیلا رہنے دیں - جب سب لوگ چلے گئے تو اُس نے مجھ سے یوں کہنا شروع کیا " مجھے معاف کر دو - تمھارے لئے مورد الزام میں ہی ہوں ..... میری پیاری .... لیکن یقین کرو کہ میں نے تم سے زیادہ اور کسی سے نہیں محبت کی .... مجھے بھولنا نہیں ... میری انگوٹھی رکھے رہو " --- یہ کہکر ڈاکٹر چلنے کے لئے تیار ہوا مگر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا -

" اچھا " وہ بولا " آئیے ہم لوگ معمولی سی شرط پر " پرفرنس " کھیلیں - مجھ ایسے آدمیوں کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ جذبات کے آگے سرنگوں ہو جائیں - مجھے تو صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو رونے سے کیسے خاموش کیا جائے اور بیوی کی ڈانٹ سے کیسے بچا جائے - اُس واقعہ کے بعد میں نے ایک قانونی شادی کرلی --- میں نے ایک تاجر کی لڑکی سے نکاح کرلیا --- سات ہزار اُس کے جہیز میں ملے اُس کا نام اکوتین ہے - " ٹرائفن " کے نام کے ساتھ یہ نام بہت موزوں ہے - اُس کا مزاج بہت خراب ہے مگر خوش قسمتی سے وہ دن بھر سویا کرتی ہے ..... ہاں تو یہ بتایئے کہ " پرفرنس " کھیلئے گا ؟ "

ہم لوگ نصف پنی فی پوائنٹ کے حساب سے " پرفرنس " کھیلنے لگے - اور کچھ دیر بعد ٹرائفن آئنوچ مجھے ڈھائی روبل جیت کر ، اپنی کامیابی پر مسرور ، کافی رات گئے اپنے گھر چلا گیا -

(ٹرگنیو)

ضیاؔ بدایونی اور مومن

ہماری قدیم شاعری کے آخری دور میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ وہ باکمال شعرا ہوئے ہیں جنکو زمانہ شاید کبھی نہیں مٹا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ سلاستِ بیان، بلندی فکر اور رنگینیٔ خیال کے جو نادر نقوش وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔

ذوقؔ مرحوم کا کلام عام فہم تھا، ہمارے ہی عہد میں آب و تاب سوانح کے ساتھ شایع ہوگیا۔ غالبؔ کا کلام دقت و نزاکت فکر میں بے نظیر تھا، اُن کے دیوان پر پہلی افتاد مولانا خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کرم تھی۔ حیرت ہے حضرت مولانا نے دفتر فلسفہ کیوں دریا برد نہ کردیا۔ آخر اُن کے بعد کون فلسفہ کا امام پیدا ہونے والا تھا؟

غالبؔ اگرچہ "گویم مشکل، دگرنہ گویم مشکل" کی مصیبت میں گرفتار ہوگئے تاہم یہ کہہ گزرے کہ:۔

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو" آسماں نے یقیناً خوب دستور صلح جوئی سے کام لیا کہ غالبؔ کے باقیماندہ کلام کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف ہوئی اور "قیمتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ہوگئی۔ اب رہے حضرت مومنؔ سو غدر ۵۷ء کے بعد گوناگوں مصائب نے ہندوستان کو اس قابل نہ رکھا کہ کوئی بات لطف و اطمینان کی ہوسکتی، آخرکار ایک مدت کے بعد آج مومنؔ کا کلام اپنی پوری جامہ زیبی کے ساتھ عالم شہود میں جلوہ گر ہے۔

ہمارے محترم جناب مولانا ضیا احمد صاحب کا وجود نہ صرف بدایوں بلکہ ملک کے لئے سرمایہ صد فخر و مباہات ہے۔ آپ کی سعی جمیل سے مومنؔ کے دیوان کا یہ نسخہ معہ شرح کے ہمارے پیش نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ مومنؔ کے کلام کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی اس کی تلافی مولانا نے فرمائی اور دقیق ترین اشعار کے معانی مولانا نے بحسن و خوبی واضح فرمادئے، اب جو سخن شناس آیندہ مومنؔ کے کلام پر توجہ کرے گا۔ اس کے لئے مولانا کی شرح راہنما ہوگی اور "الفضل للمتقدم" کا شرف مولانا کے لئے مخصوص رہیگا۔

مقدمہ پر ایک سرسری نظر سے معلوم ہوا کہ مولانا محبِ مفرط ہیں، اگرہمیں متعصبانِ مفرط میں قیاس

نہ کیا جائے تو اسقدر عرض کرنا ہے کہ افضلیت یا کم از کم " افضلیت من کل الوجوہ " سے مولنا کو احتراز ضروری تھا، مولانا فرماتے ہیں " ذوق و غالب مقلد ہیں اور مومن مجتہد " یہ مولنا کا اجتہاد ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے " قصیدہ نگاری میں بجز سودا مومن کا کوئی ہمسر نہیں " اگر ایسا ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد لیکن یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ " اگرچہ پختگی " اور صفائی میں ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں " اگر زور کے مفہوم میں پختگی اور صفائی بھی شامل ہے تو ماننا پڑے گا کہ ذوق کا مثل قصیدہ نگار شعراء اُردو میں پیدا نہیں ہوا

مولنا فرماتے ہیں " غزل میں تصوف عجز شاعرانہ ہے[1] " تاہم آپ کی رائے ہے کہ ایک صوفی صافی طبیعت غزل سرائی کے لئے رند شاہد باز بنے تو غزل کہے ورنہ قدرت کلام سے محروم قرار پائے۔ حالانکہ حضرت مومن کی پہلی غزل حمد و نعت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ گو علمیت کا جلوہ غزل میں بھی موجود ہے ؎

آتش سینہ تفسیدہ کو کیا میں رو دُوں	اشک جانب کرہ آب کے مایل نہوا

بہرحال ہمیں مولنا سے اسقدر عرض کرنے کا حق حاصل ہے، کہ مومن کی تعریف دوسروں کی تنقیص کی مستلزم نہ تھی۔ مولنا ذوق کی نسبت فرماتے ہیں ملخصًا " ذوق کی تمام عمر لابہ گری و بادہ خوانی میں بسر ہوئی غلامانہ ذہنیت ایسے ہی نتائج پیدا کرتی ہے " مومن کی بابتہ ارشاد ہے " نعت و منقبت کے علاوہ صرف دو قصیدے ہیں جو ارباب دنیا کی مدح میں کہے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو نواب وزیرالدولہ نواب ٹونک کی شان میں (جن سے مومن کو روحانی نسبت بھی تھی) دوسرا راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ مقیم دہلی کے شکریہ میں جنھوں نے اُن کو خود بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا " ابوظفر بہادر شاہ جو سلاطین مغلیہ میں تنہا درویش بادشاہ ہوا ہے راجہ اجیت سنگھ کے برابر بھی مستحق ستایش نہ تھا۔

مقدمہ کے بعد دیوان معہ شرح ہے۔ اور اس حقیقت کا اظہار غالبًا نازیبا نہ ہوگا کہ درس گاہ دینا کی یہ ستم ظریفی بیحد دلچسپ ہے کہ ایک مضمون تعلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے میں امتحان لیا جاتا ہے۔ مولنا کا کورس تھا کنزو ہلیہ یا مجموعۂ دل، اور امتحان ہوا دیوان مومن میں ــــ بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

مومن کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے :-

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو	دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا

---

[1] (نگار) تصوف کے مسایل مفروضہ کا ذکر غزل میں سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ شاعر جذبات عشق سے بالکل بیگانہ ہو اور مومن کی طرف سے کبھی اس کمزوری کا اظہار نہیں ہوا۔ اگر ابتداءِ دیوان میں کوئی غزل اسکی حمد و نعت میں پائی جاتی ہے تو وہ بالکل رسمی چیز ہے اور اس کو معارضہ کی دلیل نہیں بنا سکتے۔

مولانا شرح میں فرماتے ہیں کہ:-

"تیغ جوہر ہے - وہ جس کے جوہر تیغ کی طرح ہوں - اصلی تلوار یا آئینہ میں جو نشان ہوتے ہیں اُن کو جوہر کہتے ہیں۔ ناصحیت کے معنی میں بھی آتا ہے۔

یعنی ناصح رستہ میں جوہر سے یہاں ... کمال ہے۔ تیغِ جوہر استعارہ ہے اور کنایہ مقصود ہے کہ تیغ کمال دیکھ کر اہلِ بدعت و ضلال کا دل دونیم ہو جائے۔

ایک اور غزل کا شعر ہے:-

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اس کو دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا

شرح:- خانۂ آئینہ کی ویرانی سے اُس کی بے رونقی مراد ہے۔ اس کو یعنی معشوق کو آئینہ دیکھتے وقت اگر خود اُسکے حیرتِ حسن نے دیوانہ کر دیا۔ تو پھر آرائش سے بیزار ہو جائے گا۔"

میں حاصلِ شرح کچھ نہ سمجھا۔ شعر میں دو نازک تخیل ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب کا حسن جنوں زا ہے۔ دوسرے آئینہ پر رشک ہے کہ وہ جلوۂ حسن سے کامیاب ہے لہٰذا اگر محبوب حیرتِ حسن سے دیوانہ ہو گیا تو پھر آئینہ دیکھنا معلوم۔ آئینہ یقیناً خانۂ ویراں ہوگا۔[ے]

مومن کا ایک شعر ہے:-

مجمع بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

شرح:- "شبِ ہجراں میں کامرانی وصل یاد آئی، جب بسترِ مخمل پر دوست کے ساتھ دادِ عیش دے رہے تھے ایسی حالت میں یادِ عیشِ گزشتہ سے سوئے ہوئے نصیب کا خواب کسقدر پریشاں ہوگا یعنی یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں اور اضافہ کرے گی۔ لفظ خواب میں ایہام ہے۔"

یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں ضرور اضافہ کرتی ہے۔ لیکن یہ معنی پیدا کیونکر ہوئے، خوابِ مخمل، مخمل کے روئیں کی ہمواری کا نام ہے۔ اور اس خواب کی پریشانی اُس کا حرکت یا مس سے ناہموار ہو جانا ہے۔ شبِ غم وہ وقت یاد آگیا۔ جب بسترِ مخمل پر دادِ نشاط دے رہے تھے۔ مخمل کا خواب پریشاں یاد آیا۔

ے (نگار) میں نہیں سمجھ سکا کہ شارح کے مفہوم سے ہٹ کر آپ نے کونسا دوسرا مفہوم پیدا کیا۔ جو آپ کہتے ہیں وہی شارح بھی سمجھا ہے۔ آپ نے آئینہ پر رشک کرنے کا جو مفہوم پیدا کیا ہے وہ بے محل ہے اور شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔

کیا طالع خفتہ کا خواب اس یاد سے پریشان ہو سکتا ہے۔ استفہام انکاری یعنی ہماری خفتہ بختی اب کیا ختم ہوگی[1]

مومن:۔ پان میں یہ رنگ کہاں آپ نے — آپ مرے خون کا دعویٰ کیا

شارح:۔ "یہ رنگ پان نہیں بلکہ سرخیٔ خون عاشق ہے۔ آپ نے پان کھا کر اپنے اوپر قتل کا الزام لے لیا۔"

شاعر نے یہ نہ کہا تھا کہ آپ میرا خون پی گئے ہیں۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ یہ سرخی خون کا دعویٰ تو میرے خون کی نسبت سے رنگین ہے[2]

مومن:۔ جائے تھی تیری ہی مرے دل میں سو ہے — غیر سے کیوں شکوہ بیجا کیا

شارح:۔ "یعنی غیر کے دل میں تیری جگہ پہلے ہی کب تھی"

مطلب صاف ہے۔ عاشق کہتا ہے آپ نے غیر سے ہمارا شکوہ ناحق کیا حالانکہ ہمارے دل میں آپ کی جگہ بدستور باقی ہے۔

مومن:۔ رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم سے ستم آرا کیا

شارح:۔ "تو نے مجھ پر اس قدر ظلم کئے کہ اب آسمان کو بھی میرے حال پر رحم آنے لگا۔"

فلک سے رحم مستبعد ہے خصوصاً مجھ پر۔ مگر او ستم آرا تیرے کرم نے میرا یہ حال کیا کہ فلک کو بھی مجھ پر رحم آئے ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔[3]

مومن:۔ امید وعدۂ دیدار حشر پر مومن — یہ بے مزا تھا کہ حسرت کش بتاں نہ ہوا

شارح:۔ "مومن اسقدر بدمذاق تھا کہ امید وعدۂ دیدار پر بیٹھا رہا اور بتوں کی تمنا نہ کی یعنی نقد کو چھوڑ کر نسیہ کو اختیار کیا"

---

[1] (نگار) مقالہ نگار کو لفظ "کیا" کے مفہوم سے اختلاف ہے۔ شارح نے اس کا مفہوم "کسقدر" بتایا ہے اور معترض اس کو استفہام انکاری بتاتے ہیں اور "پریشان خوابی" کے معنی "بیداری" ظاہر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک لفظ کیا، مومن نے جہاں کہیں بھی استعمال کیا ہے شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے — [2] (نگار) اعتراض میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ رنگ پان سے یہاں "خون بہا" مراد ہے، در حقیقت "رنگ پان" بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے قتل کے بعد آپ کی یہ آرائش و مسرت خود اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ آپ نے مجھ کو قتل کیا ہے۔ [3] (نگار) شارح کا مطلب صحیح ہے۔ مومن کا مقصود یہاں اس ستم کا اظہار نہیں جو کرم کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

ضیاء بدایونی اور مومن

حشر تک وعدۂ دیدار کی امید، حشر تک مبتلائے حسرت رہتا ہے۔ اس امید سے مومن اس قدر بے مزہ تھا کہ بتوں کی محبت میں حسرت کش نہ بن سکا۔[۱]

مومن :- کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعد مرگ ہنگامۂ محبت اغیار کم ہوا

شارح :- "یعنی اگر میری زندگی میں رقیبوں کی محبت کا ہنگامہ کم ہوتا تو میں رشک سے کاہے کو مرتا"

شعر سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہے کہ رشک سے مرگیا ہنگامۂ محبت اغیار ہماری بدنصیبی کی بدولت تھا۔ ہم نہ رہے تو وہ ہنگامہ نہ رہا۔[۲]

مومن :- ناکامیوں کی کاہشِ بے حد کا کیا علاج بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

شارح :- "مومن ناکامیوں کے مصائب کا شکوہ سنج ہے یعنی پہلے تو حسرتِ بوسہ کی کاہش تھی۔ جب بوسہ ملا تو لبِ یار میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ غرض دونوں طرح ناکامی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حصول شے کے بعد اس شے میں پہلی سی کشش باقی نہیں رہتی"۔

میرے خیال میں شرح کسی قدر بعید الفہم ہے اور لبِ یار میں لذت باقی نہ رہنا بھی شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔ حصولِ نعمت کے بعد نعمت کی قدر کم بھی ہوجاتی ہے۔ اور بڑھ بھی جاتی ہے۔ یہ شوق کی بیشی و کمی پر منحصر ہے — شاعر کہتا ہے۔ ناکامی کی کاہش حد سے تجاوز کرکے لاعلاج ہوگئی۔ محبوب نے بوسہ دیا تھا تو چاہئے تھا کہ اس کامیابی سے شوق ترقی کرتا۔ لیکن پیہم ناکامیوں نے یہ عالم کردیا ہے کہ آیندہ کی امید ہی قائم نہیں ہوتی اور ایک بوسہ ملنے پر ہمارے ذوق میں کمی آگئی۔[۳]

---

۱ (نگار) شارح نے یقیناً اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھا۔ "بے مزہ" کے معنی "بدمزاق" قرار دینا خوش ذوقی کے خلاف ہو "بے مزہ ہونا" کا مفہوم "مکدر ہوجانا" ہے۔

۲ (نگار) مقالہ نگار اس شعر کا مفہوم صحیح سمجھے ہیں۔ مومن نے "نصیب کی خوبی" "بدنصیبی" کے معنے میں استعمال کی ہے اور شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بھی میری بدنصیبی تھی کہ جب تک میں زندہ رہا ہنگامۂ اغیار بھی رہا اور اب کہ میں مرگیا ہوں تو اس میں بھی کمی پیدا ہوگئی۔ حالانکہ یہ بات ایسی ہے جو میری ہی زندگی میں ہونی چاہئے تھی۔

۳ (نگار) شارح و معترض دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہونچے ہیں صرف الفاظ کا فرق ہے۔ "ذوقِ لبِ یار" میں لفظ "ذوق" کو محبوب کے لبوں سے متعلق کرکے انھیں خالی از لذت بتانا تہذیبِ عاشقی کے خلاف ہے۔ اس لئے "ذوق" کا تعلق خود شاعر کے شوق سے ہے۔ یعنی ہمیں میں وہ ذوق باقی نہ رہا کہ "لبِ یار" سے لذت کش ہوں۔

مومن :۔ عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر — یہ مجھکو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا

شارح :۔ "کلیجہ تھام لینے کا سبب تمہاری محبت کا اظہار نہ تھا بلکہ میرے حال زار پر اظہار تاسف یعنی میری حالت پہ رقیب کو بھی رحم آتا تھا۔"

دشمن کا عاشق پر رحم کھانا سمجھ میں نہیں آتا۔ کلیجہ تھام لینا درد عشق کی بدولت نہ تھا بلکہ رشک و حسد سے تھا کہ مومن اس بزم میں کیوں موجود ہے۔[1]

مومن :۔ کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری — میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شارح :۔ "مجھے حالت اسیری میں بھی آزادی میسر ہے اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری طپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے۔ اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے"

یہاں شاعر نے تمام روئے زمین کو اپنے لئے زنداں کہا ہے۔ مولانا نے ایک مخصوص قید خانہ قیاس کیا ہے اور آزادی یہ بتائی کہ زمین کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں کرہ کے ساتھ ہر چیز گردش کرتی ہے۔ مگر وہ گردش اختیاری کہاں ہے جس کو آزادی کہا جائے۔ شعر میں جو حسن تھا وہ شرح کی نذر ہو گیا۔ طپش کو گردش زمین کی علت قرار دینا اور کل کرۂ ارضی کو اپنے لئے زنداں کہنا۔ نہایت لطیف بات ہے۔ جس کی طرف شارح نے توجہ نہیں کی[2]

مومن :۔ لذت جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی — کیا اثر منتظر دعوتِ فریاد رہا

شارح :۔ "اثر کسقدر میری فریاد کی دعوت کا منتظر رہا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ میں نے فریاد ہی نہیں کی اور ستم یار کی لذت میں اتنا محو رہا کہ دم لینے کی مہلت نہ ملی"

'کیا' اگر بتکرار ہو تو 'کسقدر' کے معنی دیسکتا ہے۔ مصرع ثانی میں استفہام انکاری ہے یعنی اثر منتظر دعوت فریاد نہ رہا۔ گو میں نے فریاد نہ کی لیکن اثر ظاہر ہے کہ بیداد دوست سے دم لینے کی بھی فرصت نہ ہوئی[3]

مومن :۔ دلبروں میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے — بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

---

[1] (نگار) کلیجہ تھامنے کا مفہوم اردو میں صرف ایک ہی ہے یعنی تاثر غم والم سے بیتاب ہو جانا۔ اور رشک و حسد سے اسے کوئی واسطہ نہیں

[2] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ یقیناً زیادہ لطیف ہے۔

[3] (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔ اگر فریاد کا مقصود "دعوت ستم" ہوا کرتا تو مقالہ نگار کی توجیہ قابل قبول ہو سکتی تھی۔

شارح . "معشوق کو یہ گوارا نہیں کہ حسینوں میں عاشق کی وفا کی تعریف ہو - اس کی اس ذہنیت سے عاشق یوں فایدہ اٹھاتا ہے کہ تم نے رقیب سے میرا راز محبت کیوں کہدیا - جو افشا ہوگیا - اور حسینوں میں چرچا ہونے لگا کہ مومن انتہا کا وفا پرست ہے - جو ایسے ظالم سے عہد وفا نباہتا ہے - اس اشتعال کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ آیندہ رقیب سے وہ راز ظاہر نہ کرے گا - جس میں مومن کا سراسر فایدہ ہے"

محبوب کو بیوفا کہا گیا جو بوالہوس رقیب سے ملتا ہے - محبوب یا تو دل سے مومن کی محبت کا قایل ہے - یا بوالہوس کی محبت اور ابھارنے کے لئے اس نے مومن کی محبت کا تذکرہ کیا - بات عالم آشکارا ہوگئی -

اب شعر سے دو مدعا حاصل ہوتے ہیں - ایک یہ کہ محبوب کے یہ ذہن نشین ہو کر رقیب ملنے کے قابل نہیں ، دوسرے یہ کہ دلبروں میں مومن کی وفا مشہور ہو جانے سے اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ مومن ہاتھ سے دینے کی چیز نہیں[۵۱] -

---

مومن :- کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں دھر دیا ہاتھ اسنے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

شارح :- "پہلے تو دل اضطراب کی وجہ سے دھڑکتا تھا - اب جوش مسرت کے باعث دھڑکنے لگا"

اضطراب اور دھڑکنا تو ایک ہی چیز ہے - پھر اضطراب کی وجہ قرار دینا کیا معنی - شعر کا لطف "کیا خجل ہوں" کی شرح میں ہے - یعنی محبوب کو یہ باور کرایا تھا کہ اضطراب دل کا سبب تمہاری جدائی ہے - اس نے دل پر ہاتھ رکھدیا - مگر دل جوش مسرت سے پھر بھی دھڑکتا ہی رہا - شرمندہ ہوں - یوں کہ وہ سمجھیں گے کہ بیان غلط تھا - درحقیقت مجھسے ملنا وجہ قرار نہیں - مضطرب ہوں کیا کروں کہ یہ حرکت قلب بند ہو اور ان کو میری بات میری محبت کا اعتبار نہ ہو[۵۲] -

---

مومن :- محشر میں پاس کیوں دم فریاد آگیا رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

شارح :- "محشر میں عاشق فریاد کرنے والا تھا کہ پاس معشوق سے رک گیا - اب اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ معشوق نے دنیا میں کبھی رحم کیا ہوتا - تو وہ رحم اس وقت یاد آکر مانع فریاد ہوتا - مگر جب ہمیشہ ظلم ہی کئے تو فریاد سے باز رہنے کی کیا وجہ"

---

[۵۱] (نگار) مقالہ نگار نے خواہ مخواہ کھینچ تان سے کام لیا ، حالانکہ اس صورت میں بھی مفہوم وہی رہا جو شارح نے بیان کیا ہے -

[۵۲] (نگار) شارح کا مقصود بھی وہی ہے جو معترض کا - اگر شارح اضطراب کے بعد "جدائی" کا لفظ بڑھا دیتے تو معترض کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملتا -

یہاں مولانا نے لفظ "پاس" "لحاظ" کے معنی میں قیاس کیا ہے حالانکہ کوئی قرینہ اس کا نہ تھا جس سے شعر کے معنی بے لطف ہو گئے معشوق کا لحاظ کر کے ہمیں محشر میں فریاد سے باز رہنا مناسب نہ تھا۔ میرے نزدیک اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ محشر میں وہ دم فریاد میرے پاس کیوں آ گیا۔ کیا اُسے فریاد پر رحم آیا۔ رحم اُس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آیا۔ پاس آنے کی غرض کچھ اور ہے یعنی زبان بندی۔[1]

مومن:- دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب   تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

شارح:- "منجم نے شاعر کا حال زار دیکھا۔ اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُس کی ناکامی عشق کا پتہ لگا لیا۔ اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کر کے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طریقہ سے میرا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہو گیا۔"

میرے نزدیک یہاں رقیب مبتدا مؤخر تھا سازگاری طالع یہ ہے کہ رقیب نے نجوم سیکھا تو اُس کو یہ راز معلوم ہوا کہ وہ کسی کے دوست ہو نہیں سکتے۔[2]

مومن:- ستم ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی   رکھے رومال چشم خوں فشاں پر لاکھ تہ تہ کر

شارح:- "میرے گریہ خونیں کی شدت غضب کی ہے جس کی وجہ سے خون رومال کی تہوں میں سرایت کر گیا" "کی پر کی" میں تکرار تاکید کی غرض سے ہے۔"

مصرعہ اول میرے نزدیک یوں ہے۔ "ستم اے شدت گریہ سرایت تو نے کی پر کی"۔ چشم خوں فشاں دوسرے مصرعہ میں ہے۔ لفظ خوں پہلے مصرعہ میں غیر ضروری ہے۔ ضمیر خطاب آنا ضروری۔ اب شرح دیکھئے تغزل یا عشق دونوں کا وجود نہ رہا۔ کہنا یہ ہے کہ اخفائے غم عشق مقصود ہے اور شدت گریہ کا ستم یہ ہے کہ باوجود پردہ داری راز افشا کرتی ہے۔ خواہ اُن کی بزم میں ہوں یا کہیں اور۔[3]

مومن:- ہے سرخ ٹپکا اور خون غیر میں رنگا ہوا   کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھکر

---

[1] (نگار) معترض کا مفہوم صحیح نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مصرعۂ ثانی کی ردیف کوئی معنی پیدا نہیں کرتی۔ شارح نے مطلب ٹھیک سمجھا ہے۔

[2] (نگار) شارح نے مطلب ٹھیک بیان کیا ہے۔

[3] (نگار) معترض کی اصلاح و توجیہ دونوں بے محل ہیں۔ مطلب بالکل واضح ہے اور شارح نے اسے بالکل صحیح سمجھا ہے۔

شارح:۔ "یہ سب میرے قتل کا سامان ہے۔ کیونکہ میں جذبہ رشک سے ہلاک ہو جاؤں گا۔ پلنگ کہ میں ہوتا ہے۔ اسلئے مصرع ثانی کے محاورے "پاؤں میں مہندی لگی ہونا" نے لطف پیدا کر دیا۔"

سرخ پلنگ آرائش ہے۔ ادائے معشوقانہ ہو لیکن ترکانہ ادا نہیں۔ جو قتل سے مناسبت تامہ[1] رکھے۔ وہ بھی خون غیر سے رنگا ہوا۔ اس ادا سے تم میرے قتل پر کمربستہ ہو؟ "کیا" استعجاب یا استحقار کا فائدہ دیتا ہے یعنی جاؤ جی تمہیں عاشق کا قتل کرنا بھی نہیں آتا۔ یوں ہی معشوق بنے ہو۔[2]

مومن:۔ پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار — آنکھیں چراتے ہیں مجھے احباب دیکھ کر

شارح:۔ "احباب مجھ سے اس لئے آنکھیں چراتے اور اغماض کرتے ہیں کہ میں تیری نگاہوں میں حقیر ہو گیا ہوں۔"

میرے نزدیک شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم نے جو میرے دشمنوں سے ارتباط بڑھایا تو میرے دوست مجھ سے بھی بدظن ہو گئے۔ کہ شاید یہ بھی ایسی پست فطرت کا ہو گا ورنہ دشمنوں کیوں جاتا۔ ارتباط غیر پر انتہائی سرزنش ہے۔ اور نہایت لطیف انداز میں۔[3]

مومن:۔ یہ تشنہ کام نگہ گرم دیکھ تھا — حسرت سے رو دیا طرف آب دیکھ کر

شارح:۔ "میرا دل محبوب کی نگہ گرم (نظر عتاب) کے اثر سے جلنے لگا اور اس جلن نے اس قدر تشنگی پیدا کر دی کہ میں پانی کو دیکھ کر حسرت سے رو دیا۔ حسرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں۔"

نگہ گرم ۔ نگہ عتاب ہی کو نہیں کہتے التفات آمیز نگاہ بھی گرم کہی جا سکتی ہے۔ خیر نگہ گرم کو نگاہ عتاب کہنے میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ عاشق نگہ عتاب کا بھی آرزومند ہو سکتا ہے کہ آخر نگاہ تو ہے۔ قیامت یہ ہو کہ شاعر اپنے آپ کو نگہ گرم سے محروم نگہ گرم کا آرزومند کہتا ہے۔ اور شارح نے یہ فرمایا کہ نگاہ گرم نے وہ جلن پیدا کی کہ تشنگی (بمعنی حقیقی) پیدا ہو گئی اس قدر۔ الفاظ شاعرانہ ضرور ہیں کہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں، لیکن جب تشنگی حقیقی پیاس کے معنے میں ہے تو کیوں نہ بجھے گی۔ استسقا تو نہیں؟ معنی صرف یہ تھے

---

[1] (نگار) خاص مناسبت رکھتی ہے۔
[2] (نگار) "کیا" کا مفہوم معترض نے صحیح سمجھا ہے۔
[3] (نگار) معترض نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

کہ ہم تشنہ کام نگہ گرم کے آرزو مند تھے، پانی نظر آیا۔ کہ عوام الناس کی تشنگی رفع کرتا ہے۔ حسرت ہوئی کہ ہماری تشنگی کا کوئی مداوا نہیں[1]

مومن :۔ تو بہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے غش ہو گیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر

شارح :۔ "تو بہ مجھے اسقدر ہوش کہاں رہے۔ کہ شراب ناب کی باطنی کدورت پر نظر کرتا میں تو اسکا رنگ دیکھتے ہی غش ہو گیا۔ باطنی کدورت سے شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور اُسکی اخلاقی مضرت بھی"

باطن سے اپنا باطن مراد ہے۔ نہ کہ شراب کا۔ تو بہ مجھے یہ ہوش کہاں۔ تھے کہ میکشی کا نتیجہ خرابی باطن جانتا۔ میں تو وہ مے پرست ہوں۔ کہ رنگ مے ناب پر غش ہو گیا۔[2]

مومن :۔ مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

شارح :۔ "اہلِ دین کو یہ تاب نہیں کہ تقاضائے جلوۂ دوست (معشوق حقیقی) کر سکیں اور اگر کوئی جناب کلیم کی طرح تقاضائے ارنی کر بیٹھتا ہے۔ تو اُسے جواب میں لن ترانی سننا پڑتا ہے۔ دین میں یہ پابندی آداب دیکھ کر میں کافر ہو گیا کہ بتوں کے یہاں یہ قیود تو نہیں"

یہاں مولانا "نقل کفر کفر نباشد" کا اصول فراموش کر گئے۔ شاعر نے تو یہ کہا تھا۔ کہ دین میں تقاضائے جلوہ ممکن[3] ہے اور وہ میرے نزدیک ادب عشق کے خلاف ہے۔ میں دین کا یہ آداب دیکھ کر کافر ہو گیا۔

مومن :۔ بے مروت ناتواں پیشانی ہے رونا دیکھ کر دل دیا میں نے اُسے کیا جانئے کیا دیکھ کر

---

[1] (نگار) اس شعر میں غور طلب امر یہ ہے کہ "تشنہ کامی نگہ گرم" کی ترکیب اضافی کیسی ہے۔ یعنی مومن کی مراد وہ "تشنہ کامی" ہے جو "نگہ گرم" کے عدم حصول سے وابستہ ہے۔ اگر پہلا مفہوم لیا جائے تو شعر بہت زیادہ مادی ہو جاتا ہے اور کوئی خاص لطف نہیں دیتا۔ البتہ دوسرے مفہوم میں (جیسا کہ معترض نے ظاہر کیا ہے) شعر بلند ہو جاتا ہے۔ مومن یہ کہنا چاہتا ہے کہ "تمہاری نگہ گرم کے لئے میری تشنہ کامیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ جب میں پانی یعنی مادی ذریعہ رفعِ تشنگی کو دیکھتا ہوں تو بھی خیال فوراً اپنی روحانی تشنگی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور رو پڑتا ہوں" یقیناً شارح نے اس شعر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

[2] (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے۔

[3] (نگار) "ممکن" نہیں "ضروری" کہئے۔

شارح :ـ "ناتواں ہیں ـ حاسد جو کسی کا برا چاہے ـ یہاں معشوق مراد ہے"
ناتواں بیں ـ حاسد نہیں بلکہ عیب جیں ـ کسی کی کمزوری یا نقص کو دیکھنے والا۔[1]

مومن :ـ زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے قربان جاؤں تیرے مجھے نیم جاں نہ چھوڑ
شارح :ـ "تم نے جو رقیب کو زخمی کیا ہے ـ تو اس رشک سے میں بھی بسمل ہو گیا ہوں ـ مگر محض اتنی بات سے میرا مرنا محال
ہے ـ اگر تم (حسد و رشک سے) مجھے بالکل ہلاک کرنا چاہتے ہو ـ تو میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے نیم جاں نہ چھوڑو
اس کی صرف ایک صورت ہے یعنی رقیب کو بالکل قتل کر دو میں خود غیرت سے مر جاؤں گا ـ یہ کشاعرانہ مومن سے مخصوص ہے"
جدید سائنٹفک تحقیقات سے ایک نئی ادا "مکر شاعرانہ" مومن کی خصوصیات میں دریافت ہوئی ہے ـ یہ شعر اسکی بہترین مثال ہے ـ خلاصہ شرح یہ ہے کہ مومن مکاری سے غیر کے قتل کی التجا کرتا ہے ـ مومن غیر کے زخمی کرنے کا بھی طالب نہیں ـ چہ جائیکہ قتل ـ معنی یہ ہیں کہ اگر تو نے عدو کو اپنی ادا کا بسمل (زخمی) کیا ـ اپنا عاشق بنایا ـ اپنے نظارہ کا بھی موقع دیا ـ تو میں تجھ پر (مرنا) فدا ہو جاتا تجھ سے محبت کرنا محال ہے ـ قربان تیری اس ادا کے یا ترک محبت سے میرا نیم جان (مضطرب) رہنا لازم ہے ـ میں تیرے قربان جاؤں مجھے نیم جاں نہ رکھ ـ بلکہ وقیع دست کر میں تیری ہی محبت میں فنا ہو جاؤں، تجھ پر فنا ہو جاؤں۔[2]

مومن :ـ یہ غیرت وفا کا اثر ہے کہ بوالہوس بسمل تڑپتے ہیں ترے بسمل کے آس پاس
شارح :ـ "میری وفا دیکھکر رقیبوں کو بھی غیرت آئی نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر میں بسمل پڑا ہوں ادھر وہ بسمل ہو کر میرے پاس تڑپتے پھرتے ہیں"
شرح کا حاصل یہ ہوا ـ کہ اغیار کو یہ غیرت آئی کہ ہم بھی ایسے ہی وفا شعار عاشق ہو جائیں ـ اور وہ عشق صادق سے میری طرح بسمل ہو گئے ـ غیرت وفا سے مراد غیرت عشق کہ جان دی ترک محبت نہ کیا ـ بوالہوس کو امتیاز ہوا کہ عشق و ہوس میں فرق ہے اور تڑپ گیا۔[3]

مومن :ـ کیا کیا جلی ہے بزم میں تجھ سے نہ جب پھرے پروانے شمع شعلہ شمایل کے آس پاس
شارح :ـ "شعلہ شمایل ـ شعلہ کی صورت رکھنے والی یعنی جب تیری موجودگی میں پروانے شمع کے پاس نہ پھٹکے تو وہ تجھ سے کسقدر جلی ہے؟"
یعنی پروانے بجائے شمع کے تیری طرف مایل ہوئے اور شمع آتش رشک میں جلگئی ـ شمع کے گرد پروانے ہر وقت نہیں ہوتے شمع نے دیکھا کہ تمہارے عشاق تم سے باوجود شعلہ خوئی و عاشق کشی ایک لحظہ جدائی پسند نہیں کرتے ـ یوں شمع آتش رشک سے جلتی ہے۔
تنویر قادری

---

[1] (نگار) "ناتواں ہیں" کے معنے شارح نے صحیح نہیں سمجھے ـ [2] معترض اس شعر کا مفہوم بالکل نہیں سمجھے اور مکر شاعرانہ کو انھوں نے کوئی بڑا اخلاقی [illegible] سمجھ کر مومن کو اس سے بری ثابت کرنے کی کوشش میں شعر کا مفہوم ہی بالکل بدل دیا ـ یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن اس انداز بیان کا مالک ہے اور اس قسم کے [illegible] بکثرت پائے جاتے ہیں ـ [3] (نگار) شارح [illegible] کی طرح بسمل ہو گئے [illegible] یہ ہے کہ وہ عاشق کے [illegible] نے نیم جان بسمل کیا، تڑپ [illegible] گئے ـ [4] (نگار) [illegible] عشاق سمجھنا [illegible] اس طرح درست نہیں ہو سکتا ـ شارح بالکل صحیح سمجھا ہے۔

لامذہبیات

دُنیائے عیسویت کا ایک پُرعظمت وجلال باغی

——والٹیر——

ایک زمانہ کے ملحدین اکثر و بیشتر دوسرے زمانہ کے مستند مقدسین میں شمار کئے گئے ہیں۔

پرانی چیزوں کے بگاڑنے والے نئی چیزوں کے خلاق ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے پرانی باتیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور نئی چیزیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

جسمانی دُنیا کی طرح عقلی دنیا میں بھی عروج و زوال ہوتا رہتا ہے اور مسرت و شباب مدفون شدہ [illegible] قبروں کے پاس نظر آتے ہیں۔

عقلی ترقی کی تاریخ ملحدین کی سوانحعمریوں میں مل سکتی ہے۔ سیاسی آزادی غداروں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور آزادیٔ فکر و خیال ملحدین کے ذریعہ سے۔

سلطانِ وقت کی مخالفت کرنا بغاوت تھی اور پادری کی مخالفت کفر۔

تلوار اور صلیب صدیوں تک حلیف رہے اور دونوں نے متحد ہو کر انسانی حقوق پر حملے کئے۔

جیمس اول کہا کرتا تھا "پادری نہیں تو بادشاہ نہیں" وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ "صلیب نہیں تو تاج نہیں" بادشاہ کے قبضہ میں آدمیوں کے جسم تھے اور پادری کے ہاتھ میں ان کی روحیں۔ ایک اُن محاصل پر بسر کرتا تھا جو زبردستی وصول کئے جاتے تھے اور دوسرا اس خیرات پر جو ڈرا ڈرا کر جمع کی جاتی تھی۔ دونوں ڈاکو، دونوں گداگر!

یہ ڈاکو دو دنیاؤں کو قابو میں رکھتے تھے بادشاہ قانون بناتا تھا اور پادری عقاید۔ دونوں اپنے اختیارات خدا سے حاصل کرتے تھے اور دونوں "لاانتہا" کے نمایندے تھے۔

ایک کا بار وہ اپنی جھکی ہوئی کمر پر اُٹھائے ہوئے تھے اور دوسرے کے اصول حیرت زدہ کھلے ہوئے منہ کے

ساتھ ماننے پر مجبور تھے۔

اگر عوام آزادی کا خیال دل میں لاتے تو بادشاہ ان کو کچل دیتا اور ہر پادری گویا ایک دیوتا تھا جو عقل رکھنے والے بچوں کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

بادشاہ جبر کے ذریعہ سے حکومت کرتا اور پادری 'خوف' کے ذریعہ سے اور دونوں، دونوں ہی زبردست تھے۔

بادشاہ نے عوام سے کہا "خدا نے تم کو کسان بنایا اور مجھے بادشاہ۔ اُس نے تم کو مزدوری کرنے کے لئے اور مجھے عیش کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اُس نے تمہارے لئے گدڑی اور جھونپڑا بنایا اور میرے لئے نفیس کپڑے اور محل۔ اُس نے تم کو اطاعت شعاری کے لئے پیدا کیا اور مجھ کو حکمرانی کے لئے۔ خدا کا انصاف یہی ہے"۔

پادری نے کہا: "خدا نے تم کو جاہل اور کمینہ بنایا اور مجھے مقدس و فرزانہ تم بھیڑ ہو میں چرواہا۔ تمہارا اُون میرا ہے۔ اگر تم میری اطاعت نہ کروگے تو خدا تم کو یہاں بھی سزا دے گا اور دوسری دنیا میں بھی..... خدا کا رحم اسی کو کہتے ہیں"۔

"دلیل پیش نہ کرو۔ دلیل باغیانہ جرم ہے۔ تردید نہ کرو، تردید خود رائی کا نتیجہ ہے۔ جس کے پاس کان ہیں اُسے صرف سننا چاہیئے اور ماننا چاہیئے۔

لیکن خوش قسمتی سے دنیا میں غدار بھی پیدا ہوئے اور منکرین بھی، اور یہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں دے دیکر صحیح معنے میں نوع انسانی کی خدمت انجام دی۔ "عظمت کیا چیز ہے؟"۔

واجب عظمت وہ انسان ہے جو بضاعت علم میں اضافہ کرتا ہے، روح کو خوف کے پنجہ سے نجات دلاتا ہے مجہول اور گمنام سمندروں کو عبور کرتا ہے قلم و فکر کو نئے براعظم اور نئے جزائر عطا کرتا ہے اور فضائے دماغ میں ایک نئی کہکشاں پیدا کرتا ہے۔ بڑا آدمی تعریف یا اعلیٰ مقام نہیں تلاش کرتا۔ وہ صداقت کی جستجو کرتا ہے وہ مسرت کی راہ ڈھونڈھتا ہے اور جو چیز وہ پالیتا ہے وہ دوسرے کو بھی دیتا ہے۔

بڑا آدمی تاریکی میں ایک مشعل ہے، اوہام کی رات میں منارۂ روشنی ہے۔ ایک الہام۔ ایک پیشین گوئی! عظمت، تحفۂ عوام نہیں ہے۔ وہ کسی کو بہ جبر نہیں دی جاسکتی۔

بڑے آدمی حقیقتاً وہ لوگ ہیں جنھوں نے انسان کے جسموں کو آزاد کرایا ہے۔ وہ فلسفی اور مفکرین ہیں جنھوں نے روح کو آزادی دلائی ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے کروروں کی زندگی میں محبت کا نغمہ بھر دیا ہے۔ وہ ایسے مصور ہیں جنھوں نے حیاتِ پریشاں کی بے رنگیوں کو عقل و فراست کے نقوش سے مزین کیا ہے۔ وہ، وہ سورما ہیں جنھوں نے جہالت و خوف کے دیوتاؤں کو قتل کیا ہے، یہ لوگ وہ موجد، وہ محقق، وہ کاریگر اور سلطان العلوم ہیں جنھوں نے اس دنیا کو مہذب بنایا ہے۔

پھر اس زبردست فوج میں سب کے آگے، ہم کو کون نظر آتا ہے وہ کون ہے جو سالارانہ عزم و ارادہ کے ساتھ لوائے حریت و آزادی بلند کئے ہوئے ہے۔

والٹیر! والٹیر! والٹیر!

وہ انسان، جس نے دنیائے کلیسا میں ہلچل ڈالدی اور مذہبی خانقاہوں کی بنیادیں ہلا کر رکھدیں ۔کسی پادری کے سامنے یہ نام لے لو تو تمھیں ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس مقدس پرستار کلیسا کے ہاتھ سے دامن ضبط و تحمل چھوٹ جائے گا اور اس کے منھ سے لعنت و ملامت کی آبشار جاری ہو جائے گی۔

سنیچر، ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہے — اسقدر نحیف و ناتواں کہ سانس کو اُس کے جسم کے اندر رہنے میں تامل ہے، اُس کے والدین جلد از جلد اُس کو اصطباغ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے پریشان ہیں کیونکہ انھیں یقین تھا اگر بپتسمہ لینے سے قبل موت آگئی تو بچہ کی قسمت میں ابدی مصیبت و تکلیف لکھی ہے۔ اور خدا اُس بچہ سے نفرت کرتا ہے جس پر پادری کے ہاتھ نے پانی نہیں چھڑکا ہے — جس پادری نے پانی کے چند قطرہ چھڑک کر اس بچہ کا نام فرانکوئس میری اروٹ FRANCOIS MARIE AROUET رکھا اور اس کی روح کو ہلاکت سے بچا لیا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اتنی تہوں میں لپٹا ہوا بچہ جو سانس بھی مشکل سے لے سکتا ہے۔ ایک دن، آزادی کے گلوے مرمریں کے اندر گڑوئے ہوئے دندۂ کلیسا کے پنجے علٰحدہ کرے گا۔

جب والٹیر، "اس اسٹیج" پر آیا تو اس کے ملک کو "عیسائی" ہوئے تقریباً ۱۴۰۰ برس گزر چکے تھے۔ اس حال میں کہ بادشاہ "قانون" بناتا تھا اور مقدس اہل کلیسا ان کی منظوری دیدیتے تھے۔

اس نام نہاد اخوت عامہ کے عہد سعید میں ہر عدالت "شریعت تعذیب" کی حامی تھی اور ہر پادری اپنے شکنجوں اور آلہ ہائے تعذیب سے آسانی بادشاہت قایم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

برگزیدہ انجیل نے علوم و فنون کو نجس و ناپاک قرار دیدیا تھا اور آزادی کے ساتھ کسی خیال کا اظہار ایسا سنگین جُرم تھا کہ مذہب کی تلوار کبھی اسے معاف نہ کرتی تھی۔

محبت کے خدا، اور ابدی باپ کے پرستار ظلم و جبر کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اور وہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے جرم کا اقرار کرلیں۔ اور اپنے ساتھیوں کا نام بتا دیں۔ الغرض "مذہب" کے پاس سوائے ظلم کے کوئی اصلاحی قوت باقی نہ رہ گئی تھی۔

یہ ۱۶۹۲ء کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب تمام مصنفین، بادشاہ اور پادریوں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے اکثر جیلخانوں میں ڈالدئے گئے، جلاوطن کردئے گئے اور قتل کروا دئے گئے!

—— جو تھوڑا بہت وقت جلادوں کو اپنے پیشہ کے فرائض سے بچتا وہ کتابیں جلانے میں صرف ہوتا تھا۔ انصاف کی عدالتیں ایک جال تھیں جن میں معصوموں کو پھانسا جاتا اور وہاں بیٹھکر انصاف کرنے والے بھی گویا درۂ خداوندی تھے جنھیں انسانی جلد کو لہولہان کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ آتا تھا۔

گواہ جن کو خود مبتلائے عذاب کا خطرہ رہتا تھا مجبوراً وہی کہتے تھے جو جج سننا چاہتا تھا۔

مافوق الفطرت اور حیرت انگیز ہستیاں دنیا پر حکمرانی کرتی تھیں۔ بات ہر ایک سمجھائی جاتی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جب کوئی بیمار پڑتا تھا تو وہ ڈاکٹر کو نہ بلا سکتا تھا بلکہ پادریوں کو طلب کرتا تھا اور یہ پادری بیماروں اور مرنے والوں کو تعویذ دیکر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ دنیا کو بہ جبر تسلیم کرایا جاتا کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہر قسم کی بیماری کو دفع کر سکتے ہیں اور اگر ان کو بچہ کے گہوارہ میں رکھ دیا جائے تو اس پر کسی قسم کا آسیب مسلط نہیں ہو سکتا۔ الغرض پادری یہی سکھاتے کہ تمام بیماریاں اور تمام مصائب خدا کا نام لینے سے دور ہو سکتے ہیں یعنی تمام امراض کا علاج، دعائیں، ریاضت، ولیوں کی ہڈیاں یا صلیب کی لکڑی چھونا، مقدس پانی چھڑک لینا یا جادو کا تیل جسم پر لگا لینا ہے۔

اُس زمانہ میں مرے ہوئے راہبوں کی روحیں بہترین معالج سمجھی جاتی تھیں اور ان کا نام لیکر کوئی گٹھیا اچھا کرتا، کوئی کھانسی، کوئی نزلہ دور کر دیتا کوئی بخار، کوئی مرگی کو شفا بخشتا، کوئی سرطان کو۔ کوئی مارگزیدہ کو اچھا کر دیتا، اور کوئی مبروص و مجذوم کو۔

"چرچ" کو یقین تھا کہ فضا میں صرف ارواح خبیثہ ہی بھری ہوئی ہیں، اور ہر گنہگار کے اندر شیاطین حلول کئے ہوئے ہیں۔

شیطان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُسے ہوا پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بجلی، سیلاب، اور کہر وغیرہ پر اُسی کی حکومت قائم ہے۔ چنانچہ اس شیطانی حکومت کے انسداد کے لئے گرجے کی گھنٹیوں اور مقدس پانی سے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی ان گھنٹیوں پر مقدس پانی چھڑکا جاتا تھا اور جب وہ بجتی تھیں تو یہ تصور کیا جاتا تھا کہ فضائے آسمانی ارواح خبیثہ سے پاک ہو گئی ہے۔

اُس زمانہ میں نہ صحیح آزادی تھی، نہ صحیح تعلیم، نہ صحیح فلسفہ، اور نہ صحیح سائنس —— جو کچھ تھا وہ اوہام پرستی تھی اور دنیا "چرچ" اور "شیطان" دو چیزوں کے قبضہ میں تھی!

"چرچ" کو شیاطین، ارواح خبیثہ اور جادوگروں کی ہستی پر کامل یقین تھا اور اس طرح "چرچ"

اپنے ہر دشمن پر قابو پالیتا تھا، اس کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی پر "جادوگر" ہونے کا الزام لگا دے، پھر یہ کام عوام کا تھا کہ وہ اُس "ساحر" کے جسم کا ایک ایک ریشہ نوچ کر پھینک دیں۔ سحر و ساحری کے اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ شوہر اپنی بیوی پر شک کرتا اور بیوی شوہر پر، لڑکے والدین کی طرف سے مشکوک تھے اور والدین لڑکوں کی طرف سے یہاں تک کہ اس وہم نے انسانی اخوت و محبت کے رشتوں کو توڑ دیا تھا، عدالتوں سے انصاف کو نکال دیا تھا، دوستی کے تعلقات کو منقطع کر دیا تھا اور حیاتِ انسانی کے جامِ زریں میں سوائے زہر ہلاہل کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ تھا نتیجہ ایک "مافوق الفطرت ہستی" پر اعتقاد رکھنے کا، عقلِ انسانی کو معطل کر دینے کا، اور اپنے بجائے پادریوں پر بھروسہ کرنے کا!

جب والٹیر پیدا ہوا تو فرانس پر مذہب کی حکمرانی تھی۔ پادری حد درجہ عیاش تھے اور جج عموماً ظالم۔ قصرِ شاہی کسبیوں کا گھر تھا اور عوام کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔ مگر یہ ظلم کرنے والے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ کس طرح انقلاب کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو رہے ہیں۔ اور وہ مزدور جن کی کمر خم ہو گئی تھی، جن کے چہرے دھوپ سے سیاہ ہو گئے تھے اور جن کے خون سے دوسروں کی کھیتی تیار ہوا کرتی تھی جب قصر و خانقاہ کی عورتوں کے سفید گلے دیکھتے تو اُن کو کاٹ ڈالنے کے لئے کس کس طرح بیتاب ہو جاتے تھے۔

ایک "بڑے آدمی" یا "عظیم شخصیت" کا حال معلوم کرنے کے لئے ہم کو اُس کے ماحول سے بھی واقف ہونا چاہئے، اس لئے آیئے دیکھیں کہ والٹیر کے زمانہ میں دُنیا کی کیا حالت تھی۔

انگلستان میں جارج دوم بادشاہ تھا اور قانون کی رو سے ۲۲۳ جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی، قید خانے قیدیوں سے بھرے تھے اور قصاص گاہ میں ہر وقت آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی!

اسپین میں دماغی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ اسپین ۔۔ وہ اسپین جس نے یہود کو نکال دیا تھا یعنی اپنی عقل کو، وہ اسپین جس نے مسلمانوں کو نکال دیا تھا یعنی اپنی صنعت و حرفت اور اعلیٰ معیارِ زندگی کو۔۔ اب بھی ہر ممکن ذریعہ سے ملک کو مذہبی بنانے کی کوشش کر رہا تھا!

پرتگال میں عورتوں اور بچوں کو اس جرم میں جلایا جا رہا تھا کہ کیوں انھوں نے اُس دن گوشت کھا لیا جس دن انھیں فاقہ کرنا چاہئے تھا۔۔ اور یہ سب کچھ ایک نہایت رحمدل خدا کو خوش کرنے کے لئے ہوتا تھا!

اٹلی میں بھی پادریوں اور راہبوں کی حکومت تھی اور منکرین و ملحدین کے لئے "عدالتیں" وہاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اور یہی حال جرمنی کا تھا۔

والٹیر کے ایام شباب

والٹیر کا اصلی نام فرینکوس میری ارویٹ FRANCOIS MARIE AROUET تھا اور ماں کا نام مارگرٹ ڈی امرڈ MARGUERITE D. AUMARD سات برس کی عمر میں ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ والٹیر کا ایک بڑا بھائی ارمانڈ ARMOND بھی تھا۔ یہ بیچارہ گرجوں میں اس لئے نذر و نیاز چڑھایا کرتا تھا کہ بھائی گناہ کرتا ہے تو اُسے کچھ ثواب مل جائے۔ جہاں تک معلوم ہے والٹیر کے آبا و اجداد میں کوئی بھی علم و ادب کا شایق نہ تھا۔ دس برس کی عمر میں والٹیر کو ایک اسکول میں داخل کیا گیا جہاں وہ سات برس تک پڑھتا رہا مگر بقول خود اس اسکول میں بجز تھوڑی سی یونانی، لاطینی اور بہت سی حماقت آب باتوں کے اس نے کچھ نہ پڑھا اور پھر اس کے بعد کسی اسکول میں داخل بھی نہ ہوا۔ اس اسکول میں نہ جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا نہ تاریخ، نہ ریاضی، ورنہ سائنس۔ یہ اسکول جیسوئٹ پادریوں کا اسکول تھا!

۱۷ برس کی عمر میں والٹیر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر دے گا چنانچہ اس کا باپ اپنے دونوں لڑکوں کے بارہ میں کہا کرتا تھا کہ میرے لڑکے صحافت کے پتلے ہیں ' ایک نثر میں ' دوسرا نظم میں۔

۱۷۱۳ء میں والٹیر کسی چھوٹی سی سیاسی خدمت پر مامور ہوگیا اور فرانسیسی وزیر کے ساتھ "ہیگ" گیا۔ یہاں اُسے ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ لڑکی کی ماں کو یہ محبت پسند نہ آئی۔ والٹیر کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے کپڑے اپنی معشوقہ کے پاس بھیجے کہ انھیں پہن کر پوشیدہ طور پر چلی آؤ مگر اتفاق سے اس سازش کا پتہ چل گیا اور والٹیر برخاست کر دیا گیا۔

والٹیر کا باپ یہ واقعہ سن کر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے اپنے لڑکے کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا اور اُس سے کہا کہ یا تو تم سمندر پار چلے جاؤ یا جیلخانہ۔ آخر کار والٹیر، وکالت کرنے پر آمادہ ہوا چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"میں ایک ہفتہ سے ایک وکیل کے دفتر میں کام کر رہا ہوں اور "ٹٹ پونجیا" وکیل کا پیشہ سیکھ رہا ہوں" کچھ عرصہ کے بعد والٹیر کو اس پیشہ سے بالکل نفرت ہوگئی اور اُس نے نظمیں لکھنا شروع کیں۔ یہ وہ وقت تھا جب عوام کے سامنے بعض نئے مسایل آگئے تھے۔

۱۶۵۲ء میں ڈاکٹر بیاس نے مسایل قضا و قدر اور جبر و اختیار پر اپنے کچھ نظرئے پیش کئے تھے۔ راہبوں نے ان نظریوں کو پوپ کے پاس بھیجا وہاں سے جو فرمان موصول ہوا اس کی عبارت صاف نہ تھی

چنانچہ پوپ سے اس عبارت کا مطلب پھر پوچھا گیا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا اور یہ جھگڑا عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد جانسنئسی اور مولینوی طبقوں کا جھگڑا چلا۔ جانسنیئس ایک فرانسیسی تھا جو قضا و قدر کا قایل تھا اور کہتا تھا کہ خدا ان چیزوں کا بھی حکم دیتا ہے جو ناممکن ہیں اور یہ کہ حضرت عیسیٰ کا انتقال نہیں ہوا مولینی ایک اسپینی تھا اور کہتا تھا کہ انسان اپنی مرضی میں آزاد ہے مگر خدا جانتا ہے کہ وہ اس کو کس طرح سے استعمال کرے گا۔ ۱۶۵۳ء میں 'جانسینوں' کی مخالف پارٹی نے ایک فرمان حاصل کیا جس میں جانسنیس کے پانچ نظریوں کی مذمت کی گئی تھی جانسنیسوں نے اس پر یہ کہا کہ یہ نظریے جانسنیئس کی کتابوں میں موجود ہی نہیں ہیں۔ اس کے بعد ۱۷۱۳ء میں ایک فرمان اور حاصل کیا گیا جس کی رو سے جانسنیئس کے تمام پیرو جیلخانوں میں بھر دئے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ قضا و قدر اور جبر و اختیار کا جھگڑا اسوقت تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب لوئی چہار دہم کا انتقال ہو گیا اور سلطنت فرانس ایک کونسل کے ہاتھ میں آئی تو تمام پرانے قیدی چھوڑ دئے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد ان کی جگہ نئے قیدیوں سے بھر گئی۔

اس وقت تک والٹیر کو مذہب یا حکومت سے اتنی دلچسپی نہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ یا تو نظمیں لکھا کرتا تھا یا کامیڈی اور ٹریجڈی۔ لیکن اس پر بعض طنزیہ تحریریں لکھنے کا الزام لگایا گیا اور بطور سزا اُسے جلاوطن کر کے ٹلے بھیجدیا گیا جو ۱۰۰۳ میل دور تھا۔ والٹیر نے یہاں سے لکھا کہ میں ایسے مقام پر ہوں جہاں اگر مجھے جلاوطن نہ کیا جاتا تو وہ میرے لئے سب سے زیادہ دلخوش کن مقام ہوتا یہاں میری مسرت کامل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

آخرکار اُسے رہائی مل گئی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُسے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اب کی مرتبہ اُسے ایک سال کے لئے بیسٹائل بھیج دیا گیا۔ یہاں کے قیدخانہ میں اُس نے اپنا نام "والٹیر" رکھا اور اسی نام سے وہ آجتک مشہور ہے۔ اس کے بعد وہ انگلستان بھیجدیا گیا۔ اور یہاں وہ برطانیہ کے مشہور ادیبوں سے ملا۔

اب والٹیر مذہب کے بارہ میں تحقیقات کرنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہونچ رہا تھا کہ مذہب نصرانی کتب مقدسہ کے الہامات پر، پاگل فقیروں کے خوابوں پر، "بزرگوں" کے جھوٹ پر، پادریوں کی چالاکیوں پر، مقدس راہبات کے ہسٹیریا کے دوروں پر، اور عوام کی بیوقوفیوں پر! اس کو اسی تحقیق کے دوران میں اسکا بھی پتہ چلا کہ ۳۲۵ء سے جب شاہ قسطنطین نے مذہب عیسوی قبول کیا تھا چودھویں صدی کے آخر تک عیسویت کے متعلق نہ معلوم کتنی کانفرنسیں ہوئیں مگر چند معمولی باتوں کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ والٹیر کو اب اس کا بھی احساس ہوا کہ ان احمقانہ عقائد کی وجہ سے دنیا میں ظلم و خوف کا دور دورہ ہو گیا ہے، تصویریں، چوبی صلیب، پرانی ہڈیاں اور لکڑی کے ٹکڑے آدمیوں کے حقوق اور ان کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی سمجھے

جاتے ہیں۔ اور ان آثار کے محافظین نسل انسانی کے دشمن ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی پوری قوت سے ان طاغوتی طاقتوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔

والٹیر عقل سلیم کا دیوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں ایسی کوئی زبان نہیں ہو سکتی جس سے تمام زبانیں نکلی ہوں۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ ہر زبان پر اُس کے ماحول کا اثر ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ برف اور یخ کی زبان پھول پتیوں کی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہ اس سے واقف تھا کہ منارۂ بابل کی کہانی غلط ہے اور اس کو اس چیز کا علم تھا کہ دنیا میں ہر چیز فطری ہے۔

والٹیر نہایت خوش مزاج، ظریف اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اُسے غیر فطری عقاید اور مذہب کے خشک فلسفے سے سخت نفرت تھی اور اسی لئے عیسویت نے ہمیشہ اُس کی مذمت کی، اور وہ ہر فرقہ کے پادریوں کا نشانۂ ملامت بنا رہا۔

لیکن والٹیر نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے توہمات کا خاتمہ کر کے چھوڑیگا۔ اور اُس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سحر حربہ کو استعمال کیا۔ وہ مضحکہ اڑانے میں حاضر جوابی ظرافت میں یگانۂ عصر تھا اور اس نے ان تمام ذرایع سے خرافیات مذہب کا مقابلہ شروع کر دیا۔

والٹیر چاہتا تھا کہ پیروان مسیح کو مہذب بنایا جائے اور قتل وخون سے انھیں باز رکھا جائے۔ چونکہ یہ صلاح پادریوں کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اگر وہ خود کوئی اپنا مذہبی فرقہ قایم کر لیتا اور چند "ملحدین" کو آگ میں جلا دیتا تو تمام عیسوی دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا۔ اگر وہ پرانے افسانوں کو سچا باور کر لیتا، اگر وہ لاطینی دعاؤں کو یاد کر لیتا یا اگر وہ اپنے زمانہ کے عقائد کو تسلیم کر کے مان لیتا کہ ایک "لا انتہا" اور "رحمان ورحیم" خدا نے کروروں انسانوں کو محض ابدی عذاب میں مبتلا رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ کہ اُس نے اپنی ساری طاقت وجبروت ایک چالاک اطالوی پوپ کو دیدی ہے، اگر وہ آسمانی "خدا" کی ناک میں جلتے ہوئے گوشت کی خوشبو پہونچانے کا سامان کرتا اور اس کے کانوں میں مظلوموں کی چیخوں کو بھر دیتا تو آج وہ مقدس والٹیر کہلاتا۔

والٹیر اپنے مضامین، طنزیہ اشعار، کامیڈی، ٹریجڈی، تاریخ نظموں اور فسانوں کے ذریعہ سے پادریوں پر ۶۰ برس تک حملہ کرتا رہا اور کبھی کسی کا محتاج نہ رہا۔ وہ کماتا بھی رہا اور اپنے مشن میں بھی مصروف رہا حتی کہ ایک زمانہ وہ آیا جب وہ شاہزادوں کی طرح رہتا تھا اور یورپ کی ایک زبردست طاقت شمار کیا جاتا تھا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ والٹیر سخت بے ادب تھا کیونکہ وہ مقدس چیزوں کا بغیر کسی سنجیدگی کے محاسبہ کرتا تھا مذہبی مراسم کے موقعوں پر اپنے جوتے نہیں اتارتا تھا۔ وہ موسیٰ کے علم طبقات الارض پر مسکراتا تھا۔ اجسام

فلکی کے بارہ میں انجیل کی تعلیم پر وہ ہنستا تھا۔ لیکن والٹیر کہتا تھا کہ جھوٹ خواہ کتنا ہی پرانا ہو جائے، سچ نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی بات اُس وقت تک قابل پرستش نہیں ہو سکتی جب تک دلایل سے یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی وہ پرستش کے قابل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام معجزے اور تمام مقدس اوہام اس کے تیر ملامت کا نشانہ بنے۔

وہ کہتا تھا کہ حماقتوں کا جواب صرف یہی ہے کہ ان کا مضحکہ اُڑایا جائے۔ اُس آدمی سے عقلی بحث کیونکر کی جا سکتی ہے جو یہ یقین رکھتا ہے کہ صلیبی نشان رکھنے والی روٹی کے کھانے سے اُس نے خداوندانِ ثلاثہ کو کھا لیا ہے اُس پادری کو کیسے قایل کیا جا سکتا ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک گھونٹ شراب کا پی کر اُس نے خدائے غیر متناہی کو پیٹ میں اُتار لیا ہے اور اُس انسان کو کیسے معقول کیا جا سکتا ہے جو اس امر کو مانتا ہے کہ مقدس روٹی کا جو حصہ بچے اُسے کونے میں چھپا کر رکھ دیا جائے تاکہ چوہیاں خدا کو نہ کھانے پائیں۔ بھلا بتلائیے کہ منطق اُس تشریع آدمی پر اپنا کیا اثر ڈال سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ ایک مرتبہ تیس چالیس چھوٹے بچے ایک پیغمبر کو دیکھ کر ہنس پڑے تو خدائے رحمٰن و رحیم نے دو ریچھوں کو بھیجا جنھوں نے بچوں کو چیر پھاڑ کر کھا ڈالا۔ جن لوگوں کی عقلوں کا یہ عالم ہو ان کو ان کی حماقتوں کا احساس کیسے کرایا جا سکتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہی ہے کہ انھیں ہدف ملامت بنایا جائے اور ان پر ایسے تیر برسائے جائیں جو ان کے سینوں کو چھلنی کر دیں اور یہی وجہ ہے کہ والٹیر کو استہزا کرنے والا بتایا جاتا ہے۔ اسنے بیشک مذاق اُڑایا لیکن کس کا؟ ان بادشاہوں کا جو ظالم تھے، ان خطاب یافتہ امرا کا جو مغرور و متکبر تھے ان عدالت گاہوں کا جو جور و ظلم کا مرکز تھیں، ان پادریوں کا جو عقل انسانی کو دنیا سے محو کر رہے تھے، اُن مورخوں کا جو تاریخ کے صفحات کو جھوٹ سے بھر رہے تھے اور ان فلسفیوں کا جو اوہام پرستی کی تائید کرتے تھے۔

والٹیر برسوں تک، باوجود عالمگیر دور تظلم کے خدا کو اور بقول خود "مذہب فطرت" کو مانتا رہا اور اس دوران میں وہ اپنے عہد کے عقاید پر اس وجہ سے حملہ کرتا رہا کہ وہ اس کے نزدیک قابل ملامت تھے وہ اپنے خدا کو ایک سرچشمۂ رحمتِ بے پایاں و انصاف بیکراں تصور کرتا تھا مگر مذہبی پیشوا جس خدا کو پیش کرتے تھے وہ حماقت اور ظلم کا مجسمہ ہوتا تھا۔ چنانچہ والٹیر نے اپنی پوری طاقت سے انجیل پر حملہ کیا۔ اُس نے انجیل کے بتائے ہوئے علم طبقات الارض، اس کے نظریات عدل و انصاف، اس کے قوانین، اس کے مراسم، اس کے معجزوں، اس کی کرامتوں، اس کی ظالمانہ دھمکیوں، اور اس کے مبالغہ آمیز مواعید کی دھجیاں اُڑا دیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُس نے اُس خدا کی تعریف بھی کی جو ہم کو پانی دیتا ہے، غذا دیتا ہے، پھل دیتا ہے، تندرستی دیتا ہے اور جس نے دنیا کو رعنائی اور حسن سے معمور کر دیا ہے

اُس پر خود بھی ہر طرف سے حملہ کیا جا رہا تھا مگر وہ اپنے حربوں سے جن میں عقل، منطق، دلایل، براہین، طنز، تمسخر اور استہزا سبھی کچھ شامل تھے۔ اپنے مخالفین سے جنگ کرتا تھا۔ اُس نے اکثر معافی بھی مانگی مگر وہ معافی بھی ایک قسم کی توہین ہوا کرتی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ اپنی تردید بھی کی مگر وہ تردید گناہ سے بھی بدتر ہوا کرتی تھی۔ اس کی تعریف میں بھی زہر ہلاہل ہوا کرتا تھا اور اس کی پسپائی میں بھی سبقت ہوتی تھی۔

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ پادری اُس کو زندہ جلوا کر اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ چنانچہ اپنی تردید کے متعلق اُسنے لکھا تھا کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنے خیالات و الفاظ واپس لے لوں۔ بہت اچھا میں اس کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ میں یہ کہے دیتا ہوں کہ پوپ ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ میں یہ ماننے لیتا ہوں کہ اگر لوقا اور مارک (حضرت عیسیٰ کے حواریین) ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ بھی مذہب کی صداقت کا ایک ثبوت ہے اور یہ کہ مذہب کی سچائی اور خوبی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ ناقابل فہم چیز ہے۔ ...... قصہ مختصر یہ کہ میں سب کچھ کہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے چین سے بیٹھنے دیا جائے اور ایک ایسے شخص کے پیچھے نہ پڑا جائے جس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا ہے"۔

والٹیر نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی مظلوموں کی امداد کے لئے، بیکسوں کی حفاظت کے لئے، بے گناہوں کو بچانے کے لئے، فرانس کے ظالمانہ قوانین کو مسترد کرانے کے لئے، پادریوں کے دلوں کو نرم بنانے کیلئے منصفوں کو رحمدل کرنے کے لئے، عوام کو مہذب بنانے کے لئے اور لوگوں کے دلوں سے جنگ کی خواہش دور کرنے کے لئے!

کہا جا سکتا ہے کہ والٹیر کو خواہ مخواہ بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جرمنی کے مفکر اعظم "گٹے" کے الفاظ نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اگر تم عمق، فراست، ذہانت، ذکاوت، تخیل، لطافت، فلسفہ، علو، فطرت، تنوع، شادابی، گرمجوشی، سحر، نزاکت، رور، عقل رسا، نازکخیالی، خلوص، پاک باطنی فصاحت، براعت، آب و تاب، چستی، تیزی، شوکت، رفعت، اور ترحم کو کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہو تو والٹیر کو دیکھو"۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی وہم پرستیوں کا خاتمہ کرے مگر پھر بھی ہزاروں باپ ماں ایسے پائے جاتے ہیں جو توہم پرستی کے تو مخالف ہوتے ہیں لیکن اپنے بچوں کے لئے اجازت دے دیتے ہیں کہ ان کے دماغوں میں، بیوقوف اُستاد وحشت و بہیمیت کا بیج بوتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی چیز اس سے زیادہ اہم نہیں کہ وہ آزاد رہے اور خوف سے بے نیاز!

ایک فانی مگر آزاد ہستی ہونا ایک غیر فانی غلام ہونے سے کہیں بہتر ہے!

اُس زمانہ میں خدا کے ماننے والے یہ کہا کرتے تھے کہ فطرت کی اسکیم میں ظلم دستم کا عنصر نہیں ہے لیکن چونکہ ایک زندگی منحصر ہے دوسری زندگی پر اور ایک جانور زندہ رہتا ہے دوسرے جانور کی زندگی پر لہذا حیات ادنیٰ کی قربانی حیاتِ اعلیٰ کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ ان دلایل پر اکثر لوگ مطمئن تھے مگر پھر بھی ہزاروں آدمی ایسے تھے جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ادنیٰ اعلیٰ پر کیوں قربان کیا جائے۔ اور اب تو خوردبین کی امداد سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا یہ نظریہ غلط تھا کیونکہ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کی زندگی کو ان سے چھوٹے جانور ختم کر دیتے ہیں اور انھیں بڑے جانوروں کی حیات پر چھوٹے جانوروں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان بھی جراثیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کالرا، کے جراثیم کو دیکھو کہ وہ کتنے چھوٹے ہیں لیکن انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ بعض ایسے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں جن کی غذا قلبِ انسانی ہے، یا جو انسانی پھیپھڑا کھاتے ہیں یا جو آدمی کی قوت بینائی کا خاتمہ کر دیتے ہیں غرضکہ اسی طرح کے سیکڑوں ایسے کیڑے ہیں جو انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ زندگی، ادنیٰ زندگی پر قربان ہو رہی ہے۔

کچھ عرصہ تک والٹیر، پوپ کی رجائیت (OPTIMISM) کا قایل رہا۔ مگر ۱۷۵۵ء میں جب ایک زبردست زلزلہ آیا تو رجائیت پسندوں کو مجبوراً یہ سوال کرنا پڑا کہ تمام دنیا پر رحم کرنے والے خدا نے سیکڑوں ہزاروں معصوم بچوں کو اسوقت جبکہ وہ اپنے گھٹنے اس کی بارگاہ نیاز میں ٹیکے ہوئے اُس کی حمد کے گیت گا رہے تھے کیوں تہ خاک کر دیا۔ اس واقعہ نے والٹیر کا مذہب بدل دیا اور اُسے یہ یقین ہوگیا کہ یہ دنیا بہترین دنیا نہیں کہی جاسکتی ــــ خدا پرست، خاموش ہوگیا تھا! اور زلزلہ خدا کی ہستی سے انکار کر رہا تھا!

والٹیر کی انسانیت

اُس زمانہ میں ٹولوز مرجع خواص و عوام تھا۔ قدیم زمانہ کی اکثر یادگاریں کھنڈروں کی صورت میں یہاں موجود تھیں۔ یہاں کے لوگ جاہل مطلق تھے مگر ان کے پاس مذہب عیسوی کے ساتوں ولیوں کے خشک کپڑے کنواری مریم کے کسی لباس کا ایک حصہ، اور ان بیگانہ عقل لوگوں کی جنھیں "مقدس" کہا جاتا ہے سیکڑوں کھوپڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ عیسویت کی فتح اور اس پر مظالم کے سلسلہ میں دو رسمیں بھی نہایت تزک و احتشام سے منایا کرتے تھے انھیں لوگوں میں کچھ گھر پروٹسٹنٹ مذہب رکھنے والے عیسائیوں کے بھی تھے مگر چونکہ تعداد میں کم تھے اس لئے بہت خاموشی سے زندگی بسر کرتے تھے ان میں سے ایک آدمی

جین کلاس نامی تھا۔ اس کے ایک بیوی، اور چھ لڑکے تھے اور بذات خود وہ بہت نیک سمجھا جاتا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن فراغت کے بعد اس سے یہ کہدیا گیا کہ تاوقتیکہ وہ کیتھولک نہ ہوجائے گا اُسے یہ پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس پر اُس بیچارے نے یہ کوشش کی کہ کسی ترکیب سے یہ معلوم ہی نہ ہونے پائے کہ میں پروٹسٹنٹ ہوں اور مجھے لائسنس مل جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ آخرکار ایک دن ناامید ہوکر اُس نے اپنے باپ کے توشہ خانہ میں خودکشی کرلی۔ اس واقعہ کو شہر تولوز کے متعصب باشندوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ اُس کے والدین نے اسے خود ہی قتل کردیا ہے تاکہ وہ کیتھولک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس الزام میں لڑکے کے باپ، ماں، بھائی، ایک نوکر اور ایک مہمان کو گرفتار کرلیا گیا۔ مردہ لڑکے کو "شہید" تسلیم کرلیا گیا اور اُسکے جسم پر "چرچ" نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ایک "مقدمہ" چلا۔ بجز سماعی شہادتوں کے قتل کی اور کوئی گواہی بھی نہیں ملی، اور واقعات ملزم کے موافق تھے مگر پھر بھی ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو غریب "مجرم" کے ہاتھ پاؤں زنجیروں او رسیوں سے باندھ دئے گئے اور انھیں مخالف سمتوں کی طرف اتنا زور سے کھینچا گیا کہ جین کلاس کا ایک ایک عضو اکھڑ گیا۔ اس کے بعد اُس سے جرم کے متعلق پھر سوال کیا گیا مگر مجرم نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ تب اُس کے پیٹ میں زبردستی منوں پانی اُنڈیل دیا گیا مگر مجرم برابر اپنے جرم سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد اُسے ایک لکڑی میں باندھا گیا اور اُس کے ہر عضو کے دو دو ٹکڑے کئے گئے مگر "مجرم" نے اقبال نہ کیا۔ اس وقت وہ حالتِ نزع میں تھا مگر چونکہ دم نکلنے میں کچھ دیر تھی لہذا اُس کا گلا گھونٹا جانے لگا اور آخرکار اس طرح ایک بیگناہ نے اپنا دم توڑا۔ تولوز کے ظالموں کو اس پر بھی چین نہ آیا اور کلاس کے پسماندگان کے پاس جو جایداد تھی اُسے ضبط کرلیا گیا۔ اس کے لڑکے کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ عیسائی ہوجائے، ملازمہ کے سامنے یہ شرط پیش کی گئی کہ وہ ایک خانقاہ میں داخل ہوجائے۔ دونوں لڑکیوں کو بھی ایک خانقاہ بھیجدیا گیا اور غریب و بیکس بیوہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ دربدر بھیک مانگتی پھرے۔

والٹیر نے سارا قصہ سُنا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کلاس کے ایک لڑکے کو تو اپنی حفاظت میں لے لیا اور خود مقدمہ کی پوری روئداد لکھ کر بادشاہوں، قانون دانوں اور مختلف ممالک کے ذمہ دار لوگوں سے اس مسئلہ پر خط و کتابت شروع کی جہاں روپیہ کی ضرورت ہوئی وہاں اُس نے روپیہ بھیجا جہاں خود جانا ضروری سمجھا وہاں خود گیا اور اپنی تحریروں سے سارے یوروپ میں زلزلہ ڈال دیا۔ بالآخر "مجرم" بے گناہ قرار دیا گیا اور اس کی بیوہ اور بچوں کے لئے ہزاروں روپیہ چندہ جمع ہوگیا — یہ تھی والٹیر کی خدمت نوعِ انسانی کے لئے۔

خاندان سروَن کا قصہ

سروَن نامی ایک پروٹسٹنٹ لنگویڈاک میں رہتا تھا۔ بیوی کے علاوہ اُس کے تین لڑکیاں تھیں وہاں کے پادری نے یہ چاہا کہ ان میں سے ایک لڑکی کو وہ کیتھولک بنالے۔ قانون کی رو سے بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے ایک پادری کو حق حاصل ہوتا تھا کہ بچہ کو اس کے والدین سے چھین لے، چنانچہ سروَن کی ایک چھوٹی لڑکی کو اُس سے جدا کرکے خانقاہ میں بھیج دیا گیا مگر وہ لڑکی گھر بھاگ آئی اور یہاں دیکھا گیا کہ اُس کی پشت کوڑوں کی مار سے لہولہان ہے۔ اس کے بعد ہی ایک دن لڑکی اپنے گھر سے پھر غائب ہوگئی اور مکان سے تین میل کے فاصلہ پر اس کی لاش پائی گئی۔ پادریوں کی طرف سے شور مچایا گیا کہ لڑکی کے اعزہ نے اُسے کیتھولک ہونے سے بچانے کے لئے قتل کر ڈالا ہے۔ یہ واقعہ بھی اُسی زمانہ میں ہوا جب جین کلاس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ سروَن مع اپنے اہل وعیال کے بھاگا کہ اگر مقدمہ چلا تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں مگر سروَن کے بھاگ جانے کے باوجود اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے خاندان پھر یہ مقدمہ چلایا گیا مقتول لڑکی کے باپ اور ماں کو پھانسی کی سزا دی گئی اور بقیہ دو لڑکیوں کو جلاوطنی کی۔

اب ان غمزدوں کا بیان سنئے۔ یہ سب گرتے پڑتے جاڑے میں بھاگے تھے، سروَن کی بڑی لڑکی جس کی شادی ہوچکی تھی حاملہ تھی اور وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ چنانچہ آلپس کی برفانی چوٹیوں پر اُس کے بچہ پیدا ہوا، ماں مصیبتوں کی تاب نہ لاکر مرگئی۔

والٹیر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کی دستگیری کے لئے بھی اس نے اپنا ہاتھ اور قلم بڑھایا اور اس فیصلہ کے خلاف وہ دس برس تک لڑتا رہا، اُس نے بادشاہوں سے چندہ کی اپیل کی اور آخرکار دسویں برس اُسے کامیابی حاصل ہوئی ـــــ یہ تھا والٹیر کا جذبۂ محبت نوع انسانی کے لئے۔

اسپنیس کا واقعہ

اسپنیس ایک کھاتا پیتا پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔ سنہ ۱۷۴۰ء میں اُس نے اپنے گھر میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کو ٹھہرایا اور اُس کو کھانا بھی کھلایا مگر چونکہ ملک کے قانون کے مطابق یہ فعل گناہ عظیم تھا لہٰذا اسپنیس کو حبس دوام کی سزا ہوگئی۔ والٹیر کو ۲۳ برس کے بعد یہ حال معلوم ہوا اور اُس کی مساعی

کی بدولت اسپنیس کو رہائی ملی۔

غرضکہ اسی طرح کی سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں جن میں والٹیر نے بیواؤں، یتیموں، بیکسوں اور مظلوموں کی امداد کی۔ یہاں سب کی تفصیل بتانا مشکل ہے صرف ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے:۔

۱۷۶۵ء میں بمقام ابول، ایک پل پر صلیب نما دو لکڑیاں لگی تھیں ایک دن ان کو کسی نے چاقو سے چھیل دیا۔ دو نوجوانوں اشویلیر لابری اور ڈی اٹلونڈی پر شک ہوا۔ موخرالذکر تو جرمنی بھاگ کر اور فوج میں بھرتی ہو کر جان بچائی اور مقدم الذکر پر مقدمہ چلا۔ دونوں کے خلاف شہادت کوئی بھی نہ تھی مگر جو حکم سنایا گیا اس میں سزا کی تعیین اس طرح کی گئی تھی:۔

(۱) زبانیں گدی سے کھینچ لی جائیں

(۲) گرجا گھر کے دروازہ پر ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

(۳) لوہے کی زنجیروں میں باندھ دئے جائیں اور پھر مدفن میں آگ لگا دی جائے۔

مقدمہ کی اپیل کی گئی جس کی سماعت ۲۵ ججوں نے کی مگر عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ اور یکم جولائی ۱۷۶۶ء کو حکم کی تعمیل بھی ہو گئی۔

جب والٹیر کو اس سزا کا حال معلوم ہوا تو اس نے فرانس کو، جہاں ایسے مظالم ہو سکتے تھے، عمر بھر کیلئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پہلے تو اس نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں واقعات مقدمہ مندرج تھے۔ پھر اٹلونڈی کا پتہ لگایا اور شاہ جرمنی سے سفارش کرکے اس کا نام فوج سے کٹایا اور اسے اپنے پاس ڈیڑھ برس تک رکھ کر ریاضی ڈرائنگ اور انجنیرنگ کے فنون سکھائے یہاں تک کہ اٹلونڈی، فریڈرک اعظم کی فوج میں انجنیر ہو گیا۔

والٹیر بیکسوں اور مظلوموں کا حامی تھا اور ایک عظیم الشان بلندی سے دنیا کو دیکھتا تھا۔ وہ بہشت کے دروازہ سے اوہام کی فوج کو نکالنا چاہتا تھا تاکہ آدم کی اولاد شجر علم کے ثمر کا مزہ چکھ سکے۔ مگر پادری اس کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ وہ شجر جہالت کے پھل فروخت کرتے تھے جہاں تک اصول کا تعلق تھا وہ اپنے عہد کا بہترین قانون داں تھا۔ وہ قانونی اصطلاحات اور فیصلے نہیں جانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ قانون کو کیسا ہونا چاہئے اور اسکا نفاذ کیسے کرنا چاہئے۔ وہ گواہی کے فلسفہ کو سمجھتا تھا، شک اور ثبوت کا فرق جانتا تھا اور اس نے اپنے عہد کے تمام مدبرین اور تمام قانون دانوں سے زیادہ ملک کے قوانین میں اصلاح کی۔ وہ زمانہ طالبعلمی میں دنیا کے بہترین مقرر سیسیرو کی کتابیں پڑھ چکا تھا اور انسانی مساوات کا علمبردار تھا۔ وہ کہتا تھا کہ:۔

"تمام انسان برابر پیدا ہوئے ہیں —— اور —— ہم کو نیک صفات اور قابلیت کی قدر کرنا چاہئے۔

وہ غلامی کا، خواہ وہ کسی صورت میں ہو، سخت مخالف تھا۔ اُس کا خیال یہ نہ تھا کہ ایک انسان کا رنگ اُسے اس امر کی اجازت دیتا ہو کہ دوسرے انسان سے اُس کے رنگ کی بنا پر وہ کوئی چیز چھین لے۔ وہ غریبوں اور کسانوں کا دوست تھا اور اُس نے بچوں، عورتوں اور جانوروں کو ان لوگوں کے ظلموں سے ہمیشہ بچایا جنھیں اپنے ہمسایوں سے اتنی ہی محبت کا دعویٰ تھا جتنا وہ خود اپنے سے کرتے ہیں۔

وہ اس چیز کو مہمل خیال کرتا تھا کہ خدا پانیوں کو تو غرق کر دے اور پھر بچوں کے واسطے خود اپنی جان دیدے اس کا یہ خیال ڈیڈیرآٹ کے اس قول کے بالکل موافق تھا کہ "اگر عیسیٰ کو یہودیوں سے بچنے کی قدرت تھی اور پھر بھی اپنے کو نہ بچایا تو وہ خودکشی کے مجرم تھے"۔

والٹیر ظالموں سے نفرت کرتا تھا اور محکوموں اور پادریوں کے مظلوموں سے محبت۔ وہ بدقسمتوں کا دوست اور فاقہ کشوں کا مددگار تھا۔ وہ فطری چیزوں کا معتقد اور مہملات کا دشمن تھا۔

والٹیر کوئی ولی نہ تھا اگر مذہبی جھگڑوں پر وہ ہنستا تھا، عقاید پر اُسے رحم آتا تھا اور متعصبوں کی حرکات پر متنفر۔ وہ ولیوں سے بڑھکر تھا!

والٹیر کے زمانہ میں اکثر عیسائی اپنی روزمرہ کی زندگی میں مذہب کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح طوفان کے وقت جہازوں میں جان بچانے والی کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے اُسی طرح مصیبت کے وقت مذہب سے وہ لوگ بھی کام نکالنا چاہتے تھے۔ والٹیر، انسانیت اور اعمال حسنہ کے مذہب کا معتقد تھا۔ صدیوں تک پادریوں نے معائب اور برائیوں کو ایسے رنگ میں رنگا تھا کہ گناہ بھی خوبصورت نظر آتا تھا۔ مگر والٹیر خوبی کے محاسن اور اوہام پرستی کے معائب کا معلم تھا۔

والٹیر اپنے عہد کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار یا شاعر نہ تھا مگر وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان، حریت کا سب سے بڑا دوست اور وہم پرستی کا سب سے بڑا دشمن ضرور تھا۔ اُس نے اوہام پرستی کی زنجیروں کو توڑنے، دل و دماغ سے خوف کے بادل دور کرنے، پادریوں کے اختیارات ختم کرنے اور دنیا کو آزادی دلانے کے لئے ابنائے آدم میں سے سب سے زیادہ کام کیا۔ اور صحیح معنیٰ میں وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا مذہب پرست تھا۔

واپسی ــــ ۲۷ برس جلاوطن رہنے کے بعد والٹیر پیرس واپس ہوا۔ اس دوران میں مہذب دنیا میں وہ نہایت اعلیٰ پوزیشن کا مالک رہا اور اُس کی واپسی ایک فاتحانہ شان رکھتی تھی اُسکا ایک شہنشاہ کی طرح سے استقبال کیا گیا۔ اکاڈمی نے اُس کا خیرمقدم کیا جو عزت بادشاہوں کو بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی ــ تھیٹر میں اس کا تماشہ "آئرین" دکھلایا گیا اور وہاں اُس کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ وہ فرانس کا بہترین شاعر

مانا جانے لگا۔ دنیا کے تمام ادیبوں میں اس کا درجہ سب سے بلند تھا۔ اور اُس وقت فرانس میں صرف تین قوتیں سمجھی جاتی تھیں تختِ شاہی، قربانگاہ اور والٹیر!

بادشاہ اُس کا مخالف تھا۔ پادری اُس سے جلے ہوئے تھے مگر والٹیر کا عوام پر اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ اُس کے چہار طرف سیم وزر کے انبار لگے تھے وہ دنیا کا نہایت دولتمند انشا پرداز تھا۔ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے خود اپنا تخت بنایا تھا۔

مئی ۱۷۷۸ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ والٹیر مرنے کے قریب ہے۔

مرنے سے دو روز قبل والٹیر کا بھتیجا اس کے بستر مرگ پر دو مشہور پادریوں کو لے آیا۔ ایک پادری نے اُس سے آکر پوچھا کہ کیا تم اب بھی حضرت یسوع مسیح کی الوہیت کا اقرار کرتے ہو۔ والٹیر نے دوسری طرف منہ کر کے جواب دیا کہ "مجھے اطمینان سے مرنے دو" پادری صاحبان منغض ہو کر باہر چلے گئے۔

۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو رات کے تقریباً سوا گیارہ بجے والٹیر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ مرنے سے کچھ لمحے قبل اُس نے اپنے معتمد آدمی مورانڈ کا جو پاس ہی کھڑا تھا ہاتھ دبایا اور کہا ــ "رخصت، مائی ڈیر مورانڈ۔ میں چلا!"

اس کی اس موت کو جو اسقدر سادہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، نازک، فطری اور پرسکون تھی اور اس کے ان الفاظ کو جو اتنے ہی سادے اور معصومانہ تھے عجیب وغریب رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور عذاب خداوندی اس پر نازل ہو رہا تھا۔

لیکن آیئے ذرا ایمانداری سے یورپ کے پادریوں اور یورپ کے مشہور مفکرین کا مقابلہ کریں۔ کیا اٹلی کے تمام پادریوں نے برونو سے زیادہ انسانی عقل میں اضافہ کیا ہے؟ کیا فرانس کے تمام پادریوں نے والٹیر یا ڈڈیراٹ سے زیادہ دنیا کو مہذب بنایا ہے؟ کیا اسکاٹلینڈ کے تمام پادریوں نے ہیوم سے زیادہ علم کی اشاعت کی ہے؟ کیا دنیا کے پادریوں نے ٹامس پین سے زیادہ انسانی آزادی کے لئے کوشش کی ہے؟ ـ

سوال یہ ہے کہ اگر یہ "ملحدین" نہ ہوتے تو دنیا کیا ہوتی؟ ـــ "ملحدین" ہمیشہ بہادر اور خوش فکر ہوئے ہیں، گلشن عالم میں ان کی حیثیت گلاب کی سی رہی ہے، وہ آزادی اور محبت کے علمبردار رہے۔ اور ان کی ہستیاں عظیم المرتبت روحوں کی مالک تھیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جنھوں نے ابنائے آدم کی آزادی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو، ان کو تو مرتے وقت ضمیر کے سانپ ڈسنے لگیں اور وہ نفوس مقدسہ جنھوں نے غلامی کی تائید کی ہو، جنھوں نے

ماؤں کی چھاتیوں سے ان کے معصوم بچوں کو چھین لیا ہو، جنھوں نے غلاموں کی ننگی پیٹھوں کو کوڑوں سے لہولہان کردیا ہو وہ مرتے ہی فرشتوں کی آغوش میں چلے جائیں! ہم یہ کیونکر یقین کرسکتے ہیں کہ دنیا کے مفکرین ومحققین، آزاد خیال، انسانیت پرست، تعصب کی زنجیروں کے توڑنے والے، علم کی روشنی پھیلانے والے اور اوہام پرستی کے بت کو توڑنے والے تو تکلیف کی موت مریں اور وہ لوگ جو انسانی پوست کو ہڈی سے جدا کیا کرتے تھے، جو دوشیزاؤں ماؤں اور بچوں کو مول سے لیکر زدوکوب کیا کرتے تھے وہ سب امن اور سکون کے عالم میں اس دنیا سے گزر جائیں۔

اُس زمانہ میں فلسفیوں اور مفکرین کے لاشوں کو بھی زیر زمین دفن کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی کیونکہ خطرہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی ہڈیاں نیک لوگوں کی ہڈیوں میں مل کر ان کو ناپاک بنا دیگی اور ممکن ہے کہ قیامت کے روز گڑبڑ میں یہ خراب لوگ بھی نیکوں کے ساتھ ملکر جنت میں چپکے سے گھس جائیں لہذا جب کوئی فلسفی مرتا تھا تو اس کی لاش جلادی جاتی تھی یا اسے درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا اور یا کسی ایسی جگہ دفن کرنے کی اجازت ملتی تھی جہاں آس پاس نیکوں کے مزار نہ ہوں۔

جب والٹیر کا انتقال ہوا تو ایک پادری نے پیرس سے سو میل کے فاصلہ پر ایک گرجا میں اُسے دفن کرنے کا انتظام کردیا۔ مئی کے آخری روز اتوار کے دن اس کی لاش کو ڈریسنگ گاؤن اُڑھا کے چھ گھوڑوں کی ایک گاڑی پر رکھا گیا تاکہ یہ معلوم ہو کوئی بڑا آدمی کہیں جارہا ہے اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس میں اس کے دو تین اعزہ تھے۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد لاش اس گرجا میں پہونچی اور والٹیر کو دفن کردیا گیا مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس پادری کے پاس جس نے "بہ نظر ترحم" زمین کا ایک ٹکڑا دیدیا تھا، بڑے پادری کی طرف سے ایک عتاب نامہ پہونچا کہ والٹیر کو دفن نہ کرنے دیا جائے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہر چند والٹیر مرچکا تھا مگر قصر شاہی کی بنیادیں منہدم ہوچلی تھیں۔ عوام بادشاہوں اور پادریوں کی کرتوتوں سے واقف ہوچلے تھے۔۔ اور انتقام وظلم کے عفریت کی جگہ اب امن و آزادی کے فرشتے لے رہے تھے۔

اگر "چرچ" کے اُصول کو صحیح سمجھا جائے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجز "ملحدین" کے اور تمام مجرم مقابلۃً زیادہ سکون سے ہیں۔ اگر کوئی شخص ڈاکو ہے تو اس کی موت سے اس کے پیشہ کا کوئی تعلق نہیں، اگر کسی قاتل کے پاس مرتے وقت ایک پادری موجود ہے تو جنت میں نیک بندے اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ جس شخص نے دنیا میں اپنے گھر کو دوزخ بنالیا تھا وہ بھی بغیر کسی جھجھک کے مرسکتا ہے بشرطیکہ اُس نے عیسیٰ کی الوہیت پر کبھی نہ شک کیا ہو۔ وہ بادشاہ جس نے ناحق لڑائیاں لڑکر ملک کو یتیموں اور بیواؤں اور اپاہجوں اور محتاجوں سے بھر دیا ہو وہ ایک ولی اللہ کی طرح جان دیتا ہے بشرطیکہ عیسیٰ پر ایمان

رکھنے والے جتنے بادشاہ ہیں وہ جنت میں ہیں مگر جتنے فلسفی ہیں وہ دوزخ میں۔ وہ ظالم جن کے نام ہی ان کے مظالم کی شہادت کے لئے کافی ہیں نیک بندوں کی موتیں مرے ہیں کیونکہ ان کا بپتسمہ ہوگیا تھا اور انھوں نے عیسیٰ کی الوہیت سے انکار نہیں کیا تھا۔ لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا کردیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ اور پادری بے گناہوں کو بھی زندہ جلا ڈالیں تو اس وقت تک خدا ان سے بازپرس نہ کرے گا جب تک وہ اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ایماندار اور صداقت پرست نے "الہامی الفاظ" پر شک کیا یا کسی دوسرے خدا سے دعا مانگ لی تو حقیقی خدا ایک زخم خوردہ شیر کی طرح اپنے شکار پر چڑھ بیٹھے گا اور اس کے مرتعش جسم سے اس کی روح کھینچ لیگا۔

دنیا میں اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے کہ قتل کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ مفلوج ہوگیا ہو، دنیا میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی بے گناہ بچہ کو خدا نے عین موقع پر بچا لیا ہو۔ ہزاروں گناہ روزانہ کئے جاتے ہیں، سیکڑوں انسان اپنے شکار کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، بیواؤں کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور لوگ مارتے مارتے ان کی جانیں لے لیتے ہیں، چھوٹے بچے اپنے خونخوار باپوں سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں مگر ان کی درخواستوں اور ان کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ حسین اور معصوم لڑکیوں کو دام تزویر میں پھانس کر ان کی عزت برباد کردیجاتی ہے مگر خدا ان مظالم کو نہیں روکتا۔ پھر دنیا میں کبھی کبھی ذی فہم ایماندار انسان بھی پیدا ہوئے جو اپنے زمانہ کی اوہام پرستیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مگر پادریوں کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا اور اس لئے ان پر مقدمے چلائے جاتے تھے اور ان کو سخت سے سخت سزا دیجاتی تھی۔ اگر اتفاق سے کوئی اپنی طبعی موت سے مرا تو پادری کہا کرتے کہ وہ نہایت سختی کی موت مرا ہے۔

پادریوں نے یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے کہ ملحدین کے آخری لمحات نہایت تکلیف دہ گزرے ہیں اور اسکی تلقین گرجا کے ہر ممبر سے کی جاتی ہے مگر اس کو تسلیم کرنے کے بجائے والٹیر نے انجیل کی جانچ کی، ہاتھ پاؤں باندھ کر پکڑ کر آزادی کی وکالت کی، استبداد پسند مذہب کی زنجیروں کو توڑا، مظالم کے خلاف آواز بلند کی، عقل اور دلایل کے نام پر اپیل کی، عالمگیر رواداری پر زور دیا اور مظلوموں کی امداد کی۔

اس نے صرف یہ کہا کہ ہر مذہب کی اصل ایک ہی ہے — ہر مذہب میں وہی اسرار ہیں، وہی معجزے وہی کرامات، وہی خرق عادات، وہی مندر، وہی مراسم، وہی وعدے، وہی دھمکیاں وہی مظالم اور وہی جور و تعدی۔

والٹیر کے یہی جرائم تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کے لئے یہ کیونکر کہا جا سکتا تھا کہ اس نے سکون کے عالم میں اپنی جان دی۔ چنانچہ صدیوں سے اہل مذہب یہی تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں کہ جن لوگوں نے ہمارے مذہب

کی تعلیمات پر لبیک نہیں کہا ہے اور اس کی کورانہ تقلید نہیں کی مرتے وقت ان کو ہمیشہ تکلیف ہی رہی جب کوئی پادری حالت نزع کو بیان کرنے لگتا ہے تو اس کی فصاحت و بلاغت انتہا کو پہونچ جاتی ہے اور وہ جب ایک مرتے ہوئے ملحد کی آخری حالت بیان کرتا ہے تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اور جب اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تو عذاب جہنم کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔

دوسری واپسی —— چار سو برس تک بیسٹائل، مظالم کا مرکز بنا رہا۔ اس کی چہار دیواری میں سیکڑوں شریف انسان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے قید خانے اور اس کے آلات تعذیب خدا کے وجود سے انکار کر رہے تھے۔ مگر ۱۴ر جولائی ۱۷۸۹ء کو مظلوم عوام نے بیسٹائل پر حملہ کرکے اُسے فتح کر لیا۔ ان کا نعرہ والٹیر تھا! ۱۷۹۱ء میں اس کی اجازت ملی کہ والٹیر اب یہاں دفن کیا جا سکتا ہے۔ وہ پیرس سے ۱۱۰ میل پر خاموشی سے دفن کر دیا گیا تھا مگر اب اُسے پوری قوم یہاں لا رہی تھی۔ جنازہ کا جلوس ۱۰۰ میل لمبا تھا۔ ہر گاؤں اپنا جھنڈا لئے جنازہ کے ساتھ تھا اور ہر شخص فرانس کے فلسفی، جین کلاس کے بچانے والے اور اوہام پرستی کے برباد کرنے والے کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

اگر واقعی موت کے بعد کوئی زندگی ہے تو کوئی خدا اُس شخص کو سزا نہیں دے سکتا جس نے اس دنیا سے سزاؤں کو مٹایا ہے اور اُس شخص کو کبھی نہیں قید کر سکتا جس نے غلامی کی زنجیروں کو یہاں توڑا ہے۔

والٹیر فرانسیسی زبان کا زبردست ماہر تھا اور ہر خیال کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ ڈھونڈھ لیتا تھا۔ اہم سے اہم اور دقیق سے دقیق مسائل پر وہ نہایت آسانی سے لکھتا تھا۔ ہجو اور مدح پر ایسا قادر تھا کہ ایک ہی جملہ میں دونوں چیزیں آجاتی تھیں۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور اہم سے اہم مسائل کو اس طرح پیش کرتا تھا جیسے کوئی بازیگر اپنے گیند کا تماشہ دکھاتا ہے۔ وہ رموز دنیا سے واقف تھا۔ ظلم سے نفرت کرتا تھا۔ مظلوموں کا ساتھ دیتا تھا، اوہام پرستی کا دشمن تھا اور آزادی کا عاشق۔ یہ تھا والٹیر جس نے سترہ برس کی عمر میں اوڈی پس OEDIPUS لکھا اور ۸۳ برس کے سن میں آئرین IRENE

آلپس کے دامن میں اپنے تخت جلال سے اُس نے یورپ کے ہر ریاکار پر انگشت نمائی کی اور نصف صدی تک وہ عقل کی شمع دنیا کو دکھاتا رہا۔

مکتوبات نیاز

حضرت - یہ آپ کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ "قالوا بلیٰ" کہنے والوں میں میری روح بھی شامل تھی۔ "لن ترانی" کی توہین برداشت کرنے والے کب سے ختم ہو چکے۔ اور اس وقار و خودداری کے دور کو بھی ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا۔ مگر آپ ہنوز "وادی ایمن" کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یعنی

اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ ——— معقول!

قبلہ، طاعت و عبادت کا مفہوم اگر صرف یہ ہے کہ پیشانی رگڑ رگڑ کر تقدیر کے لکھے کو مٹایا جائے (حالانکہ آپ اس کے بھی قایل نہیں) تو یہ "گھس گھس" میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن اگر اس سے مقصود کوئی "استعلاءِ روحانی" بھی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کا انحصار "تسبیح و مصلا" "ریش و بروت" پر کیوں ہو؟

در کارِ عشق نالہ و آہے ضرور نیست

میں سمجھا کہ یہ بدگمانی آپ کو کیوں پیدا ہوئی۔ برسوں کے بعد آپ نے مجھے دیکھا اور ایسی صورت میں جس کی توقع آپ کو نہ تھی ——— "توقع" کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا "اندیشہ" کہنا چاہئے ——— بہتر ہے آیندہ کبھی حاضری کی فرصت نصیب ہوئی تو کوشش کروں گا کہ آپ کا جذبۂ زیارتِ "موئے مبارک" بھی پورا ہو جائے۔

مکرمی - یاد فرمائی کا شکریہ، میں اس دوران میں بہت کم یہاں رہا۔ اسی لئے عریضہ پیش کرنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب حیدر آباد ہی میں ہوں گے۔ کئی مہینے ہوئے ایک خط آیا تھا، ایران جانے کی طیاریاں کر رہے تھے اور مجھے بھی "دعوتِ ہوا و ہوس" دے رہے تھے، لیکن غالباً ابھی اس ارادہ کی تکمیل نہیں ہو سکی، ورنہ ضرور اطلاع دیتے۔

ہاں، علیگڑھ نہیں جاسکا، طبیعت بدمزہ تھی۔ اور اچھا ہوا کہ میں وہاں نہیں گیا۔

محض "اثباتِ وجود" سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز "اضطرابِ حیات" ہے ہو وہ اس قوم سے مفقود ہو چکا ہے۔

فرصت زدست رفتہ وحسرت فشردہ پائے

کیا آپ نمائش میں تشریف نہ لائیں گے۔ کام کی بات ہو یا نہ ہو، لیکن اپنے آپ کو کھو دینے کے لئے رنگینیوں کی کمی نہیں۔ منتظر ہوں۔

عزیزم۔ "شاعر" سے یہ مطالبہ کہ وہ کوئی پیغام بھی دنیا کو پہونچائے، بالکل جدید چیز ہے، خاصکر اس صدی میں جب کہ "ریاضی" ہر چیز کے حدود متعین کرنا چاہتی ہے۔ آپ کا فرمانا درست ہے کہ پہلے شاعر کو، مرفوع القلم ومسلوب الحواس سمجھ کر انسان صرف اس کی باتوں پر ہنسا کرتا تھا اور وہ بھی جو اس کے منھ میں آتا تھا کہہ گزرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ بیکار نہیں گیا، شاعر کی یہی دیوانگی آہستہ آہستہ لوگوں میں فرزانگی پیدا کر رہی تھی، یہاں تک کہ زمانہ کا رخ ادھر سے ادھر ہو گیا اور دنیا وہی کہنے لگی جو شاعر کہتا تھا۔

اب تو خیر مذہب ختم ہو رہا ہے، مگر اس وقت بھی جب اس کا "بطشِ شدید" عام تھا، شاعر اتنا ہی آزاد تھا۔ پھر لوگ یہ سب کچھ سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ خوش ہونا تو معمولی بات ہے رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جو اس پر سر دُھنتی تھی۔

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس باب میں قدیم شاعر کی خدمات بہت عظیم الشان ہیں۔ آپ "پیام" لئے پھرتے ہیں، میں کہتا ہوں اس نے "کام" کیا ہے، کام۔

بات یہ ہے کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور ہر وہ بات جو آزادی سے متعلق ہو انسان کو ہمیشہ اچھی معلوم ہوگی۔ اس میں اب اور جب کی قید نہیں۔

کیا آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ دنیا نے — خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را — کے باغیانہ درس کو سنا اور واہ واہ کی۔

ایک تنقید اور ملاحظہ ہو:-

صد کعبہ خلیل گو بنا کن
کفارۂ بت شکستنی نیست،

اس سے زیادہ پیام آپ اور کیا چاہتے ہیں۔

عزیز من

اس دوران میں آپ کے دو خط ملے۔ ایک تصویر کی طلب میں، دوسرا رسید کی صورت سے۔ میں نے آپ کے پہلے خط کا جواب نہیں دیا اور جو وجہ اُس وقت مانع تھی، اب بھی ہے، لیکن اس خیال سے کہ معلوم نہیں آپ اس کی کیا توجیہ کریں، نیز اس مصلحت سے کہ اس وجہ کا علم آپ کو بھی ہو جانا ضروری ہے، یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں۔

میرے عزیز دوست، ایک جماعت کی بقا کا انحصار صرف اسکی تہذیب کی بقا پر ہے اور اس میں سب سے نمایاں چیز زبان ہے۔ حیرت ہے کہ آپ میرے ساتھ اتنی خوش عقیدگی رکھتے ہیں لیکن اس کا اظہار فرماتے ہیں ایسی زبان میں جو نہ میری ہے نہ آپ کی۔ پھر با ایں ہمہ شیفتگی و نیاز مندی آپ اس کو ٹائپ کر کے بھیجتے ہیں، درانحالیکہ ایک ایسے شخص کو جسے انگریزی لکھنے کا اتنا شوق ہو، یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دوستانہ مراسلت میں ٹائپ کا استعمال خلاف تہذیب ہے۔

میں آپ کی محبت کا معترف ہوں اور شرمسار ہوں کہ بہ اندازۂ جذبات اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا کاشکے مجھے آپ کی زندگی و مشاغل زندگی کے مفصل حالات معلوم ہوتے تاکہ میں آپ سے زیادہ کھل کر باتیں کر سکتا، امید ہے کہ میری تحریر کی تلخی ناگوار نہ ہوگی

معقول! آپ اپنے اخلاق کے متعلق میری رائے دریافت فرماتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ۔

درال دیار کہ زاہدی ہنوز آنجائی

تم کافر پیدا ہوئے اور کافر ہی مروگے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ دیکھو مذاق میں سچی بات کہنا سخت خطرناک امر ہے۔ تم اس باب میں بہت آزاد واقع ہوئے ہو اور میں ہمیشہ اس پہلو کو بچاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میر صاحب سے تمہارا جھگڑا کس بات پر ہوا، پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ان کے مقابلہ میں تم ایسے شریر انسان کا ساتھ دوں گا۔ وہ ملیں تو ان سے کہدینا کہ تمہارے متعلق میری رائے صرف یہ ہے کہ

خوئے تو الفت گداز، ناز تو دشمن نواز،

صلح تو دیر آشتی، جنگ تو زود آشنا

دیکھو آئندہ کبھی ایسی جسارت، دیکھنا کہ خود ہی گناہ کرو اور خود ہی اس کی توثیق چاہو،

ہوش میں آؤ، یہ کیا کہہ رہے ہو، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ مرد پیدا ہوئے ہو تو مردوں کا سا طرز فنا بھی رکھو

یہ ذرا ذرا سی بات میں عورتوں کی طرح منھ پر آنچل ڈال کر آنسو بہانا مجھے پسند نہیں۔

عشق منت می نہد آنرا کہ رسوا می کند

گھر کے بڑے بنے ہو تو یہ سب کچھ سہنا پڑے گا۔ اعزہ کی طرف سے یہ حسنِ سلوک کوئی نئی بات نہیں۔ مگر یہ فخر تم سے وہ کبھی نہیں چھین سکتے کہ تم ان کے مربی و محسن ہو۔ ان کو بکنے دو، اور دنیا کی پرواہ نہ کرو۔ اچھا کام خود اپنی جزا ہے، اور انسان کا یہ احساس کہ وہ اپنا فرض انجام دے رہا ہے اس کی جنت ہے۔

اگر زندگی میں یہ تلخیاں نہ ہوں تو دنیا رہنے کی جگہ نہ رہے۔ تم بروں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کروگے تو تم میں ان میں فرق ہی کیا رہے گا۔ کیا تمھیں وہ حکایت یاد نہیں کہ کسی حکیم سے پوچھا گیا:۔

"ادب از کہ آموختی۔ گفت، از بے ادباں"

آیندہ یہ شکوہ و شکایت تم سے نہ سنوں ــــ "غنچہ شو دامنِ آرام بہ چنگ ست اینجا"

کرمفرمائے نیاز منداں، گرامی نامہ نے معزز فرمایا۔ فارسی تغزل کے باب میں آپ سے بہتر سند اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میری عزت بڑھاتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے، میں کیا اور میری رائے کیا۔ آپ سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ جس حد تک تغزل کا تعلق ہے میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی اس میں شک نہیں "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائیوں اور پچھلے پہر کے سکوت میں، سوائے سعدی کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا، ہندی نژاد شعراء میں خسرو کے تغزل کا اسی لئے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوشدلی" آتی ہے۔

یوں ادب و انشا میں میرا ذوق کافی دقت پسند ہے، لیکن غزل میں جہاں کوئی اشکال پیدا ہوا اور مجھے اُلجھن ہوئی۔ صاف و سہل الفاظ، سلجھا ہوا انداز بیان، شگفتہ ترکیبیں۔ یہ ہیں ایک غزل کی خصوصیات اور فارسی شعراء میں سعدی کے یہاں یہ رنگ اتنا ہی رچا ہوا ہے جتنا اردو میں میر کے یہاں۔

محبوب کے لئے جان دیدینا، بہت عامۃ الورود خیال ہے اور شعراء نے طرح طرح سے اس کو بیان کیا ہے لیکن سعدی کی سادگی ملاحظہ ہو:۔

ہمیں حکایتے روزے بدوستاں برسد۔
کہ سعدی از پئے جاناں برفت و جاں انداخت

لیلیٰ و مجنوں کی تلمیحات کے سلسلہ میں ناقہ و محمل کے متعلق شاعروں نے اچھے اچھے مضامین اختراع کئے

ہیں لیکن سعدی کا جذبۂ بیتاب دیکھئے :-

بدار اے ساربان محمل زمانے

کہ عہد وصل را آخر زمان ست

اسی تخیل کا ایک اور شعر سن لیجئے :-

برق یمانی بجست، بادِ بہاری بخاست

طاقتِ مجنوں برفت، خیمۂ لیلیٰ کجاست

غزل کے شعر کی خوبی کا معیار یہ ہے کہ اس کا مطلب بیان نہ ہو سکے۔ سعدی کے ان شعروں کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کیجئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی نازک آبگینہ کو ٹھیس پہونچا رہے ہیں۔

اس ... ابیاتِ عشق ناگزیرِ الفت" کے دو چار شعر اور سن لیجئے :-

نہ من افتادہ تنہا بہ کمند آرزو بیتاب | ہمہ کس ... سر کدام واری

باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پرسی | ورنہ کہ بردیار ... از ... بیغامے

ہر کہ می بیندم از بارِ غمت می گوید | سعدیا بر تو چہ رنج ست کہ بگداختہ

آخر من و تو نہ دوست بودم | عہد تو شکست و من ہمانم

لازم ست احتمال چندیں درد | کہ محبت ہزار چندیں ست

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی | از یک نگاہ کشت و جوابے دگر نداد

تخیل کی بلندی، بیان کی ندرت، انداز بیان کا اچھوتا پن، ترکیبوں کی چستی، مضمون آفرینی تو آپ کو بہت ملیگی، لیکن "سادگی" جو غزل کی جان ہے سعدی کے سوا کہیں نظر نہ آئے گی۔

تصحیح

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں صفحہ ۶۹ پر آخری سطر سے قبل کی سطر میں بجائے "بیمار بستر" کے "بیمار بستر بنا" لیجئے۔ - منیجر نگار

باب الاستفسار

عہدِ مغلیہ کا عسکری و مالی نظام

(جناب سید شوکت علی صاحب ۔ آگرہ)

مغلوں کا فوجی نظام کیا تھا اور کن اقتصادی اصول پر حکومت کا نظم و نسق قائم تھا، اگر زحمت نہ ہو تو مختصراً اس موضوع پر اظہارِ خیال فرمائیے۔

(نگار) مغلوں کی حکومت یکسر فوجی حکومت تھی اور سول و ملٹری کی جو تقسیم اس وقت نظر آتی ہے وہ ان کے دورِ سلطنت میں نہ تھی۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک قسم کا مارشل لا جاری تھا۔ حکومت کی آمدنی کا بڑا حصہ فوج ہی پر صرف ہوتا تھا اور جملہ نظم و نسق فوج ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس امر کا اندازہ کہ عسکری قوت کے لئے کتنا اہتمام کیا جاتا تھا سپاہ کی اس تعداد سے ہو سکتا ہے جس سے وہ حملہ و دفاع میں کام لیتے تھے۔

بابر نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کرکے ابراہیم لودی کو پانی پت میں شکست دی ہے تو پوری ایک لاکھ کی جمعیت اس کے ساتھ تھی جس میں دس ہزار سوار اور باقی پیادہ فوج اور توپخانہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ ذرائع آمد و رفت وسیع تھے اور نہ خبر رسانی کے وسائل کثیر، اس لئے ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کی فراہمی، اس کی نقل و حرکت اور رسد رسانی میں کتنی زحمت اور کتنی دولت صرف ہوتی ہوگی۔

اکبر سے قبل چونکہ کوئی منظم حکومت مغلوں کی قائم نہ ہوئی تھی اس لئے ان سے یہ توقع بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی مستقل باقاعدہ عسکری تنظیم کر سکتے تھے، لیکن جب اکبر تخت نشین ہوا اور مغلوں کے قدم مضبوطی سے ہندوستان میں جم گئے اس وقت البتہ عسکری تنظیم عمل میں آئی اور اس وسعت کے ساتھ کہ سارا ملک فوجی حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر آپ اس وقت کے عہدہ داروں کے منصب پر غور کریں گے تو حیرت ہوگی کہ گورنر سے لیکر دربار کے مسخرے تک سب فوجی منصب رکھتے تھے۔

صوبہ کے گورنر کو سپہ سالار کہتے تھے اور پرگنہ کے حاکم کو فوجدار، علاوہ ان کے دوسرے درباریوں اور عہدہ داروں کی تعیین منصب بھی ان سواروں کی حیثیت سے ہوتی تھی جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل جو بادشاہ کا کاتب خصوصی تھا اور لڑنے بھڑنے کی خدمت اس کے سپرد نہ تھی، اپنے عہدہ کے لحاظ سے ۲۵۰۰ سواروں کا منصب دار تھا اور بیربر جو صرف مسخرہ شاعر کی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی ایک ہزار سواروں کا افسر تھا۔ سید محمد میر عدل قاضی تھے لیکن ۹۰۰ سواروں کا اہتمام ان کے بھی سپرد تھا اور فیضی جس کا کام صرف شاعری کرنا تھا ۴۰۰ سواروں کا کمانڈر تھا۔

سواروں کے کمانڈروں کو منصب دار کہا کرتے تھے لیکن ان میں بھی فرق مراتب پایا جاتا تھا۔ ۵۰۰ سے لیکر ۲۵۰۰ سواروں تک کے منصب داروں کو امیر کہتے تھے اور اس سے زیادہ کے منصب دار کو امیر کبیر۔

امرا کا علاوہ اس فوجی کے ایک منصب ذاتی بھی ہوا کرتا تھا، یعنی اگر کوئی پانچ ہزار سواروں کا منصب دار تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ رکھتا تھا وہ صرف ۴۰۰۰ سوار لیکن فوجی منصب کے لحاظ سے وہ پنجہزاری کہلاتا تھا۔ شاہجہاں نے تو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ منصب داروں کو مقررہ تعداد کے ایک تہائی سے زیادہ سوار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور بعض صورتوں میں صرف ایک چوتھائی کافی سمجھا گیا۔

اکبر کے زمانہ میں (شاہزادوں کو چھوڑ کر) یہ فوجی منصب کم سے کم دس سوار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سواروں تک محدود تھا لیکن دو تین امیروں کو شش ہزاری و ہفت ہزاری منصب بھی عطا ہوا تھا۔

امرا کا مشاہرہ، منصب کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا تھا یعنی ہفت ہزاری سے لیکر یک صدہ تک، تین لاکھ پچاس ہزار روپیہ تا چار ہزار روپیہ سالانہ (موجودہ سکہ کے حساب سے) ان امراء کا مشاہرہ جن کے تین درجے[1] مقرر تھے اس طرح مقرر ہوتا تھا کہ پنجہزاری درجۂ اول کو دو لاکھ پچاس ہزار، درجۂ دوم کو ۲۴۵۰۰۰ اور درجۂ سوم کو ۲۳۵۰۰۰ روپیہ سالانہ۔

یہ مشاہرے ذاتی منصب سے متعلق ہوتے تھے تاکہ امرا اپنے اپنے صوبوں، نیز دربار میں اپنی حیثیت کو قائم رکھ سکیں اور اپنے ذاتی مصارف پورے کر سکیں۔ شاہی خدمت کے لئے سواروں کی جتنی تعداد وہ رکھتے تھے اس کا الاؤنس علحدہ ملتا تھا

سوار اپنے گھوڑوں کی نگہداشت اسلحہ کی فراہمی اور نقل و حرکت کے خود ذمہ دار ہوتے تھے۔ ان کے بھی تین درجے تھے۔ تین گھوڑے والے، دو گھوڑے والے اور ایک گھوڑے والے۔ اول و دوم درجہ کا مشاہرہ پچیس روپیہ ماہوار

---

[1] وہ امرا جن کا ذاتی منصب فوجی منصب کے برابر ہوتا تھا درجۂ اول کے امرا کہلاتے تھے۔ وہ جن کا فوجی منصب ذاتی منصب کا نصف ہوتا تھا درجۂ دوم میں شمار ہوتے تھے اور وہ جن کا فوجی منصب بہ نسبت ذاتی منصب کے نصف سے بھی کم ہوتا تھا۔ درجۂ سوم کے امیر کہلاتے تھے

اور درجۂ سوم کا ساڑھے سولہ روپیہ ماہوار۔ بعد میں دکن کے سواروں کا مشاہرہ کچھ بڑھا دیا گیا تھا۔

وہ سوار جو خود اپنے گھوڑے نہیں رکھ سکتے تھے انھیں بارگیر کہتے تھے اور ان سواروں کے خادم سمجھے جاتے تھے جو انھیں گھوڑے فراہم کرتے تھے۔

اول اول امرا یا منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر نہ تھا بلکہ جاگیروں کی صورت میں ہوا کرتا تھا لیکن ۱۵۷۵ء میں شہنشاہ اکبر نے تمام جاگیریں خالصہ میں شامل کرکے، تمام منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر کر دیا۔ اس سے امرا میں بہت برہمی پیدا ہو گئی اور بنگال، گجرات اور سندھ کے امرا کی جاگیریں پھر بحال کر دی گئیں، تو بے وجوار کے صوبوں میں البتہ وہی نقد کا دستور قایم ہو گیا

اکبر نے ایک اصلاح اور کی وہ یہ کہ منصب دار اپنے گھوڑوں کو داغ کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ مقررہ تعداد گھوڑوں کی رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ طریقہ اول اول ایران و ماوراء النہر کے عہد سلجوقی میں رائج ہوا تھا جسے ۱۲۱۲ء میں علاء الدین خلجی نے بھی جاری کیا تھا، لیکن بعد کو اس کی پابندی قائم نہ رہی اور پھر دو صدی بعد ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ نے دوبارہ قایم کیا۔ شیر شاہ کے مرنے پر یہ رواج موقوف ہو گیا تھا لیکن اکبر نے پھر اسے جاری کیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ منصب دار واقعی اتنے سوار رکھنے پر مجبور کئے جائیں جتنے از روئے منصب و مشاہرہ ان کو رکھنے چاہئے۔ اس کی بھی سخت مخالفت ہوئی اور آخر کار پنجہزاری امرا کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا پڑا، اور عہد مغلیہ کے آخر میں سبھی مستثنیٰ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوار کی حقیقی تعداد کچھ ہوتی تھی اور کاغذات میں کچھ اندراج ہوتا تھا، چنانچہ ۱۶۵۰ء میں بنگال کا ایک امیر ۵۰۰ سواروں کا منصب رکھتا تھا لیکن ان کی تعداد ستر، اسّی سے زیادہ نہ تھی۔

شہزادوں اور منصب داروں کی فوج کے علاوہ خود بادشاہ کی بھی ذاتی فوج ہوا کرتی تھی جسے والاشاہی کہتے تھے۔ اس فوج میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے تھے جو کمسنی ہی سے (بہ حالت شہزادگی) فرمانروا کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس باڈی گارڈ کی تعداد چار ہزار تھی، ان کے مشاہرہ کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ منصب داروں کے سواروں سے انھیں زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

اکبر نے ایک فوج احدیوں کی بھی قایم کی تھی۔ اور احدی کہنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر ذات شاہانہ سے وابستہ ہوتے تھے۔ اسوقت اردو زبان میں احدی کا لفظ کاہل انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ان احدیوں کو دوسرے سواروں کے مقابلہ میں زیادہ آرام ملتا تھا اور وہ رفتہ رفتہ کاہل ہو جاتے تھے۔ احدیوں کا درجہ منصب داروں سے کم اور عام سواروں سے زیادہ سمجھا جاتا تھا۔

سواروں کے علاوہ پیادہ فوج بھی رکھی جاتی تھی جس میں دربان، چوکیدار، ہرکارے، پالکی بردار بھی شامل تھے۔ لیکن وہ سپاہی جو جنگ کے لئے مخصوص تھے انھیں برق انداز، تیر انداز اور نیزہ بردار کہتے تھے۔

اکبر کے زمانہ میں برق انداز (بندوق چلانے والے) بارہ ہزار کی تعداد میں تھے جن کے ہر دستہ کے افسر کو "داروغہ" کہتے تھے۔ ان کی تنخواہوں کا حساب وکتاب بالکل علحدہ رہتا تھا۔ ادنیٰ حیثیت کے افسران چار درجے رکھتے تھے، درجۂ اول والے کو ساڑھے سات روپیہ، دوسرے درجہ والے کو سات روپیہ، تیسرے درجہ کے افسر کو پونے سات اور چوتھے درجہ والے کو ساڑھے چھ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔

اسوقت ایک فوج اور بھی تھی جسے "داخلی" کہتے تھے۔ اس میں ایک چوتھائی برق انداز ہوتے تھے اور تین چوتھائی تیرانداز۔ یہ وہ فوج تھی جو پرگنہ کے فوجداروں کے پاس رہتی تھی تاکہ قیام امن وسکون و وصولی مالیات میں وقت ضرورت اس سے کام لیا جائے۔ تیرانداز بہ نسبت برق اندازوں کے زیادہ خیال کیے جاتے تھے۔ کیونکہ برق انداز جب تک اپنی بندوق بھرے یہ متعدد تیر سر کرسکتا تھا۔ جنگ کے وقت سواروں کا مقابلہ پیادہ فوج سے نہیں بلکہ سواروں ہی سے کیا جاتا تھا اور یہ حقیقت بہت بعد کو معلوم ہوئی کہ اصل اہمیت پیادہ فوج ہی کو حاصل ہے۔ توپ خانہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک وزنی دوسرا ہلکا۔ اکبر کے زمانہ میں توپخانہ بہت اچھا تھا اور اس میں کام کرنے والے زیادہ تر ترک اور نومسلم پرتگالی ہوا کرتے تھے۔ ہلکی توپیں بیل گاڑیوں پر لادی جاتی تھیں اور ان سے بھی زیادہ ہلکی (جنھیں زمبورک کہتے تھے) اونٹوں پر ہوتی تھیں۔ بھاری توپوں کو لیجانے کے لئے کئی کئی بیل جوتے جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ کام ہاتھیوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ پھر جوں جوں عسکری انتظام خراب ہوتا گیا، بھاری توپوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بسا اوقات ان کا لیجانا مشکل ہوتا تھا۔ گولے، ٹھوس لوہے اور پتھر کے ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات ان میں تانبے کے پیسے بھر کر داغتے تھے۔ توپخانہ کا افسر اعلیٰ میر آتش کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ سو برق اندازوں کے افسر کو صدی وال کہتے تھے اور دس برق اندازوں کے افسر کو میر دہا۔ اکبر جنگ کے وقت ہاتھیوں سے بہت کام لیتا تھا۔ اور انھیں پر سوار ہوکر تیرانداز اور برق انداز جنگ کرتے تھے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ بسا اوقات ہاتھی خود اپنی ہی فوج کو زیادہ نقصان پہونچا دیتے ہیں اس لئے ان کا استعمال ترک کر دیا گیا اور ان سے صرف سواری کا کام لیا جانے لگا۔

اکبر کا دستور تھا کہ جب وہ ہاتھی پر بیٹھکر جنگ کرتا تو اس کے چاروں طرف دس، بیس بلکہ تیس ہاتھی اور ہوتے تھے۔ شاہی ہاتھی خاصہ کہلاتا تھا اور دوسرے ہاتھی حلقہ۔ اکبر کے بعد بھی یہ تفریق بدستور قائم رہی لیکن مفہوم کے لحاظ سے اتنا فرق ہوگیا کہ سواری کے تمام ہاتھی خاصہ کہلائے جانے لگے اور باربرداری کے ہاتھی حلقہ۔

ہفت ہزاری منصب داروں سے لیکر پانصدی منصب داروں تک کے لئے قاعدہ مقرر تھا کہ وہ ایک ہاتھی سواری کے لئے اور پانچ ہاتھی باربرداری کے لئے ہر ڈھائی ہزار کے منصب کے حساب سے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہاتھی بادشاہ کی ملکیت ہوا کرتے تھے اور سوائے جنگ کے منصبداروں کے استعمال میں کبھی نہ آتے تھے۔

فوج کا سپہ سالار خود بادشاہ ہوا کرتا تھا لیکن عام انتظام "بخشی الممالک" کے سپرد ہوتا تھا، اس کی ماتحتی میں علاوہ متعدد کلرکوں کے (جنھیں تیکچی کہتے تھے) تین بخشی بھی ہوا کرتے تھے۔ فوجی بھرتی، سپاہیوں کی گنتی، منصب داروں اور سواروں کی تنخواہ وغیرہ کا حساب سب اسی محکمہ کے سپرد تھا۔ سال میں دو مرتبہ فوجوں کا معاینہ ہوا کرتا تھا اور میر بخشی دیکھتا تھا کہ منصب داری کے گھوڑے داغی اور قابل استعمال ہیں یا نہیں۔ جو گھوڑے بیکار سمجھے جاتے تھے ان کو علحدہ کر کے دوسرے گھوڑے رکھنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

والا شاہی یا شاہی باڈی گارڈ کا انتظام سوائے ایک میر بخشی کے کسی اور کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اسی طرح احدیوں کا میر بخشی علحدہ ہوا کرتا تھا جس کا انتخاب اونچے درجہ کے امراء سے کیا جاتا تھا۔ جب میر بخشی کسی کو احدیوں میں بھرتی کرتا تھا تو واقعہ نگار اس کا نام درج کر کے ایک سند اس کو دیتا تھا جو وزیر کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ صوبہ داریوں میں بھی فوج کا نظام وہاں کے میر بخشیوں کے سپرد تھا۔

اکبر کے زمانہ میں کل تعداد افواج کیا تھی۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کیونکہ امراء کے فوجی منصب کی تعیین کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں بارہ ہزار برق انداز تھے اور اگر بلاک مین کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو کل سپاہ ۲۵ ہزار ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ بیان درست نہیں ہو سکتا کیونکہ جب ہمایوں ایک لاکھ سوار میدان جنگ میں لے آتا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اکبر نے اس میں اضافہ نہ کیا ہو اور توسیع سلطنت کے لئے زیادہ فوج کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔ بلاک مین نے یہ تعداد غالباً صرف شاہی باڈی گارڈ کی ظاہر کی ہے۔ شاہجہاں کے آخری نصف دور میں مناصب کے لحاظ سے ۴۲۵۵۰۰ کی جمعیت ہونی چاہیے تھی، لیکن کسی منصب دار نے کبھی مقررہ تعداد فوج کی نہیں رکھی اور اس لئے حسب اندراج "بادشاہ نامہ" اعداد و شمار یہ تھے:۔ منصب دار ۸۰۰۰ — احدی اور سوار برق انداز ۲۰۰۰۰۰ — (فوجداروں کے پاس جو سپاہ وصول مالیانہ وغیرہ کے لئے رہتی تھی اس سے علحدہ تھی) — پیادہ برق انداز، تیر انداز ۴۰۰۰۰ — (ان میں سے دس ہزار سپاہی ہیڈ کوارٹر میں رہتے تھے اور دس ہزار قلعوں اور صوبوں میں)

اورنگ زیب کے زمانہ میں پچاس ہزار سوار برزرو میں رہتے تھے اور تقریباً اتنے ہی ادھر ادھر نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ سواروں کے علاوہ بیس ہزار پیادہ فوج خالص راجپوتوں کی تھی۔ ان میں بارہ ہزار توپخانے کے لئے وقف تھے اور باقی شاہی حفاظت کے لئے — عہد مغلیہ میں فوج کی باقاعدہ قواعد کا رواج نہ تھا اور نہ صف بندی کے خاص اصول مقرر تھے، بخشی کے معاینہ کے وقت ایک کے پیچھے ایک سامنے سے گزر جاتے تھے جب بادشاہ شکار کے لئے جاتا تھا تو البتہ فوج بھی ہانکے میں شریک ہوتی تھی اور یہی ان کی بڑی قواعد تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر سپاہی مگدر اور لیزم ہلا کر ورزش کرتا رہتا تھا اور فنون سپہ گری کی مشق بھی جاری رکھتا تھا۔

مغل حکومت کا انحصار صرف کاشت پر تھا۔ معدنیات میں لوہا اور تانبا ضرور میسر آجاتا تھا لیکن کافی مصارف کے بعد، کوئلہ کا وجود بالکل نہ تھا۔ چونا، نمک اور شورہ بیشک پایا جاتا تھا اور عمارتی پتھر بھی۔

قابل کاشت رقبہ کو دیہہ (گاؤں) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور متعدد گاؤں کا رقبہ پرگنہ یا محال کہلاتا تھا اکثر گاؤں کاشتکاروں کے قبضہ میں تھے جو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ہر خاندان جداگانہ رقبہ میں کاشت کرتا تھا۔ کاشتکاروں کے ان تمام مختلف خاندانوں کا تعلق مقدم سے ہوا کرتا تھا جو مالگذاری دینے کا ذمہ دار ہوتا تھا اور گاؤں کا تمام انتظام کرتا تھا۔۔۔ کاشت زیادہ تر غلہ کی ہوتی تھی۔ ترکاری اور نیشکر بھی بوتے تھے لیکن کم، روغنی تخم کی کاشت بھی صرف ضرورت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ افیون زیادہ بوئی جاتی تھی اور تماکو کا رواج بھی بہت وسیع ہو گیا تھا۔ روئی، سن، اور نیل خاص صنعتی پیداواریں تھیں۔ ہر کاشتکار کے پاس بہت مختصر سا رقبہ ہوا کرتا تھا جسے وہ خود اپنی محنت اور اپنے خاندان کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ کھیت جوتنے کا کام بیلوں سے لیا جاتا تھا اور چونکہ کوئی مرکزی سرمایہ کاشتکاری کا نہ تھا اس لئے ہر کاشتکار مجبور ہوتا تھا کہ وہ ہر فصل پر جلد سے جلد اپنی پیداوار کو فروخت کردے۔ صنعتیں مختلف و متعدد تھیں جن میں پارچہ بافی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سوتی کپڑے عام طور پر ہر جگہ طیار کئے جاتے تھے اور زیادہ تر ملک ہی کے اندر استعمال ہوتے تھے، ساحلی مقامات سے البتہ کپڑا باہر بھی جاتا تھا، لیکن ململ اور چھپے ہوئے کپڑے زیادہ تر خشکی کے راستہ سے باہر جاتے تھے۔

جن بازاروں میں اس کپڑے کی مانگ تھی وہ بہت قدامت پرست تھے اور سوائے خاص نمونوں کے کوئی اور کپڑا استعمال نہ کرتے تھے اس لئے ایجاد و اختراع کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

ریشمی کپڑا زیادہ تر بنگال و گجرات میں طیار ہوتا تھا اور صرف مقامی ضروریات کے لحاظ سے، جوٹ اور سن بھی صرف مقامی اہمیت رکھتے تھے لیکن سترھویں صدی میں سن کے بورے وغیرہ باہر جانے لگے تھے۔

ملک کے ان حصوں میں جہاں امن وامان رہتا تھا تجارت خاصی ترقی پر تھی اور ایک منظم صورت رکھتی تھی۔ ہنڈیوں کے ذریعہ سے لین دین جاری تھا نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بعض بیرونی ممالک میں بھی۔

باہر سے جو سوداگر آتے تھے وہ مال کی زیادہ مقدار لینا ناپسند نہ کرتے تھے بلکہ اپنے روپیہ کو دس بارہ فیصدی سود پر تقسیم کر دیتے تھے۔ بیرون ملک کے لئے خشکی کے دو راستے براہ کابل و قندھار مقرر تھے، تبت کا راستہ بھی کھلا ہوا تھا لیکن اس سے بہت کم فایدہ اٹھایا جاتا تھا۔۔ بحری راستہ کے ذریعہ سے گجرات کا تعلق بحر احمر، خلیج فارس، مشرقی افریقہ، سماترا اور ملاکا وغیرہ سے بھی تھا۔ سندھ کا تجارتی تعلق ایران سے تھا لیکن زیادہ وسیع پیمانہ پر نہیں۔ بنگال کا تجارتی تعلق زیادہ جنوبی ہند، برما اور سیام سے تھا۔

سولھویں صدی میں تمام بحری راستوں پر پرتگالیوں کا اقتدار قایم تھا جو زیادہ تر ساحل کارومنڈل

سے (جہاں مغلوں کا قبضہ نہ تھا) بحر احمر اور مغربی افریقہ کے لئے پہنچا لیجاتے تھے۔ جب ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے اور ۱۶۱۸ء میں ڈچ نے اپنی فیکٹریاں سورت میں قائم کیں تو چھینٹ اور ململ مغربی یورپ کو زیادہ مقدار میں جانے لگا۔ سترھویں صدی کے وسط میں [illegible] کی تجارت [illegible] گئی کیونکہ ہندوستان وسط ایشیا کا مقابلہ نہ کر سکا اور ادھر ۱۶۳۰ء کے قحط کی وجہ سے [illegible] کی آبادی کم ہو گئی جس سے چھینٹ کی تجارت مشرقی ساحل کی طرف زیادہ وسیع ہو گئی۔ اسی صدی میں جب انگریزوں اور ڈچ نے اپنی فیکٹریاں ہوگلی پر قائم کیں تو ریشم، شورہ، ململ اور خصوصاً چھینٹ کی تجارت یہاں زیادہ بڑھ گئی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مغربی ذوق لباس کے متعلق [illegible] ہو گیا اور ململ اور چھینٹ کی مانگ بہت بڑھ گئی جسے بنگال اور مدراس سے پورا [illegible] جاتا تھا۔ [illegible] ہندوستان کے تجارتی تعلقات کا مخصوص نقطۂ نظر سونے چاندی کی [illegible] ہندوستانی [illegible] وہ چیزیں باہر کی نہ خریدتے تھے بلکہ زیادہ تر اس کے خواہشمند رہتے تھے کہ وہ اپنی چیزیں فروخت کر کے نقد حاصل کریں۔ پھر چونکہ مغربی یورپ ہندوستان کی اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا تھا اس لئے تجارتی کمپنیاں اس کوشش میں رہتی تھیں کہ دوسرے ملکوں سے چاندی سونا کھینچ کر ہندوستان لائیں [illegible] سے چاندی اور جاپان سے سونا فراہم کر کے یہاں لایا جاتا تھا۔ اندرون ملک کے ذرائع نقل و حرکت بہت ناکافی و ناقص تھے۔ ہر چند اٹک، گنگا، جمنا اور بنگال کے دریاؤں کے ذریعہ سے مال بکثرت ادھر ادھر جاتا تھا لیکن اتنے وسیع ملک کے لئے یہ محدود وسائل کہاں تک کام دے سکتے تھے۔ مجبوراً خشکی کے راستے اختیار کرنے پڑتے تھے جو ناہموار اور غیر محفوظ اور تکلیف دہ تھے۔ سڑکیں بہت کم تعمیر ہوئی تھیں اور جو تھیں بھی تو بالکل خام۔ اکثر تو صرف پگڈنڈی کی صورت میں تھیں اور سوائے اس علامت کے کہ اس کے دو رویہ درختوں کی قطار ہوتی تھی، کوئی اور نشان اسکے گزرگاہ ہونے کا نہ پایا جاتا تھا۔ راستے میں جا بجا کاروانسرائے بنی ہوئی تھیں اور تجارتی قافلے یہیں قیام کرتے تھے۔ بار برداری کے لئے [illegible] بیل اور اونٹ سے کام لیا جاتا تھا۔ آدمی گھوڑوں، پالکیوں یا چھوٹے بیلوں کی گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ ڈاک کا انتظام اچھا تھا لیکن صرف سرکاری مراسلت کے لئے عام لوگوں کو خود اپنے ذاتی ہرکارے رکھنا پڑتے تھے۔ معاشرت کا معیار عام طور پر بہت ادنیٰ تھا اور سوائے ان امراء کے جو ضرورت سے زیادہ پاتے تھے اور اسی طرح اسے خرچ کرتے تھے تمام آبادی افلاس و تنگدستی میں مبتلا تھی۔ سلطنت کی خوشحالی کا انحصار تین چیزوں پر تھا۔ ایک بارش کا وقت پر ہونا، دوسرے امن و سکون کا قائم رہنا اور تیسرے انتظام مالگزاری۔ پھر چونکہ بارش کی طرف سے اکثر شکایت رہتی تھی اور

لہ انگریزی میں اسے CALICO کہتے ہیں کیونکہ یہ کپڑا زیادہ تر کالی کٹ میں تیار ہوتا تھا۔

ذرایع نقل وحرکت عام نہ ہونے کی وجہ سے قحط زدہ مقامات کو دوسری جگہ سے غلہ فراہم نہ ہو سکتا تھا اس لئے لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے تھے اور کوئی مستقل آبادی نہ ہونے پاتی تھی۔ اگر بارش اچھی ہو جاتی تھی اور پیداوار کافی ہوتی تھی تو بھی خوشحالی کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ بڑی منڈیاں موجود نہ تھیں جہاں زیادہ پیداوار کی کھپت ہو سکے، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کاشتکار مفلس اور نادار رہتے تھے۔۔۔ ملکی و مالی نظام کی صورت یہ تھی کہ بادشاہ ان دونوں کا مالک و مختار سمجھا جاتا تھا اور اس کے چار مددگار ہوا کرتے تھے۔ ایک وکیل (وزیر اعظم) دوسرا وزیر (حاکم مال)، تیسرا بخشی اور چوتھا صدر۔ وکیل کی جگہ ہمیشہ نہیں رہتی تھی اور اس کی خدمات بھی وزیر کے سپرد ہوتی تھیں، بخشی کا حال آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ صدر کا کام شریعت کا نفاذ تھا۔

جسوقت مغلوں کی حکومت شمالی ہند میں قایم ہوئی تو یہاں کا نظام ابتدائی تھا، ملک کے مختلف حصے مختلف سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور وہی سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اکبر نے سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا جہاں کا ذمہ دار حاکم سپہ سالار یا صوبہ دار کہلاتا تھا۔ لیکن ۱۵۹۴ء کے بعد وصولی مالگذاری کا کام اس سے علحدہ کر لیا گیا۔ علاوہ ان صوبہ داروں کے خاص خاص مقامات پر فوجدار بھی مقرر کئے گئے جو قلعہ بند مقامات میں قلعہ دار کی حیثیت رکھتے تھے۔۔۔ شہر کا افسر کوتوال کہلاتا تھا جو پولیس، عدالت، میونسپلٹی اور محکمۂ احتساب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ پولیس اس وقت نہ پائی جاتی تھی بلکہ اس کا کام فوج سے لیا جاتا تھا۔۔۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سلطنت کے ہر حصہ میں (خاصکر ان مقامات میں جہاں کی فوجداری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی) یہی نظام قایم تھا تاہم قیام امن ہر افسر کا فرض تھا اور سپہ سالار و فوجدار اس کے ذمہ دار قرار دئے جاتے تھے۔

مالی انتظام یا دیوانی وزیر کے سپرد تھی اور وہ ذمہ دار تھا کہ دربار یا "حضور" سے جو احکام صادر ہوں انکی تعمیل کرے۔ ہر چند کچھ آمدنی کروڑگیری، نمک، ٹکسال، نذرانہ وغیرہ سے بھی ہوتی تھی لیکن بڑا ذریعہ آمدنی کا لگان ہی تھا۔۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہر کاشتکار اپنی پیداوار کا خاص حصہ جسے فرمانروا مقرر کر دیتا تھا لگان کی صورت سے حکومت کو دیدیا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اس قاعدہ کو بدستور جاری رکھا اور زمین کی ملکیت بدستور کاشتکاروں کی قایم رہی۔۔۔ مغلوں کے زمانہ میں زمین کی دو قسمیں ہو گئیں۔ خالصہ یا دیوانی اور جاگیر۔ خاص خاص امراء کی جاگیریں خراج سے مستثنیٰ تھیں لیکن ایک خاص رقم خزانۂ شاہی میں جمع کرنا ان کا فرض تھا، چھوٹے چھوٹے امراء کی جاگیروں کی مالگذاری متعین تھی جن میں سے ایک حصہ وہ اپنے لئے مخصوص رکھتے تھے اور باقی حکومت کے خزانہ میں داخل کر دیتے تھے۔۔۔ ملک کے وہ حصے جو براہ راست حکومت کے زیر انتظام تھے انھیں خالصہ کہتے تھے یہ حصے خزانۂ شاہی میں نقد داخل کرنے کے لئے مخصوص تھے اور وزیر کا عملہ اس کا انتظام کرتا تھا۔ اول اول یہ خدمت صوبہ دار کے سپرد تھی لیکن ۱۵۹۶ء میں ہر صوبہ میں ایک دیوان مقرر کیا گیا جو براہ راست وزارت سے واسطہ رکھتا تھا اور

اسی وقت سے دیوانی اور فوجداری علیحدہ علیحدہ بن گئی۔ وہ حصے جو خزانۂ شاہی سے وابستہ تھے جاگیروں میں منقسم تھے یعنی ہر وہ افسر جس کا کوئی مشاہرہ متعین تھا اسے اتنی ہی آمدنی کی جاگیر عطا کر دی جاتی تھی۔ ملک کا اکثر حصہ انھیں جاگیروں میں تقسیم تھا اور خالصہ یا دیوانی کے لئے ملک کا صرف چھٹا یا ساتواں حصہ رہ جاتا تھا۔ اکبر نے کاشتکار کی پیداوار کا تہائی حصہ بطور لگان کے مقرر کیا تھا لیکن سترھویں صدی میں یہ نصف حصے تک پہونچ گیا تھا۔ اس کی تعیین کے تین طریقے تھے:۔ (غلہ بخشی۔ پیمائشی۔ نسق) غلہ بخشی کی صورت میں فصل یا خرمن دیکھ کر ایک نظری تخمینہ پیداوار کا کر لیا جاتا تھا اور اس کے تہائی کی قیمت لگا کر نقد وصول کر لیا جاتا تھا۔ پیمائشی کی صورت میں ایک مقررہ رقم رقبہ کاشت کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی۔ ان دونوں صورتوں میں لگان عام طور پر نقد ہی وصول کیا جاتا تھا لیکن ملک کے ان حصوں میں جہاں کرنسی کا رواج زیادہ نہ تھا غلہ کی صورت میں بھی لے لیا جاتا تھا۔ نسق کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پورے گاؤں کی جمعبندی قائم کر کے مقدم یا مکھیا سے وصول کر لی جاتی تھی۔ یہ امر کہ ان تینوں طریقوں میں کونسا طریقہ وصولی لگان کا کس جگہ عمل میں لایا جائے صرف بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے، نسق کا طریقہ رائج تھا اور بابر نے بھی اسی کو قائم رکھا۔ شیر شاہ نے پیمائشی طریقہ رائج کیا اور اوائل اوائل اکبر نے بھی اسی کو پسند کیا۔ ہر رقبہ کی مالگزاری اسکی پیداوار کا اندازہ کر کے ایک تہائی مقرر کر دی جاتی تھی کہیں نقد وصول کی جاتی تھی اور کہیں غلہ کی صورت میں، بعد کو اسکی دقتیں محسوس کر کے نقد مالگزاری (۴۰ دام فی روپیہ کے حساب سے) مقرر کر دی گئی۔ مختلف زمینوں کی مختلف پیداوار کے لحاظ سے نرخ بھی چیزوں کا مقرر کیا گیا اور اکبر کے دور حکومت میں اسی کی پابندی رہی۔ لیکن جہانگیر کے زمانہ میں اس کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا اور نسق کی صورت اختیار کی گئی (جو آج تک جاری ہے) البتہ وہ رقبے جو زیادہ اجاڑ تھے اور جہاں کے مقدم وصولی کی ذمہ داری نہ لے سکتے تھے وہاں غلہ بخشی یا پیمائشی طریقہ سے وصولی ہوتی تھی۔ شہروں میں عدالت و انصاف کا کام قاضی کے سپرد ہوتا تھا اور مفصلات میں یہ خدمت عمال کے سپرد تھی۔ جھگڑوں کی تحقیقات سرسری اور سزا سخت ہوتی تھی لیکن اسلامی شریعت کے مطابق کبھی سزائیں نہیں دی گئیں۔ مقامی افسران مقامی انتظام کے لئے ٹیکس کے ذریعہ سے بھی رقمیں وصول کیا کرتے تھے، اندرونی و بیرونی تجارت پر بھی زبردست ڈیوٹی لگائی جاتی تھی، اور ہر چند اکبر اور اورنگ زیب دونوں نے اسکی سخت ممانعت کر دی تھی لیکن یہ دستور کسی نہ کسی صورت سے علی حالہ قائم رہا۔

ٹکسال پر خاص توجہ کی جاتی تھی کیونکہ اسکی آمدنی بادشاہ کو ملتی تھی۔ سکے سونے، چاندی اور تانبے کے ڈھالے جاتے تھے لیکن چونکہ ان کی قیمت دھات ہونے کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی اس لئے مبادلہ کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ خاص سکہ رائج الوقت چاندی کا روپیہ تھا جس میں ۱۸۰ گرین خالص چاندی ہوتی تھی۔ تانبہ کا سکہ دام کہلاتا تھا جس کا وزن ۳۲۴ گرین کا ہوتا تھا انکے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے سکے رائج تھے — اوزان میں من کا رواج تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حیثیت رکھتا تھا۔ جنوبی ہند میں ۲۵ پونڈ وزن کا ہوتا تھا اور گجرات میں ۳۳ پونڈ کا (جو بعد کو سنہ ۱۶۳۶ء میں ۳۷ پونڈ کا کر دیا گیا) شمالی ہند میں اکبر کی تخت نشینی کے وقت اس کا وزن ۵۲ پونڈ کا تھا لیکن اکبر نے اسے ۵۵ پونڈ کا کر دیا، جہانگیر نے ۶۶ پونڈ اور شاہجہاں نے ۷۴ پونڈ۔ مغربی بنگال میں اس کا وزن ۴۷ پونڈ تھا اور مشرقی بنگال میں ۴۹ پونڈ۔ ناپ میں گز کا رواج تھا جو اکبر کے زمانہ میں ۳۳ انچ کا تھا اور بعد کو ۴۰ انچ کر دیا گیا۔ جنوب میں ذراع یا ہاتھ کی پیمائش رائج تھی جس کی لمبائی ۱۸ انچ ہوتی تھی، لیکن گجرات میں ذراع ۲۶ انچ کا تھا اور بنگال میں ۲۷ انچ کا۔

محیرات

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ کی فراوانی دولت کا کیا عالم ہے؟ وہاں ۴۹۵ انسان ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کی سالانہ آمدنی ایک ملین ڈالر سے کم نہیں (یعنی تقریباً ۳۳ لاکھ روپیہ)۔ ۱۰۶ انسان ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک ۱½ ملین ڈالر سالانہ کماتا ہے، ۲۲ وہ ہیں جن کی آمدنی ۲ ملین ڈالر سالانہ ہے، ۲۲ ایسے ہیں جن کی آمدنی تقریباً ۳ ملین ڈالر سالانہ ہے، ۲۳ وہ ہیں جن کی آمدنی چار اور پانچ ملین کے درمیان ہے اور ۲۰ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۵ ملین سے زیادہ یعنی تقریباً پونے دو کروڑ روپیہ سالانہ۔

سنہ ۴۰ء میں ٹیکس سے جو آمدنی امریکہ کو ہوئی اس کی مجموعی مقدار ۳۳۵۵۱۴ ملین ڈالر تھی۔ لیکن باوجود اس فراوانی دولت کے، باوجود اس انبار زر و سیم کے وہاں ایک کروڑ سے زیادہ انسان ایسے بھی بستے ہیں جن کو ایک ٹکڑا روٹی کا بھی اطمینان سے کھانے کو نصیب نہیں ہوتا؟

یہ ہے تقسیم زر و سیم کا وہ عدم توازن جس نے دنیا کے امن و سکون کو تہ و بالا کر رکھا ہے اور جو اشتراکیت کے خونخوار دیوتا کو شادانہ بلا بلا کر جگا رہا ہے۔

آفتاب شیشے میں

آپ نے اکثر ڈاکٹروں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ رات کو لکھنا پڑھنا بصارت کے لئے نقصان رساں ہے لیکن ان سے سوال کیجئے کہ کیوں، تو وہ اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکیں گے۔

چکاگو کے ایک ڈاکٹر نے حال ہی میں اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ مصنوعی روشنی چونکہ فوق البنفسجی (ULTRA VIOLET) شعاعوں سے خالی ہوتی ہے، اس لئے وہ بینائی کو خراب کرتی ہے۔ اور ضرورت ہے کہ کوئی ایسی روشنی پیدا کی جائے جو اس نقص سے خالی ہو۔ اسی سلسلہ میں اس نے چکاگو کے کسی ماہر برقیات کی ایک جدید ترین اختراع کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جس کے ذریعہ سے آفتاب کی روشنی کو شیشوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور جس سے رات دن ہر وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

جس وقت اس سربند شیشہ پر ایک خاص قسم کی کہربائی شعاع ڈالی جاتی ہے تو اس کے اندر سے

بالکل وہی روشنی پیدا ہوتی ہے جو آفتاب کی ہے، اور چونکہ جسم انسانی کو بقائے صحت و نشاط کے لئے نور آفتاب کی سخت ضرورت ہے اس لئے امید کیجاتی ہے کہ یہ ایجاد ڈاکٹری کی دنیا میں بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اسکے ذریعہ سے ہر موسم میں ہر وقت اور ہر جگہ آفتاب کی صحت بخش روشنی حاصل ہوسکے گی اور بہت سے ایسے مریض جو نور آفتاب سے پورا فایدہ نہیں اُٹھا سکتے اس سے مستفید ہوسکیں گے۔

مکھیوں کی پرورشگاہ

امریکہ کا ایک صوبہ ہے جس کا نام ورجینیا ہے۔ اس کے ایک قصبہ کے جوار میں جسے ہرن کہتے ہیں تین سو ایکڑ کا مزرعہ ہے جو ایک شخص موسلی نامی کے تصرف میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا کا عجیب و غریب مزرعہ ہے۔

اس کا مالک پیداوار کاشت حاصل کرنے کے بجائے مکھیوں کی پرورش کے لئے وقف کرتا ہے جہاں بالکل جدید علمی طریقوں سے ان کی پیدایش و نشوونما کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یعنی ساری دنیا تو اس فکر میں ہے کہ مکھیاں کسی طرح فنا کی جائیں اور یہ شخص ان کی افزایش و نشوونما میں مصروف رہتا ہے۔

اس کا مقصود اس سے صرف تجارتی فایدہ ہے کیونکہ مچھلی کی محبوب ترین غذا مکھی ہے اور یہ مچھلی کے شکاریوں کے ہاتھ انھیں فروخت کرتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص صرف مکھیوں کی تجارت سے بڑا دولتمند ہوگیا ہے۔

اٹھارہ سال میں پانچ ہزار کتابیں

امریکہ کے صوبۂ نبراسکا میں ایک نوجوان شوبرٹ اڈورڈ نامے پایا جاتا ہے، جس کی عمر ۱۸ سال کی ہے۔ یہ اپنی اسی قلیل عمر میں پانچ ہزار کتابوں کا نہ صرف مطالعہ بلکہ ان پر ماہرانہ بحث و تمحیص کرچکا ہے۔

اس کی قوت حافظہ کا یہ عالم ہے کہ ایکبار جس کتاب کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دماغ میں محفوظ رہجاتی ہے اور نکتہ رسی کی یہ کیفیت ہے کہ جو تصنیف اسکی نگاہ سے گزر جاتی ہے اس کے متعلق ماہرانہ رائے قائم کرنے میں اس کو دیر ہی نہیں لگتی۔ علاوہ ادبیات انگریزی کے وہ علوم فلسفہ کا بھی ماہر ہے۔

جاپانی معاشرت کی بعض خصوصیات

جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت کثرت سے مینھ برستا ہے یعنی سال میں تقریباً ۲۰۰ دن بارش کے سمجھنے چاہئے اور اسی لئے وہاں رطوبت بہت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ درجۂ حرارت جب بہت کافی بڑھجاتا ہے اسوقت بھی نمی دور نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ سردی بھی وہاں بہت شدید ہوتی ہے اور چونکہ مکان بہت ہوادار ہوتے ہیں اس لئے ان میں ہر وقت رطوبت پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت وہاں گنٹھیا وغیرہ کے امراض بکثرت پائے جانا چاہئے، لیکن غالباً

یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہاں کے لوگ ان امراض سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر جاپانی امیر ہو یا غریب اس کے لئے کم از کم ایک بار روزانہ گرم پانی سے نہا لینا ضروری ہے اور پانی بھی اتنا گرم جسکی حرارت ۴۵ درجہ سے کم نہ ہو۔ جاپانی جس وقت حمام سے نکلتا ہے تو اس کی جلد سرخ ہوتی ہے اور اسکے بعد گھنٹوں تک جسم کی حرارت ۳۸ درجہ تک قایم رہتی ہے۔

جاپانیوں کے بچے بھی بہت کم مرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ائیں ان کو خود اپنا دودھ پلاتی ہیں اور ۲ - ۳ سال کی عمر تک پلاتی رہتی ہیں ان کے بچوں کے لباس بھی بہت ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں جس سے ان کی صحت اچھی رہتی ہے اور جسم تک ہوا آسانی سے پہونچتی ہے۔

دولت کے چوچلے

فرانس کی ایک خاتون ہیں جن کا نام لیلی لاکلوش ہے۔ یہ بہت خوبصورت ہیں بے انتہا دولتمند ہیں اور اسی کے ساتھ حد درجہ نفاست پسند۔ مختلف قسم کے ریاضتی کھیل ایجاد کرنے میں بھی ان کو خاص شہرت حاصل ہے اور لباس کے اہتمام میں تو دنیا کے اندر اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

وہ کوئی کپڑا بازار سے نہیں خریدتیں بلکہ اس کو خود طیار کراتی ہیں چنانچہ اپنے کپڑوں کے لئے انھوں نے چینی ہند میں بہت سے کارخانے صرف ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لئے قائم کر رکھے ہیں۔ ان کیڑوں سے ریشم حاصل کر کے ان کارخانوں کو بھیجا جاتا ہے جو انھوں نے ریشمی کپڑا طیار کرنے کے لئے فرانس میں قایم کر رکھے ہیں۔ اونی لباس کی ضرورت کی یہ صورت ہے کہ کالڈینا میں ان کی لاکھوں بھیڑیں پائی جاتی ہیں جہاں کا اون نہایت احتیاط سے کاٹ کر اونی کپڑا بننے والوں کے پاس بھیجا جاتا ہے۔

حال ہی میں ایک لباس عجیب و غریب کپڑے کا ان کے جسم پر دیکھا گیا۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ ڈگاسکر میں ایک خاص قسم کا درخت ہے جس کی چھال سے یہ کپڑا صرف انھیں کے لئے طیار کیا جاتا ہے۔

۹۲۰۵۵ ملین سگار

ممالک متحدہ امریکہ میں سالانہ جتنے سگار بنائے جاتے ہیں ان کا اندازہ بجائے تعداد کے وزن سے کرنا زیادہ مناسب ہے یعنی اگر ہم یوں ظاہر کریں کہ وہاں ہر سال ۹۲۰۵۵ ملین یعنی تقریباً ۹۲۰۵۵۰۰۰۰۰ من وزن کے سگار طیار ہوتے ہیں تو زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائیگا۔

پھر لطف یہ ہے کہ جتنے سگار طیار ہوتے ہیں وہ سب ملک ہی کے اندر ختم ہوجاتے ہیں یعنی فی کس سالانہ اوسط ہزار سگار پڑتا ہے — اتنی بڑی مقدار میں سگار طیار کرنے کے لئے وہاں سیکڑوں کارخانے موجود ہیں جہاں لاکھوں آدمی روزانہ آٹھ گھنٹے لگاتار محنت کرتے رہتے ہیں — اس کی طیاری کا اوسط فی سکنڈ ۹۲۰۴۱ یا فی منٹ ۵۵۲۰۸۴۸ سیگار ہوتا ہے۔

جاپان کیا چاہتا ہے اور کیوں

جاپان اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر "جگہ" چاہتا ہے۔ نہ صرف چاہتا ہے بلکہ اس کے حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے جس سے اب مغرب و مشرق کا ہر ملک واقف ہو چکا ہے۔ جاپان کے تین مقصد ہیں:-

۱۔ ایشیا کی قوموں میں وہ سب سے زیادہ نمایاں شمار کیا جائے۔

۲۔ سیاسی حیثیت سے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت کے برابر قرار دیا جائے۔

۳۔ جاپان والوں کے لئے غذا اور خام مواد فراہم کیا جائے، کیونکہ اب سے ۵۰ سال قبل جتنی پیداوار اہل جاپان کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی اب وہ چوتھائی جاپان کے لئے بھی ناکافی ہے۔

گزشتہ ۶۰ سال کے اندر جاپان کی آبادی تین کرور بڑھ گئی ہے یعنی تقریباً ساڑھے چھ کرور ہو گئی ہے۔ ان اعداد میں خالص جاپانی شامل ہیں ورنہ اگر فارموسا، کوریا اور سکھالین کو بھی شامل کر لیا جائے جو جاپان کی سلطنت میں شامل ہیں تو آبادی ۹ کرور تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر سوال صرف یہی نہیں کہ انکی آبادی دو چند ہو گئی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ موجودہ تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے ان کی اقتصادی ضروریات کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں جن کا پورا ہونا لازم ہے۔ اب اسی کے ساتھ آپ اس کے ذرایع آمدنی کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنی غذا بلکہ اپنی مصنوعات کے لئے بھی محتاج ہے دوسرے ممالک کا کیونکہ خود اس کے ملک میں خام پیداوار اتنی نہیں ہوتی کہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ یہی وہ چیز تھی جس نے اسے منچوریا پر قابض ہونے کے لئے مجبور کیا اور اب منچوکو کی طرف مایل کیا ہے۔ منچوکو پر اسکی سیادت قایم ہونے سے اسکی دشواریاں بہت کم ہو جائیں گی کیونکہ یہاں کوئلہ اور لوہے کی معدنیں بکثرت ہیں اور زمین زرخیز ہونے کی وجہ سے غلہ کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے، جاپانی قوم بہت زیادہ محنتی ہے اور صنعت کی طرف اس کا میلان بالکل فطری ہے، چنانچہ گزشتہ ۶۰ سال کے اندر انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت وہاں ۶۰ ہزار سے زیادہ فیکٹریاں پائی جاتی ہیں جن میں ۲۰ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں جو مال طیار ہوتا ہے اسکی نصف سے زیادہ کھپت چین و امریکہ میں ہے اور باقی مال دوسرے ملکوں میں فروخت ہو جاتا ہے۔ جاپانیوں نے شروع سے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ چیزیں ارزاں طیار کریں اور ارزاں بازار انکے لئے پیدا کریں چنانچہ اول اول انھوں نے اپنے ملک کے آس پاس ایسے بازار پیدا کئے اور رفتہ رفتہ ان کو بڑھانا شروع کیا یہانتک کہ اب دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ جاپانی مال بہت سستا ہوتا ہے اور بازار اسی سے پٹے پڑے ہیں۔ حکومت و سلطنت کے لحاظ سے جو ترقی جاپان نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر کی ہے وہ بھی حیرتناک ہے۔ اول اول اسکے پاس صرف چار جزیرے تھے جنکا رقبہ ۱۴۸۰۰۰ مربع میل تھا لیکن اب منچوریا کو شامل کر کے حکومت کا رقبہ ۶۰۰۰۰۰ مربع میل تک پہونچ گیا ہے یعنی سکھالین سے آسٹریلیا تک وسیع ہو گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اس میں اور کتنی وسعت ہونا ہے۔

اختراعات

"کارِ زمیں" سے ہٹ کر "آسماں پروازی" کو کسی زمانہ میں امرِ محال سمجھا جاتا تھا، لیکن اب علومِ جدیدہ نے آسمان و زمین سب کو ایک کرکے رکھدیا ہے یعنی اُدھر اگر آسمان میں تھگلی لگانا مشکل نہیں رہا تو دوسری طرف پاتال کی گہرائیاں بھی نگاہوں کے سامنے آرہی ہیں۔

امریکہ کے ایک سائنس داں نے حال ہی میں ایک بندوق ایجاد کی ہے، جو سمندر کی تہ میں زمین کے اندر بہت دور تک چلی جاتی ہے اور وہاں سے مادی چیزوں کو اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اس ایجاد سے قبل سمندر کی تہ کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ صرف اوپر ہی سے کنکر پتھر ہاتھ آتے تھے، لیکن اس آلہ کی مدد سے زمین کے اندر تین میل تک کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

جس طرح زمین کی بیرونی جلد میں چٹانوں کی تہوں سے اُن تغیرات کا پتہ چلتا ہے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوا ہے، اسی طرح سمندر کی تہ میں جو زمین ہے اس کے اندر بھی کیچڑ، مٹی اور چٹانوں کی تہیں پائی جاتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایجاد علماء طبقات الارض کے لئے تحقیقات کا بالکل نیا راستہ کھولدینے والی ہے اور ہم کو اپنی "مادرِ زمین" کے متعلق بہت جلد ایسی نئی نئی باتیں معلوم ہونگی جو اس سے قبل دریافت نہ ہو سکی تھیں۔

امریکہ میں ایک شخص نے خاص قسم کا برقی آلہ ایجاد کیا ہے جو خود بخود نقب زنوں کی آمد کی اطلاع پولیس کو دیدیتا ہے۔ یہ آلہ معمولی ریڈیو سٹ کے برابر ہوتا ہے اور اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ نقب زنوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنا کام کرجاتا ہے۔

یہ آلہ جس اُصول پر طیار کیا گیا ہے اس کا تعلق زیادہ تر روشنی اور بجلی سے ہے۔ جسوقت کوئی چور دروازہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کا جسم روشنی اور آلہ کے درمیان حایل ہو کر ایک خاص قسم کی برقی رو پیدا کرنیکا باعث ہو جاتا ہے اور فوراً تھانہ کی گھنٹی بجنے لگتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چور کسی مکان میں داخل ہو رہا ہے۔

یہ آلے اسٹیشنوں پر بھی لگائے جا رہے ہیں تاکہ اندر باہر آنے جانے والوں کو دروازہ کھولنے یا بند کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ جب کوئی آدمی آتا ہے تو اس کے سایہ سے آلہ میں برقی رو پیدا ہوتی ہے جو دروازوں کو کھولتی بند کرتی رہتی ہے۔

فرانس کے ایک شخص نے خاص قسم کا برقی قفل ایجاد کیا ہے، جس پر ٹیلی فون کے ڈایل کی طرح مختلف نمبر لگے ہوئے ہیں۔ جب یہ نمبر ٹھیک ملا دئے جاتے ہیں تو دروازہ اپنے آپ کھل جاتا ہے ورنہ بدستور بند رہتا ہے اور گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے توڑنے کی کوشش کرے تو بھی الارم بجنے لگتا ہے اور نہ صرف گھر والوں بلکہ پولیس کو بھی خبر ہو جاتی ہے۔

امریکہ کے ڈاکٹر مسٹر شنڈلر نے امراض معدہ کی تشخیص کو اپنے جدید آلہ سے جس کا نام انھوں نے "GESTROSCOPE" (معدہ بین) رکھا ہے، بہت آسان بنا دیا ہے۔ یہ چھنگلیا کے برابر ایک لچیلا ٹیوب ہے جس میں ۴۸ محدب شیشے (LENSES) لگے ہوئے ہیں۔ جس وقت بجلی اس کے اندر دوڑائی جاتی ہو تو معدہ کا ہر حصہ نظر آنے لگتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ کیا خرابی پائی جاتی ہے۔

آپ نے سینما میں بعض فلم SLOW MOTION کے دیکھے ہوں گے جن میں متحرک چیزوں کی حرکت نہایت آہستہ آہستہ دکھائی دیتی ہے۔ یوں اگر ہمارے سامنے گھوڑا دوڑ رہا ہے تو ہم صرف یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں نہایت جلدی جلدی آگے پیچھے پڑ رہے ہیں اور ہم کو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ اس کے قدم کیونکر اٹھتے ہیں اور آگے پیچھے جانے میں کن کن اعصاب میں کیا کیا حرکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان فلموں کے ذریعہ سے ہم یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔

معمولی فلم جس رفتار سے طیار کئے جاتے ہیں اس میں فی سکنڈ ۲۴ تصویریں لیجاتی ہیں لیکن SLOW MOTION فلم کی تصویریں ۱۹۲ فی سکنڈ کے حساب سے لی جاتی ہیں۔ لیکن حال ہی میں ایک اور کیمرا طیار کیا گیا ہے جو ایک سکنڈ میں دو ہزار تصویریں لیگا جو پلک جھپکانے کے وقفہ کو بھی کئی منٹ کی صورت میں پیش کر سکے گا، اور اس کے ذریعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ بندوق کے اندر سے گولی کیونکر نکلتی ہے اور نشانہ تک پہونچتے پہونچتے اس میں کیا تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔

تاریک ستارہ

لے اُڑا سوئے فلک خضرِ فلک پیما مجھے — خوشہ پروین نظر آنے لگی دنیا مجھے
ایک جھرمٹ تھا ستاروں کا نظر کے سامنے — یا پڑے تھے آئینے آئینہ گر کے سامنے
ہر ستارے کو یہ دعوے تھا کہ روشن تر ہوں میں — قطب ہوں، تھا، عالم کے لئے رہبر ہوں میں
مجھ سے رہبر نے کہا اے مشتِ خاکِ بے ثبات — دیکھ لیں یہ ہے تری دنیا کی ساری کائنات

روشنی سب نور آزادی کی ارزانی سے ہے
ان ستاروں میں چمک قوموں کی پیشانی سے ہے
گوشہ گوشہ دل جلوں کے نور سے معمور ہے
ہر چراغِ بزمِ آزادی چراغِ طور ہے،

ان ستاروں میں مگر اک خطۂ تاریک تھا، — دوسرے تھے دور مجھ سے یہ ذرا نزدیک تھا
یہ زمیں کیا تھی سراسر خطۂ ظلمات تھی — یا ستاروں کی بھری محفل پہ چھائی رات تھی
اسکو دکھلا کر کہا یہ خضر نے اے نوجواں — دیکھ یہ تیرا وطن ہے خطۂ ہندوستاں
مدتوں سے ظلمت و نکبت کا ڈیرا ہے یہاں — ظلمت داغِ غلامی سے اندھیرا ہے یہاں
دشمنِ انسانیت قوموں کا مسکن ہے یہی — جذبۂ احساس آزادی کا مدفن ہے یہی
ننگِ عالم ہے یہ خطہ اس قدر پھیلا ہوا، — دامنِ گیتی اسی کی گرد سے میلا ہوا

پانی پانی ہو رہا ہے کیوں وفورِ شرم سے
صاف کر داغِ غلامی اپنے خونِ گرم سے

قیصر (امراوتی)

غزل

مری حسرتوں کا نہ ذکر کر کہ بیانِ شوق حرام ہے
صلۂ وفا سے غرض نہیں مجھے اپنے کام سے کام ہے

مری زیست کا ہے گماں تجھے تو قریب آ کے دیکھ لے
میں ثبوتِ حاصلِ عشق ہوں مجھے اپنی زیست حرام ہے

ادھر آرزو کی بنا پڑی کہ نظامِ دہر بدل گیا
نہ وہ آسماں ہے نہ وہ زمیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

تو نظر نظر میں ہے جلوہ گر ہے نفس نفس میں بسا بھی تو مگر
مری شرحِ آرزو مختصر مرا شوق نیم تمام ہے

مجھے اپنی نسبتِ بندگی سے خیالِ حشر زدن نہیں
ترے عفو اور مرے گناہ کا ورنہ ایک مقام ہے

تمکین سرمست

غزل

اب اس کو کیا کروں میں جس قدر بھلاتا ہوں
اسی قدر وہ مجھے یاد آئے جاتے ہیں

ستم نہیں ارے ناداں کرم ہے عین کرم
کہ یاد آنے ہی والے بھلائے جاتے ہیں

کسی کی یاد بھی اپنے بس کی بات نہیں
کہ جب وہ چاہتے ہیں یاد آئے جاتے ہیں

وہ میرا صبر کہ آیا ہے اور نہ آئے گا
یہ میرے ہوش کہ بیٹھے بٹھائے جاتے ہیں

ہم اور زندگی اے تیری شان کے قرباں
مٹائے جانے کو کیا کیا بنائے جاتے ہیں

حجابِ حسن بھی کیا طرفہ پردہ ہے تمکیں
مرے خیال مجھی سے چھپائے جاتے ہیں

تمکین سرمست

غزل

جانِ حزیں کو نذرِ محبت نہ کر سکے — اتنی بھی پاسداریِ ہمت نہ کر سکے
شوقِ فزوں طلب نے کیا عمر بھر ذلیل — ہم چاہتے تھے اور قناعت نہ کر سکے
چھوٹے جو ہم قفس سے تو فطرت بدل گئی — اُڑنے کی اس کے بعد بھی ہمت نہ کر سکے
جلتے ہم آپ اور جلاتے جگر کا داغ — کچھ اہتمام اس شبِ فرقت نہ کر سکے
قربان اس بناؤ کے صدقے بگاڑ کے — وہ چاہتے تھے اور عداوت نہ کر سکے
اُس آستاں کے سجدے میں آنکھیں ہوئی ہیں بند — اظہارِ ذوق و شوقِ عبادت نہ کر سکے
پردہ بنا ہوا تھا دلِ سادگی سرشت — کچھ امتیازِ جور و عنایت نہ کر سکے

کیفی (چریاکوٹی)

غزل

ساقی کی نوازش سے گردش میں ہے پیمانہ — ہاں لغزشِ مستانہ، اک سجدۂ شکرانہ
مقصودِ محبت کا کعبہ ہے نہ بتخانہ — دھوکے میں نہ آجانا، اے ہمتِ مردانہ
تم ہی نے پکارا تھا اک دن مجھے دیوانہ — تم ہی نے سنایا تھا، مجھ کو مرا افسانہ
کچھ عکس ہیں ساقی کی مخمور نگاہوں کے — شیشہ ہے نہ بادہ ہے، مینا ہے، نہ پیمانہ
اک روز کرم کرنا، فرصت ہو تو سن لینا — اک درد بھرا قصہ، یعنی مرا افسانہ

ماہر القادری


SHAHI
REG.
BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY
Female Troubles.
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو
فہرست دواخانہ
مفت طلب فرماویں
دماغی اور اعصابی کمزوری
طبی دواخانہ



اردو شاعری

ہندی شاعری

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

جمالستان

نگارشات نیاز

شہاب کی سرگذشت

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۱۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱) | فہرست مضامین اپریل ۳۷ء | شمارہ (۴)

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری	معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	اپریل سنہ ۳۷ء	شمار (۴)

ملاحظات

تاثرات دکن

میں ۲۱ فروری سے ۵ مارچ تک حیدر آباد میں رہا۔ یہ زمانہ شہر یار دکن کی تقریبات سلور جوبلی کے لئے مخصوص تھا، جن کی غیر معمولی نوعیت پر گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں مختصراً اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اس ماہ کے نگار میں مختصراً میں اپنے ان تاثرات و توقعات کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں جو حیدر آباد کے حال و مستقبل سے متعلق ہیں۔

حیدر آباد ہندوستان ہی کی ایک ریاست ہے اور چونکہ ریاستوں کے متعلق ایک عام خیال قایم ہو چکا ہے۔ کہ وہاں سوائے بدنظمی اور بدتمیزی کے اور کچھ نہیں ہوتا اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات حیدر آباد کی نسبت بھی یہی گمان رکھتے ہوں، لیکن جن کو وہاں جانے اور حالات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ حیدر آباد کیا چیز ہے اور دوسری ریاستوں کے حالات اس پر منطبق کرنا کسقدر غلط ہے۔

قطع نظر اس سے کہ حیدر آباد کی ریاست اپنے رقبہ کے لحاظ سے بعض مغربی سلطنتوں سے بھی

زیادہ وسیع اور بہ لحاظ آبادی افغانستان و مصر سے زیادہ بڑی ہے، اس کی اہمیت زیادہ تر اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ وہ مغلیہ حکومت کی تنہا یادگار ہے اور اس لحاظ سے تمام اسلامی ہند کو ایک مرکز اجتماع پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پھر یہ حقیقت اگر ایک طرف حکومت ہند کے نزدیک مسلّم ہے تو دوسری طرف خود یہاں کے فرمانرواؤں نے بھی اس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور اسلامی تہذیب و کلچر کا معیار قایم رکھنے میں انھوں نے ہمیشہ بیش از بیش سعی سے کام لیا۔

تعلیمات اسلامی کا یہ مقصود کبھی نہیں رہا ہے کہ انسان صرف رکوع و سجود پر قناعت کر کے خاموش بیٹھ رہے یا صوم و صلوٰۃ کے ذریعہ سے توشۂ آخرت حاصل کرنے کو تنہا نصب العین قرار دیکر دنیاوی ترقیوں کی طرف سے روگردانی اختیار کر لے۔ بلکہ اسلام کا مدعا ہمیشہ حقایق کی جستجو اور نوامیس فطرت کی تلاش رہا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلے دنیاوی فوز و فلاح حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں تمام انسانی دعاؤں کا خلاصہ اس ایک آیت میں جمع کر دیا ہے:۔

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا ربنا عذاب النار"

جس میں سب سے پہلے اسی دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کی خواہش کی گئی ہے اور اس کے بعد آخرۃ یعنی ان ترقیوں کے قیام و بقا کی۔ کیونکہ ایک انسان کے لئے اس سے زیادہ عذاب جہنم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ذلت و نکبت کے ساتھ اس دنیا میں زندگی بسر کرے اور دوسروں کی محکوم ہو کر رہے۔

پھر اس رمز کو تمام فرمانروایان دکن اور خصوصیت کے ساتھ آصف جاہ سابع نے جس تکمیل کے ساتھ سمجھا ہے اس کا اندازہ صرف یوں ہو سکتا ہے کہ آپ عہدِ عثمانی پر غایرانہ نگاہ ڈالیں اور اسی کے ساتھ ان ارشادات و اقوال پر غور کریں جو وقتاً فوقتاً زبان مبارک سے ادا ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ تقریبات جوبلی کے سلسلہ میں ایک دن علماء و مشایخ کے سپاسنامہ کے لئے بھی مخصوص تھا چنانچہ وہ سپاسنامہ یا دعا نامہ پیش کیا گیا اور اس میں وہی سب کچھ تھا جس کی ایک دعا گو و دعا پیشہ طبقہ کی طرف سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یعنی اس میں شہریار دکن کی ان تمام خدمات کا ذکر ضرور تھا جن سے براہ راست یا کسی واسطہ سے کوئی نہ کوئی فایدہ اس جماعت کو بغیر کوئی کام کئے ہوئے پہونچتا رہتا ہے، لیکن ان حقایق کا کوئی ذکر نہ تھا جو بہ حیثیت ایک مدبر و سیاست داں فرمانروا کے اعلیحضرت کے پیش نظر رہتے ہیں اور جن کا تعلق غالباً مذہب سے زیادہ صرف انسانیت و اخلاق سے ہے۔ چنانچہ اعلیحضرت نے اس کو محسوس کیا اور اپنے جواب میں موجودہ گروہ علماء و مشائخ کے بیکار و مجہول ہونے کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قرآن پاک میں جن علماء کی تعریف کی گئی ہے ان میں آج کل بہت کمی محسوس کی جا رہی ہے

اور جس زمانہ میں ایسے علما پیدا ہوتے تھے وہ اب باقی نہیں رہا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آصف جاہ سابع کے نزدیک منصب شہریاری کا کیا مفہوم ہے اور اگر گزشتہ ۲۵ سال کی ترقیوں پر نظر کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰحضرت نے اپنے عمل سے کس طرح اس حقیقت کو اسے پورا کرکے دکھا دیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی دوسری نظیر اس کی دنیا میں مل سکتی ہے۔

جس طرح ہم ایک گھر کی حالت دیکھ کر اس کے مالک کے ذوق کا پتہ چلا سکتے ہیں اسی طرح ہم ایک ملک کی حالت دیکھکر اس کے فرمانروا کا حال معلوم کرسکتے ہیں۔ اگر ملک ترقی کر رہا ہے، رعایا خوشحال ہے، ذہنی ترقی کے ذرائع عام ہیں اور تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کا فرمانروا بیدار مغز اور فرائض شناس ہے ورنہ ہم اس کے خلاف حکم لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر اس بات میں نہ مجھے کہنے کی ضرورت ہے نہ آپ کو سننے کی، حیدرآباد جائیے اور دیکھئے کہ وہاں کا ایک ایک ذرہ اعلیٰحضرت کے غیر معمولی تدبر و فراست کا شاہد ہے اور وہاں کا نظم و نسق بتاتا ہے کہ یہاں کی عنان حکومت کسی نہایت ہی بلند فطرت رکھنے والے انسان کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بادشاہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ملک کی دولت کا امین سمجھے اور اہل ملک ہی پر اسکو صرف کرے، اس کا حصہ اگر کوئی ہے تو صرف یہ احساس کہ اس نے اپنے ان فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا اور ضمیر کا یہ اطمینان ہی اس کی تمام خدمات کا سب سے بہتر معاوضہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت بلند بات ہے اور جاہ و ثروت کی دنیا میں اس کا وجود مفقود، لیکن دکن اور شہریار دکن یقیناً اس سے مستثنیٰ ہے اور دکن پہونچکر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ راعی و رعایا کے حقیقی تعلقات کا معیار کیا ہونا چاہیئے، چنانچہ اعلیٰحضرت خود اپنے اس احساس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"میری کوششیں سب میری رعایا کی سود و بہبود کی خاطر صرف ہوتی ہیں اور جو کچھ دنیوی متاع مجھکو حاصل ہے وہ میری نہیں بلکہ بطور امانت میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اگر کوئی چیز درحقیقت میری ذاتی ملک ہے، وہ فقط میرا نور ایمان و جذبۂ یقینی ہے"

ظلِ ہمایونی کا یہی وہ احساس ہے جس نے تمام ملک میں ایک عام بیداری پیدا کردی ہے اور جس طرف دیکھئے آثار ترقی و حیات ابھرتے نظر آتے ہیں۔

عہد عثمانی کو ابھی صرف ۲۵ سال کا زمانہ گزرا ہے اور کسی ملک یا قوم کی ترقی کے لئے یہ زمانہ کوئی چیز نہیں، لیکن اتنی ہی قلیل مدت میں جو انقلاب سلطنت دکن کے حالات میں رونما ہوا ہے، کسی دوسرے فرمانروا کے عہد میں اس کے لئے نہ معلوم کتنی صدیاں درکار ہوتیں اور شاید پھر بھی یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

تمدن و تہذیب کے لحاظ سے ہر ملک میں تین طبقے ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ادنےٰ یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ کہلاتا ہے جس میں مزدوری پیشہ اور کاشتکار وغیرہ شامل ہیں، دوسرا متوسط طبقہ ہے جو بہ لحاظ تعلیم زیادہ ترقی یافتہ لیکن اقتصادی حیثیت سے بہت کمزور ہوتا ہے، تیسرا طبقہ امراء کا ہے جن میں تعلیم کم، بداخلاقی زیادہ ہوتی ہے اور جو سرمایہ داری کی تمرانیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی یہ تینوں طبقے موجود ہیں لیکن ان کی حالت دوسرے مقامات کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔

عام طور پر ادنےٰ طبقہ اپنے اخلاق و اطوار کے لحاظ سے حد درجہ پست ہوا کرتا ہے، کیونکہ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہوتا ہے اور مالی حالت اس کی حد درجہ سقیم ہوتی ہے، لیکن یہاں اس طبقہ کی اقتصادی حالت عام طور پر نہایت اچھی ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ فقر و فاقہ کی مصیبت سے آزاد ہے بلکہ ایک حد تک مطمئن زندگی بسر کرنے کے ذرائع اپنے پاس رکھتا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ زراعت پیشہ جماعت کے لئے تمام وہ آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں جو جدید ترین اسباب فلاحت و زراعت سے متعلق ہیں اور صرف فطرت کے رحم پر اس کو نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ ذرائع آبپاشی کی کثرت، اتحادی بنکوں کی افراط، اصول زراعت کی ترویج، مویشیوں کی حفاظت کا اہتمام اور خود مزارعین میں اصول حفظان صحت کی اشاعت، یہ وہ تمام باتیں ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے طبقۂ مزارعین کو خوشحال بنا رکھا ہے اور جن کی بدولت وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہ گیا مزدوری پیشہ طبقہ سو اس کے اطمینان کا سبب یہ ہے کہ ریاست کے مختلف شعبوں نے رفاہ عام کے کام کثرت کے ساتھ جاری کر رکھے ہیں اور یہاں سے انھیں خاطر خواہ اُجرت ملتی ہے

یہاں کا متوسط طبقہ اب سے چند سال قبل یقیناً اچھی حالت میں نہ تھا، لیکن جب سے تعلیمات کی جدید اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جامعۂ عثمانیہ وجود میں آئی ہے اسوقت سے اس جماعت میں نمایاں ترقی ہو رہی ہے اور عام طور پر بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ یہ شرف غالباً صرف سلطنت دکن ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا تقریباً آٹھواں حصہ اپنی رعایا کی تعلیم پر صرف کرتی ہے اور ملک کی جانب سے تعلیمی ترقی کے لئے ایک حکومت کے مساعی کا انتہائی معیار اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ڈھائی کروڑ روپیہ کا محصول اس غرض کو سامنے رکھ کر معاف کر دے۔

جامعۂ عثمانیہ نے دکن کے نوجوانوں میں جو احساس خود اعتمادی پیدا کر دیا ہے اور ملک کے نظم و نسق کو وہ جس انداز سے آہستہ آہستہ سنبھال رہے ہیں وہ نہایت عظیم الشان توقعات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔

تیسرا طبقہ یہاں امراء کا ہے جن میں سے اکثر ریاست کے جاگیردار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عہد عثمانی سے قبل ان کی حالت بہت سقیم تھی اور کوئی جاگیر ایسی نہ تھی جو قرض کا بار نہ رکھتی ہو، لیکن اعلحضرت نے

اپنے دور حکمرانی میں ان کی اصلاح حال کی طرف بھی خاص توجہ سے کام لیا اور تمام جاگیریں کورٹ کر کے اسوقت تک واگزاشت نہیں کیں جب تک ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہو گئی - چنانچہ اس وقت غالباً حیدر آباد ہی کا طبقۂ امراء ایسا ہے جو قرض کی مصیبت کا شکار نہیں ہے اور جسے آیندہ اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین کا پابند بنا دیا گیا ہے - پھر چونکہ فرمانروائے وقت کی زندگی کا اثر سب سے زیادہ امراء کی جماعت پر پڑتا ہے، اس لئے ان میں بھی اپنی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور عام تعلیمی و اقتصادی ترقی کا ذوق پیدا ہو گیا ہے اور جو خوشحالی ریاست کے اندر نظر آتی ہے وہی جاگیروں کے حدود میں بھی پائی جاتی ہے اور اس طرح گویا ادنیٰ طبقہ سے لیکر اعلیٰ طبقہ تک سب کے سب ایک ہی منزل کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں اور ان سب کی راہنما وہی آصف جاہ سابع کی ذات گرامی ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصود نفس کشی اور جس کے آئین حکمرانی کا تنہا نصب العین دوسروں کی خدمت ہے -

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتوں کی بدنظمی کا سبب اکثر بیشتر فرمانروا کی ذات نہیں ہوتی بلکہ جماعت عمال ہوا کرتی ہے - یقیناً بادشاہ اپنے وسیع ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہونچکر ہر ہر فرد کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ تنہا ہر ہر شعبہ کی عاملانہ ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے - اس لئے اگر فرمانروا اچھا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے کارکن بُرے ہیں تو بدنظمی بدستور قایم رہتی ہے اور ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا - لیکن اسکو آصفجاہ سابع کے حُسن نیت کا نتیجہ سمجھئے یا اس کی نگاہ مردم شناس، خوش قسمتی سے حیدر آباد کو کام کرنے والے بھی ایسے ملگئے جو اعلیحضرت کے مزاج شناس تھے اور جنھوں نے ذات شاہانہ کی تمام تدابیر حکمرانی کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا -

یہاں کا آئین حکومت ایک کونسل سے تعلق ہے جو تمام شعبوں کی نگراں ہے اور جملہ اہم معاملات سمع اقدس تک پہونچانے کی ذمہ دار ہے - اعلیحضرت کے عہد ہمایوں میں اس کونسل کی قابل ذکر صدارت اول اول سر علی امام کے سپرد ہوئی تھی اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں (گو وہ بہت مختصر تھا) اچھی طرح ثابت کر دیا کہ وہ فرمانروائے وقت کے بلند ارادوں کی تکمیل کی پوری اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں - ان کے چلے جانے کے بعد یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اس منصب جلیل پر فائز ہوئے اور حیدر آباد میں کوئی ایک متنفس ایسا نظر آئے گا جو مہاراجہ بہادر کے بلند و پاکیزہ اخلاق کا معترف نہ ہو - آپ کا تعلق طبقۂ امراء سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ امراء دکن کی جو روایات سننے میں آئی ہیں وہ اس وقت صرف آپ کی ذات سے زندہ ہیں - اس کا اعتراف خود اعلیحضرت نے بھی متعدد بار کیا ہے اور ساکنان حیدر آباد تو روز اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں - آپ کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ نہ صرف سکون و اطمینان بلکہ تمام ان ترقیوں کے لحاظ سے جو خسروِ دکن کے پیش نظر ہیں،

بڑا سعید و مبارک زمانہ تھا اور تاریخ حیدر آباد میں آپ کے خدمات جلیلہ اور آپ کے اوصاف حمیدہ کو یقیناً زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

کونسل میں صدارت عظمیٰ کے بعد سب سے زیادہ مہتم بالشان ہستی ممبر مالیات کی ہوا کرتی ہے، کیونکہ اگر ملک کے اقتصادیات کی نگہداشت کا اچھا انتظام نہ ہو تو پھر کسی قسم کی کوئی ترقی ممکن نہیں، اور میں اسے سلطنت دکن کی انتہائی خوش نصیبی قرار دوں گا کہ اسے سر اکبر حیدری ایسے غیر معمولی دل و دماغ کا انسان یہ عظیم الشان خدمت انجام دینے کے لئے میسر آگیا۔

سر اکبر حیدری بین الاقوامی شہرت رکھنے والے انسان ہیں اور ہندوستان کے اُن چند مخصوص نفوس میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی شہرت و قابلیت صرف اپنے دل و دماغ کے زور سے تسلیم کرائی ہے۔ سر اکبر نے بہ حیثیت ممبر مالیات جو جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل کے لئے حقیقتاً دفتر کے دفتر ناکافی ہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ریاستوں اور حکومتوں کی خوش انتظامی جانچنے کا بڑا زبردست معیار زمانۂ بعد از جنگ کا اقتصادی عدم توازن تھا کہ حکومت ہند ایسی عظیم الشان سلطنت بھی بقول شخصے "چیں" بول گئی اور ہر محکمہ میں تخفیف اور قطع و برید اس نے شروع کردی، لیکن دکن کے دم خم اس زمانہ میں بھی وہی رہے، جو کام جس طرح جاری تھے بدستور جاری رہے، جو ترقیاں ہونے والی تھیں وہ برابر ہوتی رہیں، تنخواہوں میں جو سالانہ اضافہ ہوا کرتے تھے وہ اسی طرح ہوا کئے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ آگ کب لگی تھی اور کب بجھائی گئی۔ آپ اس زمانہ کے تمام حکومتوں کے بجٹوں کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ترازوں کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے کیسی کیسی نگوار تدبیروں سے کام لیا گیا تھا لیکن ایک حیدر آباد ہی کا میزانیہ ایسا تھا جس میں کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا اور کسی ایک شخص کو بھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ سب حقیقتاً اعجاز تھا سر اکبر حیدری کی اس غیر معمولی تدبیر کا جس کا اعتراف اسوقت بڑے سے بڑے ماہر مالیات کو ہے اور جس نے ایسے نازک زمانہ میں بھی سلطنت دکن کی روایات ترقی کو کوئی صدمہ پہونچنے نہیں دیا۔ چنانچہ آپ کی انھیں غیر معمولی خدمات کا صلہ خسرو دکن کی طرف سے یہ ملا کہ سر مہاراجہ بہادر کے ریٹائر ہونے کے بعد صدارت عظمیٰ کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی، اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔

انتخابات اور مسلمان

دستور جدید کے مطابق حال ہی میں جو انتخابات عمل میں آئے ہیں، وہ بحالات موجودہ ہمارے دکھ درد کا

صحیح علاج ثابت ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس نے ملک و اہل ملک کے لئے ایک سیاسی نجات کی شاہراہ ضرور متعین کردی ہے (اور ممکن ہے) اب مسلم جماعت بھی جو اسوقت تک بدنصیبی سے سب سے زیادہ گم کردہ راہ تھی، اسپر چل پڑے — ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں، سوائے پنجاب، بنگال، سرحد اور سندھ کے ہر جگہ کانگریس کے نامزد کردہ ممبر سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور جس آپا دھاپی کی حالت میں یہ سب کچھ ہوا ہے اس کو دیکھ کر ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ آیندہ شاید ہی کوئی غیر کانگریسی ممبر انتخاب میں آسکے۔

چنانچہ عام طور پر مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلافات کے اس بُرے نتیجہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور کثرت سے شرکت کانگریس کا میلان ان کے دل میں پیدا ہوتا جارہا ہے۔ حد یہ ہے کہ سر وزیر حسن ایسا شخص بھی بے اختیارانہ پکار اُٹھتا ہے کہ اب اگر کوئی نجات کی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان کانگریس میں بہ کثرت شریک ہوں چنانچہ جذبات کے اس تغیر کو دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی محسوس کیا کہ ہندو مسلمانوں کے افتراق و اختلاف کے مٹانے کا زمانہ شاید اب دور نہیں اور ہوسکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کی نجات کا کام بھی بجائے کسی مولوی کے ایک پنڈت ہی سے لینا چاہتا ہو۔

مسلم لیگ کا وجود یوں تو اس سے قبل بھی بیکار تھا اور اس نے جو کام اسوقت تک کیا اس کی صورت بالکل ایسی تھی جیسے پرانی دیوار پر قلعی کردیجائے، لیکن اب اس انتخاب کے نتائج دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ مسلم لیگ کا قیام نہ صرف یہ کہ غیر مفید بلکہ بڑی حد تک مضرت رساں بھی ہے اور اگر اب بھی مسلمان اس مردہ گھوڑے کو ایڑ دے دیکر اُٹھاتے رہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اب ان کی بے بصری واقعی علاج کے حدود سے گزر گئی ہے۔

مسٹر محمد علی جینا، اس میں کلام نہیں کہ نہایت قابل انسان ہیں لیکن قومی کام کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے وہ ان میں مفقود ہے اور "شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" کا فلسفہ نہ کبھی ان کی سمجھ میں آیا ہے نہ آسکتا ہے۔ جہانتک میں نے اندازہ کیا ہے محمد علی جینا کی ذہنیت وہی ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی ہوا کرتی ہے اور اسی لئے وہ مسلم لیگ کے ڈھونگ کو قایم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ انکا یہ ذوق وہیں پورا ہوسکتا ہے اور کانگریس سے علیحدہ رہنے کی بھی وجہ یہی ہے کیونکہ وہاں سوال تشخص کا نہیں بلکہ صرف جانبازی کا ہے اور ظاہر ہے کہ انکا "ذوالجناح" اس فضا میں زیادہ پرواز نہیں کرسکتا۔ لیکن مسلمانوں کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ وہ کب تک اپنی قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑے رکھیں گے اور شخصی تمناؤں پر اجتماعی مصالح کی قربانیاں کب تک چڑھائی جاتی رہیں گی۔ وقت اب نہ سوچنے کا ہے نہ پس و پیش کا۔ اسوقت تک صرف مرض کا علم تھا، تشخیص کا نہ تھا لیکن اب کہ یہ مسئلہ بھی طے ہوچکا ہے، اور علاج بھی معلوم ہوگیا ہے، ہمارا بدستور خاموش بیٹھے رہنا یا "رہنمائیوں" کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دیدینا یقیناً کھلم کھلا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جمعیتہ العلماء دہلی پھر اس تحریک کو اپنے حلقہ میں زندہ رکھنا چاہتی ہے، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو اور اسے مذہبی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی توفیق کبھی نہ میسر آئے۔

شعر اور عورت

(مسلسل)

زمانۂ اسلام کے ابتدائی دور میں عربی شاعری کے اندر وہ زور باقی نہیں رہا جو زمانۂ جاہلیت میں تھا، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو قبایلی عصبیت پائی جاتی تھی، اسے اسلام نے محو کر دیا تھا۔ قبائل کی باہم خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں اور سارے ملک میں "ھل من مبارز" کا نعرہ لگانے والا کوئی نہ رہا تھا، چنانچہ شاعری کی گرم بازاری بھی ختم ہو گئی اور ان کی زبان آوری کا سیلاب شعر و سخن کے بجائے خطابت و موعظت کی طرف پلٹ گیا، اب اُن کی جادو بیانی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم، قومی اور ملکی اصلاح، حمایت دین اور دعوت الی الحق میں صرف ہونے لگی، جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا حصہ قدرتی طور پر کم ہوتا ہے۔ جذبات شاعری میں طوفان برپا کرنے والی دراصل تین چیزیں ہیں، جنگ، موت، محبت، زمانۂ جاہلیت میں گو عشقیہ شاعری تھی مگر بہت کم، اُن کی شاعری کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی اور فخریہ شاعری پر مشتمل تھا جو دراصل جنگ میں ناکامی اور کامیابی کے دو نتیجے ہیں۔

اُس زمانہ میں اہلِ عرب کی شاعری چونکہ اکثر قبائل میں خونریز جنگ کا باعث بن جایا کرتی تھی اس لئے آنحضرت کو اس سے دلچسپی نہ تھی، آپ سارے ملک عرب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے، جس میں اس قسم کی شاعری ہمیشہ مخل واقع ہوتی تھی، اس لئے آپ اس کو سیاسی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ شاعر نے اگر کبھی کوئی سب سے اچھی اور سچی بات کہی ہے تو وہ صرف لبید کا یہ قول ہے :۔

الا کل شیئٍ ما خلا اللہ باطل —— ہاں! خدا کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہے

(تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول ص۱۹۶)

مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم شعر یا شعر گوئی کو بُری چیز سمجھتے تھے، آپ نے خود حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحۃ کو کفار مکہ کا دندان شکن جواب دینے کے لئے مقرر کر رکھا تھا آپ خود ان حضرات کا کلام سنتے تھے، اظہار مسرت فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اشعار کفار مکہ پر نیزے اور تیر سے زیادہ گہرا اثر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حسان سے فرمایا :۔

"اُهجهم (یعنی قریشاً) فو اللہ
لہجاؤک علیہم اشد من
وقع السہام فی غلس الظلام
اُهجهم و معک جبریل روح القدس"

قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم
تمہاری ہجو اُن پر اُس تیر سے زیادہ کاری
ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی پر پڑتا ہے۔
اُنکی ہجو کرو اسلئے روح القدس جبریل تمہارے مددگار ہیں۔

(کتاب العمدہ جلد اول صفحہ ۱۱۲)

خلفاء راشدین اگرچہ خود اچھے خاصے شاعر تھے چنانچہ حضرت ابوبکر کا وہ قصیدہ مشہور ہے جو انھوں نے غزوۂ عبیدہ بن حارث میں کہا تھا حضرت عمر اور حضرت عثمان کے بھی حکمت و موعظت پر بہت سے عمدہ اشعار منقول ہیں، حضرت علی تو شاعری اور خطابت کے امام ہی مانے جاتے ہیں، آپ کا دیوان بھی مصر و حجاز اور ہندوستان وغیرہ مختلف مقامات پر چھپ چکا ہے تاہم شعر و شاعری کو مذکورۂ بالا وجوہ کی بناء پر یہ حضرات بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے اس دور میں فخریہ شاعری تو تقریباً مفقود ہو گئی، مرثیہ گوئی اور ہجو گوئی بھی برائے نام رہگئی تھی، اخلاقی شاعری کو البتہ کسی قدر عروج ہوا، بہاریہ شاعری کا تو کہیں پتہ بھی نہ تھا، اور ملک کی آب و ہوا اور جائے وقوع کو دیکھتے ہوئے ہو بھی کیسے سکتا تھا۔

ہاں عشقیہ شاعری جو انسان کے جذبات لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے البتہ پائی جاتی تھی مگر بہت ہی معصومانہ انداز میں، نہ اُس میں وصل و ہجر کی بے بنیاد داستان ہوتی تھی اور نہ شہوانی خواہشات کے من گھڑت افسانے حتیٰ کہ کسی محبوبہ کا نام لیکر تشبیب کرنا بھی بدتمیزی میں داخل تھا، خلفاء راشدین اس معاملہ میں بہت سخت تھے، اگر کوئی شاعر ایسی حرکت کرتا تھا تو اُس کو درے لگوائے جاتے تھے

اسی مقدس عہد کے دو سچے عاشق و معشوق عقبہ بن حباب انصاری اور ریا بنت الفطریق السلمی ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے، ان دونوں کا افسانۂ محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جس کا جواب دنیائے عشق میں تا قیامت نہ ہو سکیگا۔ داستان اگرچہ دلچسپ ہے لیکن طویل ہے اور ہمارے موضوع بحث سے خارج بھی اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں اس جگہ پر بچاری ریا بنت الفطریق کے صرف دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جو اس نے اسوقت لکھے تھے جب وہ شادی کے بعد اپنے عاشق دولہا کے ساتھ مع سازو سامان کے اپنے گھر سے رخصت ہو کر مدینہ جا رہی تھی، راستہ میں غریب عقبہ ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا، جسے وہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔

۱- تصبرتُ لا انی صبرت و انما
اُعلل نفسی انہا بک لاحقہ

میں نے صبر کیا مگر یہ صبر اس لئے تھا کہ میں اپنی
جان کو تمہارے پاس پہونچنے کے لئے بہلا سکوں۔

۲- ولو انصفت روحی لکانت الی الردیٰ اماٰمک من دون البریۃ سابقتہ	اگر انصاف کرو تو میری روح ہلاک ہو کر تمام دنیا سے پہلے تمہارے پاس پہونچنا چاہئے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۱۳)

نازنین ریّا نے یہ کہا اور ایک چیخ مار کر اپنے عاشق زار عتبہ کی لاش پر گری اور وہیں تڑپ کر جان دیدی۔ یہ قیامت کا منظر تھا، جس پر ڈاکو اور قافلے والے سب ہی کھڑے رو رہے تھے، روتے روتے جب انھیں ذرا ہوش آیا، تو ان شہیدان باوفا کی لاشیں اٹھا کر انھیں ایک ہی قبر میں دفن کر دیا، کچھ روز کے بعد ان کی قبر پر ایک درخت اُگا جس کا نام لوگوں نے "شجرۃ العروسین" رکھا تھا، یہ تھا اُس خیر القرون کا پاک اور سچا عشق جس کی داستان قیامت تک حُسن و عشق کے بڑے بڑے افسانوں کو شرماتی رہے گی۔

خلفاء راشدین کا زمانہ ختم ہوتے ہی بنو اُمیہ کے عہد میں زمانہ جاہلیت کی شاعری پھر سے زندہ ہو گئی، قبایل میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا ہو گیا، اور فخریہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا، وجہ صرف یہ تھی کہ امیر معاویہ بڑے سیاسی اور مدبر آدمی تھے، انھوں نے جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں تو اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قبایل عرب میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا کر دیا جائے اور اہل بیت اور انصار علی کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا جائے تاکہ پھر کوئی سر نہ اُٹھا سکے، اس کام کے لئے انھوں نے بڑا روپیہ صرف کیا شعراء کو داد و دہش سے مالا مال کر دیا، اُن کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر کئے جس سے شاعری کا پھر وہی دور آگیا جو زمانہ جاہلیت میں تھا، مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، شعر و سخن پر تنقیدیں کیجانے لگیں جن میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

خود سکینہ بنت حسین، عائشہ بنت طلحہ اور اُس زمانہ کے مشہور شاعر ابو دہبل کی بیوی عمرۃ وغیرہ اکثر شعر و سخن کی مجلسیں منعقد کیا کرتی تھیں، جن میں مرد بھی بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے، اُن کے کلام پر خوب خوب تنقیدیں کی جاتی تھیں، تبصرے ہوتے تھے، اور کلام کی خوبی پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت سکینہ کی دعوت پر اس زمانہ کے مشہور اساتذہ جریر، فرزدق، نصیب، کثیر اور جمیل جمع ہوئے سب نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا، آخر میں بثینہ کے عاشق زار جمیل کے پاس لونڈی آئی اور اُس نے کہا ہماری مالکہ آپ کو سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے آپ کا یہ شعر سنا تھا میں آپ کا اور کلام بھی سننے کی مشتاق تھی،

ا- الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ بوادی القریٰ انی اذاً لسعید	کاش مجھے علم ہوتا کہ میں وادی القریٰ میں کبھی رات گزاروں گا تو میں اپنے کو اس وقت بڑا خوش نصیب سمجھتا۔

(الدر المنثور صفحہ ۲۴۶)

اس زمانہ میں گو بہت سی قادر الکلام عورتیں پیدا ہوئیں مگر ان میں جو مرتبہ لیلیٰ الاخیلیہ کا ہے کسی کا نہیں علامہ جرجی زیدان نے بھی لیلیٰ الاخیلیہ ہی کو سب پر ترجیح دی ہے اس لئے اس دور میں ہم صرف اُسی کے مختصر حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلیٰ الاخیلیہ، عبداللہ بن مرحال کی بیٹی ہے، وہ اپنے زمانہ کی نہایت ہی پر جمال اور نازک خیال شاعرہ تھی۔ زمانۂ اسلام کی نسوانی شاعری میں اُس کا وہی مرتبہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں خنساء کا تھا، اس زمانہ کا مشہور شاعر توبہ بن الحمیر العامری کو اس سے عشق تھا، پہلے تو چھپ چھپ کر وہ اس سے ملتا رہا لیکن جب آتش عشق زیادہ تیز ہوئی تو اُس نے لیلیٰ کے والد بزرگوار کے پاس شادی کا پیام بھیجا، چونکہ یہ خبر پہلے ہی اڑ چکی تھی کہ توبہ کو لیلیٰ سے عشق ہے اس لئے اُس نے اس رشتہ سے انکار کردیا اور قبیلہ بنی ادلع کے ایک شخص سے لیلیٰ کی شادی کردی، توبہ کو اس کی پرواہ نہ تھی، ایک روز حسب معمول رات کی تاریکی میں لیلیٰ سے ملنے گیا، دیکھا تو خلاف معمول اس باعصمت خاتون کے چہرہ سے نقاب اُٹھا ہوا ہے، توبہ کھٹکا اور سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، لیلیٰ آگے بڑھی اور اس نے رازدارانہ طریقہ سے کہا، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی، لوگ تمہاری تاک میں ہیں خیریت اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے چلدو، محبت کا مارا توبہ جان بچا کر بھاگا، مگر ساتھ ہی اس نے اس واقعہ پر ایک بڑے لمبے چوڑے قصیدہ میں نظم کر ڈالا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے:۔

کنت اذا مازرت لیلی تبرقعت	میں جب کبھی لیلیٰ کے پاس آتا تھا تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال لیا کرتی تھی
فقد رابنی منہا انعداۃ سفورہا	کل جو میں نے اسکی نقاب اُٹھی ہوئی دیکھی تو مجھے کھٹکا پیدا ہوگیا۔

لوگ عام طور سے چونکہ اُس کے اور لیلیٰ کے پاک تعلقات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے تھے اس لئے وہ اسی قصیدہ میں اپنی اور لیلیٰ کی پاکدامنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

علیّ دماء البدن ان کان بعلہا	مجھے کفارہ میں اونٹوں کی قربانیاں دینی پڑیں اگر اُسکا شوہر
یریٰ لی ذنباً غیر انی ازورہا	علاوہ اسکے کہ میں اس سے مل لیتا ہوں میرا اور کوئی خطا پائے

(الدر المنثور ص۴۶۵)

توبہ بڑا جنگجو اور دلیر نوجوان تھا، بہت سے غزوات میں اس نے شرکت کی اور ہمیشہ ظفرمندی کا پرچم اُڑاتا ہوا لوٹا، ۸۵ھ میں ایک مرتبہ وہ بری طرح بنو عوف کے نرغہ میں پھنس گیا اور مارا گیا، لیلیٰ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو اس کو دلی صدمہ پہونچا، اس غم میں اُس نے بہت سے مرثیے کہے جن میں سے ایک درج ذیل ہے:۔

۱۔ اقسمت ارثی بعد توبۃ ہالکا	میں نے قسم کھائی ہے کہ توبہ کے بعد ہر ہلاک ہونے والے کا مرثیہ کہونگی اور ہر
احفل لمن دارت علیہ الدوائر	اُس شخص کیلئے جلسہ تعزیت منعقد کرونگی جس پر مصائب ٹوٹ پڑے ہوں

۲- لعمرک ما بالموت عارٌ علی الفتی اذا لم تصبہٗ فی الحیوۃ المعائرُ	تمہاری جان کی قسم اُس نوجوان کے لئے باعث شرم نہیں ہے جس کی زندگی ننگ و عار سے خالی ہو۔
۳- وما احدٌ حیٌّ وان عاش سالمًا باخلد ممن غیّبتہ المقابرُ	کوئی زندہ شخص اگرچہ وہ بالفعل صحیح و سالم ہو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں، وہ اُن لوگوں میں سے ہو کر رہیگا جنکو قبروں نے غائب کر رکھا ہے
۴- ومن کان یحدث الدھر جازعًا فلا بد یومًا ان یُری وھو صابر	جس شخص کو زمانہ نے آج آہ و زاری میں مبتلا کر رکھا ہو کسی نہ کسی روز دیکھا جائے گا کہ اُسے صبر آگیا ہے۔
۵- وکل شباب او جدید الی بلیً وکل امریٍٔ یومًا الی اللہ صائرُ	ہر جوانی اور نئی چیز بوسیدہ ہو کر رہے گی اور ہر شخص خدا کی طرف لوٹ کر رہے گا۔
۶- وکل قرینیٍ الفتہ لتفرق شتاتا وان ضنا وطال التعاشر	دنیا کے تمام عاشق و معشوق جدا ہو کر رہیں گے اگرچہ وہ اس میں بخل کریں اور کتنے ہی دن تک زندہ رہیں

(الدر المنثور ص۱۷۴)

لیلیٰ اخیلیہ بڑی حاضر جواب اور زبان آور شاعرہ تھی، لیلیٰ نے امیر معاویہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا اور توبہ کے متعلق ان سے بہت دلچسپ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ مرواؔن اور عبد الملک بن مروان سے بھی ملی تھی اور اُن کو بھی دندان شکن جواب دے چکی تھی، اُسی زمانہ میں ایک مرتبہ والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی نے اُس سے کہا "اب تو تمہاری جوانی گزر گئی سچ بتاؤ تم سے اور توبہ سے کیسے تعلقات تھے؟" لیلیٰ نے کہا۔ "خدا کی قسم وہ ہمیشہ اپنے عشق میں پاکباز رہا، ہاں! ایک مرتبہ البتہ خواہشات نفس سے مجبور ہو کر اُس نے کچھ ناجائز ارادہ کیا تھا مگر میں نے یہ دو شعر پڑھے جس پر وہ نادم ہوگیا اور پھر کبھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔

۱- وذی حاجۃٍ قلنا لہ لا تبح لنا فلیس الیہا ما حییت سبیل	ایک صاحب حاجت نے درخواست کی مگر ہم نے اُس سے کہا کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں، جب تک تم زندہ رہو گے کبھی اس کا میابی نہ پاؤ گے
۲- لنا صاحبٌ لا ینبغی ان نخونہٗ وانت لاخریٰ فارغ وحلیل،	میرا ایک شوہر ہے جسکی ہمیں خیانت نہ کرنی چاہئے اور تم بھی ایک دوسری عورت سے وابستہ ہو اور اُسکے شوہر ہو۔

حجاج نے پھر پوچھا "اچھا پھر کیا ہوا؟" لیلیٰ نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا اور کہا کہ ہمارے قبیلہ کے پاس کسی ٹیلہ پر چڑھ کر یہ شعر پڑھنا:-

عفا اللہ عنہا ھل ابیتنّ لیلۃً من الدھر لا یسری الیّ خیالہا	خدا اُس نازنین کے گناہ معاف کرے، کیا میں کبھی ایسی رات گزاروں گا جو میرے خیال میں بھی نہیں آتی۔

جب میں نے یہ شعر سنے تو فوراً میں سمجھ گئی کہ یہ توبہ کا فرستادہ ہے میں نے بھی یہ شعر کہکر فوراً اُسے سُنا دیا:-

وعنہ عفا ربی و احسن حفظہ	خدا اُسکے بھی گناہ معاف کرے اور اُس کو اپنی حفاظت میں رکھے
عزیز علینا حاجۃ لاینالہا	اُسکی وہ حاجت جو کبھی بر نہ آئے گی ہمیں بہت عزیز ہے۔

(آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳)

لیلیٰ اخیلیہ کی موت کا واقعہ ایک عجیب داستان ہے، کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی قتیبہ بن مسلم سے ملنے خراسان گئی، واپسی میں توبہ کی قبر کے پاس سے گزری، شوہر بھی ساتھ تھا، لیلی نے شوہر سے اجازت چاہی، اُس نے منع کیا لیکن وہ نہ مانی، قبر پر پہونچی اور کہا "السلام علیک یا توبہ"، جب کوئی جواب نہ ملا تو اُسنے لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ میں اس سے پہلے کبھی توبہ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی، کیا یہ توبہ کا قول نہیں ہے۔

۱- ولو ان لیلی الاخیلیۃ سلمت	اگر لیلی اخیلیہ مجھے سلام کرے اور میری یہ حالت ہو کہ
علیّ و دونی تربۃ و صفائح	مجھ پر خاک کا ڈھیر ہو اور پتھر کی سلیں ہوں۔
۲- لسلمت تسلیم البشاشۃ او زقا	تب بھی میں اُسکو خوشی خوشی سلام کا جواب دونگا، یا پھر
الیہا صدیٰ من جانب القبر صائح	قبر کے پہلو سے ایک آواز بلند ہوگی جو اُسکے سلام کا جواب دیگی۔
۳- واغبط من لیلی بما لا انالہ	مجھے لیلی کی اُس چیز پر رشک ہے جسکو میں نہیں پاسکتا
الا کل ما قرت بہ العین صالح	ہاں جو کچھ بھی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے وہ اچھی ہے،

(الدر المنثور ص۴۴)

یہ اشعار لیلی پڑھ رہی تھی کہ توبہ کی قبر سے ایک بہت بڑا اُلّو نکلا اور اُس کے اونٹ سے ٹکرایا، لیلی محمل سے گری اور وہیں جاں بحق ہوگئی۔

بنو اُمیّہ کا عہد ختم ہوتے ہی عربی شاعری اور بھی معراج کمال پر پہونچ گئی، بنو عباس کا دارالسلطنت بغداد تھا، وہاں کی آب و ہوا، باغات، نزہت گاہیں اور تمام وہ چیزیں جو شاعری میں کہربائی رنگ پیدا کرسکتی تھیں، قدرت نے ایک ایک کرکے اُس کو ودیعت کردی تھیں، سارے ملک میں گل و سوسن ریحان و نسترن نرگس و نسرین، سرو و چنار کی بہتات تھی جس نے عربی شاعری کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

شعراء عرب جب اپنی حدود چھوڑ کر بغداد کی سدا بہار زمین میں پہونچے تو اُن کے شاعرانہ جذبات بھی وہاں کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کی وجہ سے بہت کچھ رنگین اور پرکیف ہوگئے اور وہ سادگی جو اُن کی شاعری کی روح تھی جاتی رہی، اُس کے بجائے لطافت و رنگینی، نزاکت و شوخی پیدا ہوگئی یہاں کے بہار آفریں اور نزہت خیز

مناظر نے ایسی روح پھونک دی کہ انھیں اپنی سادگی خود بری معلوم ہونے لگی۔ عرب کی شاعری میں ہم کو پہاڑوں کی بلندی، گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار، گرمی کی شدت، سفر کی مصیبت، مکانوں کی ویرانی اور باد سموم کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، لیکن بغداد پہونچکر اس کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہاں کا سارا ملک مرغزار تھا، چپہ چپہ سرسبز و شاداب نظر آرہا تھا، ذرہ ذرہ آفتاب حسن کی تنویر سے روشن ہو رہا تھا، پھر نوخیز ترکوں کے حسن کی معصومیت اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا رہی تھی، امرا و سلاطین کے درباروں میں ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھیں شباب پروروں کے سپرد تھیں۔ یہی جلوت و خلوت کے شریک سفر و حضر کے ہمدم تھے، اُن کے جمال جہاں آرا کی شوخیاں اور حسن نظر فروز کی رعنائیاں شباب پر تھیں، جس طرف اُنکی مد بھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں اُس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا۔

عہد بنو اُمیہ کے شعرا، گو ان جذبات کی اثر انگیزی سے ناواقف تو نہ تھے، مگر یہ رنگینیاں اور سرمستیاں کہاں سے لاتے؟ جو بہار یہ اور عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ اُن کا حسن بدویانہ سادگی کا سرمایہ دار تھا، شوخی، شرارت، ناز و غمزہ سے ان کا حسن معرا تھا، اُن کے عشق و محبت کا مرکز امرد لڑکے نہیں بلکہ قانون فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی اور وہ بھی پردہ نشین، اُن کے زمانہ میں بھی عشقیہ شاعری زوروں پر تھی، تشبیب بھی خوب خوب دل کھول کر کی جاتی تھی مگر ان سب میں بدویت کا رنگ غالب تھا۔ بنو امیہ کو اپنی عربیت اور بدویت پر ناز تھا، وہ ملک عرب اور اُس کی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کو حقیر سمجھتے تھے مگر بنو عباس عربی تہذیب اور بدویت کو اپنی گردن کا ایک بدنما طوق سمجھتے تھے، اُن کی معاشرت سے متنفر اور اُس سے گلو خلاصی چاہتے تھے حتیٰ کہ خلیفہ منصور نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ حجازی کعبہ توڑ کر ایک عراقی کعبہ قائم کیا جائے جہاں لوگ حج کیا کریں، مگر شکر ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں کامیاب نہ ہوا۔

بنو عباس کے دور میں عورتوں نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا چنانچہ تمام وہ چیزیں جو اس عہد کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں، عورتوں کے کلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ امرد لڑکوں سے تشبیب کرنا جو اس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی خواتین کی شاعری کا بھی جزو تھی۔ خود ہارون رشید کی بہن عُلیہ بڑی دقیقہ رس، سخن سنج، صاحب ذوق اور نامور شاعرہ تھی، شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال، عفت و عصمت دینداری اور تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر باہیں ہمہ اس زمانہ کے شاعرانہ دستور کے مطابق ہارون رشید کے دو غلام طل اور رشا، اُس کے معشوق تھے جن کو مخاطب کر کے وہ ہمیشہ طبع آزمائی کیا کرتی تھی۔ رشا کو مخاطب کر کے جو نظمیں اُس نے کہی ہیں اُس میں سے بعض میں رشا کے بجائے اُس نے زینب کا نام ڈال دیا ہے، مگر طل کو تو اُس نے ہر جگہ صاف صاف نام لیکر مخاطب کیا ہے، طل سے اُس کو بہت زیادہ محبت تھی اُسکی شان میں

اُس نے بہت سے شعر کہے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

۱- یارب انی قد عرضت بہجرہ فالیک اشکو ذاک یا ربّاہ	خداوندا! میں اُس کے ہجر میں مبتلا کر دی گئی ہوں، بار الہا! میں تجھی سے اس کی شکایت کرتی ہوں،
۲- مولاہ سوء تستہین بعبدہا نعم الغلام وبئست المولاہ	ایک نالائق مالکہ ہے جو اپنے غلام کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر سمجھتی ہے، وہ غلام اچھا ہے خود مالکہ نالائق ہے۔
۳- طلٌّ ولکنی حرمت نعیمہ، ووصالہ ان لم یغثنی اللّٰہ	وہ طل ہے، اگر خدا نے مجھ پر مہربانی نہ کی تو میں اُس کی نعمت وصال سے محروم رہوں گی۔
۴- یارب ان کانت حیاتی ہکذا ضرًّا علیّ فما ارید حیاہ ؛	خدایا! اگر میری زندگی اسی طرح میرے لئے وبال جان رہی تو میں ایسے جینے سے باز آئی

(کتاب الاغانی جلد نہم صہ۸۵)

ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہوگئی تو اُس نے عُلیّہ کو بلا کر قسم لی کہ آئندہ وہ کبھی اس کا نام زبان پر نہ لاوے گی، علیہ نے وعدہ کر لیا اور وہ چلی گئی، ایک مرتبہ وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی تلاوت قرآن میں مشغول تھی جب وہ اس آیت پر پہونچی "فان لم یصبہا وابل فطل" تو بے اختیار اُس کی زبان سے نکل گیا:-

"فالذی منعناہ امیرالمومنین"۔

خوش قسمتی سے ہارون رشید اُس وقت کہیں کھڑا سن رہا تھا، اس پر اس جملہ کا بڑا اثر ہوا، سیدھا اُس کے کمرہ میں چلا گیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیکر بولا "میں نے طل تمہیں کو دے ڈالا اب تم جو چاہو کرو"۔

ہارون رشید کو علیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کو سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اسکے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا، ایک مرتبہ وہ ملک رَے گیا تو علیہ بھی ساتھ تھی جب وہ مقام مرج پہونچی تو اُس نے یہ شعر کہے:-

۱- ومغترب بالمرج یبکی لشجوہ وقد غاب عنہ المسعدون علی الحب	مرج کے قریب پہونچنے والا غم و الم کے آنسو بہا رہا ہے۔ اور محبت میں کامیاب ہونے والے نظروں سے اوجھل ہیں
۲- اذا ما اتاہ الرکب من نحو ارضہ تنشّق یستشفی برائحۃ الرکب	جب کوئی سوار وطن کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ اُس کے پاس جا کر سونگھتا ہے کہ شاید بوئے وطن آئے۔

(الدر المنثور صہ۳۵)

ہارون رشید نے جب یہ شعر سنے تو سمجھ گیا کہ وطن کی یاد علیہ کو ستا رہی ہے، اُس نے فوراً اُسے واپس

پہونچانے کا حکم دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی ضرورت سے شہر رقہ گیا، عجلت میں علیہ ساتھ نہ جاسکی، وہاں پہونچکر اس نے علیہ کو بلوا بھیجا، جب وہ محل میں بیٹھکر روانہ ہوئی تو اس نے یہ شعر کہا:-

لولا الرجاء لمن املت رویتہ	اگر اس شخص سے امیدیں وابستہ نہ ہوتیں جسکے دیدار کی متمنی
ما جزت بغداد فی خوف و تعذیر	ہوں تو میں بغداد سے اس خوف و خطر کی حالت میں روانہ ہوتی

علیہ شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی بڑا کمال رکھتی تھی اور اپنے ہی شعروں میں اپنی ذہانت اور طباعی سے ایسی دھنیں قائم کرتی تھی کہ جو سنتا تھا اپنا سر دھننے لگتا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام مشاغل کے وہ بڑی دیندار، پرہیزگار، اور پابند صوم و صلوۃ تھی، شاعری میں باوجودیکہ عاشقانہ مضامین نظم کرتی تھی اور کھلے ہوئے صاف صاف لفظوں میں تشبیب کرکے زور طبع دکھایا کرتی تھی، مگر کسی شخص کو کبھی اس کی پاکدامنی میں شک و شبہ نہیں ہوا وہ خود کہا کرتی تھی کہ یہ سب کچھ محض تفنن طبع کے لئے ہے۔

ایک دفعہ ہارون رشید ایک کنیز کے دام محبت میں پھنسکر عیش و طرب کے مزے اڑا رہا تھا اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا، علیہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے فوراً دو شعر کہے اور اپنی کنیزوں کو اس کا سر بتا کر گوایا جسے سنکر ہارون رشید مبہوت ہوگیا، اور اپنی بیجا حرکت پر انتہا سے زیادہ نادم ہوا، وہ شعر یہ ہیں

۱-	منفصل عنی وما	اس نے مجھے چھوڑ دیا
	قلبی عنہ منفصل	مگر میرا دل اس سے جدا نہیں ہوتا
۲-	یا قاطعی الیوم لمن	اے آج مجھے چھوڑنے والے بتا تو سہی کہ اب تو نے
	نویت بعدی ان تصل	میرے بعد کس سے ملنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب الاغانی جلد نہم ۵۸)

افسوس ہے کہ دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلتے ہی تمام علوم و فنون کے ساتھ شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا، ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک تمام ملک برباد کردئے، سینکڑوں شہر خاک میں مل گئے، زمین و آسمان میں سناٹا چھا گیا، مدینۃ العلم بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور کم و بیش چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا، مغلوں کی اس تباہ کاری نے لوگوں کے دلوں کو بجھا دیا اور طبیعتوں کو مضمحل کردیا جس کا اثر تمام علوم و فنون کے ساتھ شعر و شاعری پر بھی بہت برا پڑا، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے خانہ نشین ہوگئے، اور اپنا وقت دوسرے مشاغل میں صرف کرنے لگے، اور عربی شاعری کا وہ رنگ جو دولت عباسیہ میں تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔

عہد مغلیہ کے سلاطین و امراء کو اس سے قطعی دلچسپی نہ تھی، ان کے درباروں میں کسی عالم یا فاضل کو

تقرب ہوتا تھا تو محض اس لئے کہ وہ اس عہد کی تاریخ مرتب کریں، جنگی کارنامے لکھیں یا پھر علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی کتابیں تصنیف کریں اور بس۔ اس عہد میں چونکہ علوم بغداد، بخارا، رَے، قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ سے منتقل ہو کر قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حمص اور تونس وغیرہ میں آ گئے تھے اس لئے یہاں کے باشندوں میں خال خال شعر و سخن کا چرچا باقی تھا۔ مگر عربی شاعری کا وہ عہد شباب جو دولت عباسیہ میں تھا ایسا فنا ہوا کہ آج تک نہ لوٹا اس لئے ہم اسی دور کے حالات پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

زمانۂ اسلام میں عہد عباسیہ تک کی مشہور شاعرہ خواتین میں عاتکہ بنت عمرو بن نفیل، خولہ بنت الازور الکندی، ام حکیم بنت قارط، ہند بنت زید بن مخرمۃ الانصاریہ، عریب بنت جعفر البرمکی، لیلیٰ بنت طریف، حمدہ بنت زیاد، لطیفۃ الحدانیہ، حفصہ بنت حجاج الرکونیہ، حمدونیہ بنت عیسیٰ، عائشہ بنت احمد، نزھون الغرناطیہ الشاعرۃ الغسانیہ، الشبلیۃ الاندلسیہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی شاعرانہ نازک خیالی اور ادیبانہ بذلہ سنجی سے ملک و قوم ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے سلاطین بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور اُن کی شاعری اور زبان آوری کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔

شواعر عرب کے حالات اور اُن کے اشعار تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ کتاب الاغانی، کتاب شعر والشعراء، طبقات الشعراء، محاضرات الادباء، کتاب المنظوم والمنثور، کتاب الصناعتین، کتاب العمدہ، المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر وغیرہ ادب کی کتابوں میں بھی جستہ جستہ ملتے ہیں مگر زمانۂ حال کی مصری ادیبہ سیدہ زینب بنت علی العاملی کی کتاب "الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" صنف نسواں کے علمی و ادبی خدمات پر بہترین تصنیف ہے، اس میں خواتین عرب کے حالات بہت کچھ تفصیل سے ملتے ہیں جس میں وہ بھی شامل ہیں جنکو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان جواہر پاروں کا ذخیرہ اسقدر بکھرا ہوا ہے کہ ان کو یکجا کر کے ایک سلک میں پرونا ہفتوں نہیں مہینوں کی فرصت کا محتاج ہے، انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں اس موضوع پر کچھ زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کی کوشش کروں گا۔

سید جلیل الرحمان اعظمی

ہماری بُت پرستیاں

سرفراز (لکھنؤ) مورخہ ۸ر جمادی الاول ۱۳۵۵ھ میں سید اکبر حسین صاحب رضوی (کوئٹہ) کا مضمون "شیعہ اور گریہ و بکا" جب میں نے پڑھا تو مجھے اس لئے حیرت ہوئی کہ رضوی صاحب کے اکثر خیالات میرے اُن خیالات سے ملتے جلتے ہیں جن کی ابتدائی کشاکش بچپن کے معصومانہ زمانہ میں پیدا ہوئی تھی اور اب تو میں اسے محسوس کر کر کے اس بے راہ روی پر افسوس ہی نہیں ماتم کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ رضوی صاحب کے قلم کا لہجہ ذرا "سرحدانہ" ہوگیا ہے مگر میری رائے میں یہ درشتی اُن اوہام کا ردعمل ہے جو مذہب کے پردہ میں ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، جنھوں نے ہم کو حقیقت سے دور کر دیا ہے اور ہماری روحِ صداقت کو بجھا کر رکھدیا ہے۔

میں نے شیعہ خاندان میں آنکھ کھولی، شیعی فضا میں تربیت پائی اور شیعی رسم و رواج ہی سے واسطہ پڑا، اسلئے میں اُن مراسم سے اچھی طرح واقف ہوں جنھوں نے "شیعیان علی" کے پاک نہاد مشرب میں داخل ہوکر معلوم اُسے کیا سے کیا بنا دیا اور ایک شیعوں پر کیا منحصر ہے میں تو سارے اسلامی افق کو اوہام باطلہ کے بادلوں سے گھرا ہوا پا رہا ہوں، اور جب کبھی مجھے کوئی سنجیدہ موقع مل سکا ہے میں نے اپنے حلقۂ احباب میں (خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی) اس حقیقت کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہیں کیا:-

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس　　　در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

رضوی صاحب نے اپنے مضمون میں عزاداری کی بدعات اور موقع بے موقع مجالس کے انعقاد پر نکتہ چینی کی ہے جس سے میں اس حد تک متفق ہوں کہ شہادتِ عظمیٰ کا مقصد صرف گریہ و بکا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ کربلا کی حسینی تعلیمات پر غور کرنے اور انھیں اپنا نصب العین بنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کی تاریخ میں "ذبح عظیم" کو شرما دینے والا یہ وہ غیر فانی واقعہ ہے جس کی مثال کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، دنیا نے ازل سے اب تک بیشمار کروٹیں بدلی، ان گنت اقوام و ملل منصۂ شہود پر آتی اور فنا ہوتی رہی ہیں اور شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس کی تاریخ کا کوئی ورق کسی خونیں داستان سے رنگا ہوا نہ ہو، لیکن یہ تمام خونفشانیاں، یہ تمام

صف آرائیاں اور یہ تمام تیغ آزمائیاں حیاتِ عمرانی کی کشاکش کا نتیجہ تھیں جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کو دوسرے پر تفوق حاصل ہو جائے اور ملکی و سیاسی خواہشات کی قربانگاہ پر انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔ ان محاربات کو حق و باطل سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ ان حسیات کو سکون پہنچانا تھا کہ جو قوموں کی فاتحانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی دل و دماغ میں پرورش پاتی رہتی ہیں۔

جنھوں نے تاریخ کی ورق گردانی کی ہے اور اس کے صحیح نتائج کو اخذ کر سکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یورپ و ایشیا کے بڑے بڑے صاحبانِ فکر نے کربلا کے اس "ذبح عظیم" کو دنیا کا عظیم الشان واقعہ مانا ہے، اور چند تنگ نظروں کو چھوڑ کر سب متفق اللفظ ہیں کہ یہ ہنگامہ دورِ رواں کی قسم کا واقعہ نہیں بلکہ اپنی نوع کا ایک ہی واقعہ تھا، جو سیاسیات، ذاتیات اور نفسانی خواہشوں سے بالکل دور محض حق و صداقت کی حمایت میں پیش آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام مظلوم نے اپنی قربانی سے یہ ثابت کر دیا کہ اعلاء کلمۃ الحق اور صداقت پر جان دے دینا ہی وہ شیوہ ہے جس کو انسانیت کی معراج کہا جاتا ہے اور دنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو معرفتِ ربانی اس کا نام ہے، شیوۂ تسلیم و رضا اس کو کہتے ہیں اور صداقت و حقانیت کی آزمائش میں ثابت قدمی کا یہ مفہوم ہے۔

مذہبی کتب میں صفحۂ قرطاس پر یہ واقعہ نقشِ کالحجر کی صورت میں ثبت ہے کہ شہید اعظم علیہ السلام نے اس انجام کی اطلاع نانا کی پیغمبری کو دیدی گئی تھی ماں کی مامتا اس پر تڑپتی تھی اور باپ کی شفقت سمجھا گئی تھی۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر چلے، سوچ سمجھ کر روانہ ہوئے اور حضرت ان کو نہ روک سکے۔ کیونکہ قدرت نے اس سعادت کبریٰ کے لئے ازل ہی میں نامزد کر دیا تھا، جن کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا کہ اسلام کا قصرِ تعمیر کہیں پھر جاہلیت کی باطل پرستیوں سے نہ مل جائے اس لئے مشیت ایزدی نے چاہا کہ باطل پرستوں کو دکھا دیا جائے کہ توحید کس کو کہتے ہیں، رسالت کا مقصد کیا ہے اور امامت کے فرائض کیونکر ادا ہوتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ کربلا میں حسین نے خونریزی سے اجتناب کے لئے اتمامِ حجت نہیں کی لیکن جب دیکھا کہ باطل پرستیاں بھڑک رہی تھیں، ناپاک خواہشیں بھڑک رہی تھیں، خود پسندیاں ابھار رہی تھیں، جب دیکھا کہ سب بے اثر ہے اور تعلیم و تلقین بیکار ہوگی تو کچھ دیر ذوالفقار حیدری کی ضربوں سے ... دے اور جب ... کو ... بھی دیدیا اور پھر یہ فرماتے ہوئے رضائے دوست پر سر جھکا دیا:-

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ تھی شہادت اور یہ تھا مقصدِ شہادت۔ اب آیئے عزاداری کے متعلق غور کریں کہ یہ کیونکر وجود میں آئی اور شہادت سے اس کا کیا تعلق ہے۔ باطل پرستوں نے جب تلواریں نیام کر لیں اور اس عارضی فتح کا نشہ ایک ابدی شکست کا عنوان بن کر اتر گیا تو وہ لٹا ہوا قافلہ روانہ ہوا جس کی بیکسی پر ایمان والوں کی

آنکھیں خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکیں، کوئی اپنے مولا کے لئے رویا، کسی نے اب وجد کی یاد میں آنسو بہائے اور کوئی اُس پیکرِ حق و صداقت کے عزم واستقلال سے متاثر ہوا۔ غرض مختلف قسم کے تاثرات تھے جو دل میں تڑپ پیدا کرتے تھے اور آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتے تھے، یہ وہی جذبۂ بے اختیارانہ ہے جو اس غم کو ہلکا ہونے نہیں دیتا اور نہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں، اسی نے شعراء سے مرثیہ لکھوائے اسی نے بین اور نوحوں کے اسلوب وضع کئے، اور اسی نے خاموش آنسو بہانے کے انداز سکھائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبایل میں سنسنی پھیل گئی، اہلِ عرب وعجم میں بےچینی پیدا ہوگئی اور دنیا جانتی ہے کہ قدرت دشمنانِ ملت سے انتقام لئے بغیر نہ رہی، آج نہ یزید ہے اور نہ اُس کی باطل پرست ذریات، نہ شمر ہے اور نہ ابنِ زیاد، ان کا نام تاریخ کے اوراق میں اس لئے محفوظ ہے کہ ان کی بے دینی کے کارنامے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ دہرائے جائیں۔

رونا رُلانا ایک فطری چیز ہے انسان جب غیروں کے دکھ درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تو ایسے ایمان پیکر آقا کی بےکسی اور مظلومیت پر کیونکر خاموش رہ سکتا ہے، مجلسِ عزا کا بانی علم النفس کے اس راز سے واقف تھا کہ اگر کربلا کے واقعات کو بار بار دہرایا جائے گا تو حسین مظلوم کی تعلیم ہمیشہ حافظوں میں باقی رہے گی اور اُن کے خدائی کارنامے حیاتِ ابدی پا سکیں گے، بظاہر تو رونا ہے مگر یہی آنسو ایمان کو تازہ رکھتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ دنیا جس قدر حق وصداقت سے دور ہوتی گئی اسی قدر اصل مقصد سے بُعد ہوتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج شہادت کی روح صرف گریہ و بُکا ہی سمجھی جاتی ہے اور اُس کی بے اندازہ برکتیں طاقِ نسیاں کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں، حالانکہ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جس نے نبوت کی تکمیل کی، جس نے توحید کی بنیادوں کو استوار کیا، اور ہمیں جہل و باطل اور فسق و فجور کی تاریکیوں سے نکالا تاکہ ہم اپنے کو عرفانِ حق اور اعلائے اس صداقت کا اہل ثابت کریں اور خدا کی راہ میں اس والہانہ سرفروشی کا ثبوت دیں۔

حسین کا پیغام ہے کہ باطل کے آگے پیشانیاں نہ جھکاؤ، ہجومِ باطل کا مردانہ وار مقابلہ کرو، صداقت کے لئے جان و مال قربان کردو، ایمان وحق پر ثابت قدم رہو، اور وہ سب کچھ کرو جس سے خدا کی خدائی باقی رہے اور انسانیت ذلیل نہ ہو، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے عملی طور پر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور جب ہمارا ایمان اس درجہ ضعیف و کمزور اور ہمارے عادات واخلاق اس قدر انسانیت سوز ہیں تو للّٰہ مجھے بتایئے کہ واقعۂ شہادت کے جیسے "ذبحِ عظیم" پر آپ کو رونے اور اسے اپنے سے متعلق کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ میں جب ایسے ایمان و ایقان اور حق و صداقت کی شان باقی نہیں ہے تو حسینؑ کے ایسے مولائے کائنات سے اپنی وابستگی کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں اور دُنیا اسے تسلیم کرنے کی غلطی میں کیونکر

مبتلا ہو سکتی ہے، ہمارے سارے دین و ایمان کا خلاصہ صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ محرم کے عشرہ میں سوگواروں کی صورت بناکر، مجلسوں میں رسمی طور سے شریک ہو لیں، اور سوز خوانوں کی آواز کے اُتار چڑھاؤ پر واہ واہ کرلیں، "تحت اللفظ" خوانوں کی بہاریہ تشبیبوں پر جھوم لیں، ساقی نامہ میں عرفانی شراب کے جلوے دیکھ لیں، کبھی گھوڑوں کی سبک رفتاریوں پر حیران ہو جائیں، کبھی تلوار کی خون آشامیوں سے کانپ اٹھیں اور پھر داد و ستائش کے فلک شگاف نعروں سے چھتوں کو ہلا دیں، ٹوپیاں اُچھلتی دیکھیں، اور تعریف کرنے والوں کی تہذیب کا ماتم کریں، یہ مجلس تو نہ ہوئی، ایک مشاعرہ کی محفل ہو گئی۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ایسی مشاعرہ نما مجلسوں میں، صداقت کی روح کس کس طرح کانپ جاتی ہوگی، آپ کے اس شیوۂ مذہبی سے اصل مذہب کو کیا شکایت ہوتی ہوگی اور آپ جس کے اسوۂ حسنہ کے پیرو ہیں اُس کی روحِ مقدس آپ کے اس اندازِ عمل پر کس قدر بے چین ہوتی ہوگی یقین کیجئے کہ حسینؑ خدا کے اُس برگزیدہ ترین بندہ کا اسم گرامی ہے جس نے خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا۔ پھر کیا اُن کا مطالبہ آپ سے چند ظاہری رسوم کی حد تک ہے، جنھوں نے ساری کائنات کو حق و صداقت کا درس دیا تھا، جنھوں نے سارے اوہام باطلہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا، اُن کا تو ہر عمل ایک مستقل درس ہے اُن کے لئے جو قوت سے گھبرا کر باطل کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور ہوتے ہیں، جو ناحق کا ساتھ دے کر اپنی ضعفِ ایمانی کا ثبوت دیتے ہیں، حسینؑ آپ سے صرف رو لینے کے طالب نہیں ہیں، بلکہ آپ سے دینِ متین کی استواری کے طالب ہیں، آپ سے صداقت کی تعمیر میں سرفروشی کے طالب ہیں اور اُن تمام حق پرستیوں اور حق شعاریوں کے طالب ہیں جو جہل و باطل کی تاریکیوں کو افقِ ہستی سے مٹا کر دنیا کو سراپا انوار کر دیں۔

میں نہیں کہتا کہ مجلسوں سے وہ مقصد بالکلیہ پورا ہی نہیں ہوتا جس کے لئے ان کو وضع کیا گیا تھا لیکن ضرورت یہ ہے کہ اس یادگار شہادت کو اُس مرکز پر آنا چاہئے جو اسوۂ حسینی کی تبلیغ کا کام دے سکے۔ اس کو اسی حدود میں رکھنا چاہئے جس سے اصل مذہب متاثر نہ ہو اور تعلیماتِ حسینی کی روح کو صدمہ نہ پہونچے، صرف رونے رُلانے کو ذریعہ نجات نہ خیال کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اپنے باطن کی اصلاح اور اُن حقایق کی تکمیل ہونی چاہئے جو اس شہادت کبریٰ کے پردے میں سکھائے گئے ہیں اور جو ساری کائنات میں دینِ حنیف کا طغرائے امتیاز ہیں، ہم میں ایک یہ عیب بھی استحکام کے ساتھ پیدا ہو گیا ہے کہ جس بات کو ہم اچھا سمجھتے ہیں، اُسے اپنے ضمیر کی آواز بھی جانتے ہیں، میں اپنے ایمانی بھائیوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعزیہ و علم اور قبر پرستی کی حدیں بُت پرستی سے نہیں مل جاتیں، آپ ایک خدا کے ماننے والے ہیں، وہ خدا جو دانا بھی ہے اور بینا بھی، قادر بھی ہے اور توانا بھی، زندہ بھی ہے اور گویا بھی، اسلئے

کسی دوسرے کے سامنے نہ آپ کی پیشانی جھک سکتی ہے نہ آپ کے دل میں وہ گداز پیدا ہو سکتا ہے جو معبود برحق کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، پھر اے صاحبان توحید! اے آفریدگار واحد کے پرستار یہ لکڑی اور کپڑے کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے نیایش اور فروتنی کیسی! میرے ایمان کے نزدیک تو اسلامی ضمیر کو اس پر شرم آنی چاہئے وہ ضمیر جو سوائے معبود حقیقی کی توحید کے اور کچھ نہیں جانتا، وہ ضمیر جو خدائے واحد کی پرستاری کو زندگی سمجھتا ہے، وہ ضمیر جو صرف اسی ایک صداقت کی حمایت کا دعویدار ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی کوئی مسلمان انھیں خدا نہیں سمجھتا مگر اُن کے توسل سے اپنی عقدہ کشائی کا آرزومند ضرور ہوتا ہے اس لئے نفس کا فریب جہالت کا ڈھکوسلا ان سے وہ تمام خدا کی صفات منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتا جو صرف خدائے تعالیٰ کی صفات خاصہ ہیں، اولاد ان سے مانگی جاتی ہے، شوہر کے التفات ان سے طلب کئے جاتے ہیں، بچوں کی زندگی، بیماروں کی صحت اور مالی پریشانیوں سے نجات، غرض کونسی ایسی تمنا نہیں ہے جن کا ان سے مطالبہ نہیں کیا جاتا، اس میں شک نہیں کہ ایمان ہم کو رسول اور آل رسول ہی سے ملا ہے، خدا کو ہم نے انھیں کی وجہ سے پہچانا ہے، توحید کے اسرار انھیں نے ہمیں بتائے ہیں۔ لیکن یہ تو سوچئے کہ انھوں نے ہماری زندگی کی اصلاح کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے اور ہمارے ذہن و دماغ سے اوہام کیونکر مٹائے، اُنھوں نے سارے معبودانِ باطل سے چھڑا کر ایک خدا سے ہمارا رشتہ جوڑا اور اپنی خدائی زبان سے فرمایا:۔

اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُم

اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ کہیں وہ صفات ہماری ذات سے منسوب نہ کر دینا جو صرف خداوند حقیقی کے لئے ہیں، لیکن ہم باوجود اس دعوے توحید و حق پرستی کے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو حریف اسلام ہے، دشمن توحید ہے اور اُن کی تمام تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور اس پر یہ بوالعجبی کہ یہ یقین بھی کرتے ہیں کہ اُن کی ارواح مقدسہ ہمارے ان اعمال سے خوش ہوتی ہوں گی میں جب یہ سوچتا ہوں تو میرے قلب کی رگیں ہل جاتی ہیں کہ ہم ان سیاہ کاریوں کو اپنے دامن میں لیکر اُنھیں کیا مُنہ دکھائیں گے جنھیں زبان سے تو ہمیشہ اپنا آقا اور مولا کہا اور دل سے کبھی نہ جانا کہ اُن کی تعلیمات اور اُن کا اسوۂ حسنہ کن اجزا سے عبارت تھا، حیف!

بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا

تعزیہ داری کی ابتدا کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بنا امیر تیمور کی عقیدت نے ڈالی تھی جس کو شاہ نجف اور سلطانِ کربلا سے والہانہ عشق تھا، لیکن اُس کے بڑھے ہوئے فاتحانہ عزائم اُسے

ایک مقام پر زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ بقدرِ شوق حاضری کی سعادت حاصل نہ کر سکتا تھا، اُس نے روضۂ مبارک کی نقل (ضریح) اس لئے بنوائی تھی کہ وہ اس سے اپنے ایمانی جذبات کی تسکین کر سکے، اس روایت کی صحت میں اکثر حضرات کو کلام ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو میں اس پر کوئی ایسی گفتگو کرنا نہیں چاہتا جس سے مورخانہ چھان بین شروع ہو جائے، کیونکہ عقاید نے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں اس لئے اگر تیمور نے اپنے جذبۂ شیفتگی کے اظہار میں روضۂ مبارک کی نقل بنوالی تو اس پر حیرت و استعجاب اور حجت و تکرار کیوں کی جائے، جب کہ اہل بیت کے ساتھ مسلمانوں نے علی العموم جذبات شیفتگی و ارادت کے اظہار میں مختلف پیرائے اختیار کئے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن مسلمانانِ ہندوستان کی اوہام پرست فضا میں اس پر کیوں اکتفا کرتے، انھوں نے تعزیہ داری کی عقیدتمندانہ رسم کے سایہ میں دُنیا کی ساری بدعتوں کو جمع کر دیا اور وہ رنگ کھیلے جن پر رسالتمآب کا اسلام یقیناً ماتم کرتا ہوگا، ذرا سوچئے تو کہ جماعت حسینی اور مہندی و ضریح کی رسمیں اور پھر اُن کے نام سے جوان رسم و رواج کو مٹانے آئے تھے جو ان اوہام باطلہ کو دماغوں سے نکالنے آئے تھے، جب معمولی ٹٹوؤں کو دُلدل اور ذوالجناح کا رتبہ دیکر سڑکوں پر پھرایا جاتا ہوگا جب امام زین العابدینؑ سے جیسے عابد و زاہد صاحب عرفانِ حقیقت کو اسیر کر کے سواد انسانوں کو اونٹ پر دکھایا جاتا ہوگا تو خدارا غور کیجئے کہ ملت حقہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور شہدائے کربلا کی ارواح مقدسہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی ان حالات میں اگر اغیار ہم پر آوازے کستے ہیں اور ان مراسم کو رام لیلا کے سوانگ سے تعبیر کر کے ہمارے ایمان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں تو اس میں بُرا ماننے اور تیوریوں پر بل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میرے برادرانِ ملت اس سے انکار کر سکیں گے کہ عقائد کا یہ غلو، خواہ کیسے ہی حُسنِ نیت پر مبنی سہی، اسلام کی تعلیمات سے اُس کو کوئی دور کا بھی تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ اسلام جسے قرآن نے سمجھایا، وہ اسلام جسے احادیث صحیحہ نے پھیلایا، اور وہ اسلام جسے آئمہ اہل بیت نے عملی طور پر پیش کیا۔

اُنھوں نے خدا کو منوانے کے لئے جانیں دی تھیں، ہم تعزیوں کے لئے انسانی قربانی کو حلال سمجھتے ہیں، اُنھوں نے توحید کے لئے دُنیا بھر کی مصیبتیں اُٹھائی تھیں، ہم تعزیہ، علم اور مزاروں کے پجاری بنے ہوئے ہیں، اُن کا حق و صداقت شعار تھا، ہمارا دُنیا طلبی و دہر پرستی، وہاں ابن ملجم کے جیسے شقی کی پیاس کو اپنی پیاس پر مقدم سمجھا جاتا تھا، ہم اپنے جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے انسانیت کا خون پینے پر تیار ہیں، وہاں عنتر کے جیسے دیو پیکر کو قبضہ میں آنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہم ایک دوسرے کو ذبح کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ فی الواقع اُسی کے پیرو ہیں جو اماموں کا امام ہی جو فرزند رسول ہے

جو فاطمہ کا لاڈلا ہے، جو علی کا لخت جگر ہے، جو جوانانِ جنت کا سردار اور محبوب خدا ہے تو بسم اللہ آیئے اور اپنے گھرانے کی تعلیم کو تازہ کیجئے حق و صداقت کے میدان میں اپنے عمل اور اپنی موحدانہ سیرت سے دُنیا کو وہ درس دیجئے جو آپ کے مولا نے دیا تھا، اور آپ کو وراثتاً پہونچا ہے تعلیمات حسینی کی تبلیغ سے باطل کی تاریکیوں کو دور کیجئے، سخیف اور نجس اوہام سے اہل دُنیا کو بچایئے اور حسین کے اسوۂ حسنہ کو دُنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک پہونچا دیجئے، ورنہ صرف رو لینا، تعزیہ داری کے رسوم کا پابند ہو جانا، اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سامنے سر جھکانا اور مٹی کے ڈھیروں کو صنم خانہ بنا کر دنیوی اغراض کو پورا کرنے کی التجا کرنا، میرے نزدیک اسلام کی توہین اور شیعیت کی تذلیل ہے۔

درگاہوں اور امام باڑوں میں حاضری اکتساب سعادت کے لئے داخل حسنات سمجھی گئی تھی یہی مقصد اگر اب بھی ہو تو اس کی خوبی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اب تو مسلمانوں کا وہ حامل توحید گروہ جس کی جبینیں صرف بارگاہِ صمدیت کے لئے وقف تھیں وہ اب ہر کس و ناکس کے آستانہ پر جھکتا رہتا ہے، وہ دل جو حریم الٰہی سمجھے گئے تھے اب نہ جانے کن کن معائب و معاصی کا مسکن ہیں، وہ نگاہیں جو معرفتِ ربانی کی لطافتوں سے چھوا کرتی تھیں اب کیف و کم کے اسرار کو بھول کر دنیا کے قدموں پر بچھا ور ہو رہی ہیں، غرض اب یہی حشو و زوائد ملتِ حنیف کے اجزائے ترکیبی بنکر رہ گئے ہیں اور اسی پر اسلام کے نام لیوا (شیعہ ہوں یا سنی) سب زندہ ہیں، افسوس اس کا ہے کہ اپنے منھ سے علمبردارانِ توحید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں اور عمل کے لحاظ سے وہ کام کرتے ہیں، جن سے قرآن ساکت احادیث خاموش اور اہلِ بیت کی تعلیم بیزار ہے۔

ہر فرقہ اگر اپنی جگہ غور کرے گا تو ہزار ہا ایسے معائب ملیں گے جو اسلام اور تعلیم اسلامی سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ توحید ربانی کے روشن خد و خال چھپ گئے اور مسلمان رفعت کے بلند کنگرہ سے گر کر پستی کے عمیق غاروں میں کھو گئے ہیں، سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہ قیاسی اصول دل و دماغ میں اتنے زمانۂ دراز سے پرورش پا رہے ہیں کہ اب ان کی مضبوط جڑیں ہلائے نہیں ہلتیں، اور ان کے خلاف لب کشائی کرنا طعن و تشنیع کا ہدف بنتا ہے اور کافر و زندیق کے القاب کا مستحق ہوتا ہے۔

کاش دینِ حنیف کے پیرو صرف اس پر غور کر لیں کہ اسلام کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال جسقدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے، اُسی قدر آسان بھی ہے، اسلام نام ہے توحید ربانی کا، اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لانے کا، اللہ کے اُن پاک نہاد بندوں کی صداقت کو تسلیم کرنے کا جو بنی نوع کی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے تھے، اسی کو رسالتمآب نے ذہن نشین کرایا، اسی کو خلیفۂ رسول نے پیش کیا، اور اسی کو حسین کی

شہادت نے سمجھایا، اس درجہ سہل العمل اور آسان اُصول مذہب کو کج بحثیوں نے ایسا مسخ اور ناہموار کر دیا ہے کہ باطل پرست اقوام بھی اس کا مضحکہ اُڑا رہی ہیں، اس لئے صرف اتنا کیجئے توحید پر جمے رہئے، اور اسوۂ پیغمبر کو اپنا رہنما بنا لیجئے۔

کیا علیؑ کا فقر و فاقہ اور صبر و ضبط اسی لئے تھا کہ آخر میں اُنھیں کی جماعت اوہام باطل کا شکار ہو جائے کیا حسینؑ کی شہادتِ عظمیٰ کا یہی مقصد تھا کہ ان مجاہدین حق کی نسلیں حق و باطل میں امتیاز نہ کر سکیں اُن کے ضمیر منیر میں تو خدائے واحد کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہ تھا، انھوں نے تو صرف ایک خدا کے سامنے سرِ عبودیت جھکانے کی تعلیم دی تھی، خدا کا گھر اپنی پرستاری کے لئے نہیں، بلکہ خدا کی پرستش کے لئے بنایا تھا اور کیا نصیریؔ نے بھی جیسے مجنوں محبت کا انجام میرے اس دعوے کی دلیل نہیں ہے۔

یاد رکھیئے کہ باطل کی قوتیں ہمارے خلاف اجتماعی محاذ تیار کر چکی ہیں، اور ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لئے تیار ہیں، اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے تو یاد رکھئے کہ حق کی شکست ہمارے کمزور ہاتھوں سے ہو کر رہے گی اسلام آپ سے صرف "حسنِ عمل" کا طالب ہے اور اُس قول کا جو انسان کو خدا کے سوا ساری فانی قوتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، ثابت قدمی کے ساتھ اس راستہ پر جم جائیے، آپ اگر حسینؑ کی شہادت کو لا الہ کی بنا جانتے ہیں، آپ اگر حکیم علی الاطلاق کے درس قرآنی کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں تو اپنے قول و عمل سے دنیا کو دکھا دیجئے کہ ہم صرف خدا کے ماننے والے ہیں، رسولؐ کی رسالت پر ایمان لانے والے ہیں، علیؑ کی شجاعت و بصالت پر جان بیچنے والے ہیں، اور سید الشہدا کی تعلیمات شہادت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والے ہیں، بقیہ رسم و رواج ذہن انسانی کا ایک مشرکانہ مغالطہ ہیں اور قرآنی تعلیمات کا مضحکہ۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ یکایک ڈاکٹر امبیڈکر کا ایک بیان میری نظر سے گزرا جس نے ان خیالات میں ایک اور تازیانہ لگا دیا، ذرا اُسے بھی سُن لیجئے:-

> "بلا شبہ اسلام فی نفسہٖ بہترین مذہب ہے لیکن اگر میں اسلام اختیار کرنا چاہوں تو مجھے سب سے پہلے یہ عقدہ حل کرنا ہوگا کہ شیعہ بنوں یا سنّی، تعزیوں کو پوجوں یا خدا کو، مسلمان مختلف فرقوں میں اس طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ جس جوش سے تعزیوں اور قبروں کو پوجا جاتا ہے اگر میں وہ جوش ظاہر نہ کر سکا تو مجھے وہابی کہکر اسلام سے خارج کر دیا جائے گا، دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہئے کہ خود مسلمان بن جائیں اور اپنی اندرونی تفریق دور کریں"

آپ نے دیکھا یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جس کی طرف ہندوستان کی تقریباً ہر قوم کی

نظریں لگی ہوئی ہیں اور جس سے ملک کے ایک کثیرالافراد طبقے کی تقدیریں وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر چھوت چھات اور انسانی تفریق کی بناپر اپنے قدیم مذہب سے بیزار ہیں اور اپنی سوشل حیثیت کی ترقی اور تعمیر کے لئے چاہتے ہیں کہ ایسا مذہب اختیار کریں جو اُنھیں نوعِ بشری میں برابر کی سطح پر رکھ سکے، قدرتاً اُن کی نظر پہلے اسلام کی طرف اُٹھنی چاہئے تھی کیونکہ اسلام نہ صرف اُن کا قدیم پڑوسی ہے بلکہ اُسکی قرآنی تعلیم اُن کے مرض کا علاج بھی کر سکتی ہے اور اُن کو انسانیت کی صف میں مساوات کا درجہ بھی دے سکتی ہے لیکن جب اُنھوں نے خود مسلمانوں میں وہی اختلافات دیکھے اور وہی فقدان توحید پایا جس کی بنا پر اُنھیں اپنے مذہب سے شکایت ہے تو اُن کو مجبوراً کہنا پڑا کہ:۔

"دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہئے کہ خود مسلمان بن جائیں۔"

مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر شرمناک موقع اور کونسا ہو سکتا ہے کہ دُنیا اُنھیں مسلمان بھی نہیں سمجھتی میرے قلب میں نشتر چبھ رہے ہیں، عرقِ انفعال میں ڈوبا جا رہا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مسلمانوں کو یہ توفیق کب حاصل ہوگی کہ وہ اپنی تفریقوں کو دور کر سکیں گے، فرقہ وارانہ ذہنیت کو مٹا سکیں گے اور صرف مسلم ہی رہ کر زندہ رہیں گے، مسلم ہی کے لفظ سے قرآن نے بھی اُنھیں مخاطب کیا ہے اس کے ہوتے ہوئے انسانی دماغ کے اجتہادات ناقص ہی نہیں میرے عقیدے کے لحاظ سے ٹھکرا دینے کے قابل ہیں، کیونکہ وہ صرف مسلمان ہی تھے جنھوں نے ساری کائنات کو اپنے سایہ میں لیکر اخوت و مساوات کی تعلیم دی تھی اور اغیار کو انصار بنالیا تھا مگر افسوس کہ وہ تعلیم ۷۲ ٹکڑوں میں منتشر ہو کر ذراتِ بیابانی کی طرح پریشان ہو گئی ہر چند ہمارا دعویٰ یہی ہے کہ

"اسلام بہترین مذہب ہے"

لیکن ہمارا عمل بتاتا ہے کہ "خدائی تعلیم" کو بھول کر ہم اسلام کو رسوا و بدنام کر رہے ہیں، کوئی قبر پرستی کی دعوت دے رہا ہے اور کوئی تعزیہ و علم کی پرستش میں کھویا ہوا ہے!

غور کیجئے کہ جو بات ہمارے سمجھنے کی تھی اُس کو دوسروں نے آخر پا ہی لیا، ڈاکٹر امبیڈکر نے اسلام کو تو سمجھا لیکن ہمارے عمل کو دیکھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے احتراز کر رہے ہیں، اگر مسلمان، مسلمان ہوتے اور تفریقوں نے اُن کی وحدت کو کثرت کا نمونہ دیا ہوتا تو آج دنیا اُن کی طرف بیتابانہ دوڑتی، مگر رونا تو اس کا ہے کہ ہمارے اعمال و افعال نے ہم کو مسلمان بھی نہ رہنے دیا جس کی وجہ سے ہم تباہی کے اُس آخری زینہ پر بے سہارا کھڑے ہوئے ہیں کہ ——"اب گرے اور تب گرے"

اب سے پہلے نہ معلوم کتنی قومیں اپنے انھیں اعمال کی بدولت فنا کے گھاٹ اُتر چکی ہیں، یہی حالت سُنی شیعہ مسلمانوں کی ہے جن کی خدائی کتاب مخملی جزدانوں کے اندر نہایت احترام سے رکھی جاتی ہے اور

محراب و منبر کی زینت بھی ہوتی ہے، نہ اُس کو کوئی سمجھتا اور نہ اُس کو کوئی کھولتا ہے، رہ گئے رسالتمآب کے ارشادات سو اُن پر موضوع و معتبر کے حاشیہ چڑھا چڑھا کر نہ معلوم انھیں کیا سے کیا بنا دیا جس کا نتیجہ ہے کہ آج سنی و شیعہ مسلمان پیغمبر اسلام کے اسلام سے منزلوں دور جا پڑے ہیں۔

یقین کیجئے کہ اگر ہم اب بھی بیدار نہ ہوئے اور قرآنی تعلیم پر ہمارا ایمان قایم نہ ہوا صحیح ارشادات نبویؐ کو نہ سمجھ سکے، علیؑ کی صداقت کی پیروی نہ کر سکے حسینؑ کی شہادت سے سبق نہ لے سکے تو قہر خداوندی ہم پر نازل ہو کر رہے گا اور عذاب الہی کا کوئی جھونکا ہمیں خس و خاشاک کی طرح اُڑا لیجائے گا اور ہماری کفر آفرینیاں ہمیں اس طرح گم کر کے رہیں گی کہ شاید آنے والی نسلیں ہمارا پتہ بھی نہ لگا سکیں۔

خدا وہ وقت نہ لائے!

ہوش بلگرامی

(نگار) یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست مولانا ہوش بلگرامی کا ہے جو مذہبًا چاہے کچھ ہوں لیکن نسل و تربیت کے لحاظ سے یقینًا شیعہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج اسلام کے صحیح خد و خال بدعات و زوایید کے غبار میں اس قدر نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں کہ اگر یہی جذبات کسی سنّی کی طرف سے ظاہر کئے جاتے تو حضرات شیعہ غالبًا اس کی تاب نہ لا سکتے اور اسے عصبیت پر محمول کرتے۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ جب تاریکی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اسی فضا میں کچھ اسباب روشنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی ردّ عمل کے مختلف مظاہر کو بہ لحاظ مراتب، رسالت و امامت، اجتہاد و تفقہ، اور فکر و غور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مانا کہ رسالت کا دور ختم ہو چکا اور امامت فی زمانناپردۂ خفا میں ہے، لیکن اجتہاد و تفقہ تو موجود ہے (اگر وہ صرف عبائے سیاہ کا نام نہیں) عقل و شعور تو مفقود نہیں ہوئے (اگر مذہب نام ذہنی غلامی کا نہیں) اور بنا بریں فراستِ انسانی سے اس کا یہ حق کبھی نہیں چھینا جا سکتا کہ جو راہِ عمل اسکے لئے متعین کی جاتی ہے، پہلے اس کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھ لے اور ارباب اجتہاد کا فریضۂ اولین ہے کہ جب کوئی مطالبۂ عقلی ان کے حضور میں پیش کیا جائے تو وہ عقل و فراست سے بھی کام لیں اور اُس جرأت و ہمت سے بھی جو احکام عقل کے نفاذ کے لئے عقل سے زیادہ ضروری ہے۔

شیعی جماعت کے ارباب اجتہاد بھی اُصولاً اسوۂ حسینی کا وہی مفہوم قرار دیتے ہیں جو فاضل

مقالہ نگار نے بیان کیا ہے اور ان سے خلوت میں گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی ان تمام مراسم عزاداری کو جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے بُرا سمجھتے ہیں لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ اس باب میں عوام کی رہبری کیوں نہیں کرتے، ان لغو و شرمناک مراسم کا سدّباب کیوں نہیں چاہتے، تو وہ ایک سے زاید "عذرِ نارسائی" پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ مولوی ہر جگہ مولوی ہے خواہ وہ قبائے تشیع میں جلوہ افروز ہو خواہ عبائے تسنن میں۔

وہ سمجھتا ہے کہ ان تمام اسماء میں جن کا ذکر "علم آدم الاسماء کلہا" میں پایا جاتا ہے سب سے پہلا اسم جس کی آدم کو تعلیم دی گئی اسمِ ذات تھا یعنی اپنی ذات کی حفاظت، اپنے تشخص کی تعیین، اور اپنے داعیاتِ نفس کی رعایت۔ اس لئے کوئی ایسا قدم اٹھانا جو اس کے ذاتی اغراض و مصالح کے منافی ہو اس کے نزدیک نہ صرف کفرانِ نعمت بلکہ خدا کی نافرمانی میں شامل ہے۔

پھر آپ کسی مولوی یا مجتہد کو دیکھئے یہی حال اس پر غالب نظر آئے گا، اور اسی کی نمایش کی غرض سے وہ اپنے آپ کو ایسی ہئیت میں پیش کرے گا گویا ساری دنیا سے علحدہ کوئی اور مخلوق ہے جو با وجود انسان پیدا ہونے کے اپنے آپ کو انسان کہلانا اپنی توہین سمجھتا ہے جو باوجود اس زمین پر سانس لینے کے اپنے آپ کو آسمانی مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ اُلجھی ہوئی ریش دراز، وہ خشک و عبوس چہرہ، وہ پُرشکن پیشانی، وہ طویل الذیل عبائے خاکروب، وہ پرخشونت اندازِ تکلم وہ خدائے قہار کی شانِ جلالی ظاہر کرنے والی بھیانک آنکھیں، وہ فرعون کو شرما دینے والی ادائے خرام۔ الغرض یہ اور اسی قسم کی بہت سی خصوصیات جو گویا ہر وقت پکار پکار کر یہ اعلان کر رہی ہیں کہ "دیکھو ہم آرہے ہیں" اس قوم کے وہ معمولات ہیں جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتے اور مقصود صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے سے بلند و ممتاز سمجھ کر ان کی غیر معمولی عزت کریں اور اپنا ذریعۂ نجات جان کر ہر قسم کی ایثار و قربانی کا مرکز انھیں قرار دیں۔

اب غور فرمایئے کہ اگر یہ لوگ عوام کے ان اوہامِ باطلہ کو دور کر دیں اور صحیح علم کی روشنی میں مذہب کا مفہوم انھیں بتائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا صرف یہ کہ سوسائٹی میں مساوات پیدا ہو جائے گی، اور علمائے مذہب کا خود ساختہ تشخصِ علم و اجتہاد باقی نہ رہے گا جسے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے، ان کے دسترخوان کا تنوع، ان کے ملبوس کی رونق، ان کی خلوتوں کی رنگینی اور ان کا چار نکاح پر بھی بس نہ کر سکنے والا ہیجان، محض عوام کے جہل و باطل پرستی پر قائم ہے اور ان چیزوں کا دور ہو جانا اس طبقہ کی موت ہے۔

پھر اسوقت ضرورت اس کی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے جہل و گمراہی پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے بلکہ وقت یہ سوچنے کا ہے کہ علماء مذہب کے اقتدار کو کیونکر محو کیا جائے، ان عمامہ پوش بتوں کو کیونکر مسمار کیا جائے کہ قوم کے جہل اور اس کی تباہی و بربادی کی ذمہ دار جماعت تنہا صرف یہی ہے۔

ایک بار میں لکھنؤ کے ایک شیعی عالم سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے بھی مروجہ مراسم عزاداری کی مذمت بیان کی، لیکن اس کے بعد ہی امامیہ مشن لکھنؤ کی طرف سے (جس میں ان حضرت کا کافی اثر ہے) ایک رسالہ شایع ہوا، جس میں عزاداری کی تمام مروجہ صورتوں کو نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری قرار دیا گیا تھا۔ پھر جس قوم کے علماء کے ظاہر و باطن کا یہ حال ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہوگی، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور اس لئے اب صورت صرف یہی رہجاتی ہے کہ عوام کو ان کے اثر سے آزاد کرکے خود ان کو سمجھنے کا موقع دیا جائے اور علم و روشنی کی راہ میں جو یہ "حجابات تقدس" حایل ہو گئے ہیں انھیں دور کرکے افرادِ قوم میں ذہنی بیداری پیدا کی جائے۔

میں اکثر مجالس عزا میں شریک ہوا ہوں اور بارہا "واعظین محراب و منبر" کے مواعظ سنے ہیں، لیکن میرے سامنے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ انھوں نے مراسم عزاداری کی اصلاح کی طرف عوام کو مایل کیا ہو اور صحیح اسوۂ حسینی پیش کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہو۔ پھر چونکہ انکا تنہا مقصود لوگوں میں کیفیت گریہ و زاری پیدا کرکے ان کے قوائے عمل کو اور مضمحل بنا دینا ہوتا ہے، اس لئے وہ بیسیوں بزعم خود صحیح روایتیں بیان کرنے میں تو بہت دلیر نظر آتے ہیں، لیکن لوگوں میں صحیح ولولۂ عمل اور صداقت پرستی پیدا کرنے کے لئے انکے پاس کوئی جھوٹی روایت بھی نہیں ہوتی۔

سُنّی جماعت کی حالت اس سے بدتر ہے کیونکہ کثرت آبادی کے لحاظ سے ان میں علماء بھی اسیقدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ گر شیعوں کے یہاں بُت پرستی صرف عشرۂ محرم میں ہوتی ہے تو سنیوں کے یہاں تمام سال ہوتی ہے، اگر اہل تشیع کے بُت صرف تعزیہ و علم ہیں تو اہلِ تسنن کے یہاں ہر پختہ قبر یہی حکم رکھتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار چونکہ شیعہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کا رونا روتے ہیں، میں چونکہ کسی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے تمام عالم اسلامی کا رونا روتا ہوں ـــــ وہ دُعا کرتے ہیں کہ "خدا وہ وقت نہ لائے" اور میں سمجھتا ہوں کہ "وہ وقت آگیا ہے" اور قدرت کو جو فیصلہ کرنا تھا وہ ہو چکا ہے۔

جف القلم بما ھو کائن لہ

مکتوبات نیاز

صدیقی - عتاب نامہ ملا - حیران ہوں کیا کروں - آپ معذرت سننے سے رہے اور میں الزام تسلیم کرنے سے - وہ آپ کے دعوائے فرزانگی کے منافی ہے اور یہ میری خودداری کے خلاف - پھر سلجھے تو کیونکر؟ ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، آپ اس پر کاربند ہوں یا نہ ہوں لیکن سُن لینے میں کیا حرج ہے -

آپ ایک خط رشید صاحب کو لکھئے - ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ میرا دشمن اور کوئی نہیں — اور انھیں سے پوچھئے کہ قصور کس کا ہے - میرا یا اُن حضرت کا جن کی معصومیت کو آپ ریاضی کا ایک مسلمہ مسئلہ مانتے ہیں -

میں نے ان کو خط لکھا جواب نہیں دیا، آدمی بھیجا کوئی توجہ نہیں کی، خود گیا مگر باوجود وعدہ تشریف نہیں لائے - اب بتائیے کیا کرتا - میں نے ان سے کہدیا تھا کہ نواب صاحب پرسوں چلے جائیں گے اور کل کا وقت مقرر ہو چکا ہے، لیکن صبح سے دوپہر تک انتظار کرتا رہا، تشریف نہیں لائے -

مجھے جستجو ہوئی کہ کیا بات ہے - معلوم ہوا کہ وہ اس سے قبل خود براہ راست ملنے چلے گئے تھے اور وہاں سے مایوس واپس آئے - پھر اب کیا منھ لیکر جاتے اور اپنی اس خفت کو مجھ پر کیونکر ظاہر کرتے - کیا بتاؤں کتنا افسوس ہوا ہے، میں تمام مراحل زبانی طے کر چکا تھا اور کامیابی کی پوری توقع تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ اپنی حماقت سے انھوں نے تمام بنا بنایا کھیل بگاڑ کے رکھدیا -

اگر اس کے بعد بھی آپ مجھے موردِ عتاب قرار دیں، تو یہ آپ کی محبت ہے - اور کیا کہہ سکتا ہوں -

---

مکرمی - آپ نے بھی کس ظالم کا ذکر کیا - مجھ سے پوچھئے کہ وہ حضرت کیا ہیں اور کیا نہیں - ان کے انسان پیدا ہونے میں کلام نہیں لیکن ایک بے روح انسان — جس کی تنہا مسرت زندہ چیزوں کو کچلکر گزر جانا ہے - اب کیا بتاؤں میں نے کیسی کیسی بیدردیاں اس شخص کی دیکھی ہیں - آپ کو وہ ہستی یاد ہوگی جو اپنی صحت، اپنی مسرت اپنی زندگی اور اپنا وہ سب کچھ (جس کا سودا کونین کے عوض بھی گراں نہ تھا) اسپر قربان کر چکی تھی - پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جس وقت وہ نزع کے عالم میں تھی تو ان کی بے نیازیوں کی کیا کیفیت تھی -

ایک دن میں نے کہا کہ "پھول کی پنکھڑیاں توڑنے کے بعد انھیں مجتمع کر کے آپ پھر پھول نہیں بنا سکتے" بولے کہ "چمن میں جب تک پھولوں کی پیداوار بند نہیں ہوئی، اس پر غور کرنا حماقت ہے"۔

آپ اسے ذہن انسانی کی گمراہی بتاتے ہیں، میں قدرت کی ستم ظریفی کہتا ہوں، اور خدا کو نہ ماننے والے اس کو "عدمیت" کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

اندھیر ہے، ظالم کا ظلم جاری ہے اور اس کی کوئی سزا نہیں، مظلوم کی کراہوں سے فضا گونج رہی ہے اور کوئی سننے والا نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ دوسری دنیا میں ہوگا، اس کی مصلحت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ فیصلہ کرنے والے کا ہاتھ یہاں کس نے پکڑا تھا کہ وہاں چھوڑ دے گا۔ خیر اس قصہ کو جانے دیجئے، یہ بتائیے کہ آپ کی اُن کی یکجائی کیونکر ہو گئی۔ میں سننا چاہتا ہوں، بہت لطیف داستان ہوگی۔

مجھے تو ان سے ملے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، لیکن سنتا ہوں کہ خوش ہیں، اچھے ہیں۔ آپ کو اگر اور زیادہ تفصیلی حالات معلوم ہوں تو مطلع فرمائیے، مجھے ان سے اور ان کے واقعات زندگی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور رہیگی

اے حضت ، یہ آپ میری طرف سے اس قدر مایوس کیوں ہیں۔

چشم ہماں قوت دیدش ہماں !

مجھے یاد کر کے تو دیکھئے، اس طوفانِ آب و رنگ سے، کون ہے، جو اپنی جان سلامت لے آئے گا، اس گلی میں جانے کے لئے کون اپنے "دین و دل" کو عزیز رکھے گا۔ مگر میں خوب جانتا ہوں یہ سب جی جلانے کی باتیں ہیں ورنہ آپ

دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رحم درا ہیں

مجن صاحب کا حال سنکر بہت ملال ہوا۔ اللہ اللہ، وہ بزم جہاں سوائے رندان باصفا کے اور کسی کا گزر نہ تھا، آج وہاں "[illegible] سالوس" کی حکومت ہے۔

عبرت آتی ہے کہ کیا تھا، ویراں ہو گیا !

دیکھئے [illegible] [illegible] مرتب ہو جاتی ہیں۔ انجام خراب ہو گا ان کا [illegible] صحبت سے اور دنیا سمجھے گی کہ ان کو تباہ کیا [illegible] نے۔ میں تو کہہ دیجئے کہ آپ کس دھوکے میں مبتلا ہیں، روح کی تشنگی کو وہی چیز بجھا سکتی ہے جس نے اس تشنگی کو پیدا کیا ہے۔

پاک ست خرقہ کہ بہ مے شستہ و شو کنند

خوشا نصیب، کہ آخر کار آپ کو اس دور افتادہ پر رحم آ ہی گیا۔ آپ نہ سہی آپ کے الفاظ تو ہیں۔

بالذتِ دیدار زپیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد

حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کی بے اعتنائی کا اتنا گلہ نہیں ہے، جتنا اپنی شکستہ پائی کا، کیونکہ میرے پاس سوائے خاموشی کے کوئی عذر نہیں اگر آپ میرے شکوہ و شکایت کے جواب میں یہ کہہ دیں کہ "گر میں نے کی تھی توبہ" تو نا معقول تجھے کیا ہوا تھا۔

بہرحال میرے لئے یہ مسرت بھی کم نہیں کہ آپ کو میرے اس "رنجِ دوری" کا احساس ہے۔

آپ نے جس امر میں میری سعی چاہی ہے، وہ اس حیثیت سے کہ یوسف کی "دل باختگی" اس سے متعلق ہے، یقیناً لائقِ توجہ ہے، لیکن انجام کے لحاظ سے مجھے زیادہ پسند نہیں۔ ان کے لئے تو یہ تعلق باعث صد ہزار شرف ہے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے سلطانہ آسانی سے راضی نہ ہوگی اور جبر و اکراہ کے ساتھ "ہاں" کر بھی دی تو تعلقات کی شگفتگی معلوم۔

میں یہ جانتا ہوں کہ وہ "تعلیم یافتہ" ہے "تعلیم زدہ" نہیں اور والدین کی مرضی کی خاطر وہ اپنے دل کو مجبور بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ "یوسف" کی ملاقات سے بہت پہلے وہ کسی اور سے "پیمان محبت" کر چکی ہے اور حتی المقدور وہ اسے بنا ہنے کی کوشش کرے گی۔

پھر اگر آپ سودا صرف جسم کا کرنا چاہتے ہیں، دل کا نہیں، تو میں کوشش کے لئے آمادہ ہوں، ممکن ہے بار آور ہو جائے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا گھر ماتم کدہ بن جائے گا اور ممکن ہے کہ یوسف کبھی اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکیں۔

یقیناً معاملہ بہت نازک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یوسف کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ چیز ہی ایسی ہے لیکن تمناؤں کا خون ہو جانا بھی تو کوئی نئی بات نہیں۔ بہرحال ایک نفسیاتی تدبیر میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ آپ انھیں میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ وہ خوب سیر ہو کر دیکھ لیں، ممکن ہے "نگاہِ اولین" کا عشق "نگاہِ ثانی" کے بعد کچھ ہلکا پڑ جائے اور اس کا بھی امکان ہے کہ تکلف ٹوٹنے کے بعد "ترپاہٹ" اتنی باقی نہ رہے۔ ان سے کہئے کہ کچھ تو شرم اپنے نام کی رکھیں۔ ایسی بھی کیا بیتابی ہے۔ زلیخا وہی ہے جو اپنے اوپر جان دے۔

یہ کیسے یوسف ہیں کہ خود زلیخا کے لئے مٹے جا رہے ہیں۔

گرامی جناب - والا نامہ پہونچا - شکریہ - مشورہ درست ہے لیکن کیا کروں،

ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعیم را

آپ کو معلوم نہیں، میں جانتا ہوں کہ اس باب میں کتنی بدلینگی مجھے عطا ہوئی ہے - کیا ہجوم افکار میں مبتلا رہنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے - کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ میں بھی دادِ عیش دوں لیکن جس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیسی کیسی قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہے تو اپنی بیکسی و بے چارگی کے ساتھ میری محبت اور بڑھ جاتی ہے -

میں ناشکرگزار نہیں ہوں، لیکن میری التجا یہی ہے کہ کسی ایسی بات پر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ آخر کار خود مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہونے لگے ــــ آپ کی دلی ہمدردی کا کرر شکریہ -

---

مجمع الادب، اسماعیل کالج جوگیشوری کا

"انعامی مقابلہ"

اسماعیل کالج میں ۷؍ فروری کو جو "یوم ولی" منایا گیا تھا اس کو قومی و علمی صورت سے مستقل و مفید بنانے کے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشاپردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کی جائے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں - جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے انکے لئے معقول انعامات پیش کئے جائیں گے - انشاپردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا تمغہ اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائے گا - موصول مضامین میں سے چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شایع کئے جائیں گے - مضامین مندرجہ ذیل پتہ پر یکم جولائی ۱۹۳۷ء تک پہونچ جانا چاہئے - طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے اعلیٰ افسر کے ذریعے روانہ کرنا چاہئے - کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جا چکا ہے روانہ نہ کیا جائے -

(۱) اردو ادب و شاعری میں ولی کا درجہ - (۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اردو کا درجہ - (۳) ولی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات - (موجودہ اردو ادبیات پر ولی کا اثر -

مجمع الادب - اسماعیل کالج جوگیشوری -
۲۰؍ فروری ۱۹۳۷ء -

نجیب اشرف ندوی
صدر شعبۂ اردو

لامذہبیات

آجکل کے ملحدین کیا کہتے ہیں؟

(بہ سلسلۂ ماسبق)

دو راستوں میں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟

ہمارے سامنے دو راستے ہیں ایک وہ جو فطرت اور عالم اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مایل کرتا ہے — یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، اکتشافات و اختراع، سعی و کاوش اور رشتۂ علت و معلول کی طرف متوجہ کرکے راحت و آسایش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لئے بلا سبیل و حجت ہمکو قربانیاں، دعائیں، اور عبادتیں کرتے رہنا چاہئے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابناء جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کیلئے اسباب راحت و سکون فراہم کرنے کا۔

دوسرا کہتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے۔ ایک عقل و حقایق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقاید پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمھارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کردو

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید!

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زاید کچھ نہ کر سکتے تھے — وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاعت و عبادت، دعا و قربانی نہ کریں گے تو

نہ بارش وقت پر ہوگی اور نہ ان کی کھیتیاں بارآور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر اتر آتا ہے۔ وہ خدائے خیر کے ساتھ خدائے شر کے بھی قایل تھے اور انھیں دو خداؤں کے درمیان بیم و رجا کی "رعشہ بر اندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی اُن سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انھیں بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے، وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے اور جب چاند یا سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے — تمام فضا انھیں فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی اور شب و روز وہ صرف اس لئے الحاح و زاری، کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے۔ غرض یہ تھا ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں خوفناک آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لیکر پیدا ہوئے اور انھوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیات انسانی کی خصوصیات، اعضائے جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں۔

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں، کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، علمی انکشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصول فطرت نے لیلی۔ پھر روح کے اس احساس آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور ارباب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو بری طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیونکہ یہی ایک چیز اُن کی دسترس سے دور تھی، اس لئے وہ اہل علم کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اُتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا۔ ان کو ذریات شیطان بتایا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا، ان کے مٹا دینے کا نام

مذہبی جہاد قرار پایا اور استعمالِ آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ خوں آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جایز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذبات انسانی کو فنا کردو اور ضروریات زندگی کو کم، اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھکر تمام کام اسی پر چھوڑ دو۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذبات انسانی اسی لئے پیدا ہوئی ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہونچائی جائے اور ضروریات زندگی کا بڑھانا بھی لازم ہے کیونکہ بغیر ان کے انسان کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہوسکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض ظہور میں نہیں آسکتی۔

ایک فریق کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنونِ لطیفہ کے دشمن تھے، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکام تھے غربت و افلاس کے، تنگی و گرسنگی کے، جھونپڑوں کے، پیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ رو عملِ خودکشی کے جو دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم کو ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوائے عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب و نشاط و راحت سے معمور دکھائی پڑتی تھی۔ وہ امرا، اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوتِ بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوائے گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا در خور محال سمجھتے تھے۔

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے صدہا سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسمِ متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہوجاتا ہے، بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتماد ذاتی کا اور آسمان سے لیکر زمین تک تمام مناظر قدرت پر چھا کر رہجانے کا اب وہ اس کا قایل نہیں ہے کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق، اب وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جزا و سزا اور مافوق الفطرت قوت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے

اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ وجنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے، اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ جہول و بیکار زندگی بسر کرکے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی ومحنت سے کام لیکر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا بادشاہ بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہوگیا یہ عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصول وعقاید کو بغیر چون وچرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے، بہت کچھ ہٹ گیا ہے، خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی عقائد بھی محو ہوتی جا رہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لیلی ہے، فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یوروپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو نمایندہ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہوگیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اٹھانے کے بعد پہونچا ہے اور استعمال عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا جسوقت تک وہ اپنی فہم وفراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا، بیشک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوف جہنم سے تائب رہنا ہے اور حصول نجات کے لئے یہی کافی ہے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لئے روزی فراہم کرسکتا ہے نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مایل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اسی کی طرح جرم ومعصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا، اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے اس لئے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبۂ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ سوائے اپنے تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دیگا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب واقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوائے اپنے معبد کے کسی اور کی پرستش گاہ کی عزت نہ کرے گا، سوائے اپنے طریق

عبادت کے وہ کسی اور اصولِ بندگی کا احترام نہ کرے گا، وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو وبیکار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے اور اسی کا پیغمبر پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے۔ خدا کو قادرِ مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے۔ وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے۔

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے۔۔۔ خدا اور اتنا غصہ! خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی ضرور ہوگی تو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا، خود ہی ان میں لغزش کی کیفیت پیدا کی اور خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے۔

الہامی صحائف خدا کے غیظ و غضب اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں۔ قوموں کو اس نے برباد کیا، بستیوں کو اس نے ویران کیا، وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کئے، حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسانوں کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار وہ ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے، اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے۔ نہ وہ اہلِ مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہلِ ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابلِ اعتنا خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے۔ کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ اراذلِ ذلیل مقابلہ

رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے، بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے، اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہوجاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب؟

حقایق عالم کے لحاظ سے صحف مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و سطح بتانا، طبقات الارض کا انتہائی درس ہے اور تاروں کو آسمان میں جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ۔

صحت و امراض کے متعلق دو نظرئے دنیا میں رائج ہیں، ایک مذہبی، دوسرا علمی، مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسمِ انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین و ارواح خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک خدمت انجام دی، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروڑوں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دعا تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا، مقدس اہل مذہب دعاؤں کے بہانہ سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اسوقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے، جنات و شیاطین یا ارواح خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذہب کی) کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں، اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحف مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبۂ خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو، لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی،

یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں اپنے کام میں مصروف ہے۔

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ نہ خدا کو طاعت وعبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے، اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا، طوفان وسیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انھیں دور نہ کر سکی۔ زلزلے آتے رہے، جوالا مکھی آگ برساتے رہے، ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ وزاری نے خدا کو اس ہلاکت آفرینی سے باز نہ رکھا۔ کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا حاصل نہ کر سکیں، وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے، غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز کہا گیا، شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے، اور ان کی فریاد وزاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ دنیاوی بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس عمل سے باز رکھا ہے وہی برا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے، خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے، گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجود خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بیکار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور موخر الذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے برے یا اچھے ہونے کا اصول قائم کیا گیا ہے، نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت

چوری کو برا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی، انسان کے تجربے نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے برا قرار دیا۔ تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی، اقتصادی و عمرانی نقصان پہونچاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو۔

پھر جو چیز اس لحاظ سے بری ہے وہ یقیناً بری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو۔ واقعات و تاثرات کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی، جس طرح قدرت ایک مربع کو دایرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بری بات کو اچھی اور اچھی کو بری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہل مذہب نے جو نظریۂ اخلاق قائم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا، ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملیگا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بنا پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے، اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اسوقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لیجاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سو اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہل فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے، صدیوں تک امداد خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر جمع کرے گا، ان کی قوتوں، ان کے معبدوں اور قربانگاہوں کو از سر نو تعمیر کرے گا، لیکن صدیوں پر صدیاں گزر گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوائے غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی سے بولنے کا حق حاصل رہا جو صاحب جاہ و ثروت تھے۔ عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں، ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا، اور سوائے رنج غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظائف، روزہ و صلوٰۃ، وعظ و پند سبھی کو آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت

لیکن ظالم کرکوں کا غلام بنکر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خوف و وہم پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے کو عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی ہوئی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ۔ پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے، بادشاہت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا ڈھکیل دیتے تھے، نہ ان کے دلوں میں رحم تھا، نہ آنکھوں میں مروت، ادنیٰ ادنیٰ سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی۔

ازمنۂ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادم انسانیت تھا۔ ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بیشمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ، جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلہ میں اُس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے۔ کیا صاف و ہموار راستہ ہے۔ کیسی کھلی ہوئی فضا ہے، کیسی پُر بہار زمین ہے۔ ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہونچائے۔ نہ وہاں سولیاں ہیں، نہ قید خانے، نہ جہنم کے اژدہے ہیں نہ فرشتوں کے کوڑے۔ قدرت کی وسیع نعمتوں سے ہر شخص یکساں فائدہ اُٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر روشنی پہنچا رہا ہے۔ انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے مٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغلگیر نظر آتا ہے۔

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اُٹھتا ہے۔ سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدہے گنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں، ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں، آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس انہی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں، وہ اس

چیختے تڑپتے ہوئے بچے کو [illegible] میں پیٹ کے بل [illegible] ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ذبیحہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں ۔۔۔ اس کے بعد مجھے وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی ان کی قربانگاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی میں انسانی گوشت [illegible] کیا جاتا ہے۔ پھر چند عبادتگاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربانگاہیں بیلوں اور بھیڑوں کے خون سے تر ہیں ۔۔۔ اس کے بعد ہی مجھے کچھ نئے معبد، کچھ اور پجاری کچھ اور قربانگاہیں نظر آتی ہیں، جہاں انسانی آزادی کی [illegible] چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں [illegible] اور بادشاہوں کے جسم زرنگار قباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو [illegible] چیتھڑا بھی نہیں ۔۔۔ [illegible] یہ کہ قیدخانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، [illegible] سر ٹکرا رہی ہیں۔ آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور [illegible] انسانوں کی چیخ [illegible] فضا میں گونج رہی ہیں ۔۔۔ آہ وہ تاریک قیدخانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ [illegible] وہ جھلسے ہوئے [illegible] چہرے، وہ اینٹھنے والے اعضاء، وہ شکنجوں میں کسے ہوئے [illegible] ٹوٹنے کی آوازیں ۔۔۔ اس کے بعد جو میری نگاہ اٹھتی ہے تو [illegible] مجھے [illegible] روشنی نظر آتی ہے، انسانی جسموں کی راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے [illegible] آزادی [illegible] ہو رہی ہے اور آہستہ آہستہ زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں، قربانگاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادتگاہیں مسمار ہو رہی ہیں، زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں، اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں ۔۔۔ پھر میں [illegible] دیکھتا ہوں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے کیا نظر آتا ہے۔ یہ کہ ۔۔۔ پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں، قربانگاہیں [illegible] تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں، [illegible] نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ۔۔۔ ان کی جگہ ایک نیا مذہب [illegible] جس کا نام آزادی [illegible] ہے اور ایک نئی سلطنت قایم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر [illegible] ہے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن۔ نہ کوئی قیدخانہ ہے، نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں، نہ جرم و معاصی کی داستان۔ ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوائے صداقت کے کسی چیز کا گذر نہیں، سوائے حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں۔ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، مستقبل کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی تعمیر میں۔

دوا فروش کی بیوی

بی ۔۔۔ کا مختصر سا قصبہ جو دو یا تین پیچیدہ سڑکوں پر مشتمل تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن شہر سے دور، بہت دور، البتہ کتوں کے بھونکنے کی مدہم مگر خوفناک آواز آ رہی تھی۔ پو پھٹنے کے قریب تھی۔

ساری دنیا غافل سو رہی تھی۔ وہ تنہا ہستی جو ابتک بیدار تھی ڈاکٹر ٹونیبلک کی بیوی تھی جس نے بی میں دوا فروشی کی دوکان کھول رکھی تھی، وہ بستر پر سو جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور تین، دفعہ کچھ دیر سو کر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر اس بے خوابی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے کھلی کھڑکی سے سڑک کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی روح مضمحل، افسردہ، اور غمگین تھی، اتنی مغموم کہ اس کا دل بے اختیار چیخ اٹھنے کو چاہتا تھا۔ اور اب بھی وہ اس اضمحلال کا سبب سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا جو بتدریج سخت ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔ اور اس کے پیچھے کی جانب کچھ ہی فاصلہ پر ڈاکٹر بیچارا دیوار سے قریب پاؤں پھیلائے خراٹے لے رہا تھا۔ ایک لالچی پسو اس کی ناک کی نوک پر نیش زنی کر رہا تھا مگر اسے اس کی خبر تک نہ تھی۔ وہ خواب کی حالت میں بھی مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اسوقت یہ خواب دیکھ رہا ہو کہ شہر کے ہر فرد کو کھانسی ہو گئی ہے اور ہر شخص اس کی دوکان سے "شاہ ڈنمارک کی کھانسی کے قطرے" خرید رہا ہے۔ وہ اب سوئی چبھونے سے بھی جاگ نہیں سکتا تھا۔

دوا فروش کی دوکان، شہر کے انتہائی سرے پر واقع تھی، اس لئے دوا فروش کی بیوی کھیتوں کی طرف دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔

یکایک، رات کی خاموشی میں قدموں کی چاپ اور آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز قریب تر ہوتی گئی ۔۔۔ "یقیناً یہ افسران ہیں جو اپنے گھروں سے خیمے کی طرف جا رہے ہیں"

دوا فروش کی بیوی نے دل میں سوچا۔

اس کے بعد دو شکلیں، افسروں کی سفید وردی میں ملبوس نظر پڑیں۔ ایک دراز قد اور فربہ، دوسرا نحیف اور پستہ قد۔ قدم اُٹھاتے اور بلند آواز سے گفتگو کرتے ہوئے وہ دوکان کی سمت چل پڑے۔ جب وہ دوا فروش کی دوکان کے قریب پہونچے تو انھوں نے اپنی چال بالکل آہستہ کر دی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں پر دوا فروش کی دوکان ہے" نحیف شخص نے کہا۔

"اور یہ بالکل صحیح ہے!" "آہ مجھے یاد ہے میں گزشتہ ہفتہ یہاں ایک دوا لینے آیا تھا۔ یہاں ایک ژولیدہ مُو اور بھدے جسم کا دوا فروش رہتا ہے"

"ہاں، درست!" دراز قد نے ہلکی آواز میں کہا۔ دوا فروش سو رہا ہے اور اسکی بیوی بھی سو رہی ہوگی۔ او تبلکو، وہ بڑے دلکش خدوخال کی عورت ہے"

"میں نے اُسے دیکھا ہے۔ وہ بیحد حسین ہے۔ ڈاکٹر مجھے بتاؤ کیا وہ اُس گدھے سے محبت کر سکتی ہے؟"

"نہیں، یقیناً وہ اس سے محبت نہ کرتی ہوگی" ڈاکٹر نے یہ کہکر اس طرح سانس لی جیسے اُسے دوا فروش سے بیحد ہمدردی ہو۔ "کھڑکی کے قریب وہ نازک اندام حسینہ، خواب نوشیں کے مزے لے رہی ہوگی۔ کیوں؟ اس کا ننھا سا دہانہ کھلا ہوگا — اور ایک نازک پاؤں پلنگ کے نیچے پڑا ہوگا مجھے دعویٰ ہے کہ وہ بے وقوف دوا فروش اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ وہ کس درجہ خوش نصیب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حسین عورت اور ایک بوتل شراب میں اُسے کوئی امتیاز نہیں"

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر" افسر نے رکتے ہوئے کہا۔ "ہم دوکان میں چل کر کوئی چیز خریدیں۔ شاید کسی بہانہ سے ہم اُسے دیکھ سکیں"

"کیا بات کہی ہے — شب میں؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے چلو اندر چلیں"۔

"جیسی تمھاری مرضی"

دوا فروش کی بیوی نے پردے کی اوٹ سے گھنٹی کی آواز سُنی۔ شوہر کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے، جو پہلے کی طرح مسکرا رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا، اُس نے اپنا لباس پہنا، اپنے ننگے پیروں کو جوتوں میں چھپایا، اور دوکان کی طرف بھاگی۔ شیشے کے دروازے کی دوسری جانب اُسے دو سائے نظر پڑے اُس نے جلدی سے روشنی کی اور دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھی، اور اب ...... نہ وہ افسردہ تھی

غمگین اور نہ اب اس کا جی چلّانے کو چاہتا تھا، مگر دل ضرور دھڑک رہا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر اور پستہ قد اولبشکو اندر داخل ہوئے۔ اب وہ انھیں بجلی کی روشنی میں صاف دیکھ سکتی تھی۔ ڈاکٹر، توانا تنومند اور قوی الجثہ تھا۔ اُس کے داڑھی تھی اور وہ آہستہ رَو تھا۔ ذری سی جنبش میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی پتلون پھٹ جائے گی اور اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔ افسر، سُرخ رُو، داڑھی منڈا، نازک اور انگریزی بید کی طرح لچیلا تھا۔

"میں آپ کو کیا پیش کروں" دوا فروش کی بیوی نے اپنے سینے پر پڑے ہوئے لباس کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیدیجئے.... ار... ار.... چار پنس کی پیپر منٹ کی گولیاں"

تیزی سے دوا فروش کی بیوی نے طاق سے بکس اُتارا اور گولیاں تولنے لگی۔ ڈاکٹر نے ایک آسودہ بلی کی طرح اس پر سے نظریں ہٹالیں لیکن اس کے برعکس، لفٹنٹ اُسے برابر خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے ایک خاتون کو ایک دوا فروش کی دوکان میں کام کرتے دیکھا ہے" ڈاکٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے" دوا فروش کی بیوی نے سُرخ رو افسر کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر کا کوئی مددگار نہیں ہے اور میں ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہوں"

"بالکل صحیح۔ تمھاری چھوٹی سی دوکان نہایت عمدہ ہے! کتنی بوتلیں ہیں۔ اور تمھیں ان زہروں کے درمیان چلتے ڈر نہیں معلوم ہوتا؟ کمال ہے!"

دوا فروش کی بیوی نے پڑیا کو تہہ کیا اور ڈاکٹر کے حوالہ کی۔ اولبشکو نے قیمت ادا کی۔ آدھ منٹ تک خاموشی مسلط رہی۔ مردوں نے تبادلۂ نگاہ کیا، دروازے کی جانب ایک قدم بڑھایا، اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"براہ کرم کیا آپ دو پنس کا سوڈا بھی دے سکتی ہیں؟" ڈاکٹر بولا۔ پھر دوا فروش کی بیوی نے آہستگی اور خاموشی سے اپنا ہاتھ طاق کی طرف بڑھایا۔

"کیا آپ کی دوکان میں کوئی چیز مثلاً...... اولبشکو اپنی اُنگلی ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ کوئی چیز نشہ آور.... فرحت بخش .... ہے؟

"ہاں!" دوا فروش کی بیوی بولی۔

"خوب! تم عورت نہیں چھلاوا ہو۔ تین بوتلیں لاؤ"

دوافروش کی بیوی نے آہستہ سے سوئچ کی پڑیا کو تہ کیا اور دروازہ کی راہ سے تاریکی میں گم ہوگئی۔"

ایک منٹ بعد دوافروش کی بیوی آئی اور اُس نے پانچ بوتلیں کھڑکی پر رکھدیں۔ اُسکے رخسارے تمتائے ہوئے اور سُرخ تھے۔

[illegible] بوتل کا کاگ کھول کر اُس کے ڈھکنے کو الگ رکھتے ہوئے بولا۔ "اتنا شور نہ کرو تمھارا میاں جاگ اُٹھے گا۔"

"تمھیں [illegible] اُسے بیدار کردوں ؟"

وہ کیسی [illegible] نیند سو رہا ہے۔ وہ تمھارے خواب [illegible] تمھارا [illegible] سکے!

ڈاکٹر [illegible] گھونٹ لے کر بولا۔

"[illegible] کہ وہ ہمیشہ سوتے رہیں تو اچھا۔"

"[illegible] کیا لطف دے جاتا۔"

"[illegible] دوافروش کی بیوی ہنسی۔

[illegible] دوافروش [illegible] پیتے۔ حالانکہ دوا کی طرح تمھیں شراب [illegible] تمھارے یہاں کوئی شراب ہے ؟"

"ہاں!"

"تو تھوڑی سی لاؤ۔ [illegible] جلدی کرو!"

"تمھیں کتنی چاہیے؟"

"[illegible] دیکھا جائے گا۔"

ڈاکٹر اور [illegible] کھڑکی کے قریب اپنی ٹوپیاں اُتار کر بیٹھ گئے اور شراب کا دور چلنا شروع ہوا۔

شراب [illegible] اُس کا [illegible] انگور کی طرح ہوتا ہے۔

— "تم بڑی دلکش ہو [illegible]! میں تصور میں تمھارے ہاتھ کا بوسہ لے رہا ہوں۔"

— میں اسے حقیقت میں منتقل کرنے کے لئے ایک بڑا سرمایہ خرچ کرنے کے لئے طیار ہوں بلکہ زندگی قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔"

"یہ بہت ہے!" بیگم ٹکرنویک نے لجاتے اور سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔

"تم کیسی نادان ہو" ڈاکٹر اُس کے سراپا پر ایک نگاہ پسندیدگی ڈالتے ہوئے نرمی سے ہنسا "تمھاری آنکھیں چنگاریاں برسا رہی ہیں! میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تمنے میری روح پر فتح حاصل کر

اور ہم مفتوح ہو گئے:

دوافروش کی بیوی نے ان کے سرخ بھبھوکے چہرے کو دیکھا، ان کی گرمجوشی اور محبت بھری باتوں کو سنا، اور وہ بھی زندہ دلی اور نرمی سے بولنے لگی۔ وہ کتنی مسرور تھی! اس کی زندگی کی ابتدا دو ہی ساعت پہلے ہوئی تھی! ان کی باتوں میں وہ بھی دلچسپی لینے لگی، ہنسی، لجائی اور ان کے اصرار پر دو جام پی گئی۔ آخر وہ بولی۔

"آپ حضرات میرے یہاں کبھی کبھی ضرور تشریف لایا کریں۔ میری زندگی اس جگہ بیحد سرد اور بے لطف گزرتی ہے۔ میں تو اس زندگی کے ہاتھوں ایک دن مرجاؤں گی۔"

"میں آپ کی تجویز پر غور کروں گا۔" ڈاکٹر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "فطرت کا شاہکار یوں بے وقعتی کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے! اب ہمیں چلنا چاہئے۔ آپ کی شناسائی سے مسرت ہوئی، بتائیے آپ کو کیا دام چاہئیں۔"

دوافروش کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں چھت کی طرف اٹھائیں اور اس کے لب کچھ دیر جنبش میں رہے۔

"بارہ روبل اڑتالیس کوپیک۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

ابشکوف نے اپنی موٹی تھیلی نکالی اور نوٹوں کو کچھ دیر گننے کے بعد رقم ادا کر دی۔

"تمہارا شوہر میٹھی نیند سو رہا ہے۔ وہ خواب دیکھ رہا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا اور چلتے وقت اسکے ہاتھوں کو دبایا۔

"میں ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتی۔"

"کونسی باتیں! اس کے برخلاف یہ کوئی بری بات نہیں۔ شکسپیر نے کہا ہے: "شاد ہے وہ جو اپنے عہد شباب میں بھی نوجوان ہے۔"

"میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔"

آخر بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اور خاتون کے ہاتھوں کا الوداعی بوسہ لیکر خریدار دوکان سے بلا ارادہ چل کھڑے ہوئے۔ گویا وہ حیران تھے کہ وہ کوئی چیز تو نہیں بھول آئے۔

وہ تیزی سے سونے کے کمرے کی طرف گئی اور اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اس نے ڈاکٹر اور افسر کو دوکان سے نکلنے کے بعد سست قدموں سے جاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ ٹھہر گئے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ لیکن کس چیز کے متعلق؟ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی پلکیں پھڑکنے لگیں لیکن کیوں؟ یہ اسے خبر نہ تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ان کی سرگوشیاں اس کی قسمت کا فیصلہ کر رہی ہوں۔ پانچ منٹ بعد، ڈاکٹر اشکو سے جدا ہو کر چلا گیا اور اشکو واپس لوٹا۔ وہ دوکان سے ہو کر ایکبار پھر گزرا۔

دروازے کے قریب رک جاتا اور پھر آگے کی طرف بڑھ جاتا - آخر گھنٹی کی مدھم آواز سنائی دی - "کیا ہے، وہاں کون ہے؟" دوافروش کی بیوی نے دفعتاً اپنے شوہر کی آواز سنی - "دروازہ پر گھنٹی بج رہی ہے اور تمھیں خبر نہیں ہوتی" اس نے سختی سے کہا - "کیا اسی طرح کام چلتا ہے؟" وہ اٹھا اپنی پوشاک پہنی اور نیم بیداری کی حالت میں سلیپر پہنکر جھومتا ہوا دوکان کی طرف چلا - "کیا ہے؟" اس نے اسٹو سے پوچھا -

"دیجیے ... دیدیجیے --- چار پنس کی پیپرمنٹ کی گولیاں"

مسلسل خرخراتے جمائی لیتے ہوئے غنودگی کے عالم میں دوافروش طاق تک گیا اور ڈبہ اٹھایا -

دو منٹ بعد دوافروش کی بیوی نے اسٹو کو دوکان سے باہر جاتے اور کچھ دور جا کر پیپرمنٹ کی پڑیا گرد و غبار سے اٹی ہوئی سڑک پر پھینکتے دیکھا - ڈاکٹر تاریکی سے نکل کر اس سے ملنے آیا .... وہ ملے اور قہقہا لگاتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں روپوش ہو گئے -

"میں کس درجہ افسردہ ہوں" دوافروش کی بیوی اپنے شوہر کو غصہ سے دیکھکر بولی -

"میں چار پنس کھڑکی پر بھول آیا ہوں" دوافروش چادر تانتے ہوئے بڑبڑایا - "اسے اٹھا کر صندوقچہ میں رکھدینا" اور فوراً ہی پھر سو گیا -

(روسی افسانہ)　　ابوالفتح سرمد

ضیا بدایونی اور مومن

(بسلسلۂ ماسبق)

ترے بال لاکر سونگھائے کہیں کہ غش ہوگئے چارہ فرمائے غش

شارح:- "شاید میرے غش کا علاج کرنے والوں نے علاج کی خاطر مجھے تیرے بال سونگھائے جو خود ان کی خوشبو سے بے ہوش ہوگئے"

صحیح ہے۔ مگر شعر میں دو نازک خیالیاں ہیں۔ ایک یہ کہ "غش ہوگئے" فریفتہ ہوگئے کے معنی میں مستعمل ہے اور دوسرے یہ کہ اغیار ہماری طرح نفیس طبع نازک دماغ نہ تھے لہذا انکو خوشبو سے غش آگیا۔[1]

افلاس سے کھایا کئے غم سبز خطوں کا افسوس کہیں زہر بھی ہم کو نہ ملا قرض

شارح:- "سبز خطوں اور زہر (جس کے کھانے سے رنگ سبز ہوجاتا ہے) کی مناسبت ظاہر ہے۔ افلاس کی وجہ سے غم کھانے میں بھی لطافت ہے"

حسینوں نے افلاس کی بدولت منھ نہ لگایا۔ غم کھایا کئے۔ زہر بھی قرض نہ ملا کہ اسے کھا لیتے اور قصہ پاک ہوجاتا۔[2]

تھا ربط غیر میں مرے مرنے کا انتظار اسے شوخ بیوفا تو وفادار ہے غلط

شارح:- "لوگ کہتے ہیں معشوق مومن کے ساتھ وفادار ہے۔ اس لئے کہ جب تک مومن نہ مرگیا۔ اس نے رقیب کے ساتھ ربط ضبط نہ رکھا۔ شاعر کہتا ہے یہ قول غلط ہے۔ اس لئے کہ وفاداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ رقیب سے کبھی نہ ملتا"

---

[1] (نگار) ان دونوں نازک خیالیوں کے صرف کرنے کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ مومن نے لفظ "کہیں" یہاں "شاید" یا "غالباً" کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

[2] (نگار) معلوم نہیں ہوتا کہ معترض کو اس شرح میں کیا اعتراض ہے علاوہ اس کے افلاس کی بدولت منھ نہ لگانے کا مفہوم پیدا کرنا بھی مومن کے مقصود کے خلاف ہے۔

لوگوں کے کہنے کا کوئی قرینہ شعر میں موجود نہیں ہے۔ خطاب محبوب سے ہے۔ بیوفائی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شاعر کے مرنے کے بعد اغیار سے ربط رکھتا ہے گویا اس کے لئے وہ اس کی مرگ کا منتظر تھا۔ غیر سے بھی بیوفائی اس لئے ثابت ہے کہ رابطہ میں تا حیات شاعر التوا رہا۔[1]

ڈر مری آہ سے ظالم نہ جلا جی کہ نہیں یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

شارح :- "تو جہنم سے ڈر کر میرا جی جلاتا ہے۔ مگر میری آہ سے نہیں ڈرتا یہ بھی جہنم سے کم نہیں"

میری رائے میں یہ شعر بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ واعظ (اپنے زعم میں عشق کو بدتر کاری مانکر) جہنم کا خوف دلا کر عشق سے مانع ہے۔ یہ سنکر شاعر کا جی جلتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ جہنم سے زیادہ شعلہ فشاں، آہ جو ہم نے قبول کر رکھی ہے۔ تو ایسا عشق ہوتا۔ کیونکر دو سکتا ہے۔ کیونکہ جہنم کا ڈر کیا۔ "میری آہ سے ڈر" کا خطاب ظالم سے ہے یعنی اس آہ سے ڈرایا جاتا ہے جو مظلوم کے دل سے نکلے۔ اس شعر کے طرز ادا نے آہ کو بالفعل موجود ظاہر کیا ہے یعنی وہ آہ جو سوز عشق کا حاصل ہے۔ موجود ہے۔ نہیں تیرے جی جلانے سے تجھ پر نہ پڑ جائے۔[2]

محفل فروز تھی تب و تاب نہانِ شمع پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدانِ شمع

شارح :- "شمع کے سوز نہاں نے محفل کو روشن کر دیا۔ چونکہ پروانہ شمع کا رازداں نہ تھا۔ اس لئے جل گیا۔ ورنہ وہ بھی اس کی روشنی سے متمتع ہوتا"

پروانہ (آتش رشک سے) جل گیا کہ جلوۂ محبوب اغیار کے لئے کیوں وقف ہے۔ یا یوں کہیے کہ رازداں نہ ہونے کی سزا میں جل گیا کہ وہ شمع کو محفل فروز سمجھا۔ حالانکہ تب و تاب نہاں محفل فروز تھی۔ شمع محبت کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ محفل فروزی شمع کیا تھی عشق کا شعلۂ سرکش جو حسن کے پیرہن میں مخفی

---

[1] (نگار) یقیناً شارح مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن معترض نے اپنے ایراد میں جو ٹکڑا غیر سے بیوفائی کا بڑھایا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔

[2] (نگار) شارح اور مقالہ نگار دونوں نے مفہوم کے اظہار میں غلطی کی ہے اس شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ مومن واعظ سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ تو جو مجھے ترک محبت کی نصیحت کرتا ہے تو کیا تجھے میری آہ کا ڈر نہیں جو شعلہ فشانی میں جہنم کے برابر ہے یعنی اگر اس تیری نصیحت پر ایک آہ بھی منہ سے نکل گئی تو جل کر خاک سیاہ ہو جائے گا۔

نہ رہ سکا اور اس صورت سے جلوہ گر ہوا [1]

پروانے کیوں نہ صدقہ ہوں اس آگ کے کہ ہے　　　ہر رشتۂ فتیلۂ زخمِ جگر چراغ

شارح :- "سوزش دروں کی وجہ سے میرے زخم جگر کی بتی کا ہر ڈورا چراغ کا حکم رکھتا ہے پھر پروانہ اس پر کیوں نہ صدقہ ہوں۔ فتیلہ۔ بتی۔ یہاں وہ بتی جو زخم میں رکھی جائے مراد ہے۔"

یہاں اس قدر کہنا ضرور تھا کہ پروانہ سے کنایتاً عشاق مراد ہیں اور اس آگ سے مراد عشق ہے عشاق آتش عشق پر فریفتہ ہیں۔ مٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ زخم جگر کی ہر بتی کا رشتہ سوزِ دروں کی برکت سے چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے۔ [2]

چھوڑا نہ لالہ زار میں ساتھ اُس نے غیر کا　　　ہر چند سینہ چیر کے میں نے دکھائے داغ

شارح :- "وہ لالہ زار میں غیر کے ہمراہ معروفِ گلگشت رہا۔ ہر چند میں نے سینہ چیر کے داغہائے رشک دکھائے۔ داغ اور لالہ زار کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔"

یعنی غیر کے مقابل خود کو پیش کیا۔ اور لالہ زار کے مقابل داغہائے دل کو۔ اصل مراد داغ عشق ہے۔ اور ضمناً داغ رشک بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ [3]

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف　　　دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

شارح :- "معشوق پہلے اغیار کو دیکھ کر مجھ کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں رشک کی وجہ سے اس (معشوق) کی طرف دیکھنا چھوڑ دوں۔"

رشک مانع دید نہیں۔ ہاں اغیار کا متوجہ ہو جانا مانع دید ہو سکتا ہے [4]

---

[1] (نگار) شارح کا بتایا ہوا مفہوم بالکل درست ہے۔ معترض اس شعر کو بالکل نہیں سمجھے۔

[2] (نگار) یہاں پروانے سے مراد پروانے ہی ہیں، عشاق نہیں۔ معترض کی تاویل نادرست ہے۔

[3] (نگار) اس میں بھی معترض نے خواہ مخواہ اپج کی لی ہے غیر کے مقابل خود کو پیش کرنے کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے۔

[4] (نگار) شارح نے صحیح مفہوم ظاہر کیا ہے۔

شب ہجر و روز وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں
کبھی کیا تغیر حال دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق

شارح :- "ہجر میں تیری شوخیاں یاد آتی تھیں۔ اس لئے دل کو قلق ہوتا تھا۔ اور چونکہ وصال کی یاد دل میں تھی اس لئے سکون ہو جاتا تھا"

شوخیوں کی یاد سے قلق ہونا عجیب ہے اور وصال کی یاد سے سکون ہو جانا عجیب تر۔ ہجر کی شب روز وصل کی شوخیاں (یعنی کبھی التفات کبھی ملال، کبھی بعد کبھی اتصال) میری نظر میں تھیں اس لئے دل کا حال بھی متغیر تھا۔ کبھی سکون تھا کبھی قلق۔ قلق ظاہر ہے۔ اور سکون کی وجہ یہ کہ خیال ہوتا تھا کہ ہجر ہجر نہیں ہے۔ یہ ایک عاشقی شوخی ایسی ہی ہے، جس طرح وصل میں چھپا ہو بیٹھے تھے[1]

آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

شارح :- "میرے دل میں عشق چھپا ہے۔ یہ اس معنی کی بات ہے کہ کسی پردہ نشیں کی بدولت میری جان پر آفت آئی ہے"

پہلا مصرع ایک دعویٰ تھا مومن نے دوسرے مصرع کو دعویٰ قرار دیا۔ اور پہلے دعویٰ کو دوسرے کے جان پر آفت آنے کا ثبوت قرار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی پردہ نشیں آفت جاں ہے۔ اس لئے عشق بھی دل میں چھپا ہے[2]

دیکھ حالت مری کہیں کافر
نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

شارح :- "کافر میری حالت دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ عشق نہیں ہے دوزخ ہے۔ یعنی دوزخ میں اتنا ہی عذاب ہوگا جتنا مومن کو عشق میں ہے"

کافر حشر و نشر جنت دوزخ کے منکر ہیں علاوہ اس کے شعر کا انداز بیان بھی ایسا نہیں جس سے یہ مفہوم لیا جائے کہ کافر بھی دوزخ کے قائل ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ مولانا نے "کہیں" کو فعل سمجھا مفہوم یہ ہے کہ:- او کافر (معشوق) کہیں میری حالت تو دیکھ۔ میری یہ حالت تو عذاب دوزخ ہے۔ اس کا نام عشق و عاشقی کیوں رکھا ہے[3]

---

[1] (نگار) دونوں نے غلطی کی ہے، شوخیوں کا تعلق صرف روز وصال سے ہے، شب ہجر سے نہیں۔ اس شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے اور صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہجر و وصال کی دو مختلف کیفیات (سکون و قلق کی) مجھ پر طاری تھیں

[2] (نگار) ایراد بالکل غلط ہے — [3] (نگار) معترض کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کافر حشر و نشر، دوزخ و جنت کے قائل نہیں ہیں۔ تمام غیر مسلم اہل مذاہب اس چیز کے قائل ہیں۔ لیکن یہ بالکل درست ہے کہ شارح نے اس کا مفہوم غلط سمجھا۔ معترض نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ درست ہے۔

جرم معلوم ہے زلیخا کا　　　طعنۂ دست نارسا کب تک

شارح :- "زلیخا نے حضرت یوسف کے دامن پر ہاتھ بڑھایا۔ مگر رسائی میسر نہ ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ تم جو زلیخا کا جرم
جرم پکارتے ہو، ہمیں سب معلوم ہے۔ (یعنی کوئی جرم نہ تھا) اصل یہ ہے تم اس کو اس بات کا طعنہ دیتے ہو
کہ اس کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہو سکا"

زلیخا کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہونا صحیح نہیں، قدرتاً قیصر کی شہادت اس کے خلاف ہے
یہ بھی خیال میں نہیں آتا کہ زلیخا کی وکالت حضرت مومن کیوں کرتے ہیں۔ زلیخا کا جرم عشاق کی نظر میں جرم ہی
نہ تھا سو مومن کہتا ہے کہ تمہیں حقیقتاً زلیخا کو ادب عشق سے بیگانہ کہنا مقصود نہیں۔ بلکہ تم طنزاً اُس کو مجرم
کہتے ہو۔ مدعا ہم کو دست نارسا کا طعنہ دینا ہے[1]

دیکھئے خاک میں ملاتی ہے　　　نگہِ چشم سرمہ سا کب تک

شارح :- "سرمہ اور خاک کی مناسبت ظاہر ہے۔ ملاتی۔ ملاتی رہے گی"
تو نہیں۔ "ملاتی ہے" کے معنی یہ ہیں کہ کس وقت ملائے گی یعنی ہم آرزو مند ہیں کہ ملائے۔[2]

نہیں رہتے اثر پا کر غیرت کا اثر دیکھا　　　کہا کرتے تھے بیتابی کو بے تاثیر اکثر ہم

شارح :- "ہم اپنی بیتابی کو بے اثر کہا کرتے تھے۔ آخر بیتابی کو غیرت آ گئی۔ اور اس نے یہ اثر دکھایا کہ ہمارا ہی اثر (نشان)
باقی نہ رہا یعنی بیتابی نے تاثیر تو دکھائی مگر وہ ہمارے خلاف پڑی"
شاعر نے یہ نہیں کہا تھا کہ بیتابی سے اپنا اثر دکھایا۔ وہ غیرت کا اثر بیان کرتا ہے۔ تخیل یہ ہے کہ ہم خود
بیتابی کو اکثر بے اثر کہتے تھے۔ اب محبوب نے ہی سے اثر کہا تو غیرت سے مٹ گئے۔[3]

---

[1] (نگار) زلیخا کے ہاتھ کا دامن یوسف تک رسا ہونا تو میری سے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ اعتراض کہ یوسف
کے دامن تک زلیخا کا ہاتھ پہونچ کر اس پر چاک پیدا کر چکا تھا، درست نہیں ہو سکتا۔ تاہم شارح کا یہ کہنا کہ معشوق زلیخا کو اس کا طعنہ
دیتا ہے درست نہیں۔ مفہوم یہی ہے کہ وہ بظاہر ذکر تو زلیخا کا ہے لیکن مقصود مومن کی سعی ناکام پر طنز کرتا ہے۔

[2] (نگار) شارح نے یقیناً غلطی کی ہے اور معترض نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے۔

[3] (نگار) محبوب کا بیتابی کو بے اثر کہنا اور غیرت سے عاشق کا مٹ جانا شعر سے ظاہر نہیں۔ مفہوم صرف اتنا ہے کہ ہم
اپنی بیتابی پر بے اثر ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے آخرکار اسے غیرت آ ہی گئی اور ہمیں مٹا کر رکھ دیا۔

قیس شوخ اب کیونکہ دعویٰ ملک وحشت کا کرے
مُہرِ محضر ہو گیا نقشِ سمِ آہو ہمیں

شارح :- "اس شعر میں "شوخ" بمعنی محبوب قیاس کیا ہے اور منادیٰ قرار دیا ہے"

حالانکہ شوخ، قیس کی صفت ہے۔ مقصود یہ کہنا ہے کہ قیس نے شوخ چشمی سے دعوائے وحشت کیا تھا مگر وہ دعویٰ ہمارے عہد میں نہیں چل سکتا۔[1]

چشم وا نے نابینا کر دیا جدائی میں
کوئی آنکھ لگتی ہے خواب وصل کیا دیکھیں

شارح :- "ہجر میں انتظار کی بدولت عاشق کی آنکھیں کھلے کھلے بصارت سے معذور ہو گئیں۔ اس کی نئی توجیہ یوں کرتا ہے کہ انتظار میں آنکھ تو لگتی نہیں۔ اور جب آنکھ نہیں لگتی تو خواب وصل کیونکر نظر آئے اور جسکو کوئی چیز نظر نہ آئے (خواہ وہ خواب ہی کیوں نہو) وہ لازماً نابینا ہی کہلائے گا اس میں ندرت یہ ہے کہ چشم وا کی طرف نابینائی کو منسوب کیا گیا"

اگر مولانا یہ فرماتے کہ آنکھ کا عرصہ تک کھلا رہنا نابینائی کا سبب ہے۔ یا عرصہ تک آنکھ کھلے رہنے کا سبب جدائی میں انتظار ہے تو صحیح تھا۔ لیکن نابینائی کی یہ توجیہ کہ خواب نظر نہیں آیا۔ بہت عجیب ہے اور یہ بات کہ جس کو کوئی چیز خواہ وہ خواب ہی کیوں نہ ہو نظر نہ آئے لازماً نابینا کہلائیگا، سمجھ میں نہیں آتی۔[2]

اتنی بھی تاب دوری خورشید طلعتاں
نقصان کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

شارح :- "چاند کمال کی حالت میں خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ناقص ہونا شروع ہوتا ہے شاعر کہتا ہے خورشید طلعتوں (حسینوں) کی اتنی جدائی بھی اچھی نہیں دیکھو چاند کا کمال اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔ مصرع ثانی بطور تمثیل ہے"۔

جب حالت کمال میں ماہ خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ تو حالت نقصان میں یقیناً مقابلۃً قریب ہوا۔ پھر گزشتہ کمال کو نقص کی علت کیوں کہیں۔ قرب ہی نقصان ماہ کی علت قریبہ ہے۔ لہٰذا حسینوں سے دوری اچھی)۔

دوری سے بُعد مکانی مراد نہیں ہے۔ ہجر مراد ہے۔ چاند کامل ہوتا ہے۔ جب زمین شعاع مہر

---

[1] (نگار) میری رائے میں بھی شوخ کو منادیٰ قرار دینا درست نہیں۔
[2] (نگار) شارح نے بالکل صحیح سمجھا ہے، اور معترض کا اعتراض درست نہیں۔

کے لئے قطعاً حاجب نہو۔ اس حالت کمال میں حجب مستور ہے۔ اتصال نہیں۔ لہذا چاند کی چمک دمک بحالت کمال باوجود عدم اتصال شاعر کی نظر میں [illegible] نقص ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اس قدر تاب دوری عجیب ہے کہ ماہ بحالتِ عدم اتصال مہر۔ کاہیدہ ذرہ نہیں ہے[۵۱]

پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہو کہیں　　ہوتی ہیں بے حجابیاں جان نہفتہ راز میں

شارح: "جانِ نہفتہ راز۔ یا وہ جس کا راز مخفی ہے۔ میری جان پردۂ راز سے نکل کر بے حجاب ہو رہی ہے۔ اور میں مر رہا ہوں۔ اس حالت میں اگر کوئی اندیشہ ہے تو یہ کہ کسی پردہ نشیں کا رازِ عشق افشا نہو جائے۔"

ہم نے کسی جان کو پردۂ راز سے نکلا ہوا بے حجاب نہیں دیکھا۔ خیریت ہے مولانا نے "ہو رہی ہے" کہا اگر ہو گئی کہتے تو ہم مومن کی جان کو دیکھنے عدم آباد جاتے۔ یہ بھی نہیں کہا ہے کہ میں افشائے راز کے اندیشہ سے مر رہا ہوں۔ اور "مر رہا ہوں" حقیقی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ موت کا شعر میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ نہ موت جان کی پردہ در ہو سکتی ہے۔ شعر میں جان سے "جانِ نہفتہ راز" سے "حالِ نہفتہ راز" ہے اور اس طرح مطلب صاف ہو جاتا ہے[۵۲]

دردِ بے درماں مرا منت کشِ مرہم نہیں　　داغ نو ہے چارۂ داغِ کہن کی فکر میں

شارح: "میں جب داغِ کہن کے علاج کی فکر کرتا ہوں تو ایک نیا داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ میرا لاعلاج مرض محتاجِ مرہم نہیں۔"

میں علاج کی فکر کرتا ہوں شعر میں نہیں ہے۔ فکرِ علاج سے جدید داغ پیدا ہونا بھی غلط ہے مرض کا لاعلاج کہنا بھی شاعر کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ داغ نو داغِ کہن کا علاج ہے۔ میرا دردِ بے درماں مرہم کا احسان مند نہیں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نو بنو آلام و افکار گزشتہ غم کو خود بھلاتے رہتے ہیں۔ صائب نے اس مضمون کو ایک جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

داغ است بہاں مرہم داغے کہ کہن شد　　ہم نقشِ قدم محو کند نقشِ قدم را[۵۳]

---

۵۱ (نگار) غور طلب یہ ہے کہ لفظ کہا مومن نے کس معنے پر استعمال کیا ہے۔ [illegible] یہ محل [illegible] استعجاب میری رائے میں یہاں محلِ استعجاب میں استعمال کیا گیا ہے۔ [illegible] اور اس حالت میں خورشید سے بعید تر فاصلہ پر واقع ہے۔ ۵۲ (نگار) معترض نے اعتراض تو کر دیا لیکن خود کوئی [illegible] میری رائے میں یہاں "جان نہفتہ راز" ہی ہے اور جان کو حال سمجھنا درست نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں [illegible] کا اشارہ کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ میری موت کسی پردہ نشیں کی عشق کی پردہ دری نہ کرے۔ ۵۳ (نگار) [illegible] شعر کا مفہوم سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے اور مقالہ نگار کا اعتراض و مفہوم دونوں درست ہیں۔

بس کہ بن آئے مر گئے ہم شبِ انتظار میں — دن جو رہے تھے عمر کے جیتے رہے مزار میں

شارح :- "چونکہ ہم بن موت آئے قبل از وقت شبِ انتظار میں مر گئے تھے۔ اس لئے عمر کے باقی دن جو رہ گئے تھے قبر میں کاٹنے پڑے۔"

"بن آئے مرنے" سے حقیقتاً مر جانا مراد نہ تھا۔ نہ مزار میں جیتے رہنے کا مدعا واقعی تربت میں سانسیں پوری کرنا تھا۔ پہلے مصرع میں شبِ انتظار کی زندگی کو موت کہا ہے۔ اور دوسرے میں ایام مابعد کو تہ مزار جلنے سے تعبیر کیا ہے۔[1]

کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

شارح :- "وہ لوگ بھی عجیب قسم کے ہیں جو میرے مرنے کا غم کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں دراصل یہ میرا غم نہیں بلکہ یہ رشک ہے کہ یہ (مومن) کشتۂ یار ہوا ہم کیوں نہ ہوئے۔"

غم کرنے والوں کو غم نہیں رشک ہے شاعر نے نہ کہا تھا۔ مولانا "جہاں" سے منطقی طور پر غم کرنے والوں کو مستثنیٰ نہ کر سکے۔ شاعر کی غرض یہ تھی کہ چند افراد کے سوا سارا عالم میری موت پر غم کرتا ہے اور یہ چند حضرات غم کرنے والے عجیب مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ میری موت پر رو سکتے ہیں۔[2]

دشمن سے ہے چشمِ مہربانی — محروم نگاہ آشنا ہوں

شارح :- "چشم بمعنی توقع۔ آشنا سے محبوب مراد ہے۔"

دشمن سے محبوب مراد ہے۔ اور نگاہِ آشنا سے نگاہِ باخبر۔[3]

شبِ وصل اسکے تغافل کی زبس تاب نہیں — تلخیٔ مرگ ہے آنکھوں میں شکرِ خواب نہیں

---

۱ (نگار) شارح نے مطلب صحیح سمجھا ہے۔

۲ (نگار) شارح اور معترض دونوں نے غلطی کی ہے۔ مومن کا مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے میرا کشتۂ یار ہونا ایسا واقعہ ہے جو سارے جہاں کیلئے باعث رشک ہے اس لئے مجھے حیرت ہے ان پر جو میرے مرنے کا غم کر رہے ہیں حالانکہ انھیں بھی صرف رشک کرنا چاہئے۔

۳ (نگار) مطلب کسی نے بیان نہیں کیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ نگاہِ آشنا سے میری محرومی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ دشمن سے اب اس کی توقع رکھنے لگا ہوں۔

شارح:۔ "مجھے شبِ وصل یہ بھی گوارا نہیں کہ ذرا دیر کو بھی محبوب مجھ سے غافل ہو۔ اگر ایسا ہو تو میرے لئے پیامِ موت ہے۔ اس لحاظ سے شبِ وصل اُس کی آنکھوں میں جو نیند آرہی ہے اس کے لئے شکرِ خواب ہو مگر میرے حق میں تلخیٔ مرگ ہے کہ اتنی دیر وہ مجھ سے غافل رہے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میری آنکھوں میں جو شکرِ خوابِ وصل کا اثر ہے دراصل میرے لئے تلخیٔ مرگ کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ اتنی دیر بھی محبوب سے غفلت مجھ کو گوارا نہیں مگر اس صورت میں مصرعِ اول میں" اس سے "غافل" ہونا چاہئے

مجھے دونوں معنے سے اتفاق نہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ وصل کی شب اس کے غفلت برتنے کی مجھے تاب نہیں۔ وصل کی شب جو بظاہر میں میٹھی نیند سو جاتا ہوں۔ یہ حقیقتاً تلخیٔ مرگ ہے۔[1]

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے — تو گراں ہووےگی وہ جنس جو کمیاب نہیں

شارح:۔ "یعنی اس صورت میں یہ جنس کم ارز گراں قیمت ہو جائے گی"

جنس سے مراد سرفروش نہیں ہو سکتے۔ شاعر کبھی یہ نہیں کہنا چاہتا کہ سرفروش جانباز عشاق ہزاروں ہیں کمیاب نہیں۔ مصرعہ ثانی میں صاف" وہ جنس جو کمیاب نہیں" کہا ہے، جنس سے مراد ہوس ہے یعنی اہلِ ہوس مراد ہیں جن کی جانب التفات ہے اور وہ کمیاب نہیں ہیں اگر سرفروشوں کی خریداری دربارِ حسن میں ہوئی تو اہلِ ہوس مٹ جائیں گے یعنی جو چیز کمیاب نہیں ہے وہ گراں قیمت ہو جائے گی۔[2]

لذت بغیر جاندہی مردگاں محال — آبِ بقا فشردۂ دامانِ تر نہو

شارح:۔ "آبِ حیات سے مردوں میں جان آتی ہے۔ مگر جب تک آبِ حیات میں لذت نہو گی جاں بخشی کا اثر ہونا معلوم۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس میں لذت ضرور ہے۔ اب چونکہ شاعر کے نزدیک تمام لذتوں کا سرچشمہ دامانِ تر ہے۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ آبِ حیات، دامانِ تر کا نچوڑ ہے اور اسی لئے اُس میں اسقدر مزہ ہے۔ دامانِ تر۔ (دامنِ گناہ آلودہ) سے لذت کا تعلق بدیہی ہے"

آبِ حیات کا اثر زندوں کو موت سے محفوظ رکھنا سنا گیا ہے۔ نہ کہ مردوں کا زندہ کرنا۔ یہاں جاندہی سے جان دینا یعنی جان فدا کرنا مراد ہے۔ یعنی آبِ حیات کی تمنا میں جنھوں نے جان دی ہے ان کا جان دینا اس کا ثبوت ہے کہ آبِ حیات فشردۂ دامانِ تر ہوگا۔ لذتِ گناہ ظاہر ہے۔[3]

---

[1] (نگار) شارح کا مطلب درست ہے۔ [2] (نگار) شارح نے واقعی صحیح مطلب نہیں سمجھا۔
[3] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے نزدیک شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔

یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے اب　　جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

شارح :- " دعا دونوں کی ایک ہے مگر نیت مختلف ، معشوق عاشق سے ناراض ہوکر دعا کر رہا ہے - اور عاشق عشق سے بیزار ہوکر "

دلجوئی دلدہی اور طلب دل کے معنی میں ہے - دونوں معنی شاعر نے ملحوظ رکھے ہیں ان کی دعا بمعنی اول اور اپنی دعا بمعنی ثانی ہے - عشق سے بیزاری کا ذکر کہیں نہیں ہے[1]

توبہ گنہ عشق سے فرماتے ہیں واعظ　　یہ بھی نہیں دل دیکھے گنہگار ہوا ہے

شارح :- " مراد یہ ہے کہ اگر واعظ گنہگار ہوتا تو توبہ کیوں کرتا فرماتے سے طنزاً استعمال کیا ہے "

میری رائے میں معنی یہ ہیں کہ واعظ نے بس گناہ عشق سے توبہ کا حکم دیتا ہے - کیا کبھی اس نے بھی گناہ عشق کیا ہے (یعنی نہیں کیا ہے) اگر گناہ عشق واعظ سے سرزد ہوتا تو جانتا کہ عشق سے توبہ امکانی نہیں ہے - اگر مصرع ثانی کو جملہ خبریہ مانا جائے تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ گناہ عشق کے نتائج دیکھ کر ہمیں ہدایت کرتا ہے گر پہلے معنی لطیف تر ہیں[2]

سمجھے کے اور ہی کچھ مر چلا ہیں اے ناصح　　کہ اجر تو ہے نہیں جان جانے کے آنے کی

شارح :- ناصح نے سمجھایا کہ جان جا کر آنے والی نہیں جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ عمر چند روزہ کو غنیمت ہو اور عمل خیر کی طرف توجہ کرو عاشق اپنی خوش فہمی سے یہ سمجھا کہ جب زندگی کا اعتبار نہیں تو جہاں تک ہوسکے کاروبار عاشقی سے غافل نہ رہنا چاہئے - مر چلا - مرنے لگا عشق کرنے لگا "

میری رائے میں شاعر نے " جان " سے محبوب کی ذات مراد لی اور بادی میں یہ خیال کر اب نہ ملیں گے - قیامت ہوگیا[3]

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے　　فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

شارح : " سوختہ ساماں - بے سروساماں - گل شمع شبستاں - شمع کا شانہ کا گل - ہم سوختہ ساماں جب زمین میں دفن ہونگے - تو ہماری سوختہ سامانی کے اثر سے ماہی زمین کے سینے بھی گل شمع کی طرح جلنے لگیں گے یا گل شمع کا کام دینگے "

یہ شعر تکلف و تصنع سے خالی نہیں ہے - میرے خیال میں فلس ماہی کا جل اٹھنا شاعر کا مقصود نہیں ہے -

---

[1] (نگار) مطلب وہی ہے جو شارح نے ظاہر کیا ہے اور مقالہ نگار کا یہ خیال کہ دلجوئی یہاں طلب دل کا بھی مفہوم پیدا کرتی ہے - درست نہیں

[2] (نگار) فارسی میں توبہ کردن اور توبہ فرمودن دونوں جداجدا مفہوم میں مستعمل ہیں - اول الذکر توبہ کرنے کے معنے میں آتا ہے اور موخرالذکر توبہ کی تعلیم دینے کے معنے میں آتا ہے ذیل کے مصرعہ میں ان دونوں کا فرق ملاحظہ ہو - توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند - اس لئے شارح کا مفہوم یقیناً صحیح نہیں -　[3] (نگار) مقالہ نگار نے صحیح سمجھا ہے -

وہ یہ کہتا ہے کہ ہم سوختہ ساماں بعد دفن فلس ماہی کی شبستاں میں گل شمع ہو جائیں گے۔ آتش موجب تنویر ہے۔ اور جل بجھنا ہم بے سامانوں کی تقدیر۔ لہٰذا گل شمع ہوں گے۔ اور ماہی کے شبستاں میں نہیں بلکہ فلس ماہی کے شبستاں میں۔ فلس ماہی خود سراپا داغ ہے۔ اس کے لئے شبستاں اور شمع فرض کرکے اپنے سوختہ ساماں وجود کو گل شمع کہا ہے۔[۱]

مجھ کو مارا مرے حال متغیر نے کہ ہے کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دل مونس کے

شارح "مونس سے ہمدم یا ہمنشیں مراد ہے۔ میرا حال دگرگوں (متغیر) دیکھ کر ہمدم کا دل دھڑکتا ہے۔ اور مجھے اور ہی کچھ گمان ہے (یعنی اب نہ بچوں گا) اس حال متغیر نے مجھے تباہ کر دیا۔ نہ یہ ہوتا نہ ہمدم کا دل دھڑکتا اور نہ مجھے بدگمانی ہوتی۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود اپنی حالت کا احساس نہیں۔ ہمدم کا حال دیکھکر اسکو اندیشہ ہوا"

اگر دق میں حال دگرگوں ہو تو ضرور یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اب نہ بچوں گا مگر عاشق اس اندیشہ سے فارغ ہے گماں یہ ہے کہ ہمدم کی نظر میں اب میرا مداوا ممکن نہیں۔ یا یہ کہ ہمدم کا دل میرے لئے کیوں دھڑکتا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود محبوب پر فریفتہ ہو گیا ہو۔[۲]

ناتوانی سے نزاکت ہے زیاد مجھ سے تو دامن چھڑا نا چھوڑ دے

شارح: "وہ تو نازک ہے میں ناتواں۔ پھر بھی میں اس قدر ناتواں نہیں کہ تو مجھ سے اپنا دامن چھڑا سکے۔"

شاعر کہتا ہے کہ نزاکت کو ناتوانی پر یقیناً فوقیت حاصل ہے اس لئے تو مجھ سے دامن نہ چھڑا ورنہ یہ بات ثابت ہو جائے گی۔[۳]

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

شارح: "نالۂ شبگیر (پچھلے پہر کا نالہ) سے سانس رکنے لگتی ہے۔ اور نالہ لب پر نہیں آتا۔ اگر لب پر آئے اور تاثیر نہ ہو۔ تب مایوسی کا موقع ہے"

---

[۱] (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے اور مقالہ نگار کی تاویل بالکل دور از کار۔

[۲] (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔

[۳] (نگار) شارح مومن کے مدعا تک نہ پہنچ سکے۔ شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ مقابلۃً معشوق کی نزاکت عاشق کی ناتوانی سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے اگر اس نے دامن چھڑا لیا تو یہ نزاکت کے منافی ہوگا۔

نالہ کا لب پر نہ آنا شعر میں کہاں ہے۔ دم کا رکنا اس کو مستلزم نہیں، کہ نالہ لب تک نہ آئے۔ اور اگر نالہ لب پر نہیں آتا تو تاثیر کیا ہوگی۔ پھر مایوسی کیوں نہیں ؟

شاعر کہتا ہے نالہ سے دم رکتا ہے۔ یعنی دم رکنا نالہ کا اثر ہے۔ پھر تاثیر سے مایوس کیوں ہو۔[1]

کام ہوتے ہیں جوانوں کے سپہر پیر سے   لے گیا ہے پشت خم شاید تری شمشیر سے

شارح :۔ "آسمان پیر ہے اور اُس کی پشت خم ہے۔ مگر اس کے باوجود جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ شاید تری شمشیر خمیدہ سے پشت مستعار لے گیا ہے۔ جو یہ حال ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اسکے ہاتھوں سے جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں"

شمشیر کا لفظ چاہتا ہے کہ کام سے ستمگری مراد ہو۔ اس کے سوا یوں بھی آسمان جفا کاری میں بدنام ہے شرح میں صرف یہ نہ کہنا تھا کہ جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ پشت مستعار لے جانا بھی کوئی ٹھکانے کی بات نہیں۔ پشت کچھ ذریعہ ستم نہیں۔ پہلے مصرع میں "کام ہوتے ہیں جوانوں کے" اس کے یہ معنی ہیں کہ جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔ طریقہ گزارش سے مستنبط نہیں ہو سکے۔

پشت خم کردن۔ پشت دوتا کردن۔ عاجزی، فروتنی کرنا ہے۔ شاعر نے اس اصطلاح کا ترجمہ کیا ہے۔ یا ترجمہ بالفاظ موزوں نہ ہوا۔ یا کاتب نے کچھ اصلاح کی یا ممکن ہے پشت خم از کسے بردن بھی اس معنی میں مستعمل ہو۔ معنی بہرحال یہی ہیں کہ آسمان نے تمہاری شمشیر کے سامنے پشت دوتا کی ہو کہ ستم شعاری میں باوجود خمیدہ پشت ہونے کے جوانوں کی طرح مشاق ہے۔[2]

تنویر قادری

---

[1] (نگار) ہو سکتا ہے کہ مومن کا مقصود وہی ہو جو مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے۔

[2] (نگار) مقالہ نگار کی دور از کار تاویل میری سمجھ میں نہیں آئی کام ہونا، کام تمام ہونا کے معنے میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

ایک لاسلکی ڈرامہ

اسوقت ہندوستان میں آٹھ نئی لاسلکی نشرگاہیں قایم ہورہی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ پندرہ سال کے اندر یہ تعداد کم از کم پچاس تک پہونچ جائے گی۔

اس وقت جتنے اسٹیشن کام کر رہے ہیں ان میں دہلی کا اسٹیشن مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اس نے گزشتہ ایک سال کے اندر غیر معمولی شہرت حاصل کرلی ہے۔ موسیقی کے علاوہ اس نے اچھے اچھے مقالے بھی نشر کئے اور تفریح و افادہ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنا پروگرام مرتب کیا لیکن اس کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ لاسلکی ڈرامہ لکھنے والے میسر نہیں آتے، اس کی یہ شکایت درست ہے کیونکہ لاسلکی ڈرامہ میں جن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے اس سے ہمارے اکثر انشا پرداز ناواقف ہیں۔

چونکہ لاسلکی ڈرامہ کا تعلق صرف سامعہ سے ہوتا ہے اور ایکٹ کرنے والے سامنے نہیں ہوتے اس لئے اسکی ترتیب میں ایسی چیزیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں جن کا تعلق باصرہ سے ہے اور انھیں سامعہ کے حدود میں لاکر پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مختصر ہونا چاہئے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ کا کوئی ڈرامہ پیش کرنا اصول کے خلاف ہے۔ انھیں خصوصیات کو سامنے رکھ کر ذیل میں ایک ڈرامہ جو میں نے خود اپنے ایک افسانہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے پیش کرتا ہوں۔ نیاز

افراد:۔

انتظام علی:۔ معاشیات کے پروفیسر شعر و موسیقی سے بالکل بیگانہ لیکن بیوی سے محبت کرنے والے

ثریا بیگم:۔ پروفیسر صاحب کی جدید تعلیم یافتہ بیوی شاعری کی دلدادہ، گھر کی طرف سے ایک حد تک غافل لیکن شوہر کی مطیع

گلشن:۔ گھر کی پرانی ضعیف خادمہ

اختر:۔ پروفیسر صاحب کے دوست

---

(۱)

{ پروفیسر صاحب - مکان کے اندر داخل ہوتے ہیں۱؎ (دروازہ کھلنے کی آواز
پھر پاؤں کی چاپ -)۲؎ }

انتظام علی — " گلشن، گلشان !"
گلشن — (دور کی آواز سے) " حاضر ہوئی حضور"

(تیز قدموں کی آواز)

انتظام علی — " کیا تم کچھ کام کر رہی تھیں، گلشن !"
گلشن — " پتیلی چڑھا رہی تھی میاں !"
انتظام علی — " بیگم کہاں ہیں ؟"
گلشن — " وہیں باورچیخانہ میں ہیں ؟"
انتظام علی — " کیا کر رہی ہیں ؟"
گلشن — " کچھ لکھ رہی ہیں"
انتظام علی — " اور گنگنا بھی رہی ہیں ؟
گلشن — (دبی زبان سے رُک رُک کر) - " ہاں - میاں - کبھی کبھی - گنگنانے بھی لگتی ہیں"
انتظام علی — " شعر کہہ رہی ہوں گی - وہ تو میں جانتا ہوں کہ ہمیشہ کام ہی کے وقت ان پر شاعری کا دورہ پڑتا ہے، خیر، ذرا خیال رکھنا، اختر صاحب بھی کھانا یہیں ———"

{ دور سے " گلشن، گلشن " کی آواز سنائی دیتی ہے اور گلشن تیز قدموں کے ساتھ واپس جاتی ہے - }

وہی آواز — " کمبخت، مرگئی جاکر، جب دیکھو کام ہی کے وقت غائب ہوتی ہے"
انتظام علی — (بلند آواز سے) " بیگم، ذرا ادھر تو آؤ" {دروازہ کھلنے کی آواز
ثریا بیگم — (غصہ کے لہجہ میں) " کیوں کیا کہتے ہو ؟"
انتظام علی — " یہ اتنی خفگی گلشن پر کیوں ہو رہی ہے - خیریت تو ہے ؟"
ثریا بیگم — (تیز غصہ کی آواز سے) " سالن جلکر کوئلہ ہوگیا، خدا جانے پتیلی چڑھاتے چڑھاتے کہاں غائب ہوگئی مردار، اب کیا میں اپنا سر کھانے کو دوں گی "

۱؎ معلن ([illegible]) اس کا اظہار کریں گے — ۲؎ لاسلکی ڈرامے چونکہ ریکارڈ کرنے کے بعد پیش کئے جاتے ہیں اس لئے ان میں ہر قسم کی آوازیں مصنوعی طور پر مرتسم کردی جاتی ہیں -

انتظام علی ـــ (نرم آواز سے) "مگر تم تو وہاں موجود تھیں"

ثریا بیگم ـــ (برہمی کے تیز لہجہ سے) "تھی تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ہر وقت چولھے میں سر ڈالے بیٹھی رہتی"

انتظام علی ـــ (نرم مگر طعنہ آمیز لہجہ سے) "مگر بیگم، یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے، تمھاری شاعری سلامت چاہیئے سالن جلتا ہی رہیگا، روٹیاں جھلستی ہی رہیں گی۔ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے"

ثریا بیگم ـــ (بگڑکر) "میں پوچھتی ہوں کہ تمھیں میرے لکھنے پڑھنے سے کیوں بیر ہے۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ میں بھی ہر وقت تمھاری طرح اس فکر میں مبتلا رہوں کہ غلّہ کا کیا نرخ ہے، کپڑے کا کیا بھاؤ ہے۔ کتنا سونا ہندوستان سے باہر جا رہا ہے، کتنی تمکر جا آ رہے ہندوستان آ رہی ہے، تو میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تمھارے کام میں حارج نہیں تو تمھیں کیوں میرا مشغلہ بُرا معلوم ہو، خوب!"

(باہر سے "گلشن، گلشن" کی آواز آتی ہے)

انتظام علی ـــ (آہستگی سے لیکن غصہ کے انداز میں) "اختر آ گئے ہیں، میں باہر جاتا ہوں، کھانا بازار سے آجائیگا، آپ جائیے شعر کہئے"۔

[قدموں کی چاپ اور پھر دروازہ کھلکر بند ہونے کی کرخت آواز]

اختر ـــ "خیریت تو ہے، اس وقت اندر کیا کر رہے تھے؟"

انتظام علی ـــ (مایوسی کے لہجہ میں) "کر کیا خاک رہا تھا، اب تو تمھاری بھابھی کی شاعری میری برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے"

اختر ـــ (ہنسکر) "شاعری کرتی ہیں تو کرنے دو، تمھارا اس میں کیا نقصان ہے؟"

انتظام علی ـــ "ہونہہ، تمھیں کیا خبر کہ ان کا ایک ایک شعر میرے لئے کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے، آج ہی انھوں نے ایک شعر کہا، لیکن اُس وقت جب گوشت جلکر خاک سیاہ ہو گیا، پرسوں بھی خیر سے ایک شعر فرمایا تھا لیکن جب بلّی سارا دودھ پی چکی۔ کل ہی کی بات ہے کہ بندر ان کے پاس سے میری شیروانی اُٹھا کر لے گیا، اُدھر جب وہ تار تار ہو چکی تو اِدھر شعر پورا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مشق سخن چند دن اور جاری رہی تو دیوان پورا ہونے سے پہلے ہی یہاں دیوالہ نہ نکل جائے"

اختر ـــ (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بھئی، برا نہ مانو تو کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ کچھ قصور تمھارا بھی ہے"۔

انتظام علی ـــ "میرا، میرا کیا قصور ہے؟"

اختر ـــ "یہی کہ تم انکے ذوق کا خیال نہیں رکھتے، اگر کبھی کبھی تم بھی شعر و شاعری سے دلچسپی لے لیا کرو تو کیا حرج ہے"

انتظام علی — "عجیب باتیں کرتے ہو۔ مجھے جب ایک چیز سے لگاؤ ہی نہیں تو کیا خاک دلچسپی لے سکتا ہوں"
اختر — "تاہم محض ان کی دلدہی کے لئے اگر مصنوعی طور پر اس کا اظہار ہو تو کیا نقصان ہے"
انتظام علی — (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)۔ "بہتر ہے یہ بھی کر دیکھوں گا"

—(۲)—

(ایک ہفتہ کے بعد۔ ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں
انتظام علی ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔
(چھالیہ کترنے کی آواز اور پھر قدموں کی چاپ)

انتظام علی — "بیگم، تمھارے لئے ایک عجیب چیز لایا ہوں، یہ لو جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب دیکھو کتنا خوشنما ہے"
(تھوڑے وقفہ کے بعد) ورق اُلٹنے کی آواز

ثریا بیگم — "بیشک بہت خوبصورت ہے"
انتظام علی — "غالب واقعی اچھا شاعر تھا"
ثریا بیگم — "ہوگا، مجھے کیا معلوم"
انتظام علی — "ہوگا؟ اس کے کیا معنی۔ کیا تمھیں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی"
ثریا بیگم — "جی نہیں"
انتظام علی — "اور یہ جو دو گھنٹے سر کھپا کر میں نے غزل کہی ہے، اسے کون سنے گا؟"
ثریا بیگم — (ہنستے ہوئے) "آپ اور غزل۔ کیا کہنا"
انتظام علی — "ہائیں، تم مذاق سمجھتی ہو، لو، سنو، ہرچند یہ میری پہلی کوشش ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ناکامیاب نہیں رہا۔ پہلا شعر۔ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا؟ اچھا تو مطلع سنو:۔

ہم نہیں وہ جنھیں آتا ہی پریشاں ہونا مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

ثریا بیگم — "سبحان اللہ، کیا کہنا"
انتظام علی — "اچھا دوسرا شعر سنو اسی سلسلہ کا ہے:۔

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

ثریا بیگم — "تو یوں کہئے کہ آپ نے "نظم مسلسل" تحریر فرمائی ہے"
انتظام علی — "اسے نظم مسلسل کہتے ہیں؟ اچھا تو آج یہی سن لو، کل غزل بھی سن لینا۔ تیسرا شعر اسمیں میرا نام بھی ہے:۔

کیوں وہاں تم گئے بیکار اے انتظام　　کس نے تم سے کہا وہاں جاکر یا بجولاں ہونا

(ثریا بیگم کے قہقہہ کی آواز)

انتظام علی — "کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے"

ثریا بیگم — "آپ کا مقطع تو تقطیع سے بالکل گر گیا"

انتظام علی — "تقطیع سے گر گیا؟ گر جانے دو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی، شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور تم نے ہر مرتبہ دیگچی گرا کر کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔

ثریا بیگم — پھر تم نے وہی طعن تشنیع کی باتیں شروع کر دیں"

انتظام علی — (نرمی سے) بگڑو نہیں، دیکھو اب میں شعر کہنے لگا ہوں — اور ہاں بیگم یہ جو غالب نے لکھا ہے:۔

"در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا" اس کا کیا مطلب ہے"

ثریا بیگم — "میں بھلا آپ ایسے قابل شخص کو کیا سمجھا سکتی ہوں۔ آپ کیوں مجھے بناتے ہیں

انتظام علی — "شعر کو قابلیت سے کیا واسطہ۔ یہ بھی کوئی ریاضی کا مسئلہ ہے، علم الکیمیا کا نظریہ ہے جسکے سمجھنے میں قابلیت کی ضرورت ہو۔ چند الفاظ خاص ترتیب سے جمع کر دئے اور کوئی مہمل سی بات کہدی، شعر ہو گیا"

ثریا بیگم — "بجا ہے، شعر کی یہ تعریف مجھے آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص شاعری کر سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے خاص دماغ لیکر آیا ہو اور ——"

انتظام علی — (بات کاٹ کر) شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں۔ اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ زمانہ کی حالت تو یہ ہے کہ پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی میسر آجائیں تو جانئے کہ بڑی دولت ہاتھ آگئی اور اُدھر جیب و دیکھئے دامن کا چاک گریباں تک پہونچا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان دھجیوں کو کوئی کہاں تک رفو کرے گا اور ایسی فضول خرچی کی تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہوگا"

ثریا بیگم — "ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینی چاہئے"

انتظام علی — "خیر، جانے دو۔ یہ تو پھر جھگڑے کی بات شروع ہو گئی۔ یہ بتاؤ کہ میں نے غزل کیسی کہی"

ثریا بیگم — "کیا کہنا، جواب نہیں ہے"

انتظام علی — "اچھا تو اب روز دو غزلیں مجھ سے لے لیا کرو۔ اب تو تمہیں شکایت نہ ہوگی کہ مجھے شاعری سے لگاؤ نہیں۔ (پاؤں کی چاپ) —— کیوں کہاں جا رہی ہو"

"کہیں جا رہی ہوں، آپ کو کیا، آپ تو کپڑے پہنئے، کالج جانے کا وقت قریب ہے"

(کرسی سرکانے کی آواز۔ تخت کی چرچراہٹ)

(۳)

شام کا وقت۔ زنانخانہ کے برآمدہ میں ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی تلاوت قرآن میں مصروف ہیں ۔۔۔ تلاوت کی آواز لیکن نہایت دھیمی۔
اسی دوران میں دروازہ کھلنے، کسی کے چلنے اور پھر کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی ہے

انتظام علی ۔۔۔ "ہائیں، ابھی تک فارغ ہی نہیں ہوئیں، کیا آج پورا کلام مجید ختم کرنے کا ارادہ ہے"

("ہونہہ" کی آواز اور پھر تلاوت کلام مجید)

انتظام علی ۔۔۔ "اجی منہ سے بولو، یہ وظیفہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔ مجھے غزلیں سنانا ہیں، عشق و عاشقی کی باتیں کرنا ہیں اور آپ خدا سے لو لگائے بیٹھی ہیں"

(تلاوت کی آواز برابر آرہی ہے) ۔۔۔ (کچھ وقفہ کے بعد)

انتظام علی ۔۔۔ "اچھا تم تلاوت کئے جاؤ، میں بھی غزلیں سناتا ہوں"

ثریا بیگم ۔۔۔ (غصہ کی آواز سے) لاحول ولا، ناک میں دم ہے۔ اس گھر میں نماز روزہ بھی دشوار ہو گیا ہے"

انتظام علی ۔۔۔ (نرمی سے) میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو دورہ آپ پر پڑا ہے کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں؟"

ثریا بیگم ۔۔۔ (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز، روزہ کیا کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے، خوب، آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے"

انتظام علی ۔۔۔ مذہب کے ساتھ کون برا سلوک کر سکتا ہے، نماز روزہ میرا ایمان ہے، لیکن میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تو تم نے کبھی بھولکر بھی سجدہ نہ کیا تھا، اب جو اس کا خیال آیا تو کیوں؟ اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی تیمم کا تودہ بنی بیٹھی ہیں"

ثریا بیگم ۔۔۔ "چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اللہ رسول کے ساتھ مجھے مذاق پسند نہیں"

انتظام علی ۔۔۔ "مذاق کیسا؟ میں تمھیں نماز پڑھنے سے نہیں روکتا، تلاوت سے باز نہیں رکھتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کو یاد نہ کیا اور اب جو عبادت پر آئیں تو اس شان سے کہ گھر کو مسجد بناکے رکھدیا"

ثریا بیگم ۔۔۔ "خیر، ہوگا، کسی کو کیا؟ میں نماز نہیں پڑھتی تھی تو خدا کا گناہ کرتی تھی اور اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے پڑھتی ہوں۔ آپ کا اس میں کیا بیچ؟"

"میرا بیچ یہ ہے کہ جس دن سے تم نے نماز شروع کی ہے صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں ۔۔۔

سُنانے کا موقعہ ملے تو اور کہوں۔ مجھے تو اس مہینے میں پورا دیوان ختم کرنا ہے۔ آخر یہ کام کیونکر چلے گا"

ثریا بیگم — "آپ غزلیں کہے جائیے، مجھے سُنانے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟"

انتظام علی — "اور تم برابر اسی طرح رات دن نماز پڑھتی جاؤگی، مانو گی نہیں"

ثریا بیگم — "نہیں مانوں گی"

انتظام علی — "بہتر ہے"

(کرسی سرکانے اور چلنے کی آواز)

—(۴)—

(مرغ کے بولنے کی آواز - ادھر ادھر چلتے ہوئے قدموں کی چاپ)

ثریا بیگم — (بلند آواز سے) "گلشن، گلشن"

گلشن — (دور سے) "حاضر ہوئی، بیوی"

(گلشن کے قدموں کی آواز)

ثریا بیگم — "میرا مصلا کیا ہوا"

گلشن — "بیوی، مجھے کیا خبر، آپ نے جہاں رکھا ہوگا، وہیں ہوگا"

ثریا بیگم — (بگڑ کر تیز آواز میں) سوائے چوکی کے اور کہاں رکھتی ہوں۔ یہیں جانماز تھی، یہیں کلام مجید تھا، اسی جگہ دلائل الخیرات تھی، تسبیح تھی، رحل تھی اور اب کسی ایک چیز کا پتہ نہیں"۔

گلشن — "بیوی، بندر لے گیا ہوگا"

ثریا بیگم — (طعن آمیز لہجہ میں) اور مصلے پر بیٹھا ہوا کلام مجید بھی پڑھ رہا ہوگا، نامعقول کہیں کی، جلد ڈھونڈھ کے لا، وقت جا رہا ہے"

گلشن — "بیوی، میں کہاں دیکھوں، میں نے کہیں رکھا ہوتا تو لا کر دیدیتی"

(دروازہ کھلنے کی آواز اور قدموں کی آہٹ)

انتظام علی — "بیگم، گلشن پر کیوں خفا ہو رہی ہو۔ مجھ سے پوچھو۔ لو، یہ ہے تمہارا تمام عاشورخانہ میری بغل میں — مگر خدا کے لئے یہ تو بتا دو کہ یہ چلّہ کتنے دنوں کا ہے، تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں"

(ثریا بیگم کی ہنسی کی آواز)

ثریا بیگم — "خفا تو نہ ہوگے اگر سچ سچ کہہ دوں"

انتظام علی — "یہ لو، تمہاری جانماز، تسبیح اور قرآن سب اپنے سر پر رکھ کر کہتا ہوں کہ خفا نہ ہوں گا"
ثریا بیگم — "اچھا تو وعدہ کیجیے کہ آیندہ آپ کبھی کوئی شعر نہ کہیں گے"
انتظام علی — (سنجیدگی سے) "کیوں، کیا تمہیں میری شاعری سے تکلیف ہوتی ہے"
ثریا بیگم — "تکلیف! یہ نہیں کہتے کہ کلیجہ پیپ ہو کر رہ گیا ہے"
انتظام علی — "تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو۔ میں نے تو صرف تمہاری خوشی کے لئے شاعری شروع کی تھی، تم پسند نہیں کرتیں تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضایع کروں"
ثریا بیگم — "ہاں، میری خوشی ہو چکی اب میری مرضی یہی ہے کہ آپ اس سے توبہ کر لیں"
انتظام علی — "اچھا، میں توبہ کرتا ہوں، لیکن تم بھی توبہ کرو کہ ——"
ثریا بیگم — "خدا تمہیں شرمائے، نماز سے توبہ کراتے ہو جس نے تم سے شاعری کی لت چھوڑوائی"
انتظام علی — "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو جس نے تمہیں نماز کی عادت ڈلوائی"

(دونوں کا قہقہہ)

باجلاس مسٹر ایف - ایچ - ٹیل صاحب بہادر سب جج درجۂ چہارم چھاونی لاہور

بمقدمہ لالہ خوشی رام ولد لالہ جمنوں رام قوم ناگیہ پروپرائٹر گلوب بک ڈپو چھاؤنی لاہور .... مدعی

بنام

ڈاکٹر ڈی سنگھ ایم - بی - ڈی - ڈی - ایس معرفت سول سرجن صاحب کنگ جارج دی فورتھ سول ہسپتال بنارس چھاونی مدعا علیہ

دعوے دلاپانے مبلغ - ۱ - ۷ - ۲۴۷ روپیہ

مقدمہ مندرجہ میں ہماری تسلی ہوئی ہے کہ مدعا علیہ دیدہ دانستہ تعمیل سمن سے گریز کرتا ہے اور معمولی طریقہ سے اس کی تعمیل سمن نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا زیر آرڈر ۵ رول ۲۰ ضابطہ دیوانی مشتہر کیا جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر ڈی سنگھ مدعا علیہ مذکور تاریخ مقررہ مورخہ $\frac{4}{1937}$ 17 کو برائے پیروی مقدمہ اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہذا نہ ہوگا تو اس کے برخلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ $\frac{3}{37}$ 16 ہمارے دستخط و مہر عدالت سے جاری ہوا۔

سب جج درجہ چہارم چھاؤنی لاہور

(مہر عدالت)

باب المراسلة والمناظرہ

(جناب سید علی اوسط صاحب - بنارس)

مکرمی - تسلیم - میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا رجحان اخلاقیات میں مادی دنیا سے زیادہ روحانیات کی طرف ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت وغیرہ سے بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ اجتماع ضدین میری سمجھ میں نہیں آیا - براہ کرم اس گتھی کو سلجھائیے۔

(نگار) گرامی جناب، آپ کی تحریر پڑھکر مجھے آپ پر بہت رحم آیا اور یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوا کہ مذہب کی کورانہ تقلید واقعی انسان کی قوت ادراک و فہم کو اسقدر بلید کر دیتی ہے کہ سیاہ و سفید کا امتیاز بھی اس سے باقی نہیں رہتا ـــ آپ نے مادی دنیا اور روحانیات کے الفاظ تو ضرور اپنی تحریر میں ... لیکن معاف فرمائیے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ ان دونوں کے صحیح مفہوم سے بے خبر ہیں، اور اس لئے میرے متعلق آپ کا یہ ارشاد کہ میرا رجحان بہ نسبت مادیات کے روحانیات کی طرف زیادہ ہے، سوائے اس کے کہ اسے حسن ظن سے تعبیر کروں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ دیکھئے میں آپ کو نہایت ہی آسان طریقہ سے ان دونوں کا فرق بتاتا ہوں، اسے یاد رکھئے اور آیندہ جب ان الفاظ کو استعمال کیجئے اس کو کبھی نہ بھولئے۔

مادیات و روحانیات فی الاصل کیا چیز ہیں، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو اتنا سمجھ لیجئے کہ دنیا میں دو چیزیں ہیں ایک وہ جنھیں ہم حواس ظاہری سے محسوس کرتے ہیں مثلاً پھول کہ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں یا آواز جس کا احساس آپ کو سامعہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ دوسری چیز وہ جس کا تعلق احساس ظاہری سے نہیں ہے بلکہ صرف کیفیت و وجدان سے ہے مثلاً کیفیت مسرت و غم کہ نہ انھیں ہم دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں - اب آپ خود غور فرمائیے کہ حشر و نشر، جنت و دوزخ وغیرہ کا عقیدہ روحانیات سے متعلق ہے یا مادیات سے - یعنی ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد آپ کی مادہ پرستی ثابت ہوتی ہے یا ان سے انکار کے بعد میری مادہ پرستی۔

فرض کیجئے میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد انسان نسیاً منسیا ہوجاتا ہے یا یہ کہ اگر روح باقی بھی رہتی ہے تو مذہب کے بتائے ہوئے عذاب و ثواب سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس عقیدہ میں مادیت کا لگاؤ کہاں ہے۔ برخلاف اس کے آپ اپنے معتقدات کو ملاحظہ کیجئے کہ:۔

۱۔ آسمان سے ایک فرشتہ (عزرائیل) آتا ہے اور وہ روح کو جسم سے نکالکر آسمان کی طرف لیجاتا ہے۔

۲۔ جب مردہ قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو روح پھر جسم کے اندر واپس کر دیجاتی ہے (معلوم نہیں وہ قومیں جو اپنے مردوں کو جلا کر ان کی خاک منتشر کر دیتی ہیں ان کی روح پھر کیونکر جسم میں واپس کی جاتی ہوگی، غالباً ان کے تمام منتشر اجزاء کو جمع کرکے پہلے جسم بنایا جاتا ہوگا اور پھر روح اس کے اندر داخل ہوتی ہوگی)

۳۔ قبر کے اندر دو فرشتے (منکر ونکیر) آتشیں گرز لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور مردہ کو بٹھا کر خدا اور رسول کے متعلق سوال کرتے ہیں، اگر اس نے جواب معقول دیا یعنی اگر وہ مسلمان ثابت ہوا تو کیا کہنا ورنہ پھر غریب کی شامت آجاتی ہے اور گرز بازی شروع ہوجاتی ہے (گویا سوائے مسلمانوں کے اور جتنی مخلوق خدانے پیدا کی ہے وہ صرف جہنم میں جھونکنے کے لئے)

۴۔ حشر کے دن مردے اپنے اپنے اصلی جسموں کے ساتھ اٹھیں گے، ان کے ہاتھ میں ان کے نامۂ اعمال ہونگے پل صراط سے گزریں گے اور میزان میں ان کے اعمال تولے جائیں گے۔

۵۔ اگر جنت کے قابل سمجھے گئے تو وہاں انھیں کھانے کو عمدہ عمدہ پھل ملیں گے۔ رہنے کو سونے چاندی کے مکان، اور خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے حور وغلمان۔

۶۔ اگر دوزخ نصیب ہوئی تو وہاں سانپ بچھو انھیں ڈسیں گے، کھولتا ہوا پانی انھیں پینا پڑے گا، آگ میں جلتے رہیں گے اور خدا جانے کس کس طرح کی جسمانی سزا انھیں دیجائے گی۔

اب غور فرمائیے کہ مرنے کے بعد آپ جس عالم کے قایل ہیں اس کا تعلق مادیات سے ہے یا روحانیات سے یعنی اس میں کمیت پائی جاتی ہے یا کیفیت۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس میں مادیت وجسمانیت نہ پائی جائے اور زمان ومکان سے اس کا تعلق نہ ہو۔ گرز، میزان، پل صراط، سانپ، بچھو، حور وقصور وغیرہ کا غیر مادی تصور محال ہے اور تاوقتیکہ آپ انھیں سوس ومرئی چیز نہ مانیں آپ کے جنت ودوزخ کا تخیل پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے مقابلہ میں آپ میرے اعتقاد کو دیکھئے کہ وہاں ان میں سے کسی چیز کو درخور حاصل نہیں ہے بلکہ وہ صرف کیفیت ووجدان یا احساس محض سے متعلق ہے۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیے کہ روحانیات کا قایل میں ہوں یا آپ، مادہ پرستی آپ کے اسلام میں پائی جاتی ہے یا میرے اسلام میں۔

خیال کن تو کجائی وما کجا واعظ!

باب الاستفسار

جعفر و عباسہ کا نکاح - زوال برامکہ

(جناب عطا کریم صاحب - ضلع شاہ آباد)

۱- خاندان برامکہ کے زوال و استیصال کے اسباب کیا تھے۔

۲- جعفر و عباسہ کے نکاح اور اولاد ہونے کا واقعہ صحیح ہے یا محض افسانہ، ہارون الرشید خلیفۂ بغداد کے عادات و اطوار کیسے تھے؟

(نگار) عباسہ کا نکاح جعفر کے ساتھ بہت مشہور چیز ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہیں اس کا سب سے پہلا راوی طبری ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید، اپنے وزیر جعفر برمکی اور اپنی بہن عباسہ سے حد درجہ مانوس تھا اور کسی وقت ان سے جدائی پسند نہ کرتا تھا، لیکن چونکہ یہ دونوں غیر محرم تھے اس لئے دونوں کا پردہ توڑنے کے لئے اس نے ان کا نکاح کر دیا مگر شرط یہ قرار دی کہ خلوت میں ایک دوسرے سے نہ ملنے پائیں (یہ شرط غالباً اس لئے تھی کہ مبادا تعلقات زن و شو، خلافت کو برمک خاندان میں منتقل کر دیں) لیکن اس کی پابندی نہ ہو سکی اور آخرکار مکہ میں عباسہ سے ایک لڑکا (اور بروایت دیگر دو توام بچے) پیدا ہوئے۔ اسی زمانہ میں جب ہارون الرشید مکہ پہونچا تو کسی کنیز نے یہ خبر اس کو پہونچا دی اور اس نے جعفر سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ محرم ۱۸۷ھ میں اس نے دفعتہً جعفر کو قتل کرا دیا۔

یہ ہے روایت طبری کی جس کو اس نے صرف افواہاً نقل کیا ہے اور اس سے قبل کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس واقعہ کی غلطی کا ایک اور ثبوت ہے۔ وہ یہ کہ عباسہ کی تین شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور اس کے تینوں شوہر مر چکے تھے، چنانچہ عربی کے مشہور شاعر ابونواس نے عباسہ کے متعلق چند طنزیہ اشعار لکھے جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر خلیفہ کسی باغی کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے تو چاہیئے

کہ عباسہ سے شادی کر دے، کیونکہ اس صورت میں اس کی موت یقینی ہے۔ ابونواس نے اس سلسلہ میں عباسہ کے ان تینوں شوہروں کا بھی نام لکھا ہے اور جعفر کا ذکر اس میں کہیں نہیں ہے۔

علاوہ اس کے جس وقت جعفر کے ساتھ عباسہ کی شادی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت عباسہ کی عمر ۴۴ سال کی تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں جوانی کے وہ ولولے جو اسے جعفر کی مواصلت کے لئے بے اختیار کر دیتے کہاں سے پیدا ہو سکتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قصہ کیوں مشہور ہو گیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت عرب میں وہاں کے داستان گویوں کا عام میلان یہ تھا کہ جب کسی بادشاہ کا ذکر کرتے تھے تو وزیر سے اس کی بہن کا تعلق ازدواج یا رشتۂ محبت ضرور دکھاتے تھے۔ اور ان کی یہی وہ ذہنیت تھی جس نے عباسہ (ہارون الرشید کی بہن) اور جعفر (وزیر) کے معاشقہ کا اختراع کر کے قتل جعفر کی داستان کو رنگین بنا کر پیش کر دیا۔ اور کسی ایسی ہی داستان کو طبری نے درج کر کے بعد کے مورخین کے لئے اس کے نقل و روایت کا دروازہ کھولا۔ طبری کے بعد کے مورخین میں سب سے پہلے ابن خلدون نے اس پر انتقادی نگاہ ڈالی اور اسے ناقابل اعتماد قرار دیا۔

برامکہ کے زوال کا سبب عباسہ کے نکاح کو قرار دینا سخت غلطی ہے، کیونکہ اول تو اس کی صحت بہت مشتبہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیں تو بھی اس کو صرف بہانہ قرار دے سکتے ہیں نہ کہ اصل سبب۔

حقیقت یہ ہے کہ برامکہ کا غیر معمولی اقتدار ہی ان کے زوال کا باعث ہوا۔ آپ برامکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خالد، یحییٰ اور جعفر تینوں اپنے اپنے زمانہ میں خاص اقتدار رکھتے تھے، خالد نے خلیفہ ابوالعباس اور خلیفہ منصور کے زمانہ میں جو اہمیت حاصل کی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے بیٹے یحییٰ کو جو عظمت خلیفہ ہادی اور ہارون الرشید کے عہد میں حاصل تھی وہ بھی سب پر ظاہر ہے، اسی طرح جعفر کو جو عروج ہارون الرشید کے زمانہ میں میسر آیا وہ بھی سب کے علم میں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جعفر اپنے باپ یحییٰ اور اپنے دادا خالد کی طرح اچھا گورنر ثابت نہ ہوا، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا اچھا خوش خط تھا، نہایت بے مثل خطیب تھا، علم نجوم میں ماہرانہ درک رکھتا تھا اور وضع کی تراش خراش کا بھی خاص ذوق رکھتا تھا، لیکن ایک سیاست داں امیر یا حاکم کی حیثیت سے وہ ناکام شخص تھا۔ متعدد بار بڑے بڑے صوبوں کا چارج اس کو دیا گیا، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے نائبوں پر سارا کام چھوڑ دیا اور کبھی اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دئے۔ اس کو ہارون الرشید اچھی طرح جانتا تھا، چنانچہ جعفر کے خلاف فضل بن ربیع کی کامیابیاں اس کی بخوبی شاہد ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری بات جو ہارون کے دل میں کھٹک رہی تھی برا

کی عجم پرستی تھی اور اسے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں خلافت و حکومت بنو عباس کے ہاتھ سے نکل کر ایرانیوں کے قبضہ میں نہ چلی جائے۔ چنانچہ عربوں نے اس کا کافی پروپیگنڈا بھی کیا اور برامکہ کو ملحد و کافر تک ثابت کر دکھایا۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اصمعی کی ایک نظم نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ "جب کسی محفل میں اسلام کے مخالف کوئی بات کہی جاتی ہے تو برامکہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا ہے اور جب قرآن کی کوئی آیت ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو وہ صحیفۂ مزدک کی کہانیاں سنانے لگتے ہیں"۔ بیان جاحظ اور عیون الاخبار میں ایک اور شاعر کی طنزیہ نظم درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ "تعمیر مساجد سے دلچسپی لینا تو صرف میری تفریح ہے ورنہ فی الحقیقت میں ان کی طرف سے ایسا ہی بے پرواہ ہوں جیسے یحییٰ بن خالد"۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ منصور نے خود خالد وزیر سے صاف صاف کہدیا تھا کہ "تم ایرانیوں کی بہت طرفداری کرتے ہو"۔ اور خلیفہ ہادی نے (حسب بیان طبری) یحییٰ (جعفر کے باپ) کو کھلم کھلا کافر کہہ دیا تھا۔

اسی طرح ہارون الرشید نے بھی محسوس کیا کہ برامکہ کا اقتدار نہ صرف بنو عباس بلکہ اسلام کے لئے خطرہ کا سبب ہے اور آخر کار وہ اس کے استیصال پر آمادہ ہو گیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ جعفر کو معزول کر کے اس کے باپ بھائی کی طرح اس کو بھی مقید کر دیتا، لیکن چونکہ ہارون الرشید انتہا پسند شخص تھا اور ہر بات میں وہ انتہائی تکمیل چاہتا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جعفر کا ہلاک کر ڈالنا ہی مناسب ہے، کیونکہ بصورت دیگر وہ سمجھتا تھا، ممکن ہے اسے پھر رحم آجائے۔ (کیونکہ وہ واقعی اس سے بہت محبت کرتا تھا)۔

ہارون الرشید کا زمانہ نہ صرف عہد بنی عباس بلکہ عہد اسلام کا دور زریں کہا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو عظمت و جبروت، سطوت و جلالت اس کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے خلفاء عرب میں کسی کو میسر نہیں آئی۔ اس کے بعد تو خیر زوال ہی شروع ہو گیا تھا۔

وہ علوم و فنون کا بڑا زبردست مربی تھا اور اس کے دربار میں ہر وقت علماء عصر حاضر رہتے تھے۔ علمی مباحث سے اسے خاص دلچسپی تھی اور فنون لطیفہ کا بھی اسے خاص ذوق حاصل تھا۔ شان و شوکت کا وہ عالم تھا کہ اکاسرۂ عجم کی داستانیں بھی ماند پڑ گئی تھیں اور بذل و کرم کی وہ کیفیت تھی کہ جس نے حاتم کے افسانے سے بھی اسے بے نیاز کر دیا۔

وہ نہایت خوش خلق، بنس مکھ اور رحیم المزاج انسان تھا۔ اور کبھی کسی پر ظلم کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ میدان جنگ میں وہ ایک سپہ سالار بھی تھا اور عربی شہامت و بسالت کے پورے جوہر دکھاتا تھا۔ اس کے پورے دور حکمرانی میں صرف قتل جعفر کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے ظلم و ستم سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے۔ لیکن اگر اس وقت کی سیاسیات پر غور کیا جائے تو ہارون الرشید کا جُرم ہلکا نظر آئے گا۔

قبرص ــــ اقریطش

(جناب اسلام علی خانصاحب۔ گوجرانوالہ)

اگر زحمت نہ ہو تو کریٹ اور سائپرس سے متعلق تاریخ اسلام پر روشنی ڈالیے، ممنون ہوں گا۔

(نگار) سائپرس (CYPRUS) اجسے عربی میں قُبرُص یا قُبرُس اور ترکی میں قبرس کہتے ہیں ایک جزیرہ ہے بحرِ روم کے مشرق میں۔ ایام قدیم میں جب شام و مصر کے درمیان بحری سفر کیا جاتا تھا تو تمام جہاز اسی جزیرہ سے ہو کر گزرتے تھے، چنانچہ اسی طرح رفتہ رفتہ وہ تجارتی مرکز اور مصری و شامی تہذیب کا سنگم بن گیا تھا تانبا یہاں کی خاص پیداوار تھی اور اسی لیے اسے قبرس کہنے لگے (عربی میں اچھے تانبے کو قبرس کہتے ہیں)

جب اسلام کی فتوحات وسیع ہونے لگیں تو یہ جزیرہ بازنطینی حکومت کے قبضہ میں تھا اور سب سے پہلے امیر معاویہ نے سنہ ۲۸ھ میں فوجی مہم یہاں روانہ کی اور بجائے بازنطینی حکومت کے مسلم حکومت کا باجگزار بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ عبادہ بن الصامت کی بیوی ام حرام اسی مہم میں شہید ہوئی تھیں اور انکا مقبرہ اب بھی زیارت گاہ عام ہے۔ بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳ھ میں دوسری فوجی مہم یہاں روانہ کی گئی اور زیادہ استحکام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت یہاں قائم ہوئی۔ لیکن امیر معاویہ کے بعد ان کے جانشینوں (یزید) نے اس جزیرہ سے اپنا قبضہ اُٹھا لیا اور اس کا خراج عرب اور بازنطینی حکومت میں برابر تقسیم ہو گیا۔ الغرض عہد بنی امیہ میں اس پر مستقل قبضہ کبھی مسلمانوں کا نہیں ہوا اور اس طرح اس کی حیثیت ایک طور سے خود مختارانہ قائم رہی سوائے اس کے کہ وہ بازنطینی حکومت اور عربوں کو خراج ضرور ادا کرتا تھا۔ پھر چونکہ یہاں کی آبادی عیسائیوں کی تھی اس لئے قدرتاً انھیں بازنطینی حکومت سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی کی اخلاقی حکومت یہاں قائم تھی۔ عہد عباسیہ میں مسلمانوں کی گرفت اس جزیرہ پر اور زیادہ ڈھیلی ہو گئی اور ہر چند ہارون الرشید کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی فوجی مہمیں یہاں روانہ کی گئیں لیکن مستقل قبضہ کا خیال کبھی نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بازنطینی اقتدار یہاں بہت بڑھ گیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس جزیرہ کو تجارتی مرکزیت حاصل تھی اور عرب و عیسائی حکومتوں کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوا کرتے تھے، سوا اسکی یہ

حیثیت بدستور قایم رہی اور سوائے اس کے کہ جس حکومت کا زیادہ اقتدار ہوتا تھا اس کے جنگی جہاز بھی یہاں رہتے تھے اور کوئی فرق کبھی پیدا نہیں ہوا۔

نائس فورس فوکس (NICEPHOROS PHOCS) کے بعد جب کہ سنہ ۹۶۳ء سے ۹۶۹ء تک یہاں حکومت کی یہاں پھر بازنطینی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بعد جب ۱۱۹۱ء میں رچارڈ اول کا جنگی بیڑا ادھر سے گزرا تو اسحاق نام ایک شخص یہاں حکمراں تھا۔ رچارڈ نے اس جزیرہ کو فتح کر کے ٹمپلرس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور انھوں نے لوسگنان کے گائیڈ کو دیدیا۔ اور ۴۰۰ سال تک یہاں فرنگیوں کی سلطنت قایم رہی۔ اس دوران میں یہاں بڑے بڑے گرجا اور قلعے تعمیر کئے گئے۔ یہ حکومت صلیبین کی بڑی معاون تھی اور مصر و شام کی ملوک حکومت کے پہلو میں ایک زبردست خار کی حیثیت رکھتی تھی۔

ملوک حکومت کے بانی بیبرس اول نے ۱۲۶۶ء [illegible] ہوگیا اس کے بعد وسط پندرھویں صدی عیسوی میں مملوکوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنی گزشتہ شکست کا انتقام لینا چاہا اور متعدد لڑائیوں کے بعد مسلمانوں نے اس جزیرہ کو مفتوح کرلیا لیکن [illegible] اور وہی باجگزارانہ حیثیت اس کی قایم رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں پھر فرنگی حکومت [illegible] اور لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اس کے بعد ترکوں کے زمانہ میں سلطان سلیم ثانی نے اس کو مفتوح کرنا چاہا اور آخرکار ترکی حکومت کا یہاں اعلان ہوگیا اور ۱۸۷۸ء تک برابر ان کا قبضہ یہاں قایم رہا۔ اس کے بعد جب اسی سال انگریزوں اور ترکوں کے درمیان معاہدہ ہوا تو یہ جزیرہ انگریزوں کے سپرد کر دیا گیا [illegible] ترکوں کا اقتدار یہاں باقی رہا۔ چنانچہ اب یہ جزیرہ بالکل انگریزوں کے قبضہ میں ہے اور خوب آباد ہے۔

کریٹ (CRETE) کو عربی میں اقریطش کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اول اول جب بازنطینی حکومت سے جنگ شروع کی تو اسی سلسلہ میں اس جزیرہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا (۶۷۳ء) لیکن اس زمانہ کی تاریخ تقریباً تاریکی میں ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ قبضہ عارضی تھا۔ اس کے بعد ۸۲۵ء میں ابوحفص عمر بن عیسیٰ بن شعیب مستقلاً اس پر قابض ہوگیا۔ ابوحفص اس جماعت کا سردار تھا جس نے قرطبہ کے فرمانروا حکم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جو شکست کھا کر بحر روم کے سواحل پر قزاقانہ حملے کیا کرتا تھا۔

ہرچند بازنطینی حکومت نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر قابض ہوجائے لیکن برابر ۱۳۵ سال تک

مسلمانوں کا قبضہ اس پر قایم رہا۔ یہاں انھوں نے ایک نیا دارالحکومت بھی خندق (؟) کے نام سے تعمیر کیا جو بعد کو کنڈیا (CANDIA) ہوگیا اور رفتہ رفتہ سارا جزیرہ اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنہ ۹۶۱ء میں نے بازنطینی جنرل نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس جزیرہ کو فتح کرلیا۔ یہاں آخری مسلمان امیر (عبدالعزیز) قسطنطنیہ قید کرکے بھیجدیا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ قسطنطنیہ اسوقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا اور بازنطینی حکومت کا پایۂ تخت تھا۔

اس کے بعد جب قسطنطنیہ کو لاطینیوں نے فتح کیا، تو کریٹ سنہ ۱۲۰۴ء میں (VENETIANS) کے ہاتھ فروخت کردیا گیا۔

اس کے بعد جب ترکوں کی فتوحات وسیع ہوئیں تو ادھر بھی انھوں نے توجہ کی اور آخرکار اس جزیرہ کا بڑا حصہ سنہ ۱۶۶۹ء میں ترکوں کے قبضہ میں آگیا اور سنہ ۱۷۱۵ء تک پورا جزیرہ ان کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ ہرچند اس جزیرہ کی مدافعت میں تمام مغربی حکومتوں نے حصہ لیا تھا لیکن ترکوں کے مقابلہ میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔

اس جزیرہ میں ترکوں کے قبضہ کے وقت بالکل عیسائی آبادی پائی جاتی تھی۔ لیکن بعد کو فاتح قوم کا مذہب بھی بہت سے عیسائیوں نے اختیار کرلیا اور ان کا اقتدار اسقدر بڑھ گیا کہ حکومت بھی پریشان ہوگئی اور باوجود متعدد کوششوں کے ان کی بغاوتوں کو فرو نہ کرسکی۔

سنہ ۱۸۳۰ء میں جب لندن کانفرنس نے یونان کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کیا تو خیال تھا کہ یہ جزیرہ بھی اسی کو دیدیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور محمد علی پاشا (حاکم مصر) کو دیدیا گیا جسے ترکوں نے اپنی مدد کے لئے طلب کیا تھا۔ اس طرح ترکوں کا تعلق اس جزیرہ سے بدستور قایم رہا لیکن مقامی بغاوتوں کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہا اور بمشکل تمام کافی قربانیوں کے بعد سنہ ۱۸۶۹ء میں یہاں امن و سکون قایم ہوسکا۔

جب سنہ ۱۸۷۷ء میں جنگ روم و روس ہوئی تو یہاں پھر بغاوت شروع ہوگئی اور سلطنت گورنمنٹ اس کو ملگئی، لیکن یہ تدبیر بھی مفید ثابت نہ ہوئی اور بدامنی کا دور دورہ برابر قایم رہا اور آخرکار دول یوروپ نے مداخلت کرکے ترکوں کی حکومت کا یہاں بالکل خاتمہ کردیا۔

عجائب وغرائب

بائیس سال قبل سامان حرب پر جتنی رقم صرف ہورہی تھی وہ بھی غیر معمولی تھی لیکن اب باوجود ادعائے صلح کوشی جو کچھ صرف ہورہا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:-

	سنہ ۱۴ء		سنہ ۳۶ء	
برطانیہ	۱۰۳۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ	۱۳۳۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ
امریکہ	۶۷۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۵۰۰۰۰۰۰۰	"
فرانس	۹۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۲۰۰۰۰۰۰۰	"
جرمنی	۱۲۷۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۹۰۰۰۰۰۰۰	"
اطالیہ	۵۰۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۶۰۰۰۰۰۰۰	"
جاپان	۲۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۷۴۰۰۰۰۰۰۰	"

اسوقت دنیا میں ۲ کروڑ بچے (جن کی عمر ۶ سال سے ۲۰ سال تک کی ہے) جنگ کی تعلیم پا رہے ہیں) بعض قومیں ۵ سال کی عمر ہی سے فوجی تعلیم شروع کردیتی ہیں اور بعض تین سال کی عمر ہی میں جنگی جھنڈا بچوں کے ہاتھ میں دیدیتی ہیں تاکہ ان کے اندر کھیل کا ذوق بھی جنگ ہی کے جذبہ سے شروع ہو۔

گزشتہ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس کی حکومت نے ایک محکمہ قایم کردیا تھا تاکہ ان بموں کو زمین کے اندر ڈھونڈھے جو پھٹنے سے رہ گئے تھے۔ چنانچہ گزشتہ ۱۸ سال سے یہ کام جاری ہے اور گاڑیوں پر گاڑیاں ان بموں کی بھیجی جارہی ہیں۔ پچھلے چھ سال میں ۴۳۵۰۰۰ ٹن وزن کے بم زمین سے نکال کر حکومت کے پاس ضایع کرنے کے لئے بھیجے جاچکے ہیں اور ۱۶۷۰۰۰ وزن کے بھاری بم جو منتقل نہ ہوسکتے تھے وہیں ضایع کئے جاچکے ہیں۔ اس سے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔

شنگھائی کے ہانگ کانگ بینک کے پھاٹک پر پیتل کے دو شیر نصب کئے گئے ہیں، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر واہمہ پرست چینیوں نے ان شیروں کے پنجوں کو اسقدر مس کیا کہ اب وہ بالکل گھس گئے ہیں۔ چینیوں کا خیال ہے کہ یہ شیر بہت متبرک ہیں اور جو شخص ان کو چھولیتا ہے اس کو بہت فلاح ہوتی ہے۔

تخت برطانیہ پر جب کوئی نیا بادشاہ بیٹھتا ہے تو تاج میں اسکے سر کے مطابق ضرور تبدیلی کی جاتی ہے۔

روسیوں نے اپنی داڑھیاں اُڑا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ۱۵۰۰ اجسام اس کام کے لئے زیر تربیت ہیں۔

حال ہی میں ایک جراثیم کش سرو شعاع دریافت ہوئی ہے جو عمل جراحی کے وقت مریض کے آس پاس ڈالی جاتی ہے اور اس سے فضا میں اُڑنے والے جراثیم از خود فنا ہو جاتے ہیں۔

جاپان کی آبادی ۱۹۳۵ء میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس اضافہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یعنی وہاں فی گھنٹہ ۲۰۰ پیدائش کا اور ۱۲۳ اموات کا اوسط پڑتا ہے۔ اسوقت جاپان کی آبادی سات کرور کے قریب ہے۔

کاغذ کی [illegible] تیل ملکر طیار کیا جاتا ہے جاپان کے اندر بارہ بارہ آنے میں فروخت ہو رہی ہیں انکو لپیٹ کر نہایت چھوٹے پیکٹ میں [illegible] نہ ان میں شکن پڑتی ہے اور نہ وہ آسانی سے پھٹتی ہیں۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ دنیا [illegible] سے زیادہ جاہل ہے اور تعلیم کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ہزار سال کے بعد یہی حال رہیگا، کیونکہ پیدائش جتنی جلد ہوتی ہے اتنی جلد تعلیم تو نہیں ہو سکتی۔

رنگون [illegible] نے وہاں کی پبلک سے درخواست کی ہے کہ براہ کرم آیندہ ڈاک کے ذریعہ سے انسانی [illegible] دشمن کا سر کاٹ کر اس کے عزیزوں کے پاس بھیجنے کی رسم عام ہے۔

[illegible] معدہ کا مریض تھا۔ حال ہی میں اسکے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اندر سے جو کچھ دستیاب ہوا [illegible] کا ڈبہ کھولنے والا آلہ، تین سگار ہولڈر، تیرہ پنسلیں، پانچ فاؤنٹن پن، ایک چمچہ [illegible] کا دستہ، چند سوئیاں، ایک ٹکڑا کانچ کا اور پانچ سکے۔

[illegible] آلہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے، یہ تار کا حلقہ ہے جو ساری رات چہرہ پر [illegible] سے گڑھے پیدا کر دیتا ہے۔

[illegible] ہیں [illegible] ۴۸ میل فی گھنٹہ۔ موٹر ۱۰۳ میل فی گھنٹہ۔ ہوائی جہاز ۳۴۴ اور بندوق کی [illegible]

جرمنی کے ڈاکٹر [illegible] نے منجمد پٹرول طیار کیا ہے جسے SOLENE کہتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں پنیر کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور ہوائی جہازوں اور موٹروں میں موم بتی کی طرح جلتا ہے، یہ رقیق پٹرول سے بہتر کام دیتا ہے۔

نیو یارک میں اسوشی ایٹڈ ہاسپٹل سروس کے نام سے ایک تنظیم قایم ہے جو فی گھر ساڑھے تین آنے روزانہ لیکر ۱۸ سال سے کم عمر کے تمام لڑکوں کا علاج مفت کرتی ہے اور دوائیں وغیرہ بھی اپنے پاس سے فراہم کرتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ خیرات کے سلسلہ میں نہیں ہوتا۔ یہ تنظیم اپنے مصارف خود پورے کر لیتی ہے۔

امریکہ کے بعض مقامات میں [illegible] بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور کھیتوں کو کھا جاتے ہیں۔ ایک کسان نے تین ترکی مرغیاں لیں اور شام کو کھیت میں چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کیڑوں کو کھا جائیں، لیکن صبح کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تینوں مرغیاں بالکل بے پر و بال تھیں۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۳

نگار

قیمت

نرخنامہ اجرت اشتہار

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ـ ۱۰۰ روپے	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۱۰ [illegible]
آدھا صفحہ ـ ۵۰ 〃	۲۵ 〃	۱۳ 〃	۵ [illegible]
چوتھائی صفحہ ۲۵ 〃	۱۳ 〃	[illegible] 〃	۳ [illegible]

اُردو شاعری

یعنی جنوری [illegible] کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی ابتدا، ترقی اور ہر زمانہ کے شعرا پر [illegible] تبصرہ کیا گیا ہے [illegible] اس کی موجودگی میں آپ کو کسی [illegible] تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں [illegible] مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ؍ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری [illegible] کا نگار جس میں ہندی شاعری [illegible] تمام [illegible] کا ایک تذکرہ موجود ہے جس میں تمام شعرا [illegible] کلام کا انتخاب [illegible] درج ہے۔ ہندی شاعری کی [illegible] قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو [illegible] آپ [illegible] حجم [illegible] صفحات ہے۔ قیمت علاوہ محصول [illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان [illegible]

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی [illegible]

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام [illegible]

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز [illegible]

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (ستہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء	شمارہ (۵)

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری — معاون:۔ جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	مئی ۳۷ء	شمار (۵)

ملاحظات

دستور جدید اور کانگرس

جس طرح انفرادی طور پر انسان کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جو اسکی دنیائے خیال میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں کہ قومی ذہنیت بدلدینے کی بڑی زبردست قوت ان کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی جماعت ان ساعتوں کی اہمیت کو سمجھکر ان سے فایدہ اُٹھالیتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے، ورنہ زمانہ کا زبردست پہیہ گھومتا ہوا آتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اسے پامال کرکے چلاجاتا ہے ۔ یہ ہے قدرت کا وہ قانون جسکے تحت اسوقت تک ہزاروں قومیں بنیں بگڑیں اور آیندہ بھی بنتی بگڑتی رہیں گی۔

یکم اپریل ۳۷ء کو ہندوستان میں دستور جدید کا نفاذ ہوتا ہے، اور سارے ملک میں ایک عام ہڑتال کے ذریعہ سے نہایت خاموش مگر زبردست احتجاج اس دستور کے خلاف کیا جاتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر

یوں سمجھئے کہ اہل ملک دستور جدید کو ایک لعنت قرار دیکر اس کے توڑ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دستور جدید ہندوستان کے لئے پیام رحمت بنکر آیا ہے اور یہی ساعتیں اپنے ساتھ لایا ہے جب قوموں کی پرانی تاریخ ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ساحل تک پہونچنے والی کشتیاں وہی تھیں جن کو رُخ ہوا کے تھپیڑے نے ادھر سے اُدھر کر دیا تھا۔

دستور جدید نے جس وقت قانون کی صورت اختیار نہ کی تھی اور صرف مسودہ کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں زیر غور تھا، اس وقت بھی ملک کی ہر جماعت نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن آخر کار وہ قانون بنکر رہا، کیونکہ حکومت جانتی تھی کہ اس ملک کی مخالفت ہی کیا جہاں اختلاف مذہب کے دیوتا پر "وطنیت" کی قربانی چڑھائی جا چکی ہو اور اب کہ اس دستور کا نفاذ ہندوستان میں ہو چکا ہے، وہ باوجود ہماری بیزاری کے ہم پر مسلط رہے گا کیونکہ حکومت کو یقین ہے کہ "تفرقۂ فرو دین" مٹنے والی چیز نہیں اور اس لئے جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ہندوستان کا مستقبل مسلم یا ہندو راج یا مسیحی (جو کبھی نہیں ہونا) حکومت سے اسکے " LION'S SHARE " چھیننے کا کس کو یارا ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹ء کے اصلاحات کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالات کی تحقیق کے لئے سنہ ۲۸ء میں سائمن کمیشن آتا ہے جو تمام تر غیر ملکی افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ملک اس کمیشن کا بائیکاٹ کرتا ہے اور اس کی شائع کردہ رپورٹ کو عام طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ زمانہ لارڈ اروِن کی حکومت کا ہے جو یہاں کی سیاسی فضا کو دیکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت کا نصب العین ڈومنین اسٹیٹس (خود مختارانہ مقبوضاتی حیثیت) حاصل کرنا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ہندوستان جنگ آزادی میں مصروف تھا، اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد طے پاتا ہے لیکن وطن پرستوں میں سے کسی ایک کو مدعو نہیں کیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ خود اس سے مطمئن نہیں ہوتی اور دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو بھی نمایندۂ کانگریس کی حیثیت سے شریک کیا جاتا ہے، لیکن جب گاندھی جی ہندوستان واپس آتے ہیں تو یہاں کی فضا بہت مکدر نظر آتی ہے کیونکہ لارڈ اروِن کے جانشین لارڈ ولنگڈن پوری عسکری قوت کے ساتھ کانگریس کی جنگ آزادی کو مٹانے میں مصروف نظر آتے ہیں اور لارڈ اروِن اور گاندھی جی کے درمیان جو سمجھوتا ہوا تھا اس کو نظر انداز کرنے پر مُصر۔ آخر کار حکومت اور کانگریس کے درمیان پھر وہی حجابات حایل ہو جاتے ہیں اور اسی باہمی کشمکش و تنفر کے زمانہ میں تیسری گول میز کانفرنس کا

انعقاد ہوتا ہے اور ۱۹۳۳ء میں سفید کاغذ (WHITE PAPER) کے نام سے دستور جدید کا خاکہ بھی شایع ہو جاتا ہے جس کا عملدرآمد گزشتہ سال مجلس مقننہ کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے اور آخر کار یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے دستور جدید کا باقاعدہ نفاذ بھی ہو جاتا ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے موسوم ہے۔

دستور جدید کا مطالعہ کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ واضعین دستور نے اپنی تمام قابلیت اس بات میں صرف کر دی ہے کہ حریت پسند یا بالفاظ دیگر کانگریس جماعت کے اقتدار و اثر سے اسے جہت بلند (فرو تر؟) رکھا جائے۔ اسی لئے انھوں نے اول تو شرائط رائے دہندگی کو اتنا سخت بنایا کہ ۲۵ فی صدی سے زیادہ رائیں اہل ملک کی حاصل نہ ہو سکیں دوسرے ہر جماعت کے لئے انتخاب جداگانہ کی شرط لگا کر کانگریس کی کامیابی کو زیادہ ناممکن بنا دیا۔ الغرض جہاں تک محض دستور سازی کا تعلق تھا حکومت نے ہر ممکن پہلو کو پکڑ لیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ملک کے صحیح جذبات کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر رہی۔

لارڈ ولنگڈن کی سخت گیر حکومت نے ملک کی شورش کو دبا کر برطانوی پارلیمنٹ کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی یا ختم کر دی جا سکتی ہے اور اسی پر اعتماد کرکے دستور جدید کا چیلنج ملک کو دیدیا گیا، درانحالیکہ حقیقت یہ نہ تھی اور اس حقیقت کا اندازہ اس وقت کھلا جب گزشتہ انتخاب میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کرکے حکومت کو بتا دیا کہ حکومت اور دوسری مخالف قوتوں کی مخالفت کے باوجود ستر فی صدی رائیں اہل ملک کی اسی نے حاصل کیں۔ انتخاب کے اس نتیجہ نے سب کی آنکھیں کھولدیں اور نہ صرف غیر کانگریسی جماعتیں بلکہ حکومت نے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا کہ لارڈ ولنگڈن جس چیز کو اپنے پندار میں "جسد بے جان" بنا کر چلے گئے تھے اس میں نہ صرف یہ کہ آثار حیات باقی ہیں بلکہ قوت مسابقت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ پھر میرے نزدیک یہی وہ ساعت ہے جو ہندوستان کا مستقبل اپنے اندر لئے ہوئے ہے لیکن افسوس ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کی جو تدابیر اختیار کرنا چاہیئے تھیں ان کو ہم اپنے جوش کامیابی میں نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ کانگریس کا نصب العین دستور جدید کو توڑنا اور اس کی جگہ کسی ایسے دستور کا مطالبہ کرنا ہے جو صحیح معنے میں ہندوستان کو موجودہ دفتری اقتدار سے آزاد کرا دے۔ سو اس مقصد کے حصول کی دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ دستور جدید کے نفاذ میں کوئی حصہ نہ لیا جاتا اور شروع سے انتخاب ہی کو ناقابل عمل بنا دیا جاتا، دوسری یہ کہ دستور جدید ہی کے قائم کردہ اصول پر آئینی جنگ کیجاتی اور رفتہ رفتہ اپنے مطالبات حاصل کئے جاتے۔ کانگریس کی ایک جماعت (جو سوشلسٹ جماعت کے نام سے موسوم ہے) اول صورت کی حامی تھی لیکن چونکہ اکثریت اسکی نہ تھی اس لئے طے یہی پایا کہ کانگریس انتخاب میں حصہ لے اور اپنی اکثریت سے صوبوں کی حکومت پر اقتدار حاصل کرے، چنانچہ اس نے انتخاب

میں حصہ لیا اور ہندوستان کے چھ صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے حکومت اور حکومت پرستوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ کسی اور سوال کی گنجایش نہ تھی اور انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کو عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے تھی، لیکن کانگرس کے ارباب حل و عقد میں پھر گفتگو شروع ہوئی کہ عہدے قبول کرنا چاہئے یا نہیں، بالآخر خدا کر کے یہ بھی طے ہوا لیکن مہاتما گاندھی نے جو ہمیشہ عین وقت پر کوئی نہ کوئی پیشگوئی پیدا کر دینے کے عادی ہیں، یہ شرط لگا دی کہ پہلے گورنروں سے یہ اقرار لے لیا جائے کہ وہ کانگرس کی آئینی سرگرمیوں میں کوئی دخل نہ دیں گے اور اس کے بعد وزارتیں قبول کی جائیں — اگر اس سے گاندھی جی کا مقصود یہ ہوتا کہ اس طرح وہ وزارتیں قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں تو ہم اس کو ان کی ہوشیارانہ چال سمجھ کر خاموش ہو جاتے، لیکن لطف یہ ہے کہ وہ انتہائی سادگی سے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ انھوں نے یہ شرط عاید کر کے گورنروں سے کوئی ایسا اقرار نہیں چاہا تھا جو دستور جدید کے اقتضا کے خلاف ہوتا۔ بہرحال اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یعنی چھ صوبوں کے گورنروں نے جہاں کانگرس کی اکثریت تھی ایسا اقرار نامہ داخل کرنے سے انکار کر دیا اور دوسری جماعتوں کی وزارتیں مرتب کر کے کام شروع کر دیا۔ اب کانگرسی جماعت اس کی منتظر ہے کہ اسمبلیوں کے جلسے طلب کئے جائیں اور وہ ان وزارتوں کو توڑ کر حکومت کی راہ میں مشکلات حایل کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان تدبیروں سے وہ دستور جدید کو ناقابل عمل ضرور بنا سکتے ہیں لیکن اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اگر دستور جدید کو توڑنا ہی ان کا مقصود تھا تو اس کی صحیح تدبیر صرف یہ تھی کہ انتخاب میں کوئی حصہ نہ لیا جاتا اور حکومت کے ضمیر میں یہ خلش پیدا کر دی جاتی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ملک کی اکثریت اس کے خلاف کر رہی ہے، لیکن جب کانگرس نے انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دیدی تو اس کے معنے صرف یہ تھے کہ اب وہ آئینی جنگ کرنا چاہتی ہے اور وزارتیں قبول کر کے جنگ کی یہی صورت اسے قایم رکھنا چاہئے تھی۔

یہ بالکل درست ہے کہ دستور جدید میں گورنروں کو اسقدر وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف وزارتیں اور اسمبلیاں کچھ نہیں کر سکتیں لیکن حصول اختیار اور استعمال اختیار میں بڑا فرق ہے اور اس لئے جب تک گورنروں کے طرز عمل سے یہ بات ثابت نہ ہو جاتی کہ وہ اپنے اختیارات کا بیجا استعمال کر رہے ہیں اسوقت تک کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اس کا تاریک پہلو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ گورنروں سے یہ کہا جاتا کہ "تم چھیڑ دو گے ضرور" — اس سے انکار ممکن نہیں کہ دستور جدید ہندوستان کی خواہش آزادی کو کسی طرح پورا کرنے والا نہیں اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ صوبجاتی خود مختاری کی حیثیت ایک استبدادی حکومت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ اسکو آزادی ہندوستان کی طرف

پہلا قدم بتاتی ہے اور ہم کو اسکے اسی بیان سے فایدہ اُٹھا کر دستور کی آمرانہ حیثیت کو توڑنا چاہئے۔ برطانوی قوم
خود غرض سہی، لیکن اسی کے ساتھ اسکی آئین پسندانہ ذہنیت اتنی زبردست ہے کہ سخت اشتعال کی حالت میں
بھی وہ آئین کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ کوئی ظلم کرنا چاہتی ہے تو پہلے اس ظلم کا ایک قا
بنا دیتی ہے اس لئے اگر ہم تسلیم کرلیں کہ دستور جدید یکسر آئینی استبداد ہے تو بھی اس سے انکار ممکن نہ ہوگا کہ اس کے
اندر بعض اُصولی باتیں یقیناً ایسی پائی جاتی ہیں کہ اگر گورنر صاحبان اپنے اختیارات ذاتی استعمال کرنے لگیں تو
برطانوی حکومت کی نیت کو ضرور مجبوب کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کانگرس آئینی جنگ کرنا چاہتی تھی تو اسکو
پس وپیش وزارتیں قبول کرکے اصطلاحات کا کام شروع کر دینا چاہئے تھا اور دیکھنا چاہئے تھا کہ گورنر و
طرزِ عمل استعمال اختیارات کے باب میں کیا ہے۔ اگر وہ ان کا بیجا استعمال کرتے تو بیشک وزارتوں سے دست بر
ہو جانا چاہئے تھا اور یہ صورت عمل کی زیادہ شاندار اور مفید ہوتی۔ لیکن وزارتیں قبول کرنے اور کام شروع
کرنے سے قبل ہی یہ یقین کر لینا کہ گورنر ضرور ان کے کام میں حارج ہوں گے، اور کام کو ہاتھ نہ لگانا صرف یہ کہ مصلح
و تدبیر کے منافی ہے بلکہ اس میں ایسا تحکم بھی پایا جاتا ہے جو کانگریس کی سنجیدگی کو صدمہ پہونچانے والا ہے
یہ بحث کرنا کہ گورنر دستور جدید کو کسی حد تک بدل سکتے ہیں یا نہیں، سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی
کہ قانونی موشگافیاں کرکے فضول وقت ضایع کیا جائے کیونکہ اگر گاندھی جی یہ شرط عاید کرنے کے بعد بھی یہی سمجھتے
کہ گورنروں کے اختیارات خصوصی بدستور اپنی جگہ باقی رہتے ہیں تو پھر اس وعدہ کا لینا نہ لینا دونوں یکساں تھا اور اگر
یہ سمجھتے تھے کہ گورنر ایسا وعدہ کرنے کے بعد اپنے اختیارات خصوصی سے محروم ہو جائے گا تو یہ ان کی نادانی تھی۔

بہرحال اسوقت کانگرس کا یہ طرزِ عمل کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً اس نے وزارتیں قبول
کرکے ملک کے اغراض و مقاصد کو کافی نقصان پہونچایا ہے۔ کانگرسی جماعتوں کے بجائے اسوقت جتنی غیر کا
جماعتیں وزارت کی خدمات انجام دے رہی ہیں وہ بھی ملک کی بہتری و ان کی اقتصادی پستی دور
عملی تدابیر اختیار کر رہی ہیں اور اسوقت تک کسی گورنر نے ان کی راہ میں کوئی دشواری حایل نہیں کی اس
کہا جا سکتا ہے کہ اگر کانگرسی وزرا بھی عہدے قبول کرکے واقعی اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کو
آزادی دیجاتی۔ البتہ اگر ان کا مقصود صرف دستور کو توڑنا ہے اور وہ بجائے تعمیری کام کے صرف تخریبی صو
اختیار کرنے کے لئے آنا چاہیں تو بیشک گورنر ان کو اس کی اجازت نہ دے گا اور نہ اس تدبیر سے ملک کو کوئی
فایدہ پہونچ سکتا ہے — بہرحال اسوقت صورتِ حالات امید افزا نہیں ہے اور اگر اہل کانگرس کی
ذہنیت قایم رہی تو پنڈت سرقایم شدہ کسی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ گاندھی جی کے بیانات سے معلوم ہو
کہ انھیں بھی اپنی غلطی کا احساس شروع ہو گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ بات کی پچ بھی ہے اور اس وقت تک

اس گتھی کو جو خود انھیں کی ڈالی ہوئی ہے سلجھا نہیں سکے۔ یہ دلیل تو ہوا ہندوؤں یا ان لوگوں کا جو کانگرسی کہلاتے ہیں اب رہ گئیں دوسری جماعتیں جن میں مسلمانوں کو زیادہ دلچسپی حاصل ہے، سوال کا یہ حال ہے کہ وہ کانگرس کی کامیابی سے چونکی تو ضرور ہیں لیکن ابھی تک آنکھیں ملنے سے انھیں فرصت نصیب نہیں ہوئی۔

اس سے قبل بھی ہم لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو کانگرس میں شریک ہو کر کام کرنا چاہئے اور تمام وہ مسائل جن پر وہ حکومت کی۔ دچاہتے ہیں کانگرس کے پلیٹ فارم پر طے ہونا چاہئے۔ کانگرس کسی مخصوص جماعت کی مجلس نہیں ہے بلکہ وہ سارے ہندوستان کی سیاسی مجلس ہے۔ میں نے بعض مسلمانوں کو کہتے سنا ہے کہ کانگرس پر ہندو جماعت قابض ہے اور اسلئے انکے مطالبات پر غور کئے جانے کی وہاں کوئی صورت نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن کیا میں یہ سوال کرسکتا ہوں کہ ان کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ یلغار کرکے کانگرس پر قابض نہ ہو جائیں، اور یہ بھی اگر وہ اس پر آمادہ ہو جائیں تو کون انھیں روک سکتا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہو یا مجلس احرار، مسلم لیگ ہو یا کوئی اور جماعت، اس وقت ان سب کا وجود بے معنی ہے اور مسلمان اگر کوئی سیاسی اہمیت حاصل کرسکتے ہیں تو اسی کی صورت صرف یہ ہے کہ پوری اجتماعی قوت سے ساتھ وہ کانگرس میں حصہ لیں۔

ندوۃ العلماء مسلمانوں کے کلچر کی وہ خصوصیت جو کسی حال میں بھی ان سے منفک نہیں ہوئی، اعتماد ذات اور خودداری نفس تھی اور علماء سلف کے تذکروں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، لیکن اب ہمارے علماء کرام اور ان کے قائم کئے ہوئے اداروں کی غیرت نفس کا جو عالم ہے اس کا اندازہ ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے اس سپاسنامہ سے ہو سکتا ہے جو نواب صاحب رامپور کی خدمت میں ذریعۂ اظہار حقیقت پیش کیا گیا ہے۔ اس کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:-

"تمام ارکان ندوۃ العلماء بذات خود حضور نواب صاحب بہادر کے دل سے شکرگزار ہیں اور بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور نواب صاحب ممدوح کو صحت و عافیت کے ساتھ عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رکھے اور ریاست رامپور کو سرسبز اور ابدالآباد تک قائم رکھے اور ترقیات عطا فرمائے۔" عبدالعلی۔ ناظم ندوۃ العلماء

ان الفاظ کو غور سے پڑھئے اور قطع نظر اس سے کہ ادبی حیثیت سے وہ حد درجہ طفلانہ ہیں، یہ دیکھئے کہ ان سے کتنی گدایانہ ذہنیت ٹپک رہی ہے۔ نواب رامپور نے احسان فرمایا ہو یا اپنا فرض ادا کیا ہو اس سے بحث نہیں، رقم تین سو کی ہو یا تین لاکھ کی یہ بھی خارج از گفتگو ہے۔ لیکن غور طلب امر صرف یہ ہے کہ کیا رسم تشکر اس سے زیادہ سنجیدہ و متین الفاظ میں ادا نہ کی جا سکتی تھی، کیا ندوۃ العلماء اصول ادب و انشاء سے اسقدر بیگانہ ہو گیا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے رابطۂ عطا و قبول کی صورت، انفرادی رابطۂ عطا و قبول سے بالکل مختلف ہوا کرتی ہے۔ بیغرضی

زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ یہ الفاظ جناب سید [illegible] ناظم ندوۃ العلما کے قلم سے نکلے ہیں جو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے بخوبی واقف [illegible] زیادہ حیثیت اختیار نہیں کرتا، چہ جائیکہ تین سو روپیہ کی حقیر رقم ۔۔۔ بہرحال یہ الفاظ [illegible] موزوں ہو سکتے تھے لیکن ندوۃ العلما کے شایان شان کسی طرح [illegible] پھر اگر یہ مذہبی و علمی ادارہ روپیہ [illegible] دینے کو [illegible] سمجھتا ہے تو فرض کیجئے اگر کل میں پانسو [illegible] کی رقم ندوۃ العلما کے خزانہ میں داخل کر [illegible] تو کیا وہ اس [illegible] لجاحت آمیز دعائیہ قصیدہ ایک وفد کے [illegible] سے میرے حضور میں پیش کرے [illegible] ایک نقشہ ہے۔

[illegible] سے قبل بھی [illegible] ایک ہفتہ [illegible] اطلاع پہونچائی گئی کہ مولانا حبیب الرحمان خان [illegible] صاحب شروانی [illegible] اس جناب [illegible] کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو [illegible] داڑھی بڑھانے میں دیگر طلبہ پر سبقت لیجا [illegible] میں نے [illegible] ندوۃ العلما سے استفسار کیا کہ آیا واقعی یہ خبر صحیح ہے لیکن جیسا کہ اس سے قبل [illegible] میرے سوالوں کا جواب [illegible] اس بار بھی اسی سکوت سے کام لیا گیا اور مجھے یہ سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ [illegible] اطلاع غلط نہیں ہے [illegible] معلوم ہوا ہے کہ [illegible] وظیفہ دیا جاتا ہے جو [illegible] اس کی داڑھی کی پیمائش کی جاتی ہے [illegible] اس میں کتنی کا میابی حاصل کی ہے۔ بہرحال اس سے اور کوئی فائدہ [illegible] لیکن [illegible] داڑھی [illegible] کے مقابلہ کا بھی موقع آیا تو [illegible] کے [illegible] کاٹنے [illegible] غالباً ناکام نہ رہیں [illegible] ہمارے علمی اداروں [illegible] ہے۔

میں یقیناً [illegible] سکو بھی برا نہیں سمجھتا [illegible] کے طلبہ کو [illegible] کہا جائے [illegible] دہنیت میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے [illegible] شعار اسلامی [illegible] سے [illegible] وظیفہ کی لالچ یا ناظم صاحب کے احتساب کا خوف باقی ہے [illegible] تو وہ داڑھی بڑھائیں گے لیکن جب تعطیلوں میں دارالعلوم کی حدود سے باہر نکلیں [illegible] سے پہلے [illegible] ہلکا کرنے کے لئے [illegible] کی جستجو پیدا ہو۔

کاغذ کا مسئلہ

اس وقت کاغذ [illegible] بہت گراں ہو گیا ہے [illegible] بازار میں آسانی سے ملتا بھی نہیں۔ یہاں [illegible] میں خود [illegible] لیکن اس کو گورنمنٹ کی فرمائشیں پوری کرنے سے فرصت نہیں ملتی [illegible]

[illegible] کاغذ [illegible] اس وقت دو چند سے زیادہ گراں ہو گیا ہے اور غالباً کئی سال تک یہی حالت رہے گی [illegible] کا اثر رسائل و اخبار پر بہت خراب پڑ رہا ہے اور پڑے گا۔

پبلک کے ذوق کو دیکھتے ہوئے اسکی جرأت تو کسی جریدہ کو نہیں ہو سکتی کہ وہ قیمت میں اضافہ کرے البتہ وہ یہی کر سکتا ہے کہ کاغذ ہلکے قسم کا استعمال کرے، چنانچہ اس ماہ نگار کی بعض کاپیاں بجائے ۲۴ پونڈ کاغذ کے ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر چھاپی گئی ہیں اور اگر روز افزوں گرانی کا یہی عالم رہا تو مجبوراً ہمیں بھی ناروے کے کاغذ پر اتر آنا پڑے گا جسے پنجاب کے بعض رسائل اب استعمال کرنے لگے ہیں ۔۔۔ وہ لوگ جو صرف معنی و حقیقت کو دیکھتے ہیں ان سے تو نہیں لیکن جو صورت و سطح کے شائق ہیں [illegible] اپنی اس مجبوری کا اظہار کرتا ہے ورنہ [illegible] نمائش کے لحاظ سے نگار کبھی کوئی خصوصیت حاصل نہیں کر [illegible] اور نہ اس وجہ سے کوئی اس کا مطالعہ کرتا ہے۔

ابونواس

از

اس کی شاعری

ابونواس[1] کو پبلک میں روشناس کرنے اور اس کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنے کا بہترین طریقہ تو یہ تھا کہ اس کے اصناف کلام کا ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا اور اس کی وہ خصوصیات بیان کی جاتیں جن میں وہ منفرد ہے اور وہ خوبیاں نمایاں کر کے دکھائی جاتیں جو اس کے کلام کی خصوصیات ہیں پھر وہ جس مرتبہ کا شاعر ہے اسی مرتبہ کے شعراء کا کلام پیش کر کے اس کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، تاکہ اس کے مرتبۂ شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا

مگر یہ طریقہ ایک مضمون نگار کے لئے جس قدر دشوار ہے اس سے زیادہ عربی زبان کی کس مپرسی اور کساد بازاری کے موجودہ عہد میں پبلک کے لئے غیر دلچسپ بھی ہے، اس لئے ہم نے اس کے کلام سے صرف اسی حصہ کو منتخب کیا ہے جس سے ہر شخص لطف اٹھا سکتا ہے۔

ابونواس کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مضامین کے اعتبار سے اس کے کلام کا بڑا حصہ چار ابواب پر

---

[1] ابونواس کا نام "حسن بن ہانی" تھا، نواس عربی لفظ ہے جس کے معنی زلف کے ہیں، چونکہ ابونواس کے بڑی بڑی زلفیں تھیں اس لئے لوگ اسے "ابونواس" یعنی زلفوں والا کہنے لگے، یہ کیفیت بعد میں اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے۔

اس کا باپ بصرہ کا رہنے والا تھا اس نے ایک ایرانی عورت سے شادی کر لی تھی جس سے ابونواس پیدا ہوا، ولادت و وفات کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے مگر زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ۱۴۵ھ میں پیدا ہوا اور [illegible] میں اس نے انتقال کیا

تقسیم ہو سکتا ہے، قصائد، غزلیات، خمریات، ہزلیات، میں نے اپنے مضمون میں انھیں ابواب کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

گو اس کے مجموعۂ کلام میں فخر و حماسہ، ادب و حکمت، مرثیہ اور ہجو وغیرہ پر بھی جستہ جستہ اشعار ملتے ہیں لیکن ان ابواب شاعری سے نہ ابونواس کو کچھ دلچسپی تھی اور نہ اُس میں وہ کوئی امتیازی شان رکھتا تھا، اس لئے میں نے اُس کے ذکر سے قصداً گریز کیا ہے۔

ابونواس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اُسکی شاعری رندانہ عیش و طرب کی شاعری ہے، اُس میں والہانہ شیفتگی و دیوانگی پائی جاتی ہے، اُس کی زبان شستہ اور طرز بیان شگفتہ ہے، اُس کے الفاظ شیریں اور سریلے ہیں، استعارات و کنایات پر کیف اور وجد آور ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، وہ اپنی معشوقہ کو مخاطب کر کے اپنی شدتِ محبت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

احللتِ من قلبی ھواکِ محلۃً	تو نے اپنی محبت میرے دل میں ایسی جگہ پہونچا دی ہے،
ما حلّھا المشروب والماکول	جہاں کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی کی رسائی نہیں

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ محبت دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی ہے، ابونواس کا یہ انداز بیان بالکل اچھوتا ہے

ملٹن، شاعری میں تین چیزیں ضروری سمجھتا ہے، سادگی، جوش اور حقیقت ابونواس کے کلام میں اگر بہ نظر غایر دیکھا جائے تو یہی چیزیں ملیں گی، اُس کے اشعار اُس کے جذبات و احساسات کی صحیح تصویر ہوتے ہیں وہ عیش و نشاط، شراب و کباب اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات پیش کرتا ہے، جس میں کہیں شراب و کباب کا ذکر ہے، کہیں ہجر و فراق کے نالے کہیں رندان قدح خوار کے لطیفے ہیں اور کہیں معشوق طرحدار کے چوچلے الغرض اُس کے اشعار اُس کے واردات قلبی کا صحیح عکس ہیں۔

ابونواس بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا، وہ مذہبی قید و بند سے قطعی آزاد تھا وہ جو کچھ کرتا تھا علانیہ کرتا تھا، اُس کا کوئی کام شرمندۂ ریاکاری نہ تھا، وہ رند خرابانی تھا، شرابی تھا اور بالکل علانیہ، ملاحظہ ہو کہتا ہے:۔

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمر	ہاں! مجھے شراب پلاؤ اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے۔
ولا تسقنی سرّاً اذا امکن الجھر	جب کھلم کھلا یہ سب کچھ ممکن ہے تو پھر چھپانے کی ضرورت کیا ہے

سلہ یہ اور اُسکے بعد کے تمام آنے والے اشعار اور اُنکے متعلق علماء کے اقوال میں نے "دیوان ابی نواس" اور ایک مصری مصنف علامہ ابن منظور کی کتاب "تاریخ ابی نواس" سے نقل کئے ہیں، بار بار حوالہ دینا بے سود ہوگا، جسے دیکھنا ہو اصل دیوان اور "تاریخ ابی نواس" کا مطالعہ کرے۔

وہ فطرتاً بڑا شوخ مزاج اور ظریف واقع ہوا تھا، اُس کو اپنی فحش گوئی میں بڑا سلف آتا تھا، اُسکے اس قسم کے اشعار گو اخلاق سے گرے ہوئے ہیں جسے کوئی متین اور سنجیدہ انسان پڑھنا بھی گوارا نہ کریگا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھیں ہفوات ولغویات میں جواہر پاروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی دفن ہے جسے مکروہ چیز سمجھ کر کوئی چھوتا تک نہیں۔

امرد پرستی عہد عباسیہ کے خصوصیات میں سے تھی، ابونواس چونکہ خود بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا اس لئے ابتداء عمر سے شاہد بازی کے ساتھ ہی ساتھ خود ایاز بننے کا جو چسکا اُس کو پڑ گیا تھا وہ کبھی نہ چھوٹا ملاحظہ ہو وہ اپنا ایک واقعہ خود ہی بیان کرتا ہے:۔

۱۔ ولقد ابیت علی السریر منعمًا مابین غانیۃ وبین غلام	میں نے رات ایک دوشیزہ اور ایک لڑکے کے درمیان بڑے آرام سے گزاری۔
۲۔ فاننیکہا وینیکنی وانیکہ اللذ من خلفٍ ومن قدام	میں اُس دوشیزہ سے حماقت کر رہا تھا اور وہ لڑکا مجھ سے، میں آگے اور پیچھے دونوں طرف سے لطف اُٹھا رہا تھا

ٹالسٹائی کے نظریہ کے مطابق آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص طبقہ کی ملکیت نہ ہو بلکہ اُسکا فیض عام وخاص، جاہل وتعلیم یافتہ، چھوٹے بڑے سب کے حق میں یکساں ہو، ابونواس کے کلام کا اگر آپ بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہی چیز اُس میں ملے گی۔ اگر وہ ایک طرف شاہی درباروں میں بادشاہ، وزراء اور اُن کے مصاحبین کے۔ لئے دہ بہدآور رتھا تو دوسری طرف سوقیانہ نائونوش کی گرما گرم محلسوں میں پیر مغاں اور اُن کے یاران قدح خوار کے لئے بے انتہا نشہ آور، اگر وہ اپنے شاعرانہ اعجاز اور ادیبانہ کمال کی وجہ سے علماء وادبائی محفلوں میں مقبول تھا تو جہلاء اور رندوں کی عیش گاہوں میں بھی سرور کیف پیدا کرنے کے لئے اس کا کلام کم دلچسپ نہ سمجھا جاتا تھا۔

اگرچہ زمانہ نے اپنی بساط کے موافق ابونواس کی کافی قدر کی، اور بارہا دربار خلافت سے خلعت و انعامات بھی اُسے ملے، مگر جب اُس کی شاعری کے اعجاز کا اندازہ کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔

گو ابونواس کی ساری زندگی کا بڑا کارنامہ صرف اُس کی شاعری ہے تاہم اُس کے صرف اسی ایک کام نے عربی شاعری کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے، شام وسحر کی ہزار ہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں مگر اُس کے اشعار کی قدر وقیمت کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔

فنون شاعری میں کمال یہ عجیب بات ہے کہ ایران میں اُسوقت شاعر کے لئے مختلف علوم و فنون میں کامل ہونا ضروری تھا، چنانچہ وہاں کے تمام مشاہیر شعرا نامور علماء وفضلا تھے لیکن اس کے بالکل برعکس عرب میں ایسے ہی شعرا فن شعر کے امام اور پیشوا خیال کئے جاتے تھے جو جاہل تھے اور ایک حرف لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، شاعری اُن کی خمیر میں داخل تھی، نہ اُن کو عروض و قوافی کی ضرورت تھی اور نہ وہ فن بلاغت و معانی سیکھنے کے محتاج تھے، بلکہ معانی و بیان، عروض و قوافی کی جتنی کتابیں آج ہم کو نظر آرہی ہیں وہ سب اُنھیں کے کلام سے ماخوذ ہیں۔

ابونواس کی تعلیم گو معمولی طور پر ہوئی تھی مگر شاعری میں اُس کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ جس مضمون کو چاہتا تھا بڑی خوبی سے ادا کر دیتا تھا، فلسفہ اور علم کلام کے اہم مسایل جسے جید علماء بڑے بڑے دفتروں میں بھی حل نہیں کر پاتے تھے ابونواس اپنے چند شعروں میں حل کر دیتا تھا، ملاحظہ ہو "جزء لایتجزیٰ" کا معرکۃ الآرا مسئلہ کس خوبی سے وہ اپنے ان دو شعروں میں حل کرتا ہے، وہ اپنی محبوبہ سے بیوفائی اور بے مروتی کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے:-

۱- ترکت منی قلیلاً من القلیل اقلاً،	تو نے اپنے دل میں میرے لئے بہت کم گنجائش رکھی۔
۲- یکاد لایتجزیٰ اقل فی اللفظ من لا"	یہاں تک کہ نہیں سے بھی کم جس کا تجزیہ ممکن نہیں۔

دور عباسیہ کا مشہور امام نظام نے جب یہ شعر سنے تو چونک اٹھا اور اُس نے ابونواس سے کہا خدا کی قسم تمہارے "اشعر الناس" ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، جس مسئلہ میں ہم برسوں سر کھپاتے رہے اُسے تم نے جس خوبی سے ان دو شعروں میں حل کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ جب کوئی چیز حد سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے تو تاثیر اُسکی گرم ہوتی ہے، دیکھئے ابونواس اس مسئلہ کو کس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے، کہتا ہے:-

۱- یا من یصیر اذا احد الیہ اشار	تیرے سے بعد وہ کہ جب وہ کسی چیز کی تعریف کرے تو صحت کا خیال رکھے
اقلل او اکثر فانت مہذار	کمی کرو یا زیادتی دونوں صورتوں میں تمہارا اسنیا نہیں،
۲- سخنت من شدۃ البرودۃ حتیٰ	تم شدت برودت کی وجہ سے اب گرم ہو گئے ہو
صرت عندی کانک النار	گویا اب تم میرے لئے آگ کی طرح ہو
۳- لا یعجب السامعون من صفتی	سامعین میری اس بات پر تعجب نہ کریں، اس لئے کہ
کذلک الثلج بارد حار	برف باوجودیکہ ٹھنڈی ہوتی ہے لیکن تاثیر اس کی گرم ہے

ایک اور جگہ علم کلام کے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے، جس کا فیصلہ بدقسمتی سے ابتک نہیں ہوا یعنی

"صفت عین ذات ہے یا نہیں" وہ اپنی ایک پریجمال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جس کا نام بھی حسن اتفاق سے "حُسن" تھا

۱- ان اسم حسن لوجهها صفة ولا اری ذا فی غیرها اجتمعا	"حُسن" کا نام درحقیقت اُس کے چہرہ کی صفت ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ اُسکے علاوہ کسی میں یہ بات نہیں پائی جاتی
۲- فهی اذا سمیت فقد وصفت فیجمع الاسم معنیین معا	یہ عجیب بات ہے کہ جب اُس کا نام "حُسن" رکھا گیا تو وہ اُسکے لئے صفت بھی بن گیا۔ اور اس طرح ایک ہی اسم میں دو معنی جمع ہو گئے

کلام میں فارسیت چونکہ ابونواس اپنی ماں کی طرف سے فارسی النسل تھا اس لئے شروع شروع اُس کے کلام میں عجمیت کا رنگ پایا جاتا تھا مثلاً وہ ایک جگہ شراب کی تعریف میں کہتا ہے:-

۱- تدار علینا الکاس فی عسجدیة حبتها بانواع التصاویر فارس	ہمارے سامنے سونے کے جام میں شراب پیش کی جارہی تھی جس میں مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔
۲- قرارتها کسری وفی جنباتها مها تدریها بالقسی الفوارس	تہ میں کسریٰ کی تصویر تھی اور اُس کے پہلو میں بڑے بڑے شہسواروں کے فوٹو تھے جو تیر و کمان چلا رہے تھے۔

شعرگوئی کے اوقات جو لوگ شاعر ہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ بعض مرتبہ شعرگوئی کی مشق کے باوجود طبیعت میں ایسا انقباض پیدا ہو جاتا ہے جس کے بعد ایک شعر کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

ذوالرمہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب تمہاری طبیعت کند ہوتی ہے تو تم شعر کیونکر کہتے ہو؟ اُس نے کہا میں اُسوقت تنہائی میں بیٹھ کر اپنی کسی محبوبہ کو یاد کرنے لگتا ہوں۔

آخطل ایسی حالت میں کسی پرفضا مقام پر سیر و تفریح کے لئے چلا جاتا تھا، اور شراب پی کر طبیعت میں روانی پیدا کرتا تھا۔

ابونواس عموماً ایسے اوقات میں شعر کہا کرتا تھا جب وہ بہت خوش دل و سرشار ہوتا تھا، پھر اُسوقت وہ اور بھی عمدہ شعر کہتا تھا جیسے کہ کسی ناعس صالح کی توقع ہوتی تھی، اس کے علاوہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسے

خود پسند نہیں ہوتا تھا۔

شاعری میں ابونواس کا مرتبہ جس طرح متقدمین شعراء عرب میں امراء القیس کا مرتبہ مسلم ہے، اُسی طرح مولدین میں ابونواس کے اعجاز کا کوئی منکر نہیں۔

علماء ادب نے زمانہ کے اعتبار سے عربی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے، جاہلیین مخضرمیین اسلامیین، مولدین۔ جاہلیین سے مراد وہ شعراء ہیں جو ظہور اسلام سے قبل گزرے ہیں، اُن کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ سو برس رہا ہے، اُن میں سے حسب ذیل مشہور گزرے ہیں:۔

امراء القیس، طرفہ بن عبد، زہیر بن ابی سلمیٰ، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، نابغہ ذبیانی، حارث بن حلزہ، عروۃ بن ورد، اعشیٰ اور مہلہل وغیرہ۔

وہ شعراء جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں عہد پائے تھے "مخضرمی" کہلاتے ہیں، اُن میں سے حسان بن ثابت، نابغہ جعدی، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ اور ابوذویب وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔

جن شعراء نے جاہلیت کا زمانہ نہیں پایا بلکہ عہد اسلام میں نشو و نما پائی اُن کو "اسلامی" کہتے ہیں جنمیں سے فرزدق، جریر، اخطل، بشار بن برد، کثیر، جمیل، نعمان بن بشیر، کمیت بن زید اور مسکین دارمی وغیرہ نامور گزرے ہیں۔

پھر جو شعراء عہد عباسیہ میں پائے گئے وہ "مولدین" کہلاتے ہیں، اُن میں سے ابوالعتاہیہ ابونواس، ابن المعتز، ابن الرومی، ابوالعلاء المعری، ابوفراس، ابوتمام، بحتری اور متنبی وغیرہ مشہور گزرے ہیں۔

ابونواس اسی چوتھے دور یعنی مولدین میں سے تھا، یہ مسئلہ اجتک طے نہ ہوسکا کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون تھا، دراصل یہ کوئی آسان بات بھی نہ تھی، اس لئے کہ ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے تاہم عام طور پر علماء ادب، متقدمین میں امراء القیس اور متاخرین میں ابونواس کو تمام شعراء عرب پر ترجیح دیتے ہیں۔

ابوتمام جو عہد عباسیہ کا بڑا زبردست شاعر اور ادیب گزرا ہے کہا کرتا تھا کہ "ابونواس اور مسلم بن ولید میرے لات و عزیٰ ہیں جن کی میں صبح و شام پرستش کرتا ہوں۔

ابوالعتاہیہ سے جو مولدین میں بہت بلند پایہ شاعر گزرا ہے کسی نے دریافت کیا کہ تمھارے نزدیک "اشعر العرب" کون ہے؟ اُس نے کہا سرزمین عرب کا سب سے بڑا شاعر جسکی مثال متقدمین اور متاخرین میں کہیں نہیں ملتی وہ ہے جسکے یہ اشعار ہیں۔

۱۔ اذا نحن اثنینا علیک بصالح فانت الذی نثنی و فوق الذی نثنی	جب ہم تیری تعریف کرتے ہیں تو تو ہی اسکا صحیح مستحق ہوتا ہے، اگرچہ تیری ہستی اُس سے بالاتر ہے

۲- وان جرت الالفاظ یوماً بمدحة لغیرک انساناً فانت الذی نعنی،	اگر کبھی کوئی لفظ کسی دوسرے کی تعریف میں ہماری زبان سے نکل جاتا ہے تو اُس وقت بھی حقیقتاً ہمارا مقصود تیری ہی ذات ہوا کرتی ہے۔

اُس شخص نے کہا یہ تو ابونواس کے شعر ہیں ابوالعتاہیہ نے جواب دیا۔" ہاں! ہاں! ابونواس ہی اشعر العرب ہے۔"

ابوالعتاہیہ کہا کرتا تھا کہ میں نے زہد پر سولہ ہزار شعر لکھے ہیں جن کا ایک ثلث میں ابونواس کے صرف اس قصیدہ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں:-

۱- الا رب وجہ فی التراب عتیق ویا رب حسن فی التراب رقیق	ہاں! بہت سے چہرے ہیں جو مٹی میں ملکر فرسودہ ہوگئے اور بہت سے حسن ہیں جو خاک میں ملکر ماند پڑ گئے
۲- فقل لقریب الدار انک راحل الی منزل نائی المحل سحیق	اپنے پڑوسی سے کہدو کہ اب تم بھی ایسی منزل کی طرف کوچ کرنے والے ہو جو بہت دور دراز ہو۔
۳- وما الناس الا ہالک وابن ہالک وذو نسب فی الہالکین عریق	لوگ نہیں ہیں مگر نسلاً بعد نسلٍ ہلاک ہونے والے، اور انھیں میں بڑے بڑے نسب والے بھی شامل ہیں۔
۴- اذا امتحن الدنیا لبیب تکشفت لہ عن عدو فی ثیاب صدیق	جب کوئی عقلمند دنیا کا امتحان کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دشمن ہے جو دوست کے لباس میں ملبوس ہے

ابوالعتاہیہ یہ آخری شعر اکثر پڑھا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کوئی خود دنیا سے اُس کی تعریف پوچھے تو شاید وہ بھی اس سے اچھی تعریف نہ کر سکے۔

خلیفہ مامون نے ایک مرتبہ اپنے درباریوں میں سے جن میں بہت سے علماء وفضلاء تھے دریافت کیا" بتائیے خلافت بنو ہاشم میں سب سے بڑا شاعر کون گزرا ہے، ایک نے کہا سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس نے یہ شعر کہا ہے:-

یا قبر معن انت اول حفرة من الارض خطت للسماحة منزلا	اے معن کی قبر تو زمین کا پہلا گڑھا ہے جو جود و کرم کی منزل بنا دیا گیا۔

دوسرے نے کہا جی نہیں سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس کا یہ شعر ہے،

اشبہت اعدائی فصرت احبہم اذ کان حظی منک حظی منہم	تو (اے محبوبہ) میرے دشمنوں سے مل جل گئی اسلئے میں انسے بھی محبت کرنے لگا جب میری قسمت تجھ سے وابستہ ہو تو انسے بھی ہے

مامون نے کہا آپ لوگوں کا اُس شخص کے متعلق کیا خیال ہے جس کا یہ شعر ہے:۔

یا شقیق النفس من حکم	اے وہ جو حکما میری شریک حیات ہے
نمت عن لیلی ولم انم	تو آج میری رات میں سو جا، میں نہ سوؤں گا

سب چلا اُٹھے کہ بلاشبہ ابونواس اشعر العرب ہے۔

قصائد

یہ بات عربی شاعری میں طغراء امتیاز رہی ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ جذبات سے ہوئی ایران کی طرح مداحی اور خوشامد میں عربوں کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگ جو، بہادر مہماں نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے، انھیں چیزوں کو وہ قصاید میں ادا کرتے تھے اور یہی اُنکی شاعری تھی۔

شاعری ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر و زبر اور ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، وہ ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اُس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے، شعراء عرب اکثر صاحب تیغ و علم ہوتے، وہ قصاید میں اپنے قومی معرکے لکھا کرتے تھے وہ اول تو کسی رئیس یا بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے نہیں تھے، اور اگر کوئی لکھتا بھی تھا تو واقعات سے ہرگز قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ سلامۃ بن جندل سے لوگوں نے کہا کہ میری تعریف میں قصیدہ لکھو، اُس نے فوراً جواب دیا "افعل حتی اقول" یعنی پہلے کچھ کرکے تو دکھاؤ۔

ابن میادہ نے بعض وجوہ کی بنا پر خلیفہ منصور کی مدح میں قصیدہ لکھا اور بغداد جانے کا ارادہ کیا تاکہ دربار میں جاکر سنائے، تھوڑی دیر کے بعد نوکر دودھ لیکر آیا اُس نے پیکر خدا کا شکر بھیجا اور کہا "جب تک مجھے یہ ملتا ہے مجھے منصور کی کیا ضرورت ہے"

شعراء عرب میں سب سے پہلا شخص جس نے کسی بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا، زہیر بن ابی سلمیٰ ہے، اُس نے سب سے پہلے ہرم بن سنان کی شان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، زہیر کے بعد نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی میں قصاید لکھنا شروع کئے، گو اس کی بدولت نابغہ اس قدر مالدار ہوگیا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا لیکن عرب میں اُس کی عزت جاتی رہی، نابغہ کے بعد اعشیٰ نے شاعری کو پیشہ بنالیا، وہ جا بجا مدح کرتا اور انعام لیتا پھرتا تھا، رفتہ رفتہ یہ مرض عام ہوتا گیا، دورِ عباسیہ میں عرب و عجم کے اختلاط نے اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنادیا حتیٰ کہ قصیدہ اور کاسۂ گدائی دو مترادف الفاظ ہوگئے

ابونواس کو شاعری کے اس باب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اسی وجہ سے اس خاص موضوع

میں اُس کے کلام کو کوئی نمایاں خصوصیت بھی حاصل نہ تھی تاہم اُس نے قصاید کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں جن میں علو مضامین کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ، اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارات استعمال کئے گئے ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتے مثال کے طور پر اُس کا وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو اُس نے پابہ زنجیر سر دربار اُسوقت خلیفۂ امین الرشید کے سامنے پڑھا تھا جب وہ غضبناک بیٹھا ہوا اپنی خون آشام تلوار تول رہا تھا اور موت ابو نواس کے سر پر کھیل رہی تھی، ملاحظہ ہو، کہتا ہے:-

۱- تذکر امین اللہ والعہد یذکر مقامی و انشادیک والناس حضّر	اے امین! ذرا میری حالت دیکھ اور اس بات کا خیال کر کہ میں تیرے اور سب کے سامنے کھڑا قصیدہ پڑھ رہا ہوں بیشک زمانہ ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے
۲- ونثری علیک الدر یا در ہاشم فیامن رأی درًّا علی الدر ینثر	اے بنو ہاشم کے موتی! میں تجھ پر موتی بکھیر رہا ہوں، ہاں کوئی ہے جو دیکھے کہ موتی موتی پہ بکھیرا جا رہا ہے۔
۳- ابوک الذی لم یملک الارض مثلہ وعمک موسی الصفوۃ المتخیر	تیرا باپ وہ تھا جس کے برابر آج تک کوئی زمین کا مالک نہیں ہوا اور تیرا چچا موسیٰ تھا جو برگزیدہ اور ستودہ صفات تھا۔
۴- وجدک مہدی الہدیٰ وشقیقہ ابوامک الادنیٰ ابو الفضل جعفر	اور تیرا دادا مہدی تھا اور اُس کا بھائی ابوالفضل جعفر تیرا نانا تھا۔
۵- ایا خیر مامول یرجّیٰ انا امرؤٌ اسیرٌ رھینٌ فی سجونک مقبر	اے وہ جسکی ذات سے بہترین امیدیں وابستہ ہیں، کیا میں ہی ایک ایسا گرفتار بلا ہوں جو تیری قید میں دفن ہو کر رہیگا۔
۶- مضت لی شہورٌ مذ حبست ثلاثۃٌ کانی قد اذنبت مالیس یغفر	مجھے گرفتار ہوئے تین ماہ گزر گئے، گویا میں نے ایسا گناہ کیا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔
۷- فان کنت لم اذنب ففیم حبستنی وان کنت ذا ذنب فعفوک اکبر	اگر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے تو تو نے مجھے قید میں کیوں ڈال رکھا ہے اور اگر میں گنہگار ہوں تو تیرا عفو یقیناً اس سے کہیں بڑا ہے

بات صرف یہ تھی کہ ایک مرتبہ ابو نواس نے خلیفۂ امین کے چچا سلیمان بن ابی جعفر کی، نشہ کی حالت میں ہجو کہہ ڈالی جس سے امین سخت ناراض ہو گیا، پہلے تو اُس نے قید میں ڈالدیا، پھر بھی غصہ فرو نہ ہوا تو چاہا کہ سر دربار قتل کر ڈالے، اس لئے اُس نے ابو نواس کو قید خانے سے بلوا بھیجا مگر اُس کا یہ فی البدیہہ قصیدہ سنکر ایوان شاہی تڑپ اُٹھا اور امین کا سارا غصہ کافور ہو گیا، اُس نے نہ صرف ابو نواس کا قصور معاف کیا بلکہ شاہانہ انعام و اکرام سے اُسے مالا مال کر دیا، شیریں بیانی اور حسن ادا کی شان جو اس قصیدہ میں پائی جاتی ہے شعراء عرب کے کلام میں کہیں نہیں ملتی۔

غزلیات عام طور پر شاعری تغزل کے مترادف سمجھی جاتی ہے، شاعر کو معشوق چاہیئے اور شراب ارغوانی، بس یہی دونوں چیزیں اُس کی دُنیا ہیں اور انھیں دونوں پر اُس کی زندگی ہو عشق و محبت انسان کا خمیر ہے، اس لئے کوئی ملک اور کوئی قوم شاعری کے اس صنف سے خالی نہیں علماء نفسیات کا خیال ہے کہ اگر عشق و محبت کا جذبہ لوگوں میں نہ پایا جاتا تو شاعری کا وجود بھی دنیا سے ناپید ہوتا، سینہ جب تک حضرت دل کا کاشانہ ہے اُسوقت تک محبت جنسیہ کی خواہشات کا اُس میں پایا جانا ایک فطری امر ہے، عشق کی سحر آفرینی اور اُس کی ہمہ گیری کا اظہار عرب کا ایک شاعر اس طرح کرتا ہے:-

طاف الهوى في بلاد الله كلهم	محبت تمام دنیا میں چکر لگا آئی،
حتى اذا مر بي من بينهم وقفا	یہاں تک کہ جب میرے پاس پہونچی تو یہیں ٹھہر گئی۔

ایک دوسرے شاعر نے اس سے بھی زیادہ دلکش طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے، کہتا ہے:-

اتاني هواها قبل ان اعرف الهوى	اس سے مجھے اُسوقت محبت ہوگئی جب میں نہیں جانتا تھا کہ
فصادف قلبا فارغا فتمكنا	محبت کیا ہے؟ اُس نے میرا بھولا بھالا دل پاکر قبضہ کر لیا۔

ہمارے فارسی شعراء کا معشوق چونکہ ایک بازاری خوبصورت لڑکا ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی تو اُس کی تلاش میں دیر و حرم کا سفر کرتے ہیں اور کبھی آتش فراق سے بیتاب ہو کر دین و ایمان نذر بتخانہ کر بیٹھتے ہیں، اور بآواز بلند فرماتے ہیں۔ "کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست"

مگر شعراء عرب، کا معشوق عفت و عصمت کا حرم نشیں ہے، وہاں تک رسائی مشکل ہے، اُدھر کا رُخ کرنے سے پہلے تلواروں کا سامنا ہوگا، سیکڑوں سر کٹ جائیں گے، خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ جاہلیت کے کسی شاعر کا شعر ہے:-

ديار اللواتي دارهن عزيزة	محبوبہ، اُن گھروں میں چلی گئی جو بہت عزیز ہیں، اُن کی
بسمر القنا يحفظن لا بالتمائم	حفاظت گندم گوں نیزوں سے کی جاتی ہے، تعویزوں سے نہیں

شعراء عرب کا دستور تھا کہ اگر اُن کی معشوقہ اُن سے بچھڑ کر کسی اور وادی یا صحرا میں چلی جاتی تھی تو وہ اُس زمانہ کو جب وہ دونوں ایک جگہ بیٹھکر باتیں کیا کرتے تھے، اُس جگہ کو جہاں دونوں ملتے، چلتے تھے، اور اُسکی محبت بھری باتوں کو یاد کر کے دل ہلا دینے والے اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ معلقات سبعہ نیز شعراء جاہلیت کے دیگر دیوان کل کے کل اُن کے عشق و محبت کی طویل داستانیں ہیں جس میں انھوں نے اپنی اپنی معشوقہ کا جذبات سے اس درجہ لبریز ذکر کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

یہ زمانہ جاہلیت کی داستان محبت کا حال تھا، یہی مذاق اسلام کے بعد والی دو صدیوں کے

شعراء کا بھی رہا، فرق صرف اتنا تھا کہ شعراء جاہلیت کی معشوقائیں اپنے اپنے عشاق کی دل سے چاہے جتنی قدر کریں مگر دلی جذبات کا اظہار عموماً بہت کم کرتی تھیں، اُس زمانہ میں بھی گو عورتیں بہت سی شاعرہ تھیں مگر وہ شعر و شاعری سے صرف اُس وقت کام لیتی تھیں جب اُن کا شوہر، باپ، بھائی یا کوئی اور عزیز مر جاتا تھا، اُس وقت وہ اُن کی موت پر نوحہ خوانی کرتی تھیں، اُن کی شجاعت، سخاوت، ایثار نفس اور ہمدردی کے کارنامے بیان کرتیں اور اُن کے دشمنوں کی تحقیر کرتی تھیں۔

اسلام کے بعد یہ ہو گیا کہ عاشقانہ جذبات ظاہر کرنے والے تمام شاعروں کی معشوقائیں اُنکے عشق کی قدر کرتیں، اُن کے والہانہ جوش و خروش کا جواب اپنے سوز و گداز بھرے ہوئے شعروں سے دیتیں، چنانچہ اس عہد کے اکثر عاشق و معشوق مثلاً جمیل و بثینہ، کثیر و عزہ، قیس بن ذریح اور لبنیٰ، مجنوں عامری اور لیلیٰ، عروہ بن حزام اور عفراء، نصیب و زینب، وغیرہ سب ہی شعر و شاعری میں کمال رکھتے تھے، جن کے دیوان دونوں کے کلام کا مجموعہ ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ عرب و عجم کے اختلاط سے دور عباسیہ میں شعراء عرب کا یہ مذاق بدل گیا، اب ایران کی طرح اُن کا معشوق بھی امرد اور حسین لڑکا ہوتا تھا جو اکثر بازاری ہوتا تھا، وہ ہر ایک کو ہاتھ آسکتا تھا، سیکڑوں سے تعلق رکھتا تھا، آج اگر وہ ایک سے ہمکنار ہے تو کل دوسرے سے ہم آغوش، کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، کسی سے اشارے کنائے کرتا ہے اور کسی کو فریب آمیز نگاہوں سے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلاتا ہے۔

اس ایرانی مذاق کی داغ بیل گو پہلے سے پڑ چکی تھی لیکن ابونواس نے امین الرشید جیسے رند مشرب خلیفہ کے عہد میں اسے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا، چونکہ اُس کی عادتیں بچپن سے بگڑی ہوئی تھیں، اس لئے بغداد پہونچتے ہی وہاں کی سدا بہار زمین اور پرکیف تمدن نے اُس کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اُس نے شاعری کے اس باب کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ابونواس کو غزلیات میں امرء القیس کا مد مقابل بتایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں تک دونوں کے بلند مرتبہ اور قادر الکلام شاعر ہونے کا تعلق ہے یہ بالکل صحیح ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں رند مشرب واقع ہوئے تھے مگر جہاں تک ان دونوں کے مذاق کا تعلق ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

امرء القیس حسن نسائی کا دلدادہ تھا اور ابونواس عشق غلمان پر فریفتہ، وہ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، کبھی ام حویرث اور ام رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے، کبھی دار جلجل کی

نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے اور کبھی اپنی معشوقہ کے لئے اپنے اونٹ کی پرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔

ابونواس کی ساری داستانِ عشق دیکھ ڈالئے، جنان کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی عورت نہ ملیگی جس سے اُس کو صحیح معنوں میں عشق ہوا ہو، اُس سے بھی وصال صرف اس لئے نہ ہوسکا کہ آپ اُس سے غیر فطری فعل کے طلبگار تھے، جسے جنان کی غیرت نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔

غزلیات میں جریر کی شان بھی بہت نمایاں ہے لیکن زمانہ اور ملک کی آب و ہوا کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے، جریر عہدِ امویہ جیسے خشک اور روکھے دور کا شاعر تھا اور ابونواس عہدِ عباسیہ جیسے رنگین اور پرکیف زمانہ کی یادگار تھا، ظاہر ہے دونوں زمانوں میں جو فرق تھا وہی ان دونوں کے رنگِ تغزل میں نمایاں ہے۔

معنی آفرینی اور حسنِ ادا میں ابونواس کو جو کمال تھا اُس کی مثال شعرائے عرب میں کہیں نہیں ملتی، علمائے عرب کا قول ہے کہ "معانی زمین میں مدفون تھے جسے ابونواس نے نکال کر بکھیر دیا۔" ملاحظہ ہو وہ ایک پری تمثال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جو ننگی بیٹھی نہا رہی تھی، اور آپ کہیں آڑ میں کھڑے اُس کے حسن سے لطف اُٹھا رہے تھے، جب اُس کی نظر ان حضرت پر پڑی تو اُس نے جلدی سے اپنے بال اپنے جسمِ سیمیں پر جو ہوا سے زیادہ لطیف اور پانی سے زیادہ شفاف تھا پھیلا دئے اور اس طرح اُس نے اپنے جسمِ تاباں کو بالوں کی تاریکی میں چھپا لیا۔ وہ کہتا ہے:

۱- نضت عنها القمیص لصب ماء
فورّد وجهها فرط الحیاء

محبوبہ نے نہانے کے لئے قمیص اُتاری اور فرطِ شرم نے اُسکے گلاب جیسے رخساروں کو سرخ کردیا

۲- وقابلت الهواء وقد تعرّت
بمعتدل ارق من الهواء

اُس نے کپڑے اُتار کر اپنے سڈول جسم سے جو ہوا سے زیادہ لطیف تھا گویا ہوا کا مقابلہ کیا۔

۳- ومدّت راحة کالماء منها
الی ماء معدّ فی اناء

اُس نے اپنی ہتھیلی جو پانی سے زیادہ شفاف تھی، پانی لینے کے لئے بڑھائی جو برتن میں تیار رکھا تھا۔

۴- فلما ان قضت وطراً وهمّت
علی عجل الی اخذ الرداء

جب وہ نہا چکی اور اُس نے جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا۔

۵- رأت شخص الرقیب علی التدانی
فاسبلت الظلام علی الضیاء

تو اُسنے اچانک ایک ایسے شخص کو دیکھا جو قریب تاک میں کھڑا تھا اُسنے فوراً ہی تاریکی (یعنی بالونکو) روشنی (یعنی جسم) پر ڈالدیا

۶۔ وغاب الصبح منھا تحت لیل وظل الماء یقطر فوق ماء	گویا صبح کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپ گئی، اُسکے شفاف جسم سے پانی کے قطرات اس طرح گر رہے تھے جیسے پانی پر گر رہا ہو
۷۔ فسبحان الالٰہ وقد راھا کاحسن ما یکون من النساء	پاک ہے وہ خدا جس نے ایسی ایسی خوبصورت عورتیں پیدا کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ خلیفہ ہارون رشید سے تعلق رکھتا ہے، ابونواس کو کچھ معلوم ضرور ہوگیا تھا جسے اُس نے ہارون رشید کی فرمایش پر نظم کرکے اُس کی خدمت میں پیش کیا تھا اور بہت کچھ انعام واکرام بھی حاصل کیا تھا، مگر علماء ادب اس سے انکار کرتے ہیں اس لئے کہ ابونواس ہارون رشید کے عہد کا نہیں بلکہ امین کے دور کا شاعر ہے۔

بہرکیف واقعہ کا تعلق کسی سے بھی ہو یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ ابونواس معنی آفرینی اور حسن ادا میں کس مرتبہ کا شاعر تھا!!

یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر اپنے گردوپیش کے حالات اور زمانہ و وقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اگر ابن المعتز شاہی خاندان سے نہ ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ کہہ سکتا۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ	چاند کو دیکھو، گویا وہ ایک چاندی کی کشتی ہے،
قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر	جو عنبر کے بار سے پانی میں دبی ہوئی ہے۔

ہلال دیکھ کر عنبر کے بار سے دبی ہوئی چاندی کی کشتی کی طرف خیال منتقل ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب کسی نے ان چیزوں کو دیکھا بھی ہو۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ درحقیقت اُس کی زبان نہیں بلکہ وہ اُس زمانہ اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اُسکے خیالات وجذبات پل کر جوان ہوتے ہیں، ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا، شکسپیر اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا، زمانۂ جاہلیت کے شعراء کا فطرت پرست ہونا بھی اسی بناء پر تھا۔

ابونواس بھی اپنے وقت اور زمانہ کے حالات سے متاثر ہوا بلکہ اُس رنگ میں اس طرح رنگ گیا جس میں کوئی دوسرا شاعر اُس کا شریک نظر نہیں آتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ غیر فطری چیز کبھی حقیقت کا رنگ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی، امرد پرستی اور شاہد بازی پر ابونواس نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے، مگر اُس میں وہ بات نہ پیدا کر سکا جو ایک فطری اور حقیقی عشق میں ہوتی ہے۔

حسن اتفاق سے وہ ایک مرتبہ جنان نامی ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا، اور اس بری طرح سے کہ اُسے جنان کے علاوہ دین و دنیا کی کچھ خبر نہ رہی، اُس کے کلام کا یہ حصہ نہایت پاکیزہ، دلدوز

اور پُراثر ہے، یہاں ہم اُسی میں سے کچھ انتخاب پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جناں جیسی خوبصورت اور پریجمال تھی ویسی ہی پڑھی لکھی عاقل اور سمجھدار عورت تھی، ایک مرتبہ وہ ابونواس کے مکان کی طرف سے گزری جہاں وہ اور اُس کے ساتھی بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے جناں کو دیکھتے ہی ابونواس دل پکڑ کر رہ گیا، اُس کے ساتھیوں نے کہا " یہ کیا؟ اب کیا تم لڑکوں کو چھوڑ کر عورتوں پر جان دینے لگے ؟"۔ اُس نے کہا۔ " ہاں! اب میں ایک ایسے چاند سے مکھڑے پر مرتا ہوں جس سے نظریں نہیں ملائی جاسکتیں، تم اگر غور سے اُسے دیکھو تو تمھیں تعجب ہوگا کہ وہ انسان ہے یا فرشتہ!!

پھر تو روز بروز اُس کا عشق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ وہ اپنا سب کچھ اُس کے پیچھے کھو بیٹھا، اُس کی شان میں ہزارہا شعر کہہ ڈالے بہتوں کی خوشامدیں کیں، کئی مرتبہ اُس کے پاس قاصد بھیجے، مگر جناں نے کبھی گالی اور کوسنے سے کم بات ہی نہیں کی، ابونواس کے لئے یہ تمام گالیاں اور کوسنے۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکرخا! کا مصداق تھیں، اُس کی گالیوں کے جواب میں جو اُس نے شعر کہے ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ملاحظہ ہو، وہ کہتا ہے :-

۱- اتانی عنک سبّک لی فسبّی الیس جری بفیک اسمی حسبی	تجھ تک تمھاری گالیاں پہونچیں، بسم اللہ او۔ دو، کیا میرے لئے یہ کم فخر کی بات ہو کہ تمھاری زبان سے میرا نام تو ادا ہو
۲- وقولی ما بدالک ان تقولی فما ذا کلّہ الا لحبّی ، ،	جو تمھارا جی چاہے کہو، میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ صرف محبت کی وجہ سے ہے۔
۳- فصار لہ الرجوع الی وصالی فما تہوین من تعذیب قلبی	ان باتوں کا انجام وصال ہوگا، تم میرا دل دکھانا معمولی بات نہ سمجھو،
۴- تشابہت الظنون علیک عندی وعلم الغیب فیما عند ربی	تمھیں میری طرف سے بہت سی بدگمانیاں ہوگئی ہیں، حالانکہ غیب کی باتوں کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا ہے۔

جناں کے اعزا میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا وہ دوسری عورتوں کے ساتھ وہاں کھڑی ماتم کر رہی تھی، ابونواس کو پتہ لگ گیا، یہ بھی فوراً پہونچا، مگر یہ منظر اُس سے دیکھا نہ گیا کہ جناں اپنے دست نازک سے جس میں ہلکی ہلکی مہندی لگی ہوئی تھی برابر ماتم کئے جا رہی ہے۔ اس موقعہ پر جو اُس نے شعر کہے ہیں بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ کہتا ہے :-

۱- یا قمراً ابرزہ مأتم یندب شجواً بین اتراب	اے وہ چاند جو ایک ماتمی جلسہ میں طلوع ہوا ہے اور جو اپنی سہیلیوں کے درمیان مصروف ماتم ہے۔

۲۔ یبکی فیذری الدر من نرجس	اے وہ تو جو رو رہی ہے اور اپنی نرگسی آنکھوں سے موتی بہا رہی ہے اور گلاب
ویلطم الورد بعناب ،	جیسے رخساروں پر اپنی مہندی لگی ہوئی انگلیوں سے "ماتم" مار رہی ہے
۳۔ لاتبک میتاً حلّ فی حضرۃٍ	ایسے مردہ پر نہ رو جو گڑھے میں جا چکا ہے ،
وابک قتیلاً لک بالباب ،	بلکہ اپنے اُس شہید محبت پر رو جو تیرے دروازہ پر پڑا ہے۔

ابونواس نے ایک مرتبہ سنا کہ جنان حج کے لئے جانے والی ہے ، فوراً خود بھی روانہ ہوگیا ، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی ، اُسے سخت افسوس ہوا ، اُس کو خیال تھا کہ شاید اس طرح زیارت ہو جائے دیکھئے وہ کہتا ہے :۔

۱۔ الم ترانّنی افنیت عمری ،	کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں نے اپنی ساری عمر اُس کے
بمطلبہا ومطلبہا عسیرُ	حاصل کرنے کے لئے گنوا دی ، مگر اُس کا ملنا بہت مشکل ہے
۲۔ فلما لم اجد سبباً الیہا ،	جب مجھے کوئی بھی ذریعہ ایسا نہ ملا جس سے
یقربنی واعیتنی امورُ	میں اُسکے قریب پہونچتا اور حالات نے بار بار مجھے مایوس کیا۔
۳۔ حججتُ وقلتُ قد حجّت جنانٌ	تو میں نے حج کیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید جناں بھی کرے
فیجمعنی وایاہا المسیرُ ،	اور اس طرح ہم اور وہ دونوں یکجا ہو سکیں۔

اِدھر ابونواس کی جس قدر وارفتگی بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر اُدھر جناں کو اُس سے نفرت زیادہ ہوتی جاتی تھی ، اپنی بدنامی کے خیال سے وہ اس کو بری طرح گالیاں دیا کرتی تھی ، ایک مرتبہ جناں نے لوگوں سے کہا۔ "خدا اس جھوٹے مخنث کو سمجھے جو خواہ مخواہ مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے" یہ بات بھی ابونواس کے دل کو بھا گئی . دیکھئے کہتا ہے اور بہت خوب۔

۱۔ جنان تسبنی ذکرت بخیرٍ	جناں ! خدا تیرا بھلا کرے ، تو مجھے گالیاں دیتی ہے
وتزعم انّنی مذق خنیثٌ	اور خیال کرتی ہے کہ میں مخنث نوجوان ہوں۔
۲۔ وانّ مودتی کذبٌ ومینٌ	اور یہ کہ میری محبت جھوٹی اور پر فریب ہے
وانی للذی اھوی بثوثٌ	اور میں جس کو چاہتا ہوں اُسے رسوا کرتا ہوں۔
۳۔ وما صدقت ولا ردٌّ علیہا	گو یہ بات سچ نہیں ہے لیکن میں اُسے جھٹلا نہیں سکتا
ولکن الملول ھو النکوثُ	ہاں یہ سچ ہے کہ مایوس شخص عہد پر قائم نہیں رہ سکتا ،
۴۔ ولی قلبٌ ینازعنی الیہا	ہائے کیا کروں ؟ میرا دل اُسکے بارے میں جھگڑا کرتا رہتا ہے
وشوق بین اضلاعی حثیثٌ	اور شوق وصال میرے پہلو میں بیٹھا ہوا اکساتا رہتا ہے۔

۵ـ رائت کلفی بہا و دوام عہدی	وہ میرے عشق اور میری ثابت قدمی کو دیکھتی ہے
فملتنی کذا کان الحدیث	مگر پھر بھی وہ مجھے مایوس کرتی ہے کیا یہی بات ہونی چاہئے تھی؟

ابونواس نے زندگی سے تنگ آکر ایک مرتبہ جنان کو دھمکایا بھی اور کہا کہ اب بھی اگر تم میرے حال پر رحم نہ کھاؤ گی تو بس میں جان دیدوں گا اور میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا، دیکھئے وہ اس مفہوم کو کتنے عمدہ طریقہ سے ادا کرتا ہے، وہ کہتا ہے :-

۱ـ جنانُ ان جدت یا منای بما	جنان اے میری جانِ آرزو، اگر تو نے وہ چیز مجھے بخش دی
آمُلُ لم تقطر السماء دما	جسکی میں امید لیکر آیا ہوں تو آسمان خون کے آنسو نہ بہائیگا۔
۲ـ وان تماریْن او تمادیت فی	اور اگر تو نے اب بھی شک کیا یا حرمانِ وصال کی مدت کچھ اور
منعک اصبح بقفرۃ رمما	بڑہائی تو میں کسی جنگل میں جان دیکر بوسیدہ ہڈی بن جاؤنگا۔

کہا جاتا ہے کہ ان اشعار کا جنان پر بہت اثر ہوا، اور اُس نے ابونواس کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیا اور اُس سے کسی قدر مانوس بھی ہوگئی، پھر تو اس نے اور بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے اور چاہا کہ شادی ہوجائے مگر ابونواس کی عادتیں اسدرجہ بگڑی ہوئی تھیں کہ خود اُسے اپنی حالت پر اعتماد نہ تھا اس لئے وہ اسکی شرط پر راضی نہ ہوا، اور جواب میں یہ اشعار اُس نے لکھ بھیجے :-

۱ـ یشارطنی الحبیب علی الشروط	محبوبہ میرے لئے شرطیں قایم کرتی ہے۔
ولستُ بما یشارط بالسخوط	حالانکہ میں ایسا نہیں ہوں کہ وہ مجھ پر کوئی مکروہ شرط لگائے۔
۲ـ اریٰ ترک اللواط علیّ عارٌ	میں ترک لواطت کو اپنے لئے باعث شرم سمجھتا ہوں
لانی واحدٌ من قومِ لوط	اس لئے کہ میں ہی اسوقت قوم لوط کا تنہا نمایندہ ہوں۔

(باقی)

سید جلیل الرحمان اعظمی

بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں

میرے محترم دوست لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر جلال۔ ایم۔ شاہ نے جو بمبئی کے سب سے بڑے اسپتال (جے۔ جے۔ ہاسپٹل) میں سرکاری ماہر امراض جنسیہ کی حیثیت سے کئی برس سے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں، یہ مضمون "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے لئے تحریر فرمایا تھا چونکہ اس میں ایسی شخصیتوں سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے باعث دلچسپی ہیں اور چونکہ اس میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جو بجائے خود چھوٹی اور معمولی ہیں مگر ان سے انسانی سیرت پر اچھی خاصی روشنی پڑ سکتی ہے اس لئے میں اس کا ترجمہ اردو داں طبقہ کے مطالعہ کے لئے "نگار" کے ذریعہ پیش کر رہا ہوں۔ اگر ہمارے ملک کے دوسرے حضرات بھی ڈاکٹر جلال شاہ کی طرح اپنے "تاثرات" قلمبند کر دیں تو یقیناً بہت سے ایسے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں گے جو اس ملک کے نوجوانوں پر اچھا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں گے۔ بہرحال امید ہے کہ یہ مضمون اسی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ مترجم

جب "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے ایڈیٹر نے مجھ سے اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے رسالہ کے لئے کچھ لکھوں تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ زمانۂ گزشتہ میں دنیا کی بعض مشہور ترین شخصیتوں کے ساتھ میرے جو تھوڑے بہت خاکسارانہ تعلقات رہے ہیں، اُن کا ہلکا سا خاکہ ایک مضمون کی صورت میں کھینچ دوں جو اگرچہ رسالہ کے مقاصد سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا تاہم ممکن ہو کہ قارئین کرام کے لئے عموماً اور موجودہ نسل کے طلباء کے لئے خصوصاً باعث دلچسپی ہو۔

میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے اشخاص سے ملنے کا موقع ملا ہے جو اُس وقت یا تو بام شہرت پر پہونچ چکے تھے یا بعد میں اپنے اپنے حلقہ میں عظیم الشان شہرت کے مالک بنے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی اکابر سے میرے تعلقات کی ابتداء اُس زمانہ

میں شروع ہوئی تھی جبکہ میں لندن میں طالبعلمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض کا انتقال ہو چکا ہے اور بعض سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن گزشتہ صحبتوں کی دل خوش کن یاد ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گی۔

گاما پہلوان اس مشہور و معروف پنجابی پہلوان نے دُنیا کا چیمپین بننے کے لئے ۱۹۰۹ء میں زبسکو سے طاقت آزمائی کی تھی۔ کشتی وائٹ سٹی، لندن کے دنگل میں ہوئی تھی۔ اُس زمانہ میں چونکہ وائٹ سٹی میں انگلستان اور جاپان کی مصنوعات کی مشترکہ نمائش ہو رہی تھی اس لئے بہت سے جاپانی پہلوان بھی انگلستان میں موجود تھے جن کی کشتیاں روزانہ ہوا کرتی تھیں۔

گاما اور زبسکو کی کشتی شروع ہونے سے تھوڑی دیر قبل جاپانی پہلوان زبسکو کے پاس پہونچے اس سے مصافحہ کیا اور اس کی کامیابی کے لئے دُعا گو ہوئے۔ لیکن انھوں نے گاما کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

جاپانیوں نے گاما سے جس کج خلقی کا برتاؤ کیا اُسے سمجھنے سے ہم قاصر تھے۔ لیکن اس واقعہ کے فوراً بعد ہی چند خوبصورت جاپانی لڑکیاں دنگل میں اُتریں اور گاما کی خدمت میں پھولوں کا تحفہ پیش کیا۔

یہ تمام کھیل پہلے ہی سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ طے پا چکا تھا اور جیسا کہ ہمیں بعد میں بتایا گیا اس سے کسی کی ہتک یا دل آزاری مقصود نہ تھی۔ کشتی برابر رہی اور دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ مگر زبسکو اُسی رات کو یہ بہانہ کرکے براعظم روانہ ہو گیا کہ "میری والدہ سخت بیمار ہیں"

میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بہت سے پنجابیوں سے ملا ہوں لیکن میری اب تک کسی ایسے پنجابی یا کسی دوسرے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جسے اس بات کی ترغیب دی جا سکتی ہو کہ وہ اپنی طاقت اور کمالات کے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہے۔ گاما فی الحقیقت پنجاب کا سچا، خاموش اور طاقتور انسان ہے اور چند سال قبل ہندوستان ہی میں زبسکو کو پچھاڑ چکا ہے۔

ڈاکٹر ڈیوڈسن یہ آرک بشپ آف کنٹربری تھے اور لیمبتھ پیلس میں جو کنٹربری کے لاٹ پادریوں کے رہنے کی تاریخی جگہ ہے، ہر "اپتھی وڈنس ڈے" کو سال میں ایک مرتبہ نوآبادیوں اور غیر ملکوں کے طبقی طلبا کو مدعو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈسن نہ صرف گرجا کے سب سے بڑے عہدیدار تھے بلکہ صحیح معنوں میں ایک بڑے مدبر اور فصیح البیان مقرر بھی تھے۔ جیسا کہ "لارڈز اسپری چوال" کا قاعدہ ہے، وہ دارالامرا میں کراس بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے اور مباحث میں بھی بسا اوقات حصہ لیا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ لیمبتھ پیلس میں انھوں نے ایک بے ضابطہ جلسہ میں ہمارے متعلق کہا کہ صرف ایک جلوس ایسا ہے جو تمام شاہانہ جلوسوں سے بھی زیادہ شاہانہ ہے جنھیں وہ دیکھ چکے ہیں اور

وہ جلوس طبی طلبا کا ہے جو درس دینے والے بڑے اسپتالوں کے وارڈوں اور گیلریوں میں اساتذہ کے پیچھے پیچھے نکلتا ہے۔

گاہ بگاہ وہ مجھے لیمبتھ پیلس میں چائے اور ٹینس پر بلا کر میری عزت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ ان آرک بشپ صاحب کو ہز مجسٹی جارج پنجم آنجہانی نے پیریج کے درجے تک ترقی دیدی تھی۔ چند سال ہوئے اُنکا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے آج تک کسی مذہب کے مذہبی پیشوا کو نہیں دیکھا جس میں اس عجیب و غریب شخص کی سی مذہبی رواداری موجود ہوا اور جو اُن کی طرح دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتا ہو۔

مہاراجہ گائیکواڑ، بڑودہ

ہز ہائینس مہاراجہ گائیکواڑ بھی دوسرے ہندوستانی والیان ریاست کے ساتھ ملک معظم جارج پنجم آنجہانی کی تقریب تاجپوشی کے موقع پر ۱۹۱۱ء میں انگلستان تشریف لائے تھے۔ اُس زمانہ میں میں "انڈین گلڈ آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی" جس کا صدر دفتر مانچسٹر میں تھا، کی لندن برانچ کا آنریری سکریٹری تھا۔ گلڈ کی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی والیان ریاست سے عطیات وصول کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں پہونچا جائے۔ چنانچہ ہم نے قرعوں کے ذریعہ فیصلہ کیا کہ کون کون شخص کہاں جائے۔ میرے نام پر گائیکواڑ نکلا۔

میرے تمام دوستوں نے دوسرے والیان ریاست سے ملاقات کرنے یا اُن سے عطیہ لینے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ لیکن ہز ہائینس گائیکواڑ نے بہت جلد ملاقات کا وقت مقرر فرمادیا اور ازراہ نوازش مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ ملاقات کے دوران میں انھوں نے فرمایا کہ "میرے پاس تمام اُمور پر بحث کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے گلڈ کے بارے میں متعلقہ کاغذات میرے پاس چھوڑ جائیں تو میں فرصت کے اوقات میں اُن کا مطالعہ کرلوں گا۔ مگر یہ صرف اُس صورت میں دوں گا اگر مجھے اطمینان ہوگیا کہ گلڈ حقیقی معنوں میں ہندوستان کی خدمت کر رہا ہے۔" اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ہز ہائینس کے پاس سے ۱۰۰ پونڈ کا چک موصول ہوگیا۔

ہز ہائینس کا ہمیشہ سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے تمام اُمور کو کاروباری عجلت اور پورے انہماک کے ساتھ انجام دیا کرتے ہیں اور مذکورہ بالا واقعہ اگرچہ بجائے خود بہت ہی معمولی ہے تاہم اُسنے اُس وقت ہمارے نوجوان دماغوں کو بہت متاثر کیا تھا۔

مسز اینی بیسنٹ

مسز اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۱ء میں لندن اسلامک سوسائٹی کی زیرسرپرستی ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی جس کی صدارت کی عزت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ اُن کی تقریر کا موضوع تھا کہ "اسلام نے دُنیا کو کیا فایدہ پہونچایا ہے"

اپنی نہایت ہی شاندار تقریر میں انھوں نے تعددِ ازدواج کے مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث کی اور بتایا کہ یہی وہ ایسا اسلامی شعار ہے جس پر مغربی مصنفین نے غالباً سب سے زیادہ لے دے کی ہے جگہ کی قلت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں ان کی تقریر پر تفصیلاً تبصرہ کروں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنے پر قناعت کروں گا کہ اس موضوع پر اُن کی خداداد لسانی کا یہ اثر ہوا کہ مجمع کی بہت سی غیر شادی شدہ لڑکیاں رونے اور چیخیں مارنے لگ گئی تھیں۔

مسز بیسنٹ سے میری ملاقات میرے عزیز دوست دوارکا ناتھ تیلنگ کی وساطت سے ہوئی تھی یہ صاحب جسٹس تیلنگ آنجہانی کے صاحبزادے تھے۔ دوارکا ناتھ گرانٹ میڈیکل کالج میں نہ صرف میرے ہمعصر تھے بلکہ نہایت گہرے دوستوں میں تھے۔

دو سال قبل جب مسز اینی بیسنٹ کا انتقال ہوا تو اُس وقت مسز موصوفہ کی راکھ دریائے گنگا کے مقدس پانی میں بہانے کی غرض سے لیجانے کی عزت انھی دوارکا ناتھ کو حاصل ہوئی تھی۔

میجر شاہ مرزا بیگ

میجر شاہ مرزا بیگ (دکھن) اپنے زمانہ کے بہترین پولو کھیلنے والے تھے اور دنیا کا کوئی پولو میچ ایسا نہ تھا جس میں انھیں شامل نہ کیا جاتا ہو اس لئے کہ عام خیال یہ تھا کہ وہ دُنیا کے چار بہترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہیں۔ ایک مرتبہ وہ کاؤنٹ ڈی ماڈری کی ٹیم میں جس کا نام "ٹائیگرز" تھا، کھیل رہے تھے جس کے دیکھنے والوں میں ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ بھی تھے۔ ٹورنامنٹ کے آخری کھیل میں تو مرزا نے کمال ہی کر دیا۔ میچ کے بعد ڈیوک آف کناٹ نے ازراہِ نوازش شاہ مرزا بیگ کو خاص طور سے بلا بھیجا اور فرمایا کہ "میری بیٹی شاہزادی پیٹریشیا مجھ پر زور ڈال رہی ہیں کہ میں اُن سے آپ کا تعارف کرا دوں"

ٹیم میں مرزا کی پوزیشن سب سے اول رہی اور ان کا کھیل اس قدر شاندار تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پولو اور ٹینس میں ان کے کمال سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ بہت ہی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے جس کی وجہ سے اُن کے ہزار ہا دوست اور مداح پیدا ہو گئے تھے ۱۹۲۹ء میں انکی بے وقت موت جو پولو کھیلنے کے دوران میں ایک حادثہ کی وجہ سے ہوئی، اُن کے احباب کے وسیع حلقہ کے لئے سخت صدمہ کا باعث ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں جب ہم نے مصر کی "ڈبل آرمی ٹینس چمپین شپ" جیتی تو اُسوقت مجھے مرزا کا "پارٹنر" بننے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔

مسز نائیڈو

مسز نائیڈو اپنی دلآویز شاعری کی بدولت جسے صرف ایک سروجنی ہی لکھ سکتی ہے، کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں اس سے بہت عرصہ قبل کہ مجھے لندن میں اُن سے ملنے کی

عزت حاصل ہوئی ہو۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جب وہ لندن تشریف لائیں تو سلطنت متحدہ انگلستان و آیرلینڈ کے شعرا نے چیدہ اصحاب کی موجودگی میں مسز پیٹیس کی زیر صدارت اُن کی خدمت میں ہدیہ تحسین پیش کیا۔ لندن کے ویسٹ اینڈ بازار میں جب کبھی مسز نائیڈو سودا سلف خریدنے کی غرض سے نکلتی تھیں، ایسے مواقع پر بسا اوقات میرے ذمہ ان کی حفاظت کی خدمت سپرد رہا کرتی تھی تاکہ وہ جیسا کہ وہ خود فرمایا کرتی تھیں، ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف نہ کر دیا کریں۔ گھر پہونچنے کے بعد وہ مجھے اچھی اچھی چیزیں کھلائے بغیر نہ بھیجتیں کہ مبادا میں دوبارہ حاضر نہ ہوں۔

ڈاکٹر انصاری خوش قسمتی سے میں ڈاکٹر انصاری سے سنہ ۱۹۰۱ء سے واقف ہوں۔ میری اُن کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی جبکہ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر چکے تھے اور میں ابھی "سینٹ بارتھولومیوز ہاسپٹل" میں طالبعلمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

اُس زمانہ میں وہ لندن کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن مقرر ہوگئے تھے۔ اس اسپتال کے ساتھ ایک تعلیمی درسگاہ بھی ملحق ہے اور میرا خیال ہے کہ میرا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ انصاری اُن ابتدائی چند ہندوستانیوں میں سے تھے جو لندن کے کسی درس و تدریس دینے والے اسپتال میں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے مقرر ہوئے ہوں۔

بہرحال آج بھی درس دینے والے اسپتالوں میں بالخصوص لندن کے اسپتالوں میں ہاؤس سرجن کے عہدہ پر لوگوں کی للچائی ہوئی نظر پڑا کرتی ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ انصاری کے دوستوں اور مداحوں نے جن میں زیادہ تر ہندوستانی ڈاکٹر اور طلبا تھے، اس واقعہ کی یاد میں "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کے قریب ہی " اسٹرینڈ" کے ایک نہایت فیشن ایبل ریسٹورنٹ میں انھیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔

میزبانوں میں میں ہی اُن کا سب سے پرانا دوست تھا اور اس لئے اس شام کو جام صحت تجویز کرنے کا فرض بھی میرے سپرد تھا۔ چونکہ طلبا میں میں سب سے "زیادہ سینیر" تھا اس لئے ڈنر کے موقع پر صدارت کی ذمہ داری بھی میرے ہی ضعیف کندھوں پر ڈالدی گئی تھی۔

انصاری میری دائیں جانب بیٹھے تھے اور ڈاکٹر سی۔ اے۔ ایڈیسن، ایم۔ ڈی، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس ایم۔ پی جو انصاری کے زبردست مداحوں میں تھے اور اُسوقت بارتھولومیو میں علم التشریح کے لکچرر تھے۔ میری بائیں جانب تھے۔ یہ صاحب سب سے پہلی بار انصاری سے لندن کی "نیشنل لبرل کلب" میں ملے تھے جس کے یہ دونوں حضرات ممبر تھے۔

یہ میری پہلی تقریر تھی اور اگر دوران ڈنر میں مجھے اپنے قریب بیٹھنے والوں سے شاباشی اور اخلاقی

امداد نہ ملتی تو یقیناً میں بالکل ناکام رہتا اور ایک فقرہ بھی زبان سے ادا نہ کرسکتا۔

لیکن اس پہلی تقریر پر مجھے سب سے زیادہ شاباشی انصاری ہی نے دی۔ اس بنا پر مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں نے پورے تیس سیکنڈ میں اچھی خاصی تقریر کی ہوگی۔

میرا معمول تھا کہ میں ہر ہفتہ سہ پہر کو "چیرنگ کراس ہاسپٹل" میں انصاری سے ملنے کے لئے اُن کی قیامگاہ پر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شام کے وقت ہم "اسٹرینڈ" میں سیر و تفریح میں مشغول تھے کہ شام کے ایک اخبار کے پوسٹر پر ہماری نظر پڑی جس میں جلی حروف میں یہ الفاظ درج تھے "برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی"۔ میں نے اخبار خرید لیا اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سارا مضمون میرے دوست انصاری سے متعلق تھا جس میں لندن کے ایک بڑے اسپتال میں بہ حیثیت ہندوستانی کے اُن کے تقرر پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی، اور اس پر زور دیا گیا تھا کہ ایسی اسامیاں ہمیشہ نوجوان برطانوی ڈاکٹروں سے پُر کی جانی چاہیں۔

ذاتی طور پر انصاری اسپتال میں بیحد ہر دلعزیز تھے اور اُن کے رفقائے کار نے اُن کے تقرر پر اخباری نکتہ چینی کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کیا تھا۔ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کی "گورننگ کونسل" کے چیرمین کی جانب سے ایک دفتری اعلان شائع کیا گیا جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ "انصاری کا تقرر محض قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور برطانوی اسپتالوں کے لئے وہ دن نہایت افسوسناک دن ہوگا اگر ہاؤس سرجنوں کی اسامیوں کا اعلیٰ اسامیوں میں شمار نہ رہیگا اور اگر قابلیت کے معیار کے سوائے اور جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا"

جس زمانہ میں انصاری ہاؤس سرجن تھے، اُسی زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ میں اُن کے یہاں ڈنر پر مدعو تھا۔ جب ڈنر ختم ہوگیا تو انھوں نے خلافِ توقع مجھے نہایت قیمتی سگاروں کا ایک بکس پیش کیا اور فرمایا کہ "میرے پاس ایسے بکس ایک درجن ہیں جن میں سے میں نے تمھارے لئے چھ بکس محفوظ کردئے ہیں جو تمھیں قسط وار ملتے رہیں گے"

انگلستان میں سگار ایک مہنگی عیاشی شمار کیجاتی ہے اور قدرتی طور پر میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ اتنی دولت اُن کے ہاتھ کیسے لگی۔

آخرکار یہ راز خود بخود کھل گیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس تحفہ کی بھیجنے والی مس ماڈالین ہیں جو اُس زمانہ میں عریاں رقصوں کی وجہ سے دنیا بھر میں نمایاں شہرت حاصل کرچکی تھیں۔ اُن کی خادمہ کسی سڑک کے حادثہ میں بری طرح زخمی ہوگئی تھی اور اسپتال میں لائی گئی تھی جہاں انصاری نے اپنے وارڈ میں اسکا

کامیابی کے ساتھ علاج کیا تھا مس ماڈالین نے تحفہ کے ساتھ ایک مختصر رقعہ بھی بھیجا تھا جس میں ان کی اُن تھک کوششوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو انھوں نے مریضہ کی بحالی صحت کے لئے کی تھیں رقعہ کے آخر میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے فنی کمال کے اعتراف میں جس کا اظہار خادمہ کے علاج کی صورت میں ہوا تھا، اس حقیر تحفہ کو قبول فرمائیں۔

جو لوگ انصاری سے بہ حیثیت ڈاکٹر کے اُن کے مابعد کی زندگی میں ملے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مذکورہ بالا اعتراف کے وہ پورے طور پر مستحق تھے اور یہ کہ ملک بھر کے بیشمار مریض، بالخصوص غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص نہ صرف انھیں اپنا چہیتا ڈاکٹر خیال کرتے تھے بلکہ ہر اعتبار سے انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری اگر چاہتے تو آسانی کے ساتھ بڑی دولت کما سکتے تھے۔ لیکن وہ قدرت کے یہاں سے مختلف فطرت لیکر آئے تھے اور انھوں نے اپنے فنی فرائض کی شریفانہ بجا آوری میں اس خیال کو کبھی اپنے دل میں آنے نہیں دیا کہ وہ روپئے پیسے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ غریب مریضوں کے اُس اژدہام کے ساتھ بھی جو دہلی میں ان کے گھر کے مطب میں دیکھنے میں آتا تھا، اُن کی وہی روش اور توجہ تھی جو امراء، رؤسا اور والیانِ ریاست پر مبذول کی جاتی تھی۔

"چیرنگ کراس ہاسپٹل" میں اپنی میعادِ عہدہ پوری کرنے کے بعد انصاری "لاک ہاسپٹل" میں اور اس کے بعد "سینٹ پیٹرز ہاسپٹل" لندن میں "ریزیڈنٹ میڈیکل آفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد انھوں نے اڈنبرا سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر ایم۔ سی۔ ایچ کی۔

میرا خیال ہے کہ انصاری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آگئے تھے۔ اس زمانہ میں اُن کی خواہش تھی کہ دہلی میں ایک عام اسپتال تعمیر کریں جہاں فیس ادا کرنے والے مریضوں کے ساتھ ساتھ مفت دوا پانے والے مریضوں کا بھی علاج کیا جا سکے۔ لیکن یہ اسکیم بارور نہیں ہوئی اس لئے کہ ہندوستان پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انھیں "آل انڈیا میڈیکل مشن" کے سردار کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا تھا اور یہ اپنا اسپتال لیکر بہت جلد ٹرکی روانہ ہو گئے جو اُن دنوں دول بلقان کی متحدہ طاقتوں سے نہایت بہادری کے ساتھ مصروفِ جنگ تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم بھی زیادہ تر اس جنگی اسپتال کے قیام کے ذمہ دار تھے اور اس کے لئے انھوں نے سارے ہندوستان سے روپیہ اکھٹا کیا تھا۔

اس اسپتال نے جو سارے کا سارا ہندوستانیوں پر مشتمل تھا، ترکی بیماروں اور زخمیوں کیلئے

نہایت مفید خدمات انجام دی تھیں۔ جنگِ بلقان کے اختتام پر یہ مشن ہندوستان واپس آگیا۔
ٹرکی سے واپسی پر انصاری رفتہ رفتہ سیاسیات میں داخل ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے خلافت کمیٹی کے ذریعہ خالص اسلامی سیاسیات سے تعلق رکھا لیکن جلدی ہی وہ کانگریس میں شامل ہو گئے، جس کے وہ زمانۂ مابعد میں پریسیڈنٹ بھی منتخب ہوئے ۔ میں انصاری کی پبلک زندگی کے متعلق رائے دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہماری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ہم مختلف راہوں پر گامزن رہیں۔
ہم دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آخری مرتبہ میری ان سے ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جبکہ آنریبل سر علی محمد خاں دہلوی نے جو اُس وقت لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر تھے، اُن کی آمد کے موقع پر ایک ڈنر پارٹی دی تھی۔ ہمارے عقلمند میزبان نے انصاری کی اور میری نشستیں پاس پاس رکھی تھیں اور جب ہم ملے اس وقت ہم نے زیادہ تر لندن ہی کے زمانۂ قیام کی گزری ہوئی دلچسپیوں کے بارے میں گفتگو کی اور اُس دور کے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات کا بچپن کی مسرت کے ساتھ تذکرہ کیا جو اگرچہ بجائے خود معمولی تھے مگر ہمارے لئے وہ اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتے تھے اس لئے کہ اُن کی خوشگوار یاد آج بھی ہمارے دلوں کو مسرور کرتی ہے۔
میں سیاسی آدمی نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے سیاست دانوں میں وہ لوگ جو سیاسی خیالات میں ان سے اختلافِ رائے رکھتے تھے، سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے کہ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات میں سیاسی اختلافات کو غلبہ پانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔
اپنے بیشمار مشاغل میں مصروف رہنے کے باوجود انھیں اپنے پیشہ کے ساتھ جو شغف تھا، اُس میں کبھی بھی ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ وہ علم طب کی ترقیوں سے پوری طرح واقف رہتے تھے بلاشبہ ان کا شمار اس پیشہ کے مسلمہ لیڈروں میں ہوتا تھا۔ انصاری "آل انڈیا میڈیکل کانفرنس" کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے جس کا اجلاس بمبئی میں سنہ ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور یہیں پہلی بار انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ انھیں دل کی طرف سے تشویش رہا کرتی ہے۔
اُن کی سرگرمیاں اب ختم ہوگئی ہیں، لیکن مختلف میدانوں میں اُن کے عظیم الشان کارناموں، اُن کی جاذب شخصیت، اُن کی بے غرضانہ دوستی، اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیت، اُن کی خاکساری اور تواضع، اُن کی حب الوطنی، اُن کی وسیع النظری اور فرقہ وارانہ تعصبات سے اُن کی حیرت انگیز برتیت،

غریب اور دکھی پبلک کے ساتھ ان کا شغف اور پیار، یہ سب باتیں عرصۂ دراز تک ایک ایسی زندگی کی یاد دلاتی رہیں گی جو اپنی قوم اور ملک کی خدمت میں بسر ہوئی اور جو آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا محمد علی مرحوم

ایک سہ پہر کو مولانا اور میں "ویسٹ منسٹر" میں اکھٹے جا رہے تھے "کیکسٹن ہال" سے گزرتے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں حقوق طلب عورتوں کی طرف سے جلسہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ سیدھے ہم اندر چلے گئے، لیکن وہاں پہونچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے جلسہ میں ہمارے سوائے اور کوئی مرد نہیں۔ کچھ دیر بعد صدر جلسہ مسز پنکھرسٹ نے جو اس زمانہ میں حقوق طلب عورتوں کی تحریک کی پریسیڈنٹ تھیں، مولانا محمد علی سے تقریر کے لئے درخواست کی۔ مولانا نے درخواست کو قبول فرما لیا اور عورتوں کو ووٹ دئے جانے کی تائید میں ایک نہایت معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔

جلسہ کے بعد سارا مجمع ڈاؤننگ اسٹریٹ کے مکان نمبر ۱۰ پر گیا تاکہ وزیر اعظم سے ملاقات کرے مسز پنکھرسٹ جلوس کی سردار تھیں اور ان کی خواہش پر ہم دونوں نے ان کی حفاظت کی خدمات انجام دیں۔ "ڈاؤننگ اسٹریٹ" پہونچکر ہم برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ پر پہونچے۔ مسز پنکھرسٹ نے دروازہ پر دستک دی جسے ایک ملازم نے کھولا اور اطلاع دی کہ مسٹر ایسکوتھ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی مسز پنکھرسٹ نے اس عمارت کی سیڑھیوں پر سے اپنے متبعین کے سامنے تقریر شروع کر دی جس سے مجمع میں کافی جوش پیدا ہو گیا یہاں تک چند عورتوں نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے، تھوڑی دیر بعد پولیس آن پہونچی اور جلوس کے بڑے سرداروں کو جن میں مسز پنکھرسٹ بھی تھیں، گرفتار کر لیا

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہیجان آور مناظر دیکھے ہیں، لیکن جس جوش و خروش اور ندرت کا مشاہدہ میں نے اس جلوس میں کیا، اس کا مقابلہ کوئی نظارہ نہیں کر سکتا۔

مولانا محمد علی کا سارا دن انگلستان کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں اور بحثیں کرنے میں گزر جاتا تھا لیکن دن بھر کی مشقت کے بعد وہ نہایت مہربانی اور اخلاص کی بنا پر میرے لئے نصف گھنٹہ مخصوص فرما دیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں سنجیدہ مضامین پر بحث کرنے کی مناہی تھی اور ہم لڑکپن کی مسرت کے ساتھ شہر کے واقعات حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ مولانا دنیا کے ان وسیع القلب اشخاص میں سے تھے جن سے ملاقات کی عزت مجھے نصیب ہوئی اور میں نے ہمیشہ ان کی دوستی کی قدر و منزلت

کی جس کی یاد آج بھی میرے ماضی کے نہایت قیمتی خزانوں میں شمار ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب ہم سب کی بدقسمتی سے مولنا کا انتقال ہوگیا، اُسوقت جنازہ میں شرکت کرنے والوں میں میں بھی تھا۔

مسز سوکھی موجودہ نسل کے لوگوں میں مینکا کے نام سے مشہور ہیں۔ جب ہم پہلی مرتبہ لندن میں ملے ہیں تو اگرچہ وہ زمانہ اُن کی نوعمری کا تھا تاہم بہ حیثیت آرٹسٹ کے وہ جس شہرت کی آج مالک ہیں، اس کے آثار اُسوقت ظاہر ہو چکے تھے۔

لندن میں وہ مس لیلا رائے کے نام سے مشہور تھیں اور ہندوستانیوں کے وہاں جتنے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ اُن سب کی روح رواں تھیں۔ اُسوقت وہ ایسی مکمل رقاصہ نہ تھیں جیسی آج کل ہیں لیکن اُس زمانہ میں بھی وہ وایولن بجانے میں سننے والوں کی طرف سے خراج تحسین وصول کیا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مہاراجہ گائیکواڑ کے اعزاز میں استقبالیہ جلسہ منعقد کیا۔ تفریحی ناٹک کے طور پر انھوں نے تاریخ ہند کا ایک ایسا باب لیا جو اسلامی دور سے متعلق تھا اور جسے نہایت دلآویزی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا تھا۔ ہمایوں کا پارٹ ادا کرنے کے لئے میرا انتخاب کیا گیا تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ کھیل کے بعد انھوں نے مجھے دل کھول کر شاباشی دی تھی۔

مجھے بعد میں یہ معلوم کر کے بیحد مسرت ہوئی کہ ان کی نگاہِ انتخاب میرے ایک دوست پر پڑی اور وہ انجام کار مس لیلا رائے سے مسز سوکھی بن گئیں۔

گزشتہ آلمپک کھیلوں میں جو برلن میں منعقد ہوئے تھے، انھوں نے فن رقص کا جو مظاہرہ کیا، وہ چونکہ زمانۂ حال کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں اُسے نظر انداز کرتا ہوں

جی۔ کے۔ گوکھلے آنریبل مسٹر جی۔ کے۔ گوکھلے آنجہانی اور سر فیروزشاہ مہتا دونوں کو لندن کی "انڈین یونین سوسائٹی" نے ایک ساتھ ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اُس زمانہ میں میں سوسائٹی کا صدر تھا۔ اپنے معزز مہمانوں کا جامِ صحت تجویز کرتے وقت میں نے جسارت کر کے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کو مارلے منٹو اصلاحات کے بارے میں جو اُسوقت پارلیمنٹ کے سامنے زیر بحث تھیں کیا پالیسی اختیار کرنی چاہئے۔

مسٹر گوکھلے نے جواب میں نہایت خوش خلقی کے ساتھ میری تجاویز کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ جب وقت آئے گا وہ اُن پر پوری توجہ مبذول فرمائیں گے۔ مگر سر فیروزشاہ مہتا نے جو ترکی ٹوپی زیب سر کئے ہوئے تھے، مجھے سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ "ہم بوڑھے اپنا وقت ضایع نہیں کر رہے ہیں بلکہ نفس معاملہ پر پوری طرح غور و خوض کر رہے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو جب لندن میں میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی، اسوقت وہ "انر ٹمپل" میں تعلیم پا رہے تھے۔ اپنے مخصوص دوستوں کے حلقہ میں وہ "جو" کے نام سے مشہور تھے۔

وہ کسی قدر شرمیلے واقع ہوئے تھے اور کھچے کھچے سے رہتے تھے اور آسانی سے دوست نہیں بنتے تھے، بلکہ ہم نے سامنے جن کو وہ اپنی دوستی سے نوازتے تھے، اُن کے سامنے وہ اپنا کلیجہ تک نکال کر رکھ دیتے تھے۔

ان کے پسندیدہ خط وخال، ان کی دلوں پر قبضہ کر لینے والی مسکراہٹ، ان کے اچھے قطع کردہ کپڑے اور سجے ہوئے کمرے، ان کی شاہانہ مہمان نوازیاں اور ان کی دلچسپ بذلہ سنجیاں اور سب سے بڑھ کر اُن کا قابل تقلید ذاتی کیرکٹر اُن تمام اشخاص کی یاد سے بھلایا نہیں جا سکتا جنھیں اُس دور دراز زمانہ میں اُن کی دوستی کا شرف حاصل تھا۔

وہ لندن کے مشہور "کوئنز کلب" کے ممبر تھے جہاں کی کورٹوں میں ہم بسا اوقات ٹینس کھیلا کرتے تھے، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی طور پر مجھے اس امر کی کبھی توقع نہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سیاسی زندگی کو اختیار کر لیں گے اگرچہ یہ عیاں تھا کہ وہ ضرور کسی پیشہ کو اختیار کریں گے جس سے انھیں دلچسپی ہوگی۔ اس طرح میرے لئے یہ امر بھی تعجب انگیز تھا کہ ڈاکٹر خاں صاحب کیونکر سیاسیات میں دخیل ہوگئے۔ وہ اور میں گرانٹ میڈیکل کالج میں ہم سبق تھے اور بعد میں لندن میں ملکر ہمیں بہت مسرت ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہم دونوں کے گہرے دوست تھے۔

خان جنھیں ہم انھیں محبت سے پکارا کرتے تھے، ہاکی ٹیم میں "سینٹ ٹامسیز ہاسپٹل" کی طرف سے نمایندگی کرتے تھے اور ہر اعتبار سے اسپورٹسمین (کھلاڑی) تھے۔

لندن میں میرے ایک چچا کا انتقال ہوگیا اور ایسے وقت میں اپنے گھر سے دور رنج وغم سے نڈھال ہو رہا تھا، میں خان صاحب کی برادرانہ شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

پرنس لچ ناؤسکی جنگ عظیم چھڑنے سے قبل قیصر نے جرمنی کے اس زبردست شخص کو لندن میں اس غرض سے سفیر بنا کر بھیجا تھا کہ وہ انگلستان اور جرمنی کے دوستانہ روابط کو ترقی دے۔

ابتدائے جولائی کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میرے ایک رشتہ دار نے شہزادہ لچ ناؤسکی اور اس کی حسین بیوی کو "رٹز ہوٹل" میں کھانے کی دعوت دی۔ میں بھی مہمانوں میں شامل تھا۔ ڈنر کے بعد ناچ ہوا اور اُس شام کو میں نے شہزادی کے ساتھ متعدد بار رقص کیا۔ اس شہزادی کی شخصیت

میں کمال کی جاذبیت بھری ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ لندن میں بہت جلد اُن کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

جب علی الصبح پارٹی ختم ہوئی تو جرمن سفیر اور ان کی بیوی نے ازراہ تلطف مجھ سے فرمایا کہ "ہمارے ساتھ سفارت خانہ چلو اور وہاں قہوہ پینے کے بعد اپنے گھر چلے جانا" یہ دعوت ایسی تھی جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

کمرۂ سفارت میں ہم بہت دیر تک گفتگو میں مشغول رہے اور غالباً کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس پر ہم نے تبادلہ خیالات نہ کیا ہو۔ رخصت ہوتے وقت میرے میزبان اور ان کی بیوی نے ظریفانہ لہجہ میں فرمایا کہ "اب چین کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔ یورپ کا امن خطرہ میں نہیں ہے۔"

مگر اس واقعہ کے ایک ہی مہینہ بعد جنگ عظیم چھڑ گئی اور دنیا جنگ کی تلخ حقیقت سے دوچار ہو گئی جرمن سفیر اور ان کی بیوی کو اعلان جنگ کے بعد انگلستان سے واپس جانا پڑا۔ میں بھی ان لوگوں میں تھا جو "کارلٹن ہاؤس ٹیرس" میں جرمن سفارت سے "خدا حافظ" کہنے کے لئے گئے تھے۔

جب میں جرمن سفارت خانے سے باہر نکل رہا تھا، ٹھیک اسی وقت وزیر اعظم انگلستان مسٹر ایسکوئتھ کی بیوی بھی اسی مقصد سے وہاں داخل ہو رہی تھیں، اور عین اس وقت جبکہ میں ٹیکسی میں بیٹھنے کو تھا میرے قدیم اور عزیز دوست توفیق پاشا بھی جو اس زمانہ میں لندن میں ترکی سفیر تھے رخصت ہونے والے سفیر اور ان کی بیوی سے آخری ملاقات کرنے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔

توفیق پاشا کو بھی چند دن بعد لندن چھوڑ کر جانا پڑا اس لئے کہ ترکی بھی شریک جنگ ہو گیا تھا۔ توفیق پاشا ترکی کے مشہور ترین مدبروں میں شمار ہوتے تھے۔ ابھی حال ہی میں میں نے دلی افسوس کے ساتھ اُن کے انتقال کی خبر پڑھی مرحوم مجھ سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ بلال پاشا کہکر پکارا کرتے تھے۔

توفیق پاشا کے مکان پر میری دنیا کے جن بعض مشہور ترین لیڈروں سے ملاقات ہوئی، انہیں سے ایک انور پاشا تھے اور دوسرے ڈاکٹر سن یٹ سن۔

اول الذکر بلاشبہ دنیا کے نہایت خوبصورت اور وجیہ شخص تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک زبردست اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ ان کی شخصیت کئی لحاظ سے بے نظیر کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سن یٹ سن کئی سال قبل لندن کے مڈل سیکس اسپتال میں طالب علم رہ چکے تھے اور

بعد میں کئی مرتبہ اُن کا لندن آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے چین کی شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے اور اس کی بجائے جمہوریت قایم کرنے کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ابھی یہ طالب علم ہی تھے کہ ایک شب کو بہت رات گئے وہ لندن کے چینی سفارتخانہ کے پاس سے گزرے۔ سفارت خانہ کے عملہ نے انھیں پکڑ لیا اور کئی دن تک انھیں محبوس رکھا۔ لیکن ایک ملازم کی امداد سے وہ اس قابل ہوگئے کہ ڈاکٹر کینٹلی کو اپنی گرفتاری کی اطلاع دے سکیں جو "مڈل سیکس ہاسپٹل" میں سن یٹ سن کے زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر کینٹلی فوراً برطانوی وزارت خارجہ میں گئے اور سکریٹری کے ذریعہ چینی حکومت کے نام ایک "ضروری یادداشت" بھیجی جس کا نتیجہ سن یٹ سن کی رہائی کی شکل میں نکلا۔ رہائی کے بعد وہ کئی سال تک لندن میں مقیم رہے۔

زمانۂ حال کی تاریخ جاننے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چین کی تاریخ کے بدلنے میں انھوں نے کتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔ چینی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جانے پر جب وہاں جمہوریت قایم ہوئی تو یوان شی کے اُس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ سن یٹ سن پس پردہ رہ کر کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے مگر رائے عامہ نے یوان شی کے کی وفات پر انھیں مجبور کیا کہ وہ صدارت کی ذمہ داری قبول کریں۔ چنانچہ کئی سال تک اپنے ملک کی مخلصانہ خدمت کرنے کے بعد وہ راہی ملک عدم ہوگئے۔

تمام چینی قوم نے رضاکارانہ چندہ کرکے اُن کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جو ثبوت ہے اس امر کا کہ انھوں نے اپنے پیارے ملک کی کسقدر شاندار خدمت انجام دی تھیں۔

مہاتما گاندھی

اگست سنہ ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظمیٰ چھڑی ہے تو اُسوقت مہاتما گاندھی انگلستان ہی میں تھے جس مشن پر وہ وہاں تشریف لائے تھے وہ بلاشبہ ہندوستان کے باہر برطانوی نوآبادیوں بالخصوص جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی ناقابلِ اطمینان پوزیشن سے متعلق تھا۔ وہ ابھی برطانوی سلطنت کے دار السلطنت لندن میں اُن کی خاطر مصروف جنگ تھے کہ تمام سلطنت کو یکایک موت وحیات کی ایسی کشمکش میں شریک ہونا پڑ گیا جو تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی جو چار سال کی طویل اور صبر آزما مدت تک جاری رہی اور جس کے اثرات سے ابھی تک نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوئی۔

انگلستان کے اعلانِ جنگ کر دینے پر مہاتما گاندھی نے بیمار اور زخمی ہندوستانیوں کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ انھیں لندن میں رنگروٹ بھرتی کرنے کے لئے اسٹیشن کھولنے کی سرکاری اجازت مل گئی اور انھوں نے سلطنت متحدہ برطانیہ کے مقیم ہندوستانیوں کے نام اپیل بھیجی

اور انہوں نے "ایمبولنس کور" میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ کچھ عرصہ بعد "انڈین والنٹیرز ایمبولنس کور" کی حیثیت سے اس کا نام گزٹ میں چھپا، لیکن ہم اسے محبت کی بنا پر آئی۔ وی۔ اے۔ سی کہکر پکارا کرتے تھے۔ لفٹنٹ کرنل سی۔ بیکر۔ آئی۔ ایم۔ ایس اس کور کے کمانڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔

بہت سے ہندوستانیوں نے جن میں زیادہ تر طلبا تھے، مہاتما کی آواز پر لبیک کہا۔ میں نے بھی دوسرے طلبا کی طرح مطالعہ کو عارضی طور پر خیرباد کہدیا تھا اور پرائیویٹ حیثیت سے کور میں شامل ہوگیا تھا۔

مہاتما گاندھی جن کے ساتھ بسا اوقات ہز ہائینس آغا خاں بھی ہوتے تھے، "ریجنٹ پارک" میں رنگروٹوں کی پریڈ دیکھنے کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ "یوپی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ" میں بھی وزٹ (معائنہ) کے لئے آیا کرتے تھے جہاں ہمیں فرسٹ ایڈ اور ایمبولنس کے کام کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مہاتما گاندھی کو بلاشبہ پہلے سے ایمبولنس کے کام سے واقفیت تھی جسے انھوں نے جنگ بوئر کے دوران میں میدانِ جنگ میں حاصل کیا تھا وہ پریڈ کے موقع پر اور بے ضابطہ جلسوں میں بھی اکثر اوقات تقریریں کیا کرتے تھے اور جس انسانی خدمت میں ہم مصروف تھے، اس کی عظمت ہمارے ذہن نشین کرایا کرتے تھے اور درحقیقت یہ وہ شریفانہ فعل ہے جو ذات پات کی قیود سے بالاتر ہے اور جو اسقدر اعلیٰ ہے کہ ہمیشہ ہماری بہترین کوششوں اور توجہات کا مرکز بن سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کے ہمت افزا الفاظ سے ہمیں اپنے کام میں ہمیشہ ترغیب و تحریص ملتی رہتی تھی اور ان کی وجہ سے ہم میدانِ جنگ میں اور زیادہ اہم خدمات بجالانے کے قابل ہوجایا کرتے تھے۔ یہ ہماری ابتدا تھی اس لئے کہ اصل کام وہ تھا جو ہمیں بعد میں میدانِ جنگ میں کرنا پڑا۔

کیمپ میں نہایت سخت ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ہمیں اصل خدمت کا موقع فرانس میں ہندوستانی فوج کے پہونچنے سے چند دن قبل ملا۔ میں اتفاق سے اُس پہلے گروہ میں شامل تھا جو "نیٹلے اسپتال" بھیجا گیا جہاں "رایل وکٹوریہ ہاسپٹل" کا ہندوستانی شعبہ زخمیوں اور بیماروں کے لئے کھولدیا گیا تھا۔ ہمارے پہونچنے کے بعد ہی زخمیوں کی آمد شروع ہوگئی۔

نیٹلے میں ہمارے افسروں میں لفٹنٹ کرنل۔ پی۔ شارمین، میجر آر۔ ایچ نٹ جو حال ہی میں حکومت بمبئی کے سرجن جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں، میجر سی۔ ایل۔ ڈن اور میجر جے۔ ایچ۔ میکڈانلڈ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہز مجسٹی ملک معظم جارج پنجم آنجہانی اور ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ کبھی نیٹلے میں کبھی کبھار بیماروں اور زخمیوں کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آیا کرتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۵ء میں کورس سے استعفا دیدیا تاکہ بارتھولومیو میں اپنے مطالعہ کو ختم کر لوں۔

شریف حسین

ہز مجسٹی شاہ حسین والی حجاز نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے اور جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے اُن سے ملکر بیحد مسرت ہوئی۔

جو ہندوستانی سپاہی "ایجیشن ایکس پیڈیشنری فورس" میں تھے اور مصر، فلسطین، شام اور ٹرکی میں جنگی خدمت بجالا رہے تھے، اُن کی ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ مجھے ۱۹۱۹ء میں حج کی غرض سے حجاز بھیجا گیا۔ میجر سی۔ ایل۔ پورٹر جدہ تک ہماری پارٹی کے انچارج رہے۔ میں اس جماعت کا سینیر میڈیکل آفیسر تھا جو تقریباً ۲ ہزار افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

جدہ میں میں "آفیسر کمانڈنگ" اور "سینیر میڈیکل آفیسر" کے متحدہ عہدہ کے فرائض ادا کر رہا تھا حالانکہ میری پوری ملازمت محض ۳ ½ سال کے قریب تھی۔

مکہ معظمہ کے دروازہ پر ہز رائل ہائنس امیر فیصل نے جو بعد کو عراق کے بادشاہ بنے، ہمارا استقبال کیا۔ اس مقدس شہر میں ہمارے پہونچ جانے کے بعد ہز مجسٹی شریف حسین نے بھی اپنی وزٹ سے ہمیں سرفراز فرمایا۔ حجاز کے دوران قیام میں وزیر جنگ جنرل قسوفی پاشا ہمارے آرام و آسایش کا خیال رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر میزبان ملنا مشکل ہے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے حج کے اختتام پر بادشاہ نے فریضۂ حج کی مسرت بخش تکمیل کی خوشی میں ایک دربار منعقد فرمایا۔ مجھے اور میرے ساتھی افسران کو شاہی خاندان کے افراد یعنی بادشاہ کے چاروں بیٹوں امیر علی، امیر فیصل، امیر عبداللہ (جو آجکل شرق اردن کے بادشاہ ہیں) اور امیر زید کے قریب ہی نشستیں دی گئیں۔

دربار میں ایک عرب نے بادشاہ کی اجازت سے چند اشعار سنائے جو عید الضحیٰ کی مبارک تقریب پر لکھے گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ بعد کو معلوم ہوا، ان اشعار کا تعلق اس تقریب سے مطلق نہ تھا بلکہ وہ کلیتہً بادشاہ کی ذات سے متعلق تھے اور اُن میں شروع سے آخر تک سوائے جھوٹی تعریفوں کے اور کچھ نہ تھا جب نظم پڑھی جاچکی تو عرب شاعر نے اسے نہایت ادب و احترام کے ساتھ آگے بڑھکر بغرض شرف قبولیت خدمت شاہی میں پیش کیا۔

ہز مجسٹی نے اُسوقت تمام حضار دربار پر نظر ڈالی اور میرے ہاتھ میں مصری کوڑا دیکھکر جلدی سے

میری طرف لپکے اور کوڑا چھینکر نہایت بے دردی سے اس عرب کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ہز مجسٹی غصہ سے کانپ رہے تھے مگر اُسے برابر مارتے جا رہے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ "آج کے دن تو نے مجھ جیسے خاطی انسان کی تعریف کرنے کا ناقابل معافی گناہ کیوں کیا حالانکہ یہ دن وہ ہے کہ آج سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی تعریف کا سزاوار نہیں"۔

واپسی پر جب ہم جدہ پہونچے ہیں تو وہاں میری ملاقات ایک مشہور و معروف شخص (کرنل لارنس) سے ہوئی جس کے ساتھ میں بہت دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ بعد کو ہماری دوسری ملاقات شام میں ہوئی۔

عربی زبان میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "سوائے لارنس کے اور کوئی شخص سرپٹ اونٹ پر نہیں چڑھ سکتا"

یہ سچ ہے کہ لارنس سے میری ملاقات صرف دو مرتبہ ہوئی، لیکن اس کی صاف گوئی، سچائی، اور محبت کا میرے دل پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ جب کچھ عرصہ قبل میں نے تکلیف دہ حالات میں اُسکے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کسی عمر بھر کے دوست کا انتقال ہو گیا۔

ضیاءالدین احمد برنی"

جوش کی ایک شاعرانہ لغزش؟

میں جوش صاحب سے واقف نہیں، نہ وہ مجھے جانتے ہیں، اس لئے کسی کا یہ سمجھنا کہ میں نے سطور ذیل ان کی حمایت میں سپرد قلم کی ہیں، سوء ظن کے سوا اور کسی شے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ میرا مقصد ایک خالص ادبی مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے اور بس۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں یورپ سے واپسی کے بعد جب میں لکھنؤ پہونچا تو سب سے پہلے جس چیز کے دیکھنے کی مجھے خواہش ہوئی وہ رسالہ "نگار" تھا۔ جولائی، کا "نگار" میں نے دیکھا۔ اس میں جوش صاحب کی ایک نظم پر جناب نیاز نے تبصرہ کیا ہے اور آخری شعر کی تنقید پورے دو صفحے پر تمام ہوئی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

نگاہ روبرو، اے روح نعمت دارین
ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

نیاز صاحب کا بیان ہے کہ "جناب جوش کو اپنے اس شعر پر بہت ناز ہے اور غالباً ایک اسی شعر کیلئے ساری نظم لکھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ اگر واقعی ان کا یہ پندار صحیح ہو تو بھی اس کا امتیاز انھیں حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اقبال اسی خیال کو بہت پہلے اس طرح ظاہر کرچکا ہے کہ:۔

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ"

نیاز صاحب کا یہ اعتراض تو نفس مضمون کے متعلق ہے۔ اب رہے شعر کے الفاظ۔ اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "سب سے بڑی غلطی جوش نے "یزداں شکار" کی ترکیب استعمال کرنے میں کی ہے۔ انھوں نے اس ترکیب سے وہی مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے جو اقبال کے مصرع سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہاں معنی بالکل اُلٹے ہوگئے۔ جوش سمجھتے ہیں کہ "یزداں شکار" کے معنی "یزداں کو شکار کرنے والے" کے ہیں۔ درانحالیکہ اس کے معنے ہوئے "شکار یزداں" کے یعنی "وہ جسے یزداں نے شکار کیا ہو"۔

جوش کی ترکیب غلط ہونے کے دو بڑے سبب نیاز صاحب نے بیان کئے ہیں:۔

(۱) چونکہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں اور نہ وہ اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اسلئے

اس کے معنی شکار کرنے والے کے کبھی نہیں آتے اور (یزداں شکار) اس معنی میں استعمال کرنا جس میں جوش نے استعمال کیا ہے بالکل غلط ہے۔

(۲) چونکہ شکار اسم ہے اس لئے دوسرے اسم کے ساتھ اس کی نسبت دو ہی صورتوں سے ہو سکتی ہے یعنی صفت و موصوف کی حالت میں یا مضاف و مضاف الیہ کی حالت میں ظاہر ہے کہ یہاں نسبت صفت و موصوف کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لامحالہ مضاف و مضاف الیہ کی نسبت ماننا پڑے گی اور وہ بھی مقلوب اور اس صورت میں "یزداں شکار" کے معنی سوائے "شکار یزداں" کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے جو جوش کے مفہوم و مدعا کا بالکل ضد ہے۔"

نیاز صاحب کا یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شکار اسم ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ کبھی اسم فاعل کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی ترکیبیں اساتذہ کے کلام میں میری نظر سے گزری ہیں لیکن اس وقت کوئی ایسا شعر مجھے یاد نہ تھا جو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا۔ چند روز ہوئے کہ دوران مطالعہ میں اس قسم کے اشعار مجھے مل گئے جن سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ "پیمبر شکار" جس معنی میں جوش نے استعمال کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

امیر خسرو علیہ الرحمہ (جن کی شاعرانہ بزرگی اور زباندانی کو اہل زبان نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ خان شہید بن سلطان غیاث الدین بلبن نے جب ان کا کلام شیخ سعدی کو بھیجا تو شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے لائق ہے۔[1] دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ شعراء میں لکھا ہے کہ امیر بایسنغر امیر خسرو کے خمسہ کو نظامی کے خمسہ پر ترجیح دیتے تھے۔) اپنی مشہور مثنوی "آئینۂ سکندری" میں جہاں سکندر کی بزم آرائی کی تصویر کھینچی ہے، خوبان بزم کی تعریف یں کہتے ہیں:

صنوبر قدانے چو گلنار تر ، برخسارہ خوں کردہ گل را جگر
ہمہ نازپرور دو نازک خرام ، مہ نیمہ و آفتاب تمام،
مسلسل بسے دل بگیسوئے شاں ، معلق جہانے بہر موئے شاں
نہفتہ بعجز گل خویش را ، نظر بستہ چشم بد اندیش را
بہر بازی از نرگس پر خمار ، خدنگ افگنان و فرشتہ شکار

ظاہر ہے کہ آخری شعر میں "فرشتہ شکار" کی وہی ترکیب ہے جو جوش کے شعر میں "پیمبر شکار" کی ہے

---

[1] شعر العجم شبلی۔ جلد دوم۔ تذکرہ شیخ سعدی۔

اور خسرو نے "فرشتہ شکار" کے معنی فرشتہ کو شکار کرنے والے ہی کے لئے ہیں، جو نیاز صاحب کے نزدیک "بالکل غلط" ہے۔

اگر کسی کے نزدیک قواعد صرف و نحو کی رو سے یہ ترکیب صحیح نہیں تو صرف و نحو کے وہ قواعد انہی کو مبارک رہیں۔ جوش کے لئے طوطی ہند کے کلام سے استناد کرنا بالکل کافی ہے۔ اور اس مثال کے بعد کسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم تلاش و جستجو سے اس قسم کے اور شواہد بھی مل سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی استاد کا شعر ہے:-

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

حسنِ اتفاق سے اس شعر میں خود "پیمبر شکار" موجود ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو جوش نے سمجھے ہیں یعنی "پیمبر کو شکار کرنے والا"۔ غالباً اس مثال کے بعد نیاز صاحب کو جوش کی غلط فہمی پر اصرار نہ ہوگا اور وہ تسلیم کر لیں گے کہ جوش نے یزداں شکار کی ترکیب استعمال کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔

"پیمبر شکار" کے علاوہ اس شعر میں ایک اور مرکب "فرشتہ صید" بھی موجود ہے جس کی ترکیب پیمبر شکار جیسی ہے اور جس کے معنی فرشتہ شکار یا فرشتہ کو شکار کرنے والے کے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ "شکار" کے علاوہ "صید" بھی ایک ایسا لفظ ہے جو شکار کی طرح اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کیا عجب کہ تلاش سے اس قسم کی اور مثالیں بھی دستیاب ہو جائیں۔

نیاز صاحب کا خیال ہے کہ جوش کا زیر بحث شعر اقبال کے اس مصرعہ سے ماخوذ ہے:-

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

یہ قیاس صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بظاہر خود اقبال نے یہ خیال فارسی کے اس شعر سے لیا ہے:-

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار یزداں گیر

"پیمبر شکار" اور "یزداں بکمند آور" میں اتنا قریبی تعلق یقیناً نہیں ہے جتنا "یزداں گیر" اور "یزداں بکمند آور" میں ہے۔ لہٰذا اگر یہ مضمون جوش کا زادۂ طبیعت نہیں تو اقبال کو بھی اس کی مالکیت کا حق نہیں پہنچتا۔ اگرچہ خود میرے نزدیک یہ بالکل ممکن ہے کہ جوش اور اقبال دونوں میں سے کسی ایک نے بھی کہیں سے اخذ نہ کیا ہو بلکہ وہ صورت واقع ہوئی ہو جسے اصطلاح میں توارد کہتے ہیں۔

عندلیب شادانی

(نگار) یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی کا ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اور ان زبان کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

نقد "شکار" کے اس مخصوص طریق استعمال کے جواز میں امیر خسرو یا کسی اور ہندی شاعر کے کلام سے سند پیش کر دینا، ممکن ہے ان کے لئے باعث اطمینان ہو، لیکن میں کسی غلطی کو اس لئے کبھی صحیح نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ایک سے زاید آدمیوں نے کی ہے۔ غلطی ہمیشہ غلطی رہے گی خواہ اس کا مرتکب کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو۔

کسی ترکیب یا لفظ کے صحیح استعمال کا علم صرف دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک یہ کہ اس زبان کی لغت اور قواعد سے مدد لی جائے یا پھر یہ کہ مستند اہل زبان کے کلام میں جستجو کی جائے۔ از روئے لغت و قواعد تو ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی اس کی غلطی کے قایل ہیں، رہا اہل زبان کے کلام سے استناد سو افسوس ہے کہ وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔

امیر خسرو کے علم و فضل سے کسی کو انکار نہیں اور فارسی دانی کے لحاظ سے ان کا وہ مرتبہ ہے جو ہندوستان میں اس وقت تک کسی کو حاصل نہیں ہوا، لیکن وہ اہل زبان یقیناً نہ تھے اور "فارسی محاورہ" کے استعمال کے باب میں ہندی نژاد ہونے کی حیثیت سے ان کا کلام بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

میں اپنی غلطی و لغزش تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہوں بشرطیکہ مجھے کوئی سمجھا دے، البتہ غلط کو صحیح باور کر لینے کی یہ وجہ کہ کسی اور بڑے شخص نے بھی یہ غلطی کی ہے، میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی اور نہ آئے گی۔ شاعری میں ایک عنصر معنی کا ہوتا ہے، دوسرا الفاظ و محاورات کا۔ پھر جس حد تک معنی کا تعلق ہے اس میں عرب و عجم، ایران و ہندوستان کی قید نہیں ہر شخص دوسرے سے بڑھ جانے کا مدعی ہو سکتا ہے، لیکن جب سوال زبان کا آئے گا تو اہل زبان کے مقابلہ میں، غیر اہل زبان کی اپج کو رد کرنا ہی پڑے گا۔

مثلاً اقبال کو لیجئے کہ معانی کے لحاظ سے ان کی فارسی شاعری کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ایران میں اس وقت کوئی ان کا مقابل نظر نہیں آتا، لیکن زباندانی کے لحاظ سے نہ اقبال نے کبھی اس پر فخر کیا اور نہ اس باب میں ان کا کوئی شعر سنداً پیش کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کو لیجئے کہ خود ہندوستان کے اندر کیسے کیسے ماہر اس کے موجود ہیں، اور کیسی کیسی بلند پایہ تصانیف ان کی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی یہ عظمت محض مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہے جس وقت صحت زبان کا کوئی جھگڑا پیدا ہوگا تو استناداً انگلستان ہی کے کسی مصنف کا کلام پیش کیا جائیگا۔

یہی حال خسرو کا تھا کہ اپنی غیر معمولی ذہانت سے انھوں نے فارسی کیا، عربی و بھاشا میں بھی شاعری کی، لیکن کیا آپ کسی اہل عرب یا ہندی نژاد شاعر کے سامنے ان کا کلام رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں

کہ خسرو کی عربی زبان اور ہندی بھاکھا کا مرتبہ وہی ہے جو تمھاری زبان کا۔

امیر خسرو کے باپ ترک تھے ایرانی نہ تھے، ماں بھی ان کی ہندی تھیں، ایرانی نہ تھیں وہ خود پیدا ہوئے یہیں اور کبھی ایران میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا، اس لئے ان کے کلام کو فارسی زبان کی صحت میں استناداً پیش کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مفہوم و معنی کی بلندی اور تنوع کلام کے لحاظ سے ان کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ ہندوستان کیا ایران و عرب میں بھی کوئی ان کا مثل مشکل سے پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ان کا کلام غلطیوں سے پاک تھا (اور غلطیاں بھی زبان کی!) تو معاف فرمائیے میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ امیر خسرو جب خود اپنے کلام پر نگاہِ انتقاد ڈالتے ہیں تو ان کو متعدد غلطیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان کا اعتراف بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:۔ چوں پسرو طرزِ سرودم پس شاگردم نہ اوستادم۔ لیکن ہمارے فاضل مقالہ نگار اس باب میں امیر خسرو کے کہنے پر بھی اعتماد نہیں کرسکتے، اور اسے خسرو کی شاعرانہ انکساری تصور فرماتے ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم نے امیر خسرو کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس میں کلام نہیں کہ نہایت ہی حُسن ظن سے لکھا ہے (اور اس میں شک نہیں کہ خسرو کی مجمع کمالات ذات اسی حسنِ ظن کی مستحق تھی) تاہم وہ بھی اتنا لکھنے پر مجبور ہو ہی گئے کہ:۔

لیکن لغزشیں کون بتائے، یہ کس کا منھ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں "کہ بعض کلام میں لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی ہے اور بعض جگہ بالکل تکلف و آورد ہے"

مولٰنا شبلی کا دبی زبان سے یہ کہنا ہی سب کچھ کہہ ڈالنا ہے اور اگر وہ قدامت پرست طبقہ کے انسان نہ ہوتے اور خیال کی آزادی انھیں رائے عامہ سے زیادہ عزیز ہوتی، تو شاید وہ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بتا سکتے کہ خسرو کے یہاں کیا کیا اور کس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

میں خود خسرو کا بڑا مداح ہوں اور ان کو ہندوستان کا بہترین شاعر سمجھتا ہوں لیکن یہ حُسن ظن ان کی طرف کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی میں نے قایم نہیں کیا کہ ان کا کلام یکسر اغلاط سے پاک ہے یا یہ کہ اگر کوئی غلط بات ان کی زبان سے نکل جائے تو میرا فرض ہے کہ اسے صحیح سمجھوں۔

اگر ہمارے دوست بجائے خسرو کے حوالہ دینے کے خود اپنی ذاتی رائے کی بنا پر اس ترکیب کی صحت کا دعویٰ کرتے تو میں زیادہ قدر کرتا کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے

[redacted]

ہیں تقلید نہیں ہے بلکہ اجتہاد ہے استمساک بالغیر نہیں بلکہ اعتماد علی النفس ہے، لیکن ان کے منہ سے یہ سنکر کہ "طوطی ہند کے کلام سے استناد کرنا کافی ہے اور اس کے بعد کسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی" مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ افسوس اس لئے کہ ہم لوگوں کی یہ مرعوب ہو جانے والی ذہنیت مذہب سے گزر کر اب ادبیات تک پہونچ گئی ہے اور حیرت اس لئے کہ یہ بات ایسے شخص کے منہ سے نکلی ہے جو عرصہ تک آزادی فکر و خیال اور حریت رائے وضمیر کی پرستش کرنے والے ملک میں زندگی بسر کر چکا ہے۔

ہمارے عزیز دوست نے استناداً ایک شعر اور پیش کیا ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلا سکے کہ کس کا ہے۔ اگر یہ شعر واقعی کسی مستند ایرانی شاعر کا ہے تو بیشک مجھے اس ترکیب کی صحت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، لیکن تاوقتیکہ اس کا اطمینان نہ ہو جائے مجھے حق حاصل ہے کہ اپنی رائے پر بدستور قایم رہوں۔

مجھے امید ہے کہ جناب شاد آنی اپنی جستجو کو برابر جاری رکھیں گے اور اگر کوئی شعر واقعی قابل استناد نظر آ جائے تو مجھے مطلع فرمائیں گے لیکن یہ پھر عرض کروں گا کہ جستجو کا میدان ایران ہی ہو اور ایران میں بھی وہ طبقہ جو واقعی زبان کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی یا اسی قسم کی اور تصانیف سے اگر کوئی استناد انھوں نے پیش کیا تو وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

خدا کا انصاف

(ڈرامہ)

ان فتاوی کی بنا پر جو اکابر علمار اسلام نے مدیر نگار کے استفتا پر
تحریر فرمائے تھے اور جنوری ۱۹۳۱ء کے نگار میں شایع ہوئے تھے

استفتا، کا مفہوم یہ تھا:-

"ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہے لیکن زندگی اسکی مکروفریب میں بسر ہوتی ہے۔ دوسرا کافر برہمن ہے جو رات دن مورتیوں کی پوجا پاٹ کرتا ہے لیکن اخلاق کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ انسان ہے - ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری"

اس استفتا کی نقلیں ۳۲ علما کرام کو بھیجی گئی تھیں، جن میں سے سولہ نے جواب دیا- ان پر انتقادی نظر ڈالتے ہوئے میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جو یہاں درج کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ علمار اسلام کا نظریہ نجات کیا ہے :-

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے، تو انکو چار علحدہ علحدہ قسموں میں جدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی، دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہو اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اعتراف کرتی ہے -

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف ایک مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے، کیونکہ نہ انھوں نے جواب میں اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا جس سے کچھ سراغ چل سکتا لیکن شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ لفافہ کے اوپر ڈاک خانہ ایک مہر بھی ثبت کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے

کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پتہ چلنا مشکل تھا کہ یہ کس بزرگ کی تحریر ہے، کب لکھی گئی اور کہاں سے آئی؟

اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ:-

"سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے!! مولانا نے غالب کے انداز میں کوئی ادق شعر تصنیف فرمایا ہے جس کے بعض درمیانی حصے متروک محذوف ہیں۔ اور اپنے نزدیک ایسا مسکت جواب دیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی بلیغ جواب فریق ثانی کو اس درجہ تکمیل کے ساتھ ساکت کر سکتا ہو۔

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ اس استفسار یا استفتا پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قایم ہونا چاہئے اور ان تنقیحوں کے قایم کرنے میں انھیں تکلف ہے، تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے، کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا یہی وہ "نادک فرمائی" ہے، جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی، لیکن اب "حطیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسایل روزہ نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے۔ جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو کی طرح ڈالنے والا ہو۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جو بہ سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے:-

"قاضی صاحب بھوپال، مفتی صاحب رام پور، مفتی صاحب حیدرآباد، مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند، مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ، مولانا محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب دہلی، مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ، مولانا محمد عبدالعزیز صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب"۔

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے بہرحال اُسے ناجی ہونا ہے۔ بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بُت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے — غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے اس کا علم مالک الملک کو ہے۔

اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہو کہ ان ناری ہو اور کون ناجی۔

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ :-

" دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اُس " لیکن " پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

افراد ڈرامہ

طاہرہ - ایک نوجوان لڑکی

بلقیس - ایک جوان عورت

حسیب الدین - ایک مرد

سداشُکھ - برہمن

ضرغام الدین ،، ایک مسلمان پیر

کتبائیل - فرشتۂ حساب کتاب (فرضی نام)

میکائیل - فرشتۂ میزان (فرضی نام)

(میدان حشر، دوپہر کا وقت، آفتاب سوا نیزے بلند۔ آدمیوں کا مضطرب ہجوم - ہر طرف شور و ہنگامہ - ایک بلند ٹیلے پر میزان عدل قایم ہے اور میکائیل آبنوسی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ قریب ہی کتبائیل دوسری کرسی پر متمکن ہیں پشت پر سیکڑوں ماتحت فرشتے قسم قسم کے آلات ضرب لئے ہوئے کھڑے ہیں سامنے کروروں انسان اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے ہوئے برہنہ سر، برہنہ پا، گریباں چاک، پریشاں حال، سر سے پاؤں تک پسینے میں غرق، بدحواس منہ کھولے کبھی فرشتوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی میزان عدل کو۔)

ایک غیبی مہیب آواز ——— " سداشُکھ حاضر ہے"

(آواز کی ہیبت سے ہر شخص کانوں میں اُنگلی دے لیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد مجمع کو چیرتا پھاڑتا ایک معمر انسان پھٹی ہوئی دھوتی اور تار تار کرتے میں نمودار ہوتا ہے، مونچھیں بڑی بڑی، داڑھی منڈی ہوئی، سر صاف لیکن چند بال پر ایک لمبی چوٹی - پیشانی پر مٹے ہوئے قشقہ کا نشان، بائیں ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ جو سیاہی سے لپا ہوا ہے)

کتبائیل ۔ (بلند غضبناک آواز سے)، ادھر آ، سامنے

(سدا سکھ کانپتا، لرزتا آگے بڑھتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

کتبائیل ۔ (اور زیادہ کرخت آواز سے) اپنا نام بتا،

سداسکھ ۔ (کانپتے ہوئے) مجھے سداسکھ کہتے تھے

کتبائیل ۔ (ہونہہ) تو مسلمان تھا یا ہندو

سداسکھ ۔ حضور خود جانتے ہیں کہ میں کیا تھا

کتبائیل ۔ (جبیں بہ جبیں ہو کر) مردود، ہم تو جانتے ہی ہیں تو کیا تھا، لیکن ہم تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں، خود تجھ سے تیرے کفر کا اعتراف چاہتے ہیں۔ بول،

سداسکھ ۔ (ہاتھ جوڑ کر) سرکار، تھا تو میں ہندو ہی

کتبائیل ۔ تو کسکی پرستش کرتا تھا،

سداسکھ ۔ بھگوان کی۔

(لا حول! لا قوۃ کا ایک شور فرشتوں کی صفوں سے بلند ہوتا ہے اور ان کے نتھنوں سے خود بخود چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں)

کتبائیل ۔ یہ کون تھا، جس کی تو اس کی پرستش کیا کرتا تھا۔

سداسکھ ۔ یہ خدا تھا، خدا کا ایک نام تھا میری زبان میں

کتبائیل ۔ (طعن آمیز لہجہ میں) خدا کا نام تھا! تیری زبان میں! ، ہونہہ۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خدا کے نو دو نہ ناموں میں یہ نام بھی شامل تھا اور کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ سوائے عربی زبان کے کسی اور زبان میں خدا کا نام لینا ناجائز قرار دیدیا گیا تھا۔

سداسکھ ۔ میں عرب میں پیدا نہ ہوا تھا اس لئے نہ میں عربی زبان سے واقف تھا اور نہ خدا کے "نو دو نہ" ناموں سے، میرے مکان کے پاس ایک مسلمان مولوی صاحب رہتے تھے۔ وہ ضرور مجھ کو کبھی کبھی سمجھایا کرتے تھے کہ بھگوان کا نام نہ لیا کرو یہ کفر ہے، "اللہ اللہ" کہا کرو۔

کتبائیل ۔ (حیرت و غصہ سے) اور پھر بھی تو نے کہنا نہ مانا، حد ہے تیرے کفر کی۔ اچھا تو مسلمان مولوی کی اس نصیحت کا کیا جواب دیتا تھا

سداسکھ ۔ کچھ نہیں، یہی کہ خدا کا کوئی نام نہیں، جس نام سے پکارو وہ سن لیتا ہے، وہ سب کا مالک ہے، ہندو بھی اسی کے بندے ہیں اور مسلمان بھی، یہ جھگڑے صرف اسی دنیا کے ہیں،

وہاں صرف کام پوچھا جائے گا، نام نہیں۔

(کتبائیل اور کیائیل ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

کتبائیل ۔ (ہونہہ) اچھا اگر تو بھگوان کو خدا ہی سمجھ کر پکارتا تھا تو پھر مندر میں جاکر پتھروں کی پوجا کیوں کرتا تھا، کیا تو انھیں خدا نہ سمجھتا تھا۔

سدا سکھ ۔ میں نے پتھر کی مورتیوں کو خدا سمجھ کر کبھی ان کی پوجا نہیں کی، بلکہ صرف دھیان گیان کے لئے ایک ٹھکانا بنا لیا تھا تاکہ خیال اِدھر اُدھر نہ بٹے۔

کتبائیل ۔ کیا مسجد میں جاکر تو دھیان گیان نہ کرسکتا تھا، کیا خدا کی یاد وہاں ممکن نہ تھی؟

سدا سکھ ۔ اُن مولوی صاحب نے بھی مجھ سے ایک دفعہ یہی بات کہی تھی،

کتبائیل ۔ پھر تو نے کیا جواب دیا۔

سدا سکھ ۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب اس کے جواب میں میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں کہ کیا مندر میں خدا کی یاد نہیں ہوسکتی۔ محراب کے سامنے سجدہ میں گر کے اللہ اللہ کرنا اور مورتیوں کے آگے جھک کر بھگوان نام جپنا ایک ہی ہے۔ میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ پتھر کا عبادت کے درمیان میں آجانا ہی بُرا ہے تو پھر آپ لوگ کیوں حج میں حجرِ اسود کو چومتے ہیں۔ یہ سنکر وہ مرنے مارنے کو طیار ہوگئے اس لئے میں چپ ہوگیا اور اُن سے معافی چاہ لی۔

کتبائیل ۔ اللہ ری، تیری دیدہ دلیری کہ تو نے مقدس حجرِ اسود کا ذکر اپنی ناپاک زبان سے کیا اور اپنی مورتیوں کے ساتھ اس کو ملا دیا۔ خیر معلوم ہوگیا کہ تو ازلی کافر و مشرک ہے اور اس کا خود تو نے اقرار کیا۔ اب یہ بتا کہ تو نے اپنی دنیاوی زندگی کس طرح بسر کی۔

سدا سکھ ۔ صبح پوجا کرکے کھیت پر چلا جاتا تھا، وہاں ہل چلاتا تھا، غلہ بوتا تھا، کاٹتا تھا، اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ محنت کرکے پالتا تھا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی کو ستایا نہیں سب کے درد دکھ میں شریک رہا، جو خدمت مجھ سے ہوسکتی تھی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ قرض کبھی کبھی ضرور لیتا تھا لیکن ادا بھی کردیتا تھا، البتہ ایک قرض ادا نہ ہوسکا میں بیمار تھا اور میری بیوی نے اپنا ایک زیور بیچ کر میرا علاج کیا تھا، میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تیرا یہ قرض ضرور ادا کردوں گا، لیکن افسوس ہے کہ میں اسی بیماری میں مرگیا اور یہ بار میرے سر رہ گیا، اگر وہ معاف کردے گی تو خیر ورنہ اس کی جو سزا چاہے مجھے دیجائے حاضر ہوں۔

کتبائیل ــ جو کچھ تو نے بیان کیا اس کا کیا ثبوت ہے۔
سداسکھ ــ ساری دنیا سامنے موجود ہے، آپ خود پوچھ لیجئے کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہو یا نہیں
(ایک خلا شگاف آواز بلند ہوتی ہے کہ "سداسکھ کے خلاف جس کو جو کچھ کہنا ہے سامنے آئے"۔ دیر تک اس کی گونج قایم رہتی ہے اور پھر اس کو دہرایا جاتا ہے، لیکن کوئی شخص سامنے نہیں آتا)

کتبائیل ــ (کافی انتظار کے بعد) اپنا نامۂ اعمال کھول اور پڑھ اس میں کیا لکھا ہے۔
سداسکھ ــ (نامۂ اعمال کھولکر غور سے دیکھتے ہوئے) یہ تو بالکل سیاہ ہے اور سوائے کفر و شرک کے اور کچھ اس میں نظر ہی نہیں آتا۔
کتبائیل ــ (ماتحت فرشتوں سے خطاب کرکے) لیجاؤ اس کو میزان عدل کی طرف۔
(چند فرشتے آتے ہیں اور دھکا دیتے ہوئے اسے کیکائیل کی طرف لیجاتے ہیں)

(۲)

(وہی منظر، وہی مقام اور وہی وقت)

غیبی آواز ــ ضرغام الدین حاضر ہے۔

(ضرغام الدین ۔ ادھیڑ عمر کے آدمی ۔ لمبی داڑھی ۔ مونچھ منڈی ہوئی ۔ پیشانی پر چمکتا ہوا نشان سجدہ کا ۔ بائیں ہاتھ میں جریب، داہنے میں نامۂ اعمال لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

کتبائیل ــ "تمہارا کیا نام ہے"

(مجمع میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اور متعدد مرد عورت لوگوں کو چیرتے پھاڑتے سامنے آتے ہیں)

سب ــ (ایک آواز سے) انصاف، انصاف،
کتبائیل ــ ہائیں، یہ کیا ہنگامہ ہے تم لوگ کیا چاہتے ہو،
سب ــ (ایک آواز سے) ہم انصاف چاہتے ہیں اور ضرغام الدین کے خلاف۔
کتبائیل ــ (تعجب سے) ضرغام الدین ۔ مولوی ضرغام الدین کے خلاف ۔ وہ شخص جس نے کبھی ایک وقت کی نماز قضا نہیں کی، جس نے کبھی ایک روزہ ترک نہیں کیا، جس نے اپنی عمر میں پچیس حج کئے اور ہر سال متعدد قربانیاں کیں

ب ۔ "ہاں، ہاں اسی کے خلاف"

کتبائیل ۔ اچھا، تو ہر شخص علٰحدہ علٰحدہ کہے جو اسے کہنا ہے

(ایک عورت آگے بڑھتی ہے)

عورت ۔ میرا نام طاہرہ ہے، میرا باپ ضرغام الدین کا مُرید تھا اور خاصہ دولتمند آدمی تھا، میں اس کی اکلوتی بیٹی تھی، میرے باپ کو یہ ہر سال اپنے ساتھ حج چلنے کی ترغیب دیا کرتا تھا، لیکن وہ کسی نہ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکتا تھا۔ جب وہ بہت ضعیف ہو گئے تو اس خیال سے کہ معلوم نہیں آیندہ سال تک جیوں یا مروں، اس نے اس مولوی سے کہا کہ "میں امسال آپ کے ساتھ جانے کے لئے طیار ہوں" اس نے سوچکر کہا کہ اچھا تو اس مرتبہ تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا کیونکہ میں نے رات کو خواب دیکھا ہے کہ آنحضرت سرور کائنات تخت پر تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں کہ نور محمد کو میرے پاس بھیجدو۔ میں نے عرض کیا حضور مجھے بھی حاضری کی اجازت ہو، ارشاد ہوا کہ نہیں تم وہیں رہو اور نور محمد کے گھر کی حفاظت کرو" سو بھئی میرا جانا تو ناممکن ہے اور تمہارا ٹھہرنا کسی طرح درست نہیں۔ میرے باپ نہایت جاہل سیدھے شخص تھے وہ یہ خواب سنکر مسرت سے اچھل پڑے اور اسی دن سے اپنے جانے کی طیاریاں شروع کر دیں۔ چونکہ میری ماں کا کئی ... کا زیور موجود تھا اور گھر میں کوئی دوسرا محافظ نہ تھا اس لئے وہ چلتے وقت زیور اور نقدی ... مال کو اس مولوی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں واپس نہ آ سکوں تو میری بیٹی کو دیدیا جائے۔

(کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی اور سارے مجمع کی نگاہیں ضرغام الدین پر پڑنے لگیں جو خاموش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے)

کتبائیل ۔ "پھر کیا ہوا"

طاہرہ ۔ جب میرا باپ حج کے بعد واپس نہ آیا تو مجھے فکر ہوئی کہ کیا بات ہے، ضرغام الدین سے کئی بار پوچھا اس نے یہ کہکر ٹال دیا کہ آتا ہوگا، آخر کار میرے محلہ کا ایک آدمی کچھ عرصہ کے بعد واپس آیا اور میرے باپ کے دو خط لایا ایک میرے نام کا اور دوسرا ضرغام الدین کے نام۔ میرے خط میں لکھا تھا کہ میں بیس دن سے بیمار ہوں اور مجھ میں کوئی حالت باقی نہیں رہی اگر یہ خط تمھیں ملے تو سمجھ لینا کہ میں مر گیا اور اپنا زیور پیر صاحب سے لیکر کسی مناسب جگہ جہاں تم پسند کرو شادی کر لینا۔ اپنے پیر کو بھی اس نے یہی لکھا تھا کہ زیور میری لڑکی کو دیدیا جائے

کتبائیل — (بات کاٹ کر) پھر زیور تجھے ملا یا نہیں

طاہرہ — اسی سے پوچھئے کہ وہ کس شرط پر زیور دینا چاہتا تھا۔

کتبائیل — کیا شرط تھی۔

طاہرہ — کہتا تھا کہ میرے ساتھ شادی کر لو

کتبائیل — پھر تو نے شادی کی یا نہیں

طاہرہ — نہیں

کتبائیل — کیوں

طاہرہ — مجھے اس کی صورت پسند نہ تھی، اس کی سیرت سے نفرت تھی، میں جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اسکی بیوی موجود ہے اور یہ کس کس طرح اس کو تکلیفیں پہونچاتا ہے، میں سمجھتی تھی کہ صرف زیور کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ گھر سے نکال دیگا پھر سو بات کی ایک بات یہ کہ یہ بڈھا کھوسٹ تھا اور میری عمر زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی تھی

کتبائیل — "پھر کیا ہوا"

طاہرہ — یہ ہوا کہ اس نے زیور دینے سے انکار کر دیا اور میں اس صدمہ سے بیمار ہو کر دق میں مبتلا ہو گئی اور اپنے باپ کے مرنے کے چھ مہینے بعد ہی اس مولوی کو دعائیں دیتی ہوئی دُنیا سے رخصت ہو گئی۔

کتبائیل — (ضرغام الدین سے) کیوں کیا کہتے ہو۔ کیا اس عورت کا بیان صحیح ہے۔

(ضرغام الدین خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا)

کتبائیل — کوئی فریادی اور ہے؟

ایک نوجوان — (آگے بڑھکر) حضور، میں بھی ایک فریاد لایا ہوں۔

کتبائیل — کہو کیا کہتے ہو

نوجوان — میرا نام حبیب الدین ہے، میں ہندوستان کی خلافت کمیٹی کا سکرٹری تھا اور مولانا ضرغام الدین کمیٹی کی طرف سے دورہ کرنے برما بھیجے گئے تھے وہاں ان کو سیٹھ جمال نے دس ہزار روپیہ کے دس نوٹ دئے لیکن انھوں نے واپس آکر داخل نہیں کئے اور نہایت افسوسناک لہجہ میں بیان کیا کہ رنگون میں کسی نے جیب سے نکال لئے۔ میں نے سیٹھ جمال سے نوٹوں کے نمبر منگوائے اور خفیہ جانچ کی تو معلوم ہوا کہ اس شخص نے وہ تمام

نوٹ ایک ایک کر کے اپنے وطن میں بھناتا اور ایک پختہ مکان اسی رقم سے طیار کرایا چنانچہ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس سے خیانت کا مواخذہ کیا جائے اور جو حویلی اس نے طیار کی تھی اس کے گلے میں ڈالدی جائے تاکہ اس کے بوجھ سے یہ ہر وقت پستا اور کراہتا رہے۔

کتبائیل — (خاموش) سزا کی تجویز کسی بندہ کا کام نہیں، اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسکو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ (بلند آواز سے، اور کسی کو کچھ کہنا ہے۔

ایک عورت۔ (آگے بڑھکر) مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔

کتبائیل — بول، کیا کہتی ہے۔

عورت — میرا نام بلقیس ہے، میرا شوہر اس کام پر تھا اور فرشتہ سے کم معصوم اسے نہ سمجھتا تھا۔

کتبائیل — (فرشتہ کے ساتھ معصومیت کی نسبت سنکر تیز نگاہوں سے میکائیل کی طرف دیکھتے ہوئے) تو کیا یہ فرشتوں کی طرح معصوم نہ نکلا۔

عورت — فرشتوں کی معصومیت کا حال تو مجھے دنیا میں کبھی معلوم نہ تھا اور یہاں بھی اس کا کوئی تجربہ ابھی تک نہیں ہوا۔

پہلے آپ میری پوری بات سن لیجئے، پھر خود فیصلہ کیجئے گا کہ وہ آپ سے زیادہ معصوم تھا یا آپ اس سے زیادہ معصوم ہیں۔

کتبائیل — (خشونت کے ساتھ) جلدی کہہ جو کچھ کہنا ہے۔

عورت — مجھے اماں نے کہنے دیجئے، تو سنیے۔ فرشتوں کے پیارے چہروں کے لئے یہ چیز موزوں نہیں۔ ہاں، تو اس نے پہلے مجھ سے کہا "چلو تمہیں بھی پیر صاحب کے پاس لے چلوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس کو زیارت کرا دو۔" میں محلہ کی عورتوں سے پیر صاحب کا سارا حال سن چکی تھی اس لئے ڈر رہی تھی لیکن اپنے شوہر کے اصرار سے مجبور ہو گئی۔ آخر کار ایک دن بعد نماز عشا ہم پہنچے۔ یہ لوگ ہم کو حجرہ کے اندر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ پیر صاحب لیٹے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی سبحان اللہ سبحان اللہ کی تسبیح پڑھنے لگے اور بولے تیرا کیا نام ہے۔

شرم کے مارے میں پسینے پسینے ہوئی جاتی تھی اور سمٹی ہوئی پیچھے سرکتی جا رہی تھی اور

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پھر پوچھا اور ذرا سخت لہجہ میں میں نے بادلِ نخواستہ نام بتایا، وہ اُٹھ بیٹھے اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ہاتھ باہر نکال، میں آج تجھے اپنے حلقہ میں داخل کرتا ہوں۔ میرا شرم کے مارے بُرا حال تھا کیونکہ اسی دن میں نے مہندی لگائی تھی اور اس کی سرخی چیز بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ادھر سے پھر اصرار ہوا اور مجبوراً اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میں نے آگے بڑھا دیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ کو فوراً دبوچ لیا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے جاتے تھے اور میرا ہاتھ مسلتے جاتے تھے، ہاتھ مسلتے جاتے تھے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، سر جھکا لیا اور غیرت و شرم سے مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

آدھ گھنٹہ کے بعد جب میرے ہاتھ کی حالت بالکل نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح ہو گئی تو اسے چھوڑ دیا اور میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھا کر دونوں شانے پکڑ لئے، میں نے چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن اول تو وہ گرفت ایسی نہ تھی کہ میں آسانی سے پیچھا چھڑا لیتی اور دوسرے یہ کہ جاتی بھی تو کہاں، آگے یہ شیطان تھا اور پیچھے دیوار، حجرہ کا دروازہ بند تھا اور میرے احمق شوہر مجھ سے دور گھر میں بیٹھے "دعائے گنج العرش" پڑھ رہے تھے۔ میں نے مجبوراً اسے بھی برداشت کیا لیکن جب اس کے ہاتھ شانے سے ہٹ کر نیچے سینہ کی طرف پہونچنے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں کھڑی ہو گئی اور جتنی گالیاں میں دے سکتی تھی سب سُنا دیں۔

جب گھر واپس آئی تو میرا بُرا حال تھا اور میرے شوہر ہنوز وظیفہ میں مصروف تھے۔ میں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ سارا ماجرا کہہ دوں لیکن یہ سمجھ کر کہ اسے کبھی یقین نہ آئے گا، خاموش ہو رہی اور پھر کبھی نہیں گئی۔ اس کو میرے شوہر نے انتہائی گستاخی سمجھ کر مجھے بُرا بھلا بھی کہا، اور مارا بھی لیکن میں نے اس طرف کا رخ پھر کبھی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ میرے اور شوہر کے درمیان مغایرت بڑھتے بڑھتے نفرت میں تبدیل ہو گئی اور آخرکار ایک دن اس نے اسی شیطان کے کہنے سے مجھے طلاق دیدی اور میری معصوم بچی مجھ سے چھین کر مجھے باہر نکالدیا میرے ماں باپ غریب تھے وہ بھی صبر کر کے بیٹھ رہے اور میں اپنی بچی کو یاد کرتے کرتے ایک سال کے اندر ہی ختم ہو گئی۔

کتبائیل ــ (ضرغام الدین سے مخاطب ہو کر) کیوں تمھارا کیا جواب ہے۔

(ضرغام الدین بدستور خاموش رہا)

کتبائیل ــ (بلند آواز سے) کوئی اور فریادی؟

(دفعتہً متعدد آدمی آگے بڑھنے لگے اور یہ کشمکش خطرناک صورت اختیار کرنے لگی)

کتبائیل ــ (یہ ہنگامہ دیکھ کر) اچھا، اب میں کسی کی فریاد سننا نہیں چاہتا، کیونکہ نجات کا تعلق ان باتوں سے نہیں ہے بلکہ صرف معتقدات سے ہے اور اس لئے میں سب سے پہلے اسی مسئلہ کو طے کرنا چاہتا ہوں۔ (ضرغام الدین سے)۔ بولو تمھارا مذہب کیا تھا۔

ضرغام الدین ــ "اسلام"

کتبائیل ــ تم خدا کو ایک سمجھتے تھے۔

ضرغام ــ ایک بالکل ایک۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ

کتبائیل ــ انبیاء و رسل کے قایل تھے

ضرغام ــ ایسا قایل کہ بغیر ان کا نام لئے ہوئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔

کتبائیل ــ تم کتب سماوی، حیات بعد الموت، عذاب قبر، منکر نکیر، برزخ، حشر و نشر، دوزخ و جنت کو برحق جانتے تھے۔

ضرغام ــ برحق نہ جانتا تو آج باوجود اتنی سیاہ کاریوں کے نجات کی طرف سے مطمئن کیونکر ہو سکتا تھا۔

کتبائیل ــ تم کو اس میں کوئی شک تو نہ تھا کہ حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں اور شیطان کے دھوکے میں آکر انھوں نے گیہوں کھایا اور جنت سے نکالے گئے۔

ضرغام ــ شک کیسا؟ میں نے تو اپنی ساری زندگی اسی افسوس میں بسر کر دی کہ اگر آدم و حوا سے یہ غلطی نہ ہوتی تو عدن میں چین سے پڑے پڑے ہر وقت میوے نہ کھایا کرتے۔

کتبائیل ــ کیا تم، نبی آخر الزماں کے معجزۂ شق القمر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

ضرغام ــ نبی آخر الزماں تو خیر رسول خدا تھے میں تو امت محمدی کے ہر ہر ولی کو صاحب کشف و کرامات جانتا تھا اور دور کیوں جائیے خود مجھ سے بھی بعض کرامتیں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

کتبائیل ــ طوفان نوح، کے بابت تمھارا کیا عقیدہ تھا

ضرغام ــ یہی کہ وہ ایک بڑھیا کے تنور سے اُٹھا اور سوائے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے سب کو ڈبو دیا۔

کتبائیل ــ حضرت موسیٰ نے جب مصر کے جادوگروں کے سامنے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو کیا ہوا۔

ضرغام — وہ اژدہا بنکر جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا

کتبائیل — "اور جب انھوں نے دریائے نیل پر عصا مارا تو —"

ضرغام — (جلدی سے بات کاٹ کر) دریا پھٹ گیا، بنی اسرائیل آسانی سے گزر گئے لیکن فرعون جب گزرنے لگا تو پانی کے دھارے پھر مل گئے اور وہ اپنے لشکر سمیت غرق ہوگیا۔

کتبائیل — حوران بہشت کے متعلق تمہارا یہ عقیدہ تھا کہ وہ صرف خیالی چیزیں ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

ضرغام — استغفر اللہ، میں نے عبادتیں ہی اس لئے کی تھیں کہ یہاں حوریں ملیں گی، میں تو انسے ملنے کی امید پر خدا جانے کتنے چلے دریا میں ننگے کھڑے ہوکر کھینچ چکا ہوں اور آپ پوچھتے ہیں کہ میں انھیں خیالی چیز تو نہیں سمجھتا تھا، خوب!

کتبائیل — کیا تمھیں یقین نہ تھا کہ بھلائی برائی سب خدا کی طرف سے ہے۔

ضرغام — یہ یقین نہ ہوتا تو دنیا میں اتنے گناہ کرنے کی جرأت ہی کیونکر ہوتی۔

کتبائیل — اس کا کیا مطلب!

ضرغام — یعنی میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ سب خدا کی مرضی سے ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر میں قادر نہیں

کتبائیل — اور ہاں ہم فرشتوں کے متعلق تمھارا کیا عقیدہ تھا۔

ضرغام — میں آپ لوگوں کو نورانی مخلوق سمجھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ آپ جو صورت چاہیں اختیار کرسکتے ہیں، نظام کائنات سب آپ ہی حضرات کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور آپ میں سے ہر ایک کسی خاص خدمت پر مامور تھا، میں آپ کو معصوم بھی سمجھتا تھا یعنی یہ کہ آپ نہ مرد ہیں نہ عورت۔

کتبائیل — معتقدات کے لحاظ سے تمھارے جواب واقعی ایسے ہیں کہ تمھارے گناہوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، تاہم چونکہ جزا و سزا کی تعیین میرا فرض نہیں ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ فیصلۂ خداوندی تمھارے حق میں کیا ہو اس لئے تم جاؤ پہلے میزان میں اپنا نامۂ اعمال وزن کراؤ اور وہاں سے پل صراط پر جاؤ کہ آخری فیصلہ وہیں ہوتا ہے۔

(مولانا ضرغام میزان عدل کی طرف اکڑتے ہوئے بڑھتے ہیں)

(۳)

[وہی وقت، وہی منظر، میزان عدل کے پاس سداسکھ اور مولانا ضرغام دونوں اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے کھڑے ہیں۔

کیکائیل — (بھاری آواز سے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے) تم اپنے اپنے اعمال علٰحدہ علٰحدہ وزن کرانا چاہتے ہو یا ایک ساتھ۔

ضرغام — میں اس کا مطلب نہیں سمجھا

سداسکھ — میں بھی نہیں سمجھا

کیکائیل — یعنی ایک صورت تو وزنِ اعمال کی یہ ہے کہ ہر شخص کا نامۂ اعمال الگ الگ میزان میں رکھ کر دیکھا جائے کہ پلڑا جھکتا ہے یا اوپر اُٹھتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک پلڑے میں ایک کا نامۂ اعمال رکھا جائے اور دوسرے میں دوسرے کا اور پھر دیکھا جائے کہ کون جھک جاتا ہے۔

ضرغام — (ذرا تن کر) یہ آپ نے کیا فرمایا، کجا یہ کافر، کجا میں مردِ مسلمان، میرے اعمال سے اسکے اعمال کو کیا نسبت،

سداسکھ — سچ ہے، میرے اعمال سے ان کے اعمال کو نسبت،

کیکائیل — لیکن مناسب یہی ہے کہ دونوں ایک ساتھ رکھ کر تول لئے جائیں، کیونکہ اس طرح سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کفر و اسلام میں کیا فرق ہے۔

ضرغام — (مسکراتے ہوئے) بالکل درست فرمایا آپ نے، یہی صورت بہتر ہوگی

کیکائیل، فرشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان میں سے دو فرشتے دونوں کا فردِ اعمال لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک فرشتہ مولانا ضرغام کے سامنے جا کر اپنے ہاتھ مودبانہ پھیلا دیتا ہے اور وہ اپنا نامۂ اعمال اس پر انتہائی تفخر کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ دوسرا فرشتہ سداسکھ کے قریب جاتا ہے پہلے اسکی طرف گھورتا ہے اور پھر انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ ایک خنجر کی نوک اس کے نامۂ اعمال میں چبھو کر اُٹھا لیتا ہے اور ساتھ کو جسم سے دور رکھے ہوئے اس طرح لیجاتا ہے گویا وہ کوئی سخت نجس چیز ہے۔

دونوں فرشتے میزان کی طرف جاتے ہیں اور داہنے پلڑے میں مولانا ضرغام کی فردِ عمل رکھ دیتے ہیں اور بائیں میں سدا سکھ کی۔ دفعۃً بایاں پلڑا اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے اور داہنا جھکتا۔ یہاں تک کہ مولانا ضرغام کے اعمالِ حسنہ کے وزن سے زمین چرچرانے لگتی ہے اور "سبحان اللہ" کا نعرہ فرشتوں کی صفوں سے بلند ہوتا ہے۔

(۴)

میدانِ حشر کا وہ حصہ جس کے آگے دوزخ و جنت کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ سامنے پُل صراط قائم ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اس کے نیچے نہایت عمیق و وسیع غاروں کا سلسلہ ہے جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ماورائے پُل صراط حدِ نظر تک نخلستانوں کے آثار نظر آ رہے ہیں جہاں سے فردوس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میدان کے ایک گوشہ میں بہت سے جانور کھڑے ہوئے ہیں جن میں زیادہ تر دُنبے، بکرے اور بکریاں ہیں، اونٹ بھی نظر آتے ہیں لیکن کم —

ہجوم سے مولانا ضرغام اور سدا سکھ نکل کر سامنے آتے ہیں

ایک فرشتہ — (ان سے مخاطب ہو کر) تم دونوں کا حساب و کتاب ہو چکا، میزانِ عدل میں فردِ عمل تُل چکی اور کارکنانِ قدرت کی طرف سے جو اطلاع عرشِ کبریائی تک پہونچائی جانی تھی وہ پہونچا دی گئی۔ اب وقت فیصلہ کا ہے جو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تم دونوں میں سے کس کو مستحقِ نجات قرار دیتا ہے اور کس کو لائقِ سزا، وہ مالک و مختار ہے اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جزا و سزا کے اصول اس نے کیا مقرر فرمائے ہیں۔ بہرحال یہ سامنے پُل صراط ہے اب تم آگے بڑھو اور اس سے محفوظ گزر جانے کی کوشش کرو، اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو سبحان اللہ کیا کہنا وہ سامنے بہشت ہے اور اس کی تمام ناقابلِ قیاس لذتیں، اگر تم ناکام رہے تو کہنے کی ضرورت نہیں، آگ کے شعلے غاروں سے بلند ہوتے ہوئے تمہیں بھی نظر آ رہے ہوں گے۔

سدا سکھ — (کانپتا، لرزتا ہوا) اگر نجات کا انحصار اسی پُل صراط سے گزر جانے پر ہے اور بہشت ان مہیب غاروں کو عبور کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے تو میں درخواست کروں گا کہ

مجھے یہیں سے اٹھا کر آپ جہنم میں ڈال دیجئے، کیونکہ پل صراط سے گزرنا کسی کے امکان میں نہیں ہے خاص کر میں کہ دنیا میں ایک دن بھی میں نے جمناسٹک کی مشق نہیں کی نہ تار اور رسّی پر چلنا سیکھا۔

فرشتہ - (غصہ سے) بد تمیز کافر خاموش رہ تجھے کیا خبر کہ مسلمانوں کے لئے یہی پل "راہ" ایک وسیع سڑک بن جاتی ہے اور وہ کس شان کے ساتھ اس سے محفوظ گزر جاتے ہیں۔ (ضرغام الدین سے مخاطب ہو کر) بولو تم کیا کہتے ہو۔

ضرغام الدین - بیشک درست فرمایا آپ نے، دیکھئے میں ابھی اس کو عبور کر کے دکھاتا ہوں۔ (جانوروں کی طرف منہ کر کے) اے میری قربانی کے جانورو، چلو آگے بڑھو اور مجھے پل صراط پر لے چلو کہ اسی دن کے لئے میں نے تمہارا خون بہا کر تم پر احسان کیا تھا۔

جانوروں کے جھنڈ کے جھنڈ، دنبے اور بکرے دوڑتے ہوئے ضرغام الدین کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ ان میں سے ایک نہایت موٹے تازے دنبے کا انتخاب کر کے اس پر سوار ہو جاتا ہے اور پل صراط کی طرف چل پڑتا ہے۔ سدا شکھ حیران و پریشان اس منظر کو دیکھ رہا ہے اپنی بے بسی و بیکسی پر آنسو بہا رہا ہے۔ دفعۃً ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے اور کشاں کشاں اسے پل صراط کی طرف لیجاتا ہے۔ ناگہاں نہایت تیز چمک کے ساتھ تڑاقے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور سب کی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ مولانا ضرغام بجلی کی تیزی سے پل صراط کو عبور کر تے چلے جاتے ہیں اور سدا شکھ کا جسم ہر قدم پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پل صراط کے نیچے غاروں کے اندر گرتا جاتا ہے۔

ضرورت ہے

یو-پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر

"فراق" گورکھپوری

ایک زمانہ تھا کہ میری زندگی کی تنہائیوں کا دلچسپ ترین مشغلہ صرف شعر پڑھنا تھا، اس کے بعد شعر کہنے کا دور آیا اور کافی عرصہ تک مجھ پر مسلط رہا، لیکن ان دونوں زمانوں میں کوئی زمانہ اس احساس سے خالی نہ گزرا کہ اگر شاعری ہماری حیاتِ دنیاوی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری نہیں ہے تو کم از کم اسے ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ یقیناً ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ بات بھی اسے حاصل نہ ہو تو پھر
"ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ۔"

یہ تھا وہ احساس جو شاعری ترک کرا کے آہستہ آہستہ مجھے "انتقادِ شاعری" کی طرف لے گیا، اور اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ آج اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ شاید میں اپنے سوا کسی کو شاعر سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس یہ ہے کہ میں سوائے اپنے ساری دنیا کو شاعر سمجھنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ میں دنیا کی شاعری میں وہ چیز نہ پاؤں جس نے مجھ سے میری شاعری ترک کرائی۔

میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے اور اگر اسے شاعری نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں اس میں "وہ کچھ چاہتا ہوں جسے میں بتا نہیں سکتا"!

شاعری "دل کا معاملہ" ہے اور دنیا میں اتنے مختلف "دل" اور ان کے اتنے مختلف جذبات ہیں کہ اس کے متعلق کوئی نظریہ "مسلمات" کی حیثیت سے پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے اور اس کے بعد پھر یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے چہ جائیکہ "اخلاقیات" و "مذہبیات" وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے اگر وہ شعر کہنے پر آ جائے۔

بعض کا خیال ہے کہ شاعری اور آرٹ دو علحدہ علحدہ چیزیں ہیں۔ میں یہاں آرٹ اور اس کی

ہمہ گیری کے متعلق اظہارِ خیال کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ آرٹ تو خیر بہت لطیف چیز ہے شاعری، "مادیات" سے بھی جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کے لطیف ترین "زائیدہ ہائے خیال" وہ ہیں جو اس نے فلسفۂ حیات و فلسفۂ مذہب کے متعلق پیش کئے ہیں علی الخصوص ہندو مذہب اور ہندو فلسفۂ حیات۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا میں "بت پرستی" رواج پا کر رہی اور خدا کا تصور بغیر "عرش و کرسی" کے ذکر کے ممکن نہ ہوا۔ شاید یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کو غالب نے یوں ظاہر کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

سو دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ "دشنہ و خنجر" کے الفاظ سے واقعی "ناز و غمزہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یا نہیں اور اسی کا نام شاعری ہے جسے اگر "آرٹ" سے علحدہ کر دیا جائے تو اس کے "تصوف" ہو جانے میں تو شک ہی نہیں اگر بدقسمتی سے وہ "مجذوب کی بڑ" کا مرتبہ نہ پا سکی۔

الغرض شاعری کی اصلی روح چاہے کچھ ہو لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا "رکھ رکھاؤ" ہے۔ یہاں اس منطقی بحث کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کا نام "رکھ رکھاؤ" ہے، وہ خود الفاظ سے علحدہ ایک چیز ہے اور اسی لئے جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے اظہار کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا ہے اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہونچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا "نہر کی پن چکی" کا اس سے غرض نہیں، دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اور پھر چونکہ میں اسی دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا "شرمندۂ معنی" ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی اور ایسی دنیا کا قایل نہیں ہوں جہاں "معنی"، "شرمندۂ الفاظ" نہیں ہوتے، اس لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اسی "پُر معصیت" دنیا کی لی جائے کیونکہ "معصومیت" کا تصور محض "لڑکپن" ہے اور شعر نام ہے "جوانی" کا۔۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک دوست ہیں جو کسی وقت شعر کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن اب تصوف کی طرف مایل ہو گئے ہیں اور مجھ سے بہت خفا رہتے ہیں، کیونکہ میرے نزدیک شاعری کو تصوف سے متعلق کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کر لی جائے کہ اس کے بعد "حسن و عشق" دونوں کا [illegible] ہے، نہ عورت عورت رہ جاتی ہے، نہ مرد مرد۔

ایک دن فرمانے لگے کہ "تم نہیں سمجھ سکتے تصوف اور اس کی شاعری کتنی بلند چیز ہے" اسکی ابتدائی منزل "ترکِ دنیا" ہے اور پھر "ترکِ عقبیٰ" و "ترکِ مولیٰ" سے گزر کر "ترکِ ترک" کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔ تمھاری شاعری تو "ترکِ دنیا" سے بھی نیچے ہے اور تصوف کی شاعری کی ابتدا "ترکِ ترک" سے ہوتی جہاں "خیالِ ترک" بھی ترک کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ "دلِ بے مدعا" جسپر شاعر نے ہمیشہ سر دھنا لیکن پایا نہیں اور صوفی شاعر نے اسے پہلے ہی قدم پر پالیا۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک شاعری کی ایک منزل اور اس سے بھی بلند ہے پوچھا "وہ کیا" میں نے کہا کہ نام تو اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن نمونے ایک دو ضرور پیش کرسکتا ہوں۔ مثلاً:

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں 	مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی ! دام میں

. . . .

فرمانے لگے "یہ تو بالکل مہمل ہیں" میں نے کہا کہ آپ کا "ترکِ ترک" اس سے زیادہ مہمل ہے اس رنگ کے شاعر کو ہم زیادہ سے زیادہ مخبوط کہہ سکتے ہیں لیکن آپ کی اس "ترکیات" والی شاعری کو تو سوائے حماقت کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ رہگیا دلِ بے مدعا سو حضرت وہ آپ ہی کو مبارک رہے، مجھے تو ایسا دل دیجئے جس میں سوائے مدعا کے کچھ نہ ہو اور اسی کیساتھ کسی معشوق پری تمثال کو سامنے بٹھا کر چلے جائیے پھر دیکھئے کہ "وصل وصل" کا رنگ زیادہ چوکھا رہتا ہے یا "ترکِ ترک" کا۔ اس میں شک نہیں کہ "ذہن رسا" فطرت کی بڑی پاکیزہ ودیعت ہے جو انسان کو عطا ہوئی ہے، لیکن اگر اسمیں بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو پھر انسان انسان تو رہتا نہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ صوفی ہو جائے یا اس سے بھی بڑھکر خدا بن بیٹھے۔

ایک صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا کہ باوصف تصوف سے اسقدر بیگانہ ہونے کے میں بیدل کی شاعری کا کیوں دلدادہ ہوں جو یکسر تصوف ہے۔ میں خاموش رہا کیونکہ ان کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ بیدل کی شاعری تو ایک خاص قسم کی شاعری ہے اور اسی لئے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے الفاظ وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ یا تو وہ خود ہمیں اس فضا میں لیجاتے ہیں جہاں کے وہ الفاظ ہیں یا پھر خود اس فضا میں آکر ہمارے ذہن کو متاثر کرتے ہیں جہاں کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مجاز کو بیدھڑک "حقیقت" کہدینا اتنا مرغوب نہیں۔ جتنا "حقیقت" کو بھی مجاز کے رنگ میں ظاہر کرنا۔

سو یہ بالکل غلط ہے کہ میں تصوف کے رنگ سے متنفر ہوں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں۔ اور میرا ہر شاعر سے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ جو خیال

چاہے ظاہر کرسکے لیکن یہ دیکھ سکے کہ اس کے الفاظ سے وہ پوری طرح ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں، اسکے بعد مرتبہ اسلوبِ بیان کا ہے جس کی بلندی و نزاکت کے لحاظ سے شعر ان خصوصیات کی حدود میں آتا ہے جو ہم کو اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ یہ شعر میرؔ کا ہے یا سوداؔ کا، مومنؔ کا ہے یا غالبؔ کا، اور جن سے ہم شعر کے خوب اور خوب تر ہونے پر حکم لگاتے ہیں۔

دورِ حاضر اس میں شک نہیں کہ ترقیٔ سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیتِ انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے سخنگو نظر آرہے ہیں، لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حال سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کردوں تو میری زبان سے فوراً فراقؔ گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔

فراقؔ جن کا نام رگھوپتی سہائے ہے گورکھپور کے رہنے والے ہیں اور ہر چند اردو شاعری کا ذوق انھیں ورثتاً ملا ہے لیکن ان کا مخصوص "رنگِ سخن" خود انھیں کی ذاتی چیز ہے، جس کے ابتدائی نشو و نما یا تدریجی ارتقاء پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا، کیونکہ میں ان کے ابتدائی حالات سے بالکل ناواقف ہوں۔

میں نے اول اول ان کو یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جبکہ وہ گریجویٹ ہو چکے تھے، اس کے بعد کانپور کے سناتن دھرم کالج سے تعلق پیدا کر لیا اور وہیں سے وہ انگریزی ادب میں ام۔ اے کی سند حاصل کرکے الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے جہاں اب بھی وہ زبان انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص غیر معمولی ذہین (GENIUS) ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے اور دوسرا ایسی متزلزل چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کے لئے کافی ہے، لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے بچ گئے اور اب میں انھیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

لکھنؤ میں جب کبھی مجھے ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملا، میں نے ان کے ذوق کی پاکیزگی کو بیّن طور پر محسوس کیا، لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ مستقبل میں اس کو فن کی حیثیت سے اختیار کر لیں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے فراقؔ کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اسوقت یہ معلوم

کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے۔

ان کا میلان وہی ہے جو مصحفی کا تھا کہ جس رنگ کو لیا اپنا بنا لیا اور ذہین و بیقرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے علی الخصوص اس وقت جب فطرت کے ساتھ ساتھ ان کا اکتساب بھی کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم بلحاظ انداز بیان اگر ان کو "مومن اسکول" میں شامل کیا جائے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔

میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے۔ پھر چونکہ فراق کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "قدر اول" کا مرتبہ دیا جائے۔

یہ بالکل درست ہے کہ فراق کے کلام میں اسقام بھی پائے جاتے ہیں، یعنی نہ وہ فنی غلطیوں سے یکسر پاک ہے اور نہ بیان کی ژولیدگیوں سے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاعرانہ روح ان کے ہر ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ مخصوص والہانہ انداز جو غزل کی جان ہے کسی جگہ ہاتھ سے چھٹنے نہیں پاتا۔ فراق اب شاید مشاعروں کی طرحوں پر بھی غزلیں لکھتے ہیں اور "فرمائشی شعر گوئی" کے لئے بھی طیار ہو جاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ مشق سخن کے لئے یہ طریق کار مفید ہو، لیکن شاید "پاکیزگی سخن" کا اقتضاء کچھ اور ہے چنانچہ جس وقت ہم فراق کی طرحی و غیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مغنی کی وہ حیثیت جب وہ تنہائی میں بیٹھ کر صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے گنگناتا ہے، اس حیثیت سے بہت مختلف ہوتی ہے جب اس کا مقصود صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ظاہر کیا کہ فراق کی شاعری میں مومن کا رنگ غالب ہے، لیکن قبل اس کے کہ میں فراق کا کلام پیش کر کے اس کی وضاحت کروں، خصوصیات مومن کا مختصراً ظاہر کر دینا ضروری ہے۔

مومن کی تنہا وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں، اس کے انداز بیان کی بلاغت ہے، جس طرح ایک مصور کے حسن ذوق کا پتہ چلانے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کس زاویہ سے تصویر لی ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کے حسن بیان پر حکم لگانے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس خیال کا "خط رفتار" کیا ہے اور اس نے اپنا تیر کس گوشہ سے چلایا ہے۔ اور اسی کی جدت و ندرت پر کلام کی خوبی کا انحصار ہے، جو مومن کا حصہ کہلاتی ہے۔ انداز بیان کی ندرت غالب کے یہاں بھی ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مل جاتے ہیں کہ امتیاز دشوار ہو جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مومن

جو کچھ کہتا ہے وہ بہت ڈوب کر کہتا ہے اور غالب کی حیثیت صرف "گاہ گاہ غوطہ زنی" کی حد تک بڑھتی۔ دوسری خصوصیت مومن کی اس کی فارسی ترکیبوں کی حلاوت ہے اور تیسری یہ کہ اس مادی اسی دنیا کی ہے، اسی دنیا کے انسانوں کی ہے اور اسی "عالم آب و گل" کے جذبات و احساسات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فراق کی شاعری میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی انداز بیان میں بھی ندرت ہے اور فارسی ترکیبیں بھی وہ بہت شگفتہ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کارزمیں سے ہٹ کر وہ آسمان پروازی میں مبتلا نہیں ہوتے، ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

مضمون نیا نہیں ہے لیکن سلاست الفاظ اور سادگی بیان کے ساتھ محبت کی اس خاص کیفیت کو (جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن ادا نہیں کر سکتا) ایسے سہل ممتنع انداز میں ظاہر کر دینا، یہ ہے اس شعر کی جان جس سے سننے والا فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

دوسرے مصرعہ کے بیساختہ پن اور ردیف و قافیہ کی خوبصورت صرف نے شعر کے مفہوم کو حد درجہ دلنشیں بنا دیا ہے۔ محبوب کے یاد آنے اور نہ آنے کے متعلق حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے:۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر ترقی بہت دشوار تھی، لیکن فراق نے زاویۂ بیان بدل کر اس میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی۔

اسی غزل کا ایک شعر خالص مومن کے رنگ کا دیکھئے:۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست آہ، اب مجھ سے تجھے رنجش بیجا بھی نہیں

مہربانی اور محبت کے نازک فرق کو "رنجش بیجا" کے ذکر کے بعد اس انداز سے بیان کرنا شاعری کا کمال ہے اور فراق کا صرف یہ ایک شعر ان کے پاکیزگی ذوق کی اتنی زبردست شہادت ہے کہ اس کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ فطرت انسانی اور اس کے مختلف مظاہر کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔ تعبیرات میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فراق کی کامیابیاں اس باب میں ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:۔

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

یہاں زندگی سے سلسلہ میں دیوانے کی اچٹی ہوئی نیند کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اور پھر اس کی توضیح کرتے ہوئے یہ کہہ جانا کہ "نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی" انتہائے بلاغت ہے۔
چند اور تعبیرات ملاحظہ ہوں:-

قید کیا رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم
چل پڑے تو صحرا ہے، رک گئے تو زنداں ہے

اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا
موجِ فنا بھی اک اثر ناتمام ہو

اس بحرِ محبت میں اے دل ڈوبنے والے بچتے ہیں
پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کہ بیڑا پار بھی ہے

اپنے چل پڑنے کو صحرا اور ٹھہر جانے کو زنداں قرار دینا۔ اسی طرح فنا کو "اضطراب ناتمام" سے تعبیر کرنا اور سر سے پانی گزر جانے کو بیڑا پار ہو جانا کہنا، معمولی متخیلہ کا کام نہیں۔ ایک اور لطیف شعر اسی رنگ کا دیکھئے

خوابگاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے
اک سکون بے پایاں ہستی پریشاں ہے

فراق کی ایک بالکل نئی تخئیل ملاحظہ ہو:-

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبوب کے دم بھر آجانے کی یہ تعبیر کہ شاید تنہائی نے بھیس بدلا ہے، ہندی شاعری کی چیز ہے اور اردو شاعری میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزری خالص وارداتِ محبت اور کیفیاتِ حسن و عشق کے بھی چند اشعار سن لیجئے:-

غرضکہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نثار پرسشِ غم کے میں کیا کہوں آخر
کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں

تو نہ چاہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں
تو جو چاہے تو غمِ ہجر بھی آساں ہو جائے

پردۂ یاس میں امید نے کروٹ بدلی
شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

پہلا شعر میر کے رنگ کا ہے اور ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو عشقِ بلند کلام کے سوز و گداز میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرے شعر میں حسرت "پرستشِ غم" کو سرگرانیوں سے دور ہو جانے کا باعث قرار دینا اُن تاثرات سے متعلق ہے جو "کار دبارِ محبت" میں غریب عاشق کو ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔

تیسرے شعر میں فلسفۂ ہجر و وصال پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور جو تھا شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ غم کے بقا کا تعلق حقیقتاً امید سے ہے نہ کہ یاس سے۔ کیونکہ یاس کی انتہا سکون ہے اور غم کے منافی۔ انداز بیان نے اس خیال کو بہت زیادہ لطیف صورت دیکر پیش کیا ہے۔

محبت کی بیقراری بڑی پُرلطف چیز ہوتی ہے اور عاشق ہمیشہ اس کے قیام کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کبھی کبھی گھبرا کر وہ ضبط و غم کے متاع کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیتا ہے، جس کا ردِ عمل اور زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس خیال کو فراق نے جس خوبصورتی سے ادا کیا ہے وہ شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

فریب صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے   نہ آیا بیقراری کو حیات جاوداں ہونا

اسی غزل میں ایک نہایت نازک تخییل ملاحظہ کیجیے:-

ہر آواز جرس پر اک صدائے بازگشت آئی   بہت ہے اسقدر بھی خیر، یادِ رفتگاں ہونا

آواز جرس کی صدائے بازگشت کو "یادِ رفتگاں" کہنا بڑا اسا وہی (ETHERIAL) تخییل ہے۔

ایک اور شعر اسی زمین کا یہ ہے:

ابھی اک "پرتوِ حسنِ خیالِ یار باقی ہے"   ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رایگاں ہونا

پہلا مصرعہ فراق کا نہیں ہے، بلکہ یہ ادنیٰ تغیر غالب کا ہے، لیکن فراق نے دوسرا مصرعہ لگا کر اسے بالکل اپنا بنا لیا۔ اور غالب سے زیادہ حسن کے ساتھ ۔۔ فرقت کو صرف اس لئے "دردِ رایگاں" نہ کہہ سکنا کہ پرتوِ حسنِ خیالِ یار ہنوز باقی ہے، نہایت لطیف بات ہے۔

شعراء نے "حسنِ مجرد" کے خیال کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا ہے، لیکن فراق کا انداز بیان ملاحظہ ہو:-

بہار چند روزہ کو بہار جاوداں کردے   تو و رنگ و بو سے کچھ الگ کر دے گلستاں کو

تکرار الفاظ سے معنی میں حُسن پیدا کرنا بہت کافی مشق چاہتا ہے۔ فراق کے کلام میں بعض نمونے اس رنگ کے نہایت پاکیزہ پائے جاتے ہیں:-

یہاں ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی   کوئی بھی اہل کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

بے خبری ظاہر کرنے کی یہ تعبیر کرنا کہ گویا "اہل کارواں" کارواں میں شامل ہی نہ تھے بڑا لطیف

انداز بیان ہے۔ اسی غزل کا مقطع ہے:۔

پھر بھی سکونِ عشق پہ آنکھ بھر آئی بار ہا ۔۔۔ گو غمِ ہجر بھی فراق کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

دوسرے مصرعہ میں فرق کا رق، تقطیع سے گرتا ہے، لیکن شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ فراق نے بعض غزلیں ایسی لکھی ہیں، جو شروع سے اخیر تک مرصع ہیں مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

یہ کہئے کل کوئی بے اختیار روتا تھا ۔۔۔ وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا
کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلت و ہوش ۔۔۔ ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دور ہو جانا ۔۔۔ یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھ سود و زیاں کاروبار الفت کے ۔۔۔ دگر نہ یوں تو نہ کھونا تھا کچھ نہ پانا تھا
اگاؤ تھیں وہ ترے حسن بے نیاز کی آہ ۔۔۔ میں تیری بزم سے جب نا امید اٹھا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدید "یاد ایامے" ۔۔۔ گزر گیا وہ زمانہ جسے گزرنا تھا
کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے ۔۔۔ زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید ۔۔۔ مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ رنجوریِ محبت کے بیان میں جس کیفیت و سادگی، جس سلاست و حلاوت کی ضرورت ہے وہ کسقدر تکمیل کے ساتھ ان شعروں میں پائی جاتی ہے۔

اب اور چند متفرق اشعار سن لیجئے:۔

سب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز ۔۔۔ وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے
گزرے گا ہو کے شہر خموشاں سے آج کون ۔۔۔ سو مرتبہ چراغ لحد جھلملا چکے

دل چاہتا ہے وعدۂ جاناں کو استوار ۔۔۔ اے وائے عشق میں بھی اگر انتظام ہو

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

کھلے رازِ دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلے بھڑک اٹھے ۔۔۔ یہ نہ پوچھ پھوٹ کے ہو گئے کیا جو فراق چھالے زباں کے تھا

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے ۔۔۔ ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

اے فراق انھیں پاک ہم یہ دل میں کہتے ہیں　　سوچئے تو مشکل ہے دیکھئے تو آساں ہے

جلوہ حسن نثار غم پنہاں کر دے　　عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کر دے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا　　یہ فرق دل کا وزیست تو کہنے کی بات ہے
یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب　　تم دل دکھاؤ وقت مصیبت تو بات ہے

ہاں بتا دے مجھے وہ رابطۂ ترک طلب　　جس سے آجائے مجھے تیری تمنا کرنا

یہ ایسے اشعار ہیں کہ اگر کسی خوش ذوق انسان کے سامنے پڑھ دئے جائیں اور اس کو یہ نہ بتایا جائے کہ ان کا کہنے والا کون ہے تو وہ انھیں دہلی کے دور متاخر کے کسی شاعر کا کلام سمجھے گا، جبکہ غزلگوئی صرف جذبات و تاثرات کے اظہار کا نام تھی، ہر چند موجودہ دور بھی بڑی حد تک اسی اصول کا پابند ہے لیکن انداز بیان اس کا کچھ اور ہے۔ پہلے معنی آفرینی کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہ کی جاتی تھی اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ "احساسات محبت" صنعت سے بیگانہ تھے۔ اب لوگوں میں "احساس محبت" بجائے "وقوف احساس" زیادہ ہے، اس لئے اس کی باریکیاں تو زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں لیکن "کیفیت" پیدا کرنے میں اسقدر کامیاب نہیں ہوتے۔

فراق کی شاعری میں "احساس" و "وقوف احساس" دونوں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ کیفیت و حلاوت کی بھی کمی نہیں اور وہ فنا دگی و والہانہ ادا بھی ہر جگہ موجود ہے، جو محبت کا لازمی نتیجہ اور غزل کی جان ہے۔

فراق نے اپنے ایک خط میں خود اپنی غزلگوئی کے متعلق عجیب و غریب تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں:-

"جس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں، اسی طرح غزل سے ہوتا کیا ہے، مگر مجبوریاں اور مایوسیاں جھک مارنے پر آمادہ کر ہی دیتی ہیں"

سو آپ فراق کا سارا کلام پڑھ جائیے، یہ محبت کی "مجبوری و مایوسی" بقدر مشترک اسکے ہر شعر میں نظر آئے گی اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی غزلگوئی کو دوسرے نوجوان شعراء کے تغزل سے ممتاز کر دیا ہے۔

فراق کے کلام میں جا بجا ندرت بیان اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ وہ کچھ اجنبی بدلی سی چیز نظر

آتی ہے۔ اس کا سبب مغربی لٹریچر کی وسعت مطالعہ ہے، جس سے فراق کا متخیلہ متاثر ہو کر بغیر کسی قصد و ارادہ کے بعض بعض جگہ انداز بیان کی بالکل نئی راہیں اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اجنبیت کسی جگہ پیدا ہونے نہیں پاتی اور سوائے اس کے کہ ذہن انسانی مطالعۂ عمیق کی طرف مجبور ہو کوئی ناگوار الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

الغرض فراق کی غزلگوئی کا مستقبل مجھے بہت درخشاں نظر آتا ہے اور اگر انھوں نے اپنے اس فطری ذوق کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی توجہ فن کی طرف بھی صرف کر دی تو اس دور کے باکمال شعراء کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کر لینا بالکل یقینی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ان کی ایک بالکل تازہ غزل موصول ہوئی جسے میں اپنے انتقاد پر مہر توثیق کی صورت سے یہاں درج کئے دیتا ہوں:-

نیرنگِ حسنِ یار ترے بس میں کیا نہیں — لطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں
آہ — جن کی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں — نالے اب اُنکے بند ہیں۔ تو نے سنا نہیں؟
کس درجہ پردہ دار طلسمِ نگاہ ہے — اس بزم میں کسی کو کسی کا پتا نہیں
میرے سکوتِ یاس پر اتنا نہ ہو ملول — مجھ کو خدا نخواستہ تجھ سے گلا نہیں
نیرنگیٔ امید کرم ان سے پوچھئے — جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں
تھا حاصلِ پیام ترا اے نگاہِ ناز — وہ رازِ عاشقی جسے تو نے کہا نہیں
اللہ رے عشق کی غیرت کیا ہوا — اتنا کبھی بے نیاز وہ جانِ وفا نہیں
میں شاد کام دید بھی محو ستم دیدہ بھی — ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں
ہر گردشِ نگاہ ہے دورِ حیاتِ نو — دنیا کو جو بدل نہ دے وہ میکدہ نہیں
اس رہگذار پر ہے رواں کاروانِ عشق — کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتا نہیں
بس اک پیامِ نرگسِ مستانہ ہے فراق
مجھ کو رماغ کاوشِ لطف و جفا نہیں

مکتوبات نیاز

صدیقی ۔ نامۂ خلوص کا شکریہ ۔ آپ نے اپنی "کاوشِ ذہن آزما" کی صراحت نہیں کی، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ذہین نوجوانوں کے دلوں میں کیا ہیجان و تلاطم برپا رہتا ہے

"گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی"

دیکھئے آپ صحیح و تندرست ہو چکے ہیں اور اب اپنی بیماری کا ذکر اس طرح نہ کیجئے گویا آپ کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ زندگی نام صرف جوانی کا ہے اور شاید ہوسرانی کا بھی، پھر وہ جتنی زیادہ گریز پا ثابت ہو اتنی ہی زیادہ عزیز ہونی چاہئے۔ خیام کا فلسفہ مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں جتنا اس کا عمل (اگر واقعی اس نے کبھی بادہ خواری کی تھی) اس لئے

دراں مقام کہ ساقی قدح بگرداند
چرا سخن رود از خضر و آب حیوانش

جب تک تعلق کاروبار فطرت سے رہے میں شاعری کا زیادہ قائل نہیں لیکن ایک ذرا باغیانہ روح اپنے اندر پیدا کر لیجئے پھر دیکھئے کہ مدارِ زیست سوائے شاعری کے اور کیا رہ جاتا ہے۔ اس سے میری مراد وہ "استغنائے نفس" ہے جو "دیہیم شاہانہ" کے ساتھ ساتھ عرفی کی زبان سے "گدا کلاہ نمد کج نہاد" کہلوائے بغیر نہ رہ سکا۔ بیدل اس چیز کو یوں ظاہر کرتا ہے:۔

خونے بجگر جمع کن و رنگ بروں آ

اس کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور اسی لئے اس میں ہلکا سا تشاؤم (PESSIMISM) پیدا ہو گیا ہے
آپ غالب کی زبان میں اسے یوں سمجھئے

صد رنگ گل بہ جلوہ برآید ز نوکِ خار

جلال اسیر اس سے بھی بڑھ گیا۔ کہتا ہے۔

میزنم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

بہرحال مدعا یہ کہنا ہے کہ اب آپ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیجیے جن سے دوسروں کا دل دُکھے (خود آپ کو اگر کوئی لطف اس میں آتا ہے تو آیا کرے) آپ اگر خود کسی سے محبت کرنا پسند نہیں کرتے تو دوسروں کی محبت کا امتحان آپ کیوں اس طرح لیتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ محبت کئے جانے کی لذت سے آپ بیخبر نہیں ہیں، اور اسی لئے یہ شرارتیاں ہیں — نوعمری میں ایسی بچپنے کی باتیں کرنا بھی میرے نزدیک شرارتی ہی کی ایک قسم ہے۔

آپ کی نظم کا ایک ایک شعر مستقل چیز ہے — مئی کے نگار میں شائع ہوگی۔ نینی تال آنے کا ظاہر کوئی امکان نہیں لیکن مطمئن رہئے میں لکھنؤ کی گرمیوں میں بھی آپ کو نہ بھولوں گا۔

کرمنا۔ مضمون پہونچا۔ شکریہ۔ واقعی آپ نے بہت کاوش کی ہے لیکن میں اس "جلوۂ برق شرابِ نگاہ گاہی" کا قایل نہیں — یعنی

یا تو بیگانے ہی رہئے ہو جئے یا آشنا

اور آشنا رہنے کی صورت یہ ہے کہ میرے مستقل حلیف ہو جایئے۔ فرمایئے کیا ارادہ ہے جاپان والا مضمون تو کہیں گم ہو گیا فتوائے کفر والے پرچے اب نہیں ملسکتے ختم ہو گئے۔ جاپستان میں دو ایک مضمون شامل ہیں۔ ایک جلد مکتوبات کی روانہ کی جاتی ہے۔

گرامی نامہ کا شکریہ — اچھا ہوا آپ راولپنڈی آ گئے۔ ابھی سے یہ خیال دل میں گدگدی پیدا کر رہا ہے کہ

من وکوہ عرفی و انجمن تنافی

عدم صاحب ملیں تو جتنی شکایتیں بے توجہی کی ممکن ہیں وہ سب میری طرف سے کر دیجئے۔ دیکھئے جب کسی کا گریبان دسترس سے دور ہوتا ہے تو بے کسی کا یہ عالم ہو جاتا ہے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر ملسکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:—
(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴؍ (سنہ ۲۳ء) مئی ۴؍ — (سنہ ۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴؍ فی پرچہ — (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۳۰ء) اپریل۔ مئی و جون ۴؍ فی پرچہ — (سنہ ۳۱ء) جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۴؍ فی پرچہ — (سنہ ۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲؍ — فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۳۳ء) فروری جولائی تا اکتوبر ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) ۱۲؍ —

منیجر نگار۔ لکھنؤ

تخلیقِ غم

جب مکمل عرش پر دُنیا کا خاکہ ہو چکا — جب مرتب بزمِ فطرت کا صحیفہ ہو چکا
خاک کے ذروں میں پیدا ہو چکی تابندگی — جب چمن کا پھول رنگ و بو کا تارا ہو چکا
اُٹھ چکے جب راز کے پردے حریمِ ناز سے — بارگاہِ عشق میں جب حسن رسوا ہو چکا
چاندنی سے جب برسنے لگ گئیں سرمستیاں — یعنی جب بہتا ہوا پانی بھی بادہ ہو چکا
لیکر انگڑائی جب اُٹھ بیٹھی عروسِ بیخودی — جب محبت کے نشیمن میں اُجالا ہو چکا
جب فرشتے زندگی کے گیت گانے لگ گئے — جب جنوں ویرانیوں میں جلوہ فرما ہو چکا

کارفرمائے حقیقت کی نگاہِ تبصرہ
لینے آئی اپنی دنیا کا مکمل جایزہ

تھی مگر دنیا کے چہرے پر ابھی بے رونقی — مسکراتے پھول کے دل میں بھی تھی افسردگی
ماہ و انجم کی ضیا پر ایک مضحک تبصرہ — یاسمن کی بزم میں تھی جگنوؤں کی روشنی
بند لب غنچے ابھی وابستۂ اسرار تھے — بیہُشی کا رنگ لے لیتی تھی اکثر بیخودی
عشق کی بدمست راتوں میں تھی کچھ بے کیفیاں — حسن کی نگیں سحر پر کچھ گراں تھی زندگی
چاند کی خاموش کرنوں میں تھا اک مہمل سکوت — رات کی رومان نوازی میں نہ تھی کچھ دلکشی
بادہ سامانیِ نرگس میں تھی بے معنی نشاط — سرد نغموں سے بھری تھی زندگی کی بانسری

مختصر یہ ہے کہ یہ عالم ابھی عالم نہ تھا
یعنی اس ہنگامۂ عشرت میں جزوِ غم نہ تھا

غم ہوا بیدار سورج کی کرن کے ساتھ ساتھ — نالہ جاگا نغمہ ہائے انجمن کے ساتھ ساتھ
خشکیاں سوکھی زباں کی طرح بل کھانے لگیں — تتلیوں کے سائے میں جوبنِ چمن کے ساتھ ساتھ
زندگی نے جا کے ویرانوں میں بھی اک سانس لی — غربت ایجادی ہوئی عیشِ وطن کے ساتھ ساتھ
اشک میں پیدا ہوا چنگاریوں کا سوز و ساز — داغ کا رشتہ ہوا ہر پیرہن کے ساتھ ساتھ
درد اک نادیدہ نشتر بن کے لہراتا ہوا — چبھ گیا دل میں خمارِ انجمن کے ساتھ ساتھ

فکر نے اک آہنی پنجے میں جکڑا ذہن کو
یاس ابھر آئی جبیں کی ہر شکن کے ساتھ ساتھ
کشمکش جب داخل آداب ہستی ہو گئی
کام کی دنیا یہ انسانوں کی بستی ہو گئی

غم نے چاہا آئنہ دل کا چمکتا ہی رہے
غم نہ ہو تو بزم ہستی میں اندھیرا ہی رہے
غم نے چھینے ہیں مقدر سے ہلاکت کے چلن
غم نہ ہو تو ما و تو کی جنگ برپا ہی رہے
غم نے بھڑکا کر بجھایا سخت کوشی کا چراغ
غم نہ ہو تو دل مثال شمع جلتا ہی رہے
غم نے بزم قدس میں دل کو دیا اذن سکوں
غم نہ ہو تو آسماں نظروں کا پردا ہی رہے
غم نے کی دنیا میں تکمیل مذاق بیخودی
غم نہ ہو تو عاشقی وقف تمنا ہی رہے
غم نے قایم کر دیا ربط جبین آستاں
غم نہ ہو تو حسن کا ہر رنگ رسوا ہی رہے
غم خوشی کے نور میں لپٹا ہوا اک تیر ہے
غم کتاب آدمیت کی نئی تفسیر ہے

فضل الدین اثر اکبر آبادی

غزل

عشق نے روح کو جب، درد سے آباد کیا
ذوق گفتار کو آمادۂ فریاد کیا
عشق اور عقل کا مخلوط کرشمہ ہے بشر
خوب تعمیر یہ مجموعۂ اضداد کیا
اب میری حالت غمناک پہ کڑھنا کیسا
کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے برباد کیا
حادثہ ہے، مگر ایسا تو المناک نہیں!
یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا
یاد کرنے سے کیا گو کہ بہت ہی پرہیز
پھر بھی دیوانوں کی مانند اُسے یاد کیا
ہم نہ پیتے کبھی اے ساقی بے فیض مگر
تیری مخمور نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا
بات جو تم نے کہی سوز سے لبریز کہی
واہ کیا تذکرۂ درد خداداد کیا
بربط غالب و مومن کی صدا آتی ہے
از سر نو وہ فسوں کس نے پھر ایجاد کیا

عدم

اعترافِ شکست

بےخبر تھا نیند کی آغوش میں سارا جہاں
دے رہی تھی رات نغموں کی زباں میں لوریاں

جوگیا کی مست دھن میں گا رہی تھی خامشی
نیند اپنے راگ سے برسا رہی تھی خامشی

چاند کا سیماب گوں دریا ترنم ریز تھا
کاروانِ انجمِ سیمیں تبسم ریز تھا

چاندنی اور چاند تاروں پر یہ ہوتا تھا گماں
بحرِ سیمیں کشتیٔ زر گنگا جمنی مچھلیاں

وادیوں میں شوخیاں دکھلا رہی تھی چاندنی
پہلوئے کہسار میں شرما رہی تھی چاندنی

یہ تو سب کچھ تھا سو تھا طرفہ ستم یہ بھی ہوا
پاس کے اک پیڑ پر ظالم پپیہا بول اٹھا

ہو کے برہم رہ گیا عقل و خرد کا بندوبست
وہ مثلِ صادق ہوئی دیوانہ را ہوئے بس است

آشنا سی کوئی شے سینے کو برمانے لگی،
دل سے اٹھ اٹھ کر لبوں تک آنچ سی آنے لگی،

دل کی دنیا ایک بیک لینے لگی انگڑائیاں!
آنکھ کے پردوں پہ کچھ پھرنے لگیں پرچھائیاں،

ہلکی ہلکی چٹکیاں دل میں کوئی لینے لگا
گرتے پڑتے کشتیٔ امید پھر کھینے لگا

بیخودی و بیہشی کی موج لہرانے لگی
ہوش و ادراک و خرد کو نیند سی آنے لگی

پڑ گئی اک جان سی دل کے شکستہ ساز میں
منتقل ہونے لگی ہر سانس اک آواز میں

رفتہ رفتہ سانس کی آوازیں آہیں بن گئیں
اک مرقع عہدِ ماضی کا نگاہیں بن گئیں،

آنکھ میں آ کر دھواں آہوں کا پانی بن گیا
اور یہ پانی نوید زندگانی بن گیا۔

کشتگانِ جبر سارے مرتے مرتے جی اٹھے
یعنی سب ارمانِ دل ایک ایک کر کے جی اٹھے

دلمیں ہوک اٹھی لبوں پر شورِ فریاد آ گیا
بھولنے کی جس کے کوشش تھی وہی یاد آ گیا

اے مرے یاد آنے والے اے مرے دل کے مکیں
اے ربابِ زندگی کے نغمۂ کیف آفریں

سعیٔ ترکِ عشق بھی ہے اک نہفتہ رازِ عشق
انتہائے بیخودی اور ابتدائے نازِ عشق

جانِ جسمِ زار سے بیزار ہے تیرے بغیر
آ، کہ میری زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

تو بھلانے والی شئے ہے بھولنے کی شے نہیں
مے نہ ہو گر دشمنِ تمکیں تو وہ مے مے نہیں

مان جا پیماں شکن ظالم خدارا مان جا
مان جا، واللہ تو جیتا میں ہارا مان جا

دعوت

بیا کہ ابھی فطرت ہے محوِ ناز ہنوز
نشاطِ روح ہے رعنائی مجاز ہنوز

یہ سبزہ زار یہ چشمے یہ آسماں یہ زمیں — مری نظر میں ہیں اک عکس جلوۂ رنگیں
کہ دیدہ ہائے دلِ ماندہ ان میں باز ہنوز

شفق کے رنگِ خیالی پہ جان دیتا ہوں — میں حسنِ ماہ کو نذر اک جہان دیتا ہوں
رہینِ سجدہ ہے میرا سرِ نیاز ہنوز

نشاطِ دل ہے یہ منظر نہیں گفتگوئے زباں — کہ سن رہا ہوں پرندوں کا نغمۂ شیریں
نصیبِ گوش ہے صد لذتِ نماز ہنوز

ابھی ہے روح میں اک کیف کا اثر باقی — نیازِ عشق کی بخشی ہوئی نظر باقی
زبانِ دل پہ نہیں داغِ حرص و آز ہنوز

ابھی ہے نشترِ یادِ حبیب وجہِ تپش — درونِ روح فراوانیِ متاعِ خلش
ہے صرفِ آہِ جنوں زلفِ شبِ دراز ہنوز

ابھی ہے دفترِ کبر و ہوا یہ بے معنی — ابھی ہے گفتگوئے زہدِ خشک لایعنی
ہر اک نفس ہے مرا وقفِ سوز و ساز ہنوز

جنونِ قلب میں جامہ دری کی ہے قوت — پتنگِ عقل اڑانے کی ہے ابھی ہمت
نثار تجھ پہ ہے رعنائی مجاز ہنوز

ازل سے عشقِ نوی حرفِ اضطراب رہا — تو غرقِ حسن میں ڈوبا ہوا شباب ہوں میں
مری نگاہ میں ہے صورتِ ایاز ہنوز

ہوئی جو چشمِ کرم میرے حال کے شامل — رہا نہ دیر و حرم کی گرفت کے قابل
ہے وقفِ دید مری چشمِ امتیاز ہنوز

خدا کرے کہ یہ ہدیہ قبول ہو جائے — سرور طائرِ دل کو حصول ہو جائے
ہے رہنِ گرسنگیِ حرصِ شاہباز ہنوز

مضطر شاہجہانپوری ایم اے

وادیٔ ایمن میں

تعالیٰ اللہ یہ صحرا یہ وادی اور یہ منظر
ہزاروں آئینہ خانے جڑے ہیں ایک پتھر پر

جدھر جاتی ہیں نظریں بجلیاں سی کوند جاتی ہیں
یہیں تو برقِ جلوہ نے کیا تھا طور کو خستہ

کھڑی ہے یادگارِ اشتیاقِ حضرتِ موسیٰ
نیاز و ناز کے افسانے سنتا ہے ہر اک کنکر

جو اُن کے جلوۂ صد رنگ پر قربان جاتی ہیں
حیاتِ جاوداں ملتی ہے ٹھوکر سے یہیں اکثر

جہاں اُنکے جمالِ حسن کا پرتو جھلکتا ہے
وہاں نورِ نظر بنتا ہے ہر چھوٹا بڑا پتھر

جو بعد موت بھی زندہ رہے جینا اسی کا ہو
سنا ہے چوٹ برقِ حسن کی سینہ اسی کا ہو

یہ ایمن، اور یہ وادیٔ سینا کی تماشا ہے
یہاں تو ذرے ذرے کو انا الموسیٰ کا دعویٰ ہے

وہ کوہِ طور جس پر بجلیاں جلووں کی کوندی تھیں
پھر اُس کو آتشِ جلوہ سے نزدیک آنے کا سودا ہے

مذاقِ دیدِ عرفاں اب کہاں ملتا ہے انساں کو
اب اس وادی میں جلووں کو [illegible]

پہاڑ اب بھی تمنائی ہیں جلوہ گاہ بننے کے
مگر حسنِ ازل کو انتظارِ چشمِ موسیٰ ہے

درختوں سے ٹپکنے کو بہت مضطر ہیں انگارے
فضا کو اضطرابِ مقدمِ مہمانِ سینا ہے

تجلی آشنا، اللہ کا پیارا نہیں کوئی
وہی ہے انجمن، اور انجمن آرا نہیں کوئی

الٰہی میری آنکھوں کو مذاقِ چشمِ موسیٰ دے
برہنہ پا مجھے اُس طور کی چوٹی پہ پہنچا دے

گرا دے بجلیاں مجھ پر حیات افروز جلووں کی
مرے ذوقِ تپش کو دعوتِ وادیٔ سینا دے

وہ گرمی محبت آج پھر کر دے عطا مجھ کو
جو ہر رگ میں دلِ مضطر کی شعلہ سا بھڑکا دے

اگر بجلی نہیں ہے میرے ظرفِ تنگ کے قابل
سوادِ طور پر اک مشعلِ جلوہ ہی چمکا دے

کلیم اللہ کا منصب اگر اب مل نہیں سکتا
تو شمعِ طور کا پروانہ بن جانے کا سودا دے

مسیحا ہو نہیں سکتا کہ موسیٰ ہو نہیں سکتا
جو تو چاہے تو دیوانہ ترا کیا ہو نہیں سکتا

اب اس دشتِ مقدس سے میں خالی ہاتھ کیا جاؤں
یدِ بیضا عنایت کر کہ چمکاتا ہوا جاؤں

یہاں تو بجلیاں بھی بھیک میں انساں کو ملتی ہیں
یہاں آ کر میں کیوں محرومِ انوارِ تجلی جاؤں

پلا دے وہ مئے دو آتشہ میخانے سے اپنے
کہ جس کے نشے سے بزمِ جناں تک جھومتا جاؤں

جلا دے میرے سامانِ خودی کو پھونک دے مجھ کو
تمنا ہے کہ اب جاؤں تو بے برگ و نوا جاؤں

ملا دے خاک کر کے خاک میں وادیٔ ایمن کو
شعاعِ نور بن کر تیرے جلووں میں سما جاؤں

مجھے آنکھوں میں اپنی اہلِ عالم عمر بھر رکھیں
مری مٹی بھی سرمہ کی طرح اہلِ نظر رکھیں

(نجیب احمد بلیاوی)

آیندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار"

دو چند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا

اور موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے ۔ یعنی ۔ اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائیگی اور اسکی پہلی قسط جنوری ۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی ۔ اسلامی ہند کی تاریخ بالکل جدید اُصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے اس میں تمام تاریخی ماخذوں کی حقیقت سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تو تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن انکی تعیین بہت کم کیگئی ہے

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ"

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اسکے خریدار پیدا کیجئے ۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ ۔ نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں ملے گا ۔ ششماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اُٹھا سکیں گے ۔

منیجر نگار

[illegible] کی دیگر تصانیف

[illegible]

جنوری

نگار

قیمت

نگار

اڈیٹر: — نیاز فتحپوری

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں [illegible] تک دفتر میں اطلاع [illegible] ورنہ دفتر ذمہ دار نہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (۵) ششماہی تین روپیہ (معہ محصول)

[illegible] سالانہ قیمت [illegible]

شمارہ (۶)	فہرست مضامین جون ۱۹۳۷ء	جلد (۳۱)

نگار

اگلے مہینے کے دو نہایت اہم مضامین :—
خلافت و امامت (غیر شیعی نقطۂ نظر سے)
غزل گوئی — (انتقادات عالیہ کے معیار سے)

شمارہ — ۶	جون ۳۷ء	جلد — ۳۱

ملاحظات

مشترکہ قومی زبان

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی طرف سے جناب ڈاکٹر اشرف صاحب ناظم شعبہ اطلاعات سیاسی نے ایک پمفلٹ شایع کیا ہے جس کا عنوان ہے "گاندھی جی اور اُردو"

اس کی اشاعت کا مقصود کیا ہے، خود ان کی زبان میں سنئے، فرماتے ہیں :—

"ہندی ساہتیہ سمیلن مدراس کی کارروائیوں کے بارہ میں بعض فرقہ پرست اخبارات نے یہ خیال منظم طور پر پھیلانا شروع کر دیا ہے کہ اس سمیلن کی کارروائیوں اور ان میں گاندھی جی کی شرکت کا منشاء مقصود تھا کہ ہندوستان میں اُردو زبان اور رسم الخط مٹا کر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو رائج کر دیا جائے...... حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے..... میں اس سلسلہ میں خود مہاتما گاندھی کی تقریروں کے بعض حصے مرتب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، جن سے آپ کو

اچھی طرح اندازہ ہوجائے گا کہ گاندھی جی اور ہندی سمیلن کی کارروائیوں کا صحیح منشا کیا تھا"
اس تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے گاندھی جی کے اخبار ہریجن سے چھ مختلف اقتباسات پیش کئے ہیں۔ پہلا اقتباس اس امر کی وضاحت کے لئے ہے کہ گاندھی جی کی مراد ہندی زبان سے کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"صرف ہندی زبان میں جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اُردو بھی پڑ گیا اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس کی صلاحیت تھی اور ہو کہ وہ ہمارے ملک کی مشترکہ زبان قرار دیجائے
دوسرا اقتباس "ہندی ہندوستانی" کے تسمیہ کے متعلق ہے گاندھی جی فرماتے ہیں:۔
"یعقوب حسن صاحب نے ابھی مجھ سے دریافت کیا کہ جب آپ کی غرض مشترک زبان سے ہے تو پھر آپ سیدھی سادھی اور عام فہم ہندوستانی کی بجائے ہندی ہندوستانی کی نئی اصطلاح پر کیوں زور دیتے ہیں؟ تو پھر سنئے میں آپ کو اس اصطلاح کا اور چھور بتاتا ہوں۔ میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی سہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اُردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے ہندی اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ "ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے" اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اُردو پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔
"اس کے بعد بھارتیہ سہتیہ پرشد کا زمانہ لیجئے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کی بجائے ہندی ہندوستانی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پُر زور مخالفت کی، مگر میں ان کی تجویز ماننے کے لئے مجبور نہ تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز پر میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا۔ اس لئے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اُردو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ ہندی لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے۔ یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ہندی نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے، لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟

"اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی زبان سے لاگ کھا سکتی ہیں جس میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو، اس لئے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔ جب یہ دو زبانیں، ہندی اور ہندوستانی یعنی اُردو مل جائیں گی اور ان کی آمیزش سے ایک آل انڈیا زبان جنم لے گی اور آئے دن صوبجاتی الفاظ سے اس کا خزانہ بھرپور ہوتا رہیگا، اسوقت جاکر ہمارے پاس اصطلاحات کا ایسا ذخیرہ فراہم ہوگا کہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔"

"اب شاید آپ سمجھے کہ میں ہندی ہندستانی اصطلاح پر کیوں اتنا زور دیتا ہوں۔"

تیسرا اقتباس دستور کانگرس کی دفعہ ۲۵ کا ہے جس کی رو سے کانگرس کی زبان ہندوستانی زبان قرار دی گئی ہے چوتھا اقتباس انگریزی کے ترک استعمال کے متعلق ہے، پانچواں وہ جس میں گاندھی جی نے اعلان کیا ہے کہ:-

"جبر اور زبردستی کا کوئی سوال نہیں ہے نہ ہمارے پیش نظر ہے کہ جو چیز حصول مطلب کا ایک ذریعہ ہو اُسے خود مقصود بالذات قرار دیدیا جائے۔ مقصد صرف اسقدر ہے کہ ہندی ہندستانی کے وسیلہ سے ہم ایک سمت میں چل سکیں۔ اکثریت کے دباؤ اور دھونس کا سوال اس لئے اور بھی نہیں ہے کہ اقلیت کو اس تجویز کے یکسر مسترد کر دینے کا پورا پورا حق ہے۔"

اور چھٹا ہندی رسم الخط سے متعلق ہے جس میں گاندھی جی نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ "اُردو اور رومن خطوں میں دیوناگری خط جیسی صوتی صلاحیت و جامعیت نہیں ہے"

ان اقتباسات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گاندھی جی نے ملک کی مشترکہ زبان کا نام بجائے اُردو یا ہندوستانی کے ہندی زبان کا لفظ تجویز کیا تھا اور پھر ہندی سمیلن کی رعایت پیش نظر رکھ کر "ہندی ہندوستانی" کر دیا۔ گاندھی جی کا یہ کہنا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو سمیلن اور خود اپنے آپ پر ظلم ہوتا، میری سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ نہ ظلم کی نوعیت اس میں متعین کی گئی ہے اور نہ اس کا کوئی سبب ظاہر کیا گیا ہے

آگے چلکر جو صراحت انھوں نے کی ہے کہ "ہندی ہندوستانی" سے مقصود ان کا شمال و جنوب کی زبانوں کو ملا دینا ہے، اس سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ ان کا مدعا ایک خاص قسم کی سنسکرت آمیز زبان پیدا کرنا ہے اور اسلئے واقعی ہندی سمیلن اور خود گاندھی جی پر ظلم ہوتا اگر بجائے ہندی ہندوستانی کے وہ محض ہندوستانی کو ترجیح دیتے جس میں سنسکرت کو اتنا درخور حاصل نہیں ہے

اب ان تصریحات و اقتباسات کو دیکھتے ہوئے قطع نظر اُس اصلی بحث سے کہ مشترکہ زبان اُردو ہو یا ہندستانی

یا ہندی ہندوستانی، ایک نئی بحث یہ سامنے آتی ہے کہ مہاتما گاندھی واقعی کیا چاہتے ہیں اور یہ سلسلۂ نزاع اُردو و ہندی، مسلمانوں کو جو تنفر ان سے پیدا ہوگیا ہے وہ درست ہے یا نادرست۔ ڈاکٹر اشرف صاحب نے یہ پمفلٹ اسی لئے شایع کیا ہے کہ گاندھی جی کی طرف سے مسلمانوں کی یہ بدظنی دور ہو جائے اور اسی پر ہمیں غور کرنا ہے کہ اقتباساتِ پمفلٹ سے ڈاکٹر صاحب کا مقصود واقعی پورا ہو سکتا ہے یا نہیں

اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کا نام بدلنے کی ضرورت کیا تھی۔ اس کا جواب دوسرے اقتباس کے ذریعہ سے یہ دیا جاتا ہے کہ گاندھی جی کا منشا اُردو کے بجائے ہندی کہنے سے یہ تھا کہ اسمیں فصیح و بلیغ ہندی اور فصیح و بلیغ اُردو، دونوں شامل ہو جائیں۔ اگر یہ توجیہ کسی جاہل انسان کی طرف سے پیش کی جاتی تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن حیرت یہ ہے کہ گاندھی ایسا شخص ایسی رکیک تاویل پر اُتر آتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر اشرف ایسا فاضل انسان اسے گاندھی جی کی صفائی میں پیش کر رہا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اُردو جدید نام ہے اور پہلے اس کو ہندی یا ہندوستانی ہی کہتے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ جو نام کم از کم ایک صدی سے رائج چلا آرہا ہے اس کو بدلنا ہی کیوں چاہئے اور اگر اس کے لئے صرف یہ سبب کافی ہو سکتا ہے کہ پہلے اس کا نام یہ نہ تھا، تو موجودہ تمدن اور نظام تمدن میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جن کا نام وہ نہ تھا جواب پایا جاتا ہے اس لئے ان سب کا نام بدل کر قدیم نام رکھنا چاہئے، اور اگر عہد قدامت کا اور زیادہ لحاظ کیا جائے تو سرے سے کوئی نام ہی نہ رکھنا چاہئے، کیونکہ بہت سی چیزیں زمانہ حال کی اس وقت موجود ہی نہ تھیں

گاندھی جی خود ہی یہ اُصول مقرر فرماتے ہیں کہ "جو چیز حصول مطلب کا ذریعہ ہے اسے مقصود بالذات نہ قرار دینا چاہئے" اور خود ہی تسمیۂ زبان کے مسئلہ کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ محض نام کوئی چیز نہیں ہے اور اگر ہندو مسلمان دونوں کسی ایک مشترک زبان کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ بحث بالکل لغو ہے کہ اس کا نام اُردو رہے یا بدل کر اسے ہندی کر دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ مہاتما گاندھی ہوں یا کوئی اور ہندو لیڈر، اصل راز کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے اور اسی لئے وہ اس نوع کی لغو و رکیک تاویلوں پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں کہ ہندوؤں کا یہ زمانہ ان کے نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کا زمانہ ہے اور جب کوئی قوم اس دور سے گزرتی ہے تو قدرتاً اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز کو خالص وطنی رنگ میں رنگ لے اور چونکہ زبان کا تعلق براہ راست ایک قوم کے کلچر سے ہوا کرتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ہندو اس طرف سے غافل رہتے اور کوئی مخصوص زبان اور مخصوص رسم الخط اپنے لئے مقرر نہ کرتے، پھر چونکہ ان کا مذہبی لٹریچر دیوناگری رسم الخط میں موجود ہی تھا اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ ان کے لئے ایسے ہی آسان تھے جیسے فارسی عربی کے الفاظ مسلمانوں کے لئے، اس لئے ان کو وہی فیصلہ کرنا چاہئے تھا جو انھوں نے کیا اور اُردو سے ان کو

علٰحدہ ہو جانا چاہیئے تھا جو یقیناً اپنے اندر غیر ملکی عناصر زیادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ باوجود تمام حزم و احتیاط کے آخر کار گاندھی جی کی زبان سے سمیلن کے جلسہ میں یہ الفاظ نکل ہی گئے کہ "اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور وہی اس کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں"۔ میں ہندوؤں کی اس ذہنیت کو بہت پسند کرتا ہوں کہ وہ اپنے مخصوص کلچر کے لحاظ سے ایک مخصوص زبان اپنی علٰحدہ کر لینا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ میں اس کو بہت ناپسند کرتا ہوں کہ وہ اس حقیقت کو چھپائیں اور خواہ مخواہ ہندی اور ہندوستانی کو وہ اُردو ہی ثابت کرنے کی کوشش کریں، جبکہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جو مفہوم ہندی ہندوستانی کا متعین کیا جاتا ہے وہ اُردو سے کس قدر مختلف ہے اور اس طرح جو نئی زبان پیدا ہو رہی ہے وہ کسی طرح مسلمانوں کے لئے قابلِ فہم نہیں ہو سکتی جب تک وہ تھوڑا بہت علم سنسکرت کا نہ حاصل کر لیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا منشا کیا ہے اور ہندوؤں کی اس ڈپلومیسی کا کیا مدعا ہے۔ اگر آج یہاں مسلمان اتنی تعداد میں نہ پائے جاتے تو ملک کی مشترک زبان کی بحث میں اُردو کا نام بھی نہ لیا جاتا اور جس طرح تلنگی و مرہٹی وغیرہ کو صرف "صوبجاتی" زبان قرار دے کر مرکزی زبان کے سلسلہ میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا، اسی طرح اُردو کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا، لیکن چونکہ معاملہ آٹھ کرور افراد کی زبان کا ہے جن کو ساتھ لئے بغیر وہ دستورِ جدید ایسی اصلاحات تو بیشک حاصل کر سکتے ہیں لیکن آزادیٔ کامل کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اُردو کی ذات سے کھلم کھلا اپنی بیزاری کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے (حالانکہ گاندھی جی نے کیا) لیکن انھوں نے اپنا مقصد یوں حاصل کرنا چاہا کہ پہلے اس کا نام بدلنے کی طرف مسلمانوں کو مائل کیا (یعنی بجائے اُردو کے ہندوستانی کہنے پر راضی کیا) اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو نہایت سادگی سے دوسرا قدم یوں اُٹھایا گیا کہ بجائے ہندوستانی کے دوسرا نام ہندی ہندوستانی تجویز کیا تاکہ اس میں جنوبی ہند کی سنسکرت آمیز زبان بھی شامل ہو جائے۔ ڈاکٹر اشرف صاحب اپنے پمفلٹ کے ذریعہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اجتماعی حیثیت سے گاندھی جی زبان کے مسئلہ میں بالکل بے تعصب ہیں۔ اول تو ان کے اقتباسات سے یہ بات کسی طرح ثابت ہی نہیں ہوتی اور اگر کھینچ تان کر کوئی تاویل ایسی تلاش کر لی جائے تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ خود گاندھی جی کا انفرادی میلان دیوناگری کی موافقت میں ہے اور وہ اسی کی اشاعت ملک میں چاہتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خود پسند کرتے ہیں کسی اور چیز کو اور مشورہ دیتے ہیں کسی دوسری چیز کا۔ کم از کم گاندھی جی کی طرف سے تو اس "نفاق پیشگی" کا اندیشہ ہم کو نہ ہونا چاہئے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کی صفائی میں جو کچھ فرمایا ہے اسکے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

یہ بالکل صحیح ہے کہ کانگریس سے مسلمانوں کی علٰحدگی کے اسباب متعدد ہیں، لیکن یہ بھی غلط فہمی ہے کہ انھیں میں ایک سبب اُردو ہندی نزاع بھی ہے۔ شرکتِ کار کے لئے اصل چیز دو جماعتوں کی ذہنیتوں کا اشتراک ہے

اور یہ بغیر اخلاقی رواداری کے ممکن نہیں، پھر اگر کسی ایک جماعت کے طرز عمل سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس رواداری کے لئے طیار نہیں تو قیامت تک اتحاد عمل ممکن نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مذہب کے باب میں ہندوؤں نے رواداری سے کام لیا ہو، ممکن ہے کہ سیاسیات میں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت رعایت کی ہو، لیکن زبان کے مسئلہ میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ رواداری سے کام نہیں لیا، بلکہ اُردو کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں میں بہت زیادہ اجنبیت پیدا ہوگئی

افسوس ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا اس کے ثبوت میں ڈاکٹر اشرف کی طرح اسوقت کوئی پمفلٹ تو پیش نہیں کر سکتا، لیکن میری طرح کیا مجھ سے بہت زیادہ انھوں نے کانگرس و متعلقات کانگرس کے جلسے دیکھے ہوں گے اس لئے میں انھیں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کانگرسی جلسوں اور کانگرسی نمائشوں میں شریک ہونے کے بعد ایک شخص کیا محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان جلسوں کا لٹریچر، رضاکاروں کے بیج، پوسٹر و اشتہارات، اعلانات و ہدایات، جھنڈا، پروگرام اور ٹکٹ وغیرہ سب کچھ ناگری رسم الخط میں ہوتا ہے اور مطلق اس جماعت کی پرواہ نہیں کی جاتی جو اس زبان یا اس رسم الخط سے بیگانہ ہے۔ کبھی یہ تو دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی انھوں نے انگریزی کو بھی لے لیا، لیکن اس توہین کو کبھی گوارا نہیں کیا گیا کہ ہندی کے ساتھ اُردو کو بھی جگہ دیجائے۔ اس سے حقیقتاً اس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کے زیر اثر ہندو جماعت کام کر رہی ہے اور جس کو دیکھ کر مسلمانوں میں احتراز و اجنبیت کے جذبات پیدا ہونا ناگزیر ہیں کہنے کو تو وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اُردو سے انھیں کوئی عناد نہیں، لیکن عمل ان کا یکسر مخالفانہ ہے اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ان کا اس سے انکار کرنا کھلا ہوا فریب ہے۔ میں بہت خوش ہوتا اگر وہ قطعی فیصلہ کر دیتے کہ ہندوستان کی آیندہ زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط دیوناگری کہ اس طرح مسلمانوں پر ان کا پوزیشن تو واضح ہو جاتا، لیکن گیہوں دکھا کر جو بیچنے والی ترکیب میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی اور نہ آسکتی ہے۔ میں اس سے قبل متعدد بار اُردو ہندی نزاع کے متعلق اظہار خیال کر چکا ہوں اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اُردو کو ہندوستانی کہنا بھی پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ ہندی ہندوستانی لیکن اسی کے ساتھ میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہندوؤں نے اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان ہندی قرار دیں گے، تو مسلمانوں کو یہ کوشش نہ کرنا چاہئے کہ وہ اُردو یا ہندوستانی زبان میں کوئی ایسا تغیر پیدا کریں جو ہندوؤں کے لئے قابل قبول ہو کیونکہ یہ ناممکن العمل بات ہے، لیکن انھیں ہندی ضرور حاصل کرنا چاہئے کہ یہ نہ صرف اُردو کی خدمت ہے بلکہ ایک ایسے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے جو ملک کی بڑی جماعت نے کیا ہے اور جس سے ملکر ہم کو ملک و وطن کی خدمت انجام دینا ہے۔ لیکن افسوس تو یہی ہے کہ ہمارے برادران وطن نہ اس جرأت کیلئے آمادہ ہیں، نہ اُس رواداری کے لئے اور

مجھی سے پھر گلہ اُٹھا رہے چاک گریباں کا

مسئلۂ امامت وخلافت کے متعلق میں نے وعدہ کیا تھا کہ جولائی کے رسالہ میں دوبارہ اپنے خیالات کا اظہار کروں گا اگر کسی سنی عالم کی طرف سے "آزاد خیال شیعی عالم" کے مقالہ کا کوئی معقول جواب موصول نہ ہوا، ہر چند اس دوران میں متعدد مضامین اہل سنت کی طرف سے پہونچے، لیکن ان میں کوئی اس قابل نہ تھا کہ درج کیا جاتا۔ سب کے سب اسی فرسودہ ذہنیت و پامال طرز مناظرہ کے حامل تھے جو مولویوں کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ اتفاق سے ٹھیک اسوقت جبکہ جون کے نگار کی آخری کاپی کتابت کے لئے دیجانے والی تھی، ایک مضمون ایسے عالم کی طرف سے موصول ہوا جو علوم مشرقی و مغربی دونوں کے فاضل ہیں اور جنھوں نے کافی غور کرنے کے بعد اظہار خیال کیا ہے۔ چنانچہ آیندہ ماہ کے رسالہ میں یہ مضمون تمام و کمال شایع کر دیا جائیگا اور اس کا جو جواب حضرات شیعہ کی طرف سے ملیگا اسکی اشاعت کے بعد میں اسوقت تک کے تمام شایع شدہ لٹریچر کو پیش نظر رکھ کر اپنی رائے ظاہر کروں گا۔

یزداں شکار کی ترکیب صحیح ہے گزشتہ ماہ کے نگار میں جناب شادانی کے مضمون پر میں نے اختلافی نوٹ دیا تھا، لیکن اس کے بعد میرے دوست جناب ابوالکمال امید امیٹھوی نے صائب کے اس شعر کی طرف مجھے توجہ دلائی :-

بال پرواز ترا ہر چند صائب بستہ اند　　شکر للہ خاطر معنی شکارم دادہ اند

اس میں معنی شکار بالکل اسی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے جو یزداں شکار میں پائی جاتی ہے، اس لئے اب مجھے اس ترکیب کی صحت سے انکار نہیں ہے اور میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ جناب شادانی کا ایک مضمون اور ملا جس میں انھوں نے فارسی کے متعدد مستند شعراء کے کلام سے اس ترکیب کی صحت پر استناد کیا ہے۔ ان میں سے چند یہاں درج کرتا ہوں :-

قاآنی —— بے عبارت راز گوئی و بے اشارت راز جوئے　　بے تکلم دلفریب و بے تبسم جاں شکار

سپہر کاشانی —— چارۂ اید ربیا تا ما و تو دستاں زنیم　　جاں رہا ہاں تا ندست ایں بلائے جاں شکار

شیبانی —— گر نہ خواہد دل چرا شد بسیں خم زلفین یار　　دلفریب و دلربا و دلستان و دل شکار

صباحی کاشی —— بیجو چشم و روئے خوباں نرگس و گل راعیاں　　دیدۂ عابد فریب و چہرۂ زاہد شکار

ہاتفی —— بفر مود عفر ماندۂ روزگار　　کہ غرندہ شیران مردم شکار

میں جناب شادانی کا از بس ممنون ہوں کہ باوجود ناسازی مزاج کے انھوں نے تلاش و جستجو کی زحمت گوارا فرمائی اور اس طرح مجھے میری غلطی سے متنبہ کر دیا۔ موصوف کا مضمون اسوقت پہونچا جب جون کا نگار بالکل مکمل ہو چکا تھا اور میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس انتباہ و اصلاح کے اعلان میں ایک ماہ کی تعویق ہو اس لئے میں نے اوسی فرصت میں اسکا اظہار ضروری سمجھا میں پھر ایک بار جناب امید اور جناب شادانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں

اسفارِ موسیٰ علومِ جدید کی روشنی میں

(ملاحدۂ عہدِ حاضر کے نقطۂ نظر سے)

توریت یا بائبل کے ابتدائی پانچ صحیفے "پنج اسفار موسیٰ" (Pentateuch) کہلاتے ہیں۔ ان کے متعلق عرصہ تک لوگوں کا اعتقاد یہ رہا ہے (اور اب بھی بعض جماعتیں اسی اعتقاد پر قایم ہیں) کہ ان کے مصنف حضرت موسیٰ تھے۔ حالانکہ یہ اسفار ان کے صدیوں بعد مرتب ہوئے ہیں اور حضرت موسیٰ کو ان کی ترتیب و تصنیف سے کوئی واسطہ نہ تھا

لیکن اگر اہل مذاہب کا اصرار ہے کہ نہیں یہ اسفار واقعی نتیجہ ہیں الہام خداوندی کا جسکی بنار پر حضرت موسیٰ کو اپنے موت و دفن کا حال بھی قبل از وقت معلوم ہوگیا تھا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان الہامات کی ذمہ داری تمامتر حضرت موسیٰ پر عاید ہوتی ہے، یا بالفاظ دیگر خود ذات ربانی پر جس نے اپنے ایک نبی کی زبان سے ان حقیقتوں کو ظاہر کیا

مذاہب کی بنیاد دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے مظاہر قدرت اور حوادثِ طبیعی کے سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو اور کوئی نہ کوئی توجیہہ و تاویل اس نے مقرر نہ کی ہو۔ لیل و نہار کا ظہور، موسموں کا تغیر، مینھ کا برسنا، اولوں کا گرنا، بجلی کی چمک، سمندروں کا مدوجزر، زلزلہ و طوفان وغیرہ متعدد ایسے مناظر تھے جنھیں انسان اولین نے خوف و استعجاب کے ساتھ دیکھا اور اس کی مختلف تاویلیں اس نے کیں، لیکن اس کی کوئی تاویل اس احساس سے خالی نہ تھی کہ یہ سب کچھ کسی غیبی قوت کا کام ہے جسکے مقابلہ میں انسان عاجز ہے، پھر چونکہ اس قدرت کا تخیل وہ خود اپنے مادی وجود اور اپنے تاثرات سے علحدہ ہو کر قایم نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اس نے سمجھا کہ وہ قوت بھی وہی جذبات رکھتی ہوگی جو خود انسان کے اندر پائے جاتے ہیں، یعنی اس کو غذا کی بھی خواہش ہوتی ہوگی، اسے غصہ بھی آتا ہوگا، وہ خوش بھی ہوتی ہوگی، اس لئے اس نے سوچا کہ تمام وہ حوادث طبیعی جن سے انسان کو نقصان پہونچتا ہے۔ اسی قوت کا غصہ ہے اور وہ مظاہر جن سے انسان کو فایدہ پہونچتا ہے اس قدرت کی خوشنودی کے علامات ہیں۔ پھر چونکہ انسان کو قوت غیبی کے اس غصہ سے بہت نقصان پہونچا کرتا تھا اور اس کی خوشنودی سے

فایدہ اس لئے اس نے سوچا کہ قدرت کی حصول خوشنودی کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے چنانچہ اس نے خیال کیا کہ جس طرح انسان عاجزی و خوشامد، دعوت و ضیافت، تحفہ و ہدیہ سے خوش ہوتا ہے اسی طرح یقیناً وہ قوت بھی خوش ہوتی ہوگی اور یہ ہے اصل بنیاد طاعت و عبادت، اور روزہ و قربانی کی گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ عبادت کے تمام مراسم کی بنیاد صرف اس اعتقاد پر قایم ہے کہ تمام کاروبار انسانی کسی اور قوت کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اگر چاہے تو واقعات و حوادث کی رفتار و ترتیب کو بھی بدل سکتی ہے یعنی اگر اس قوت کی خوشامد کی جائے، اس کو قربانی دیکر خوش کیا جائے تو وہ طوفان کو بھی روک سکتی ہے، ژالہ باری کو بھی ملتوی کر سکتی ہے، آتش فشاں پہاڑوں کی آگ کو بھی سرد کر سکتی ہے، زلزلوں کو بھی دور کر سکتی ہے، اور اپنے لطف و عنایت سے جس کو چاہے بے انتہا خوشحال اور جس کو چاہے پامال بھی کر سکتی ہے۔ الغرض اُس بُت پرست کافر سے لیکر جو مورتیوں کی پوجا کرتا ہے، اس یزداں پرست تک جو خدا کا ایک غیر مادی بلند تخیل اپنے سامنے رکھتا ہے، سب کی طاعت و پرستش کا اصل مقصود، خدا یا غیبی قوت کو خوش رکھنا ہے تاکہ خود اس کی خوشحالی یا نجات متیقن ہو جائے

عہد تاریخ یا ایجاد تحریر سے قبل مذاہب عالم کی یقیناً مختلف و متعدد صورتیں پائی جاتی ہوں گی، جن کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں، لیکن پھر بھی باوجود اس کے کہ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذاہب کے مفہوم، خدا کے تصور اور عبادات کی نوعیت میں بہت کچھ اصلاح و تغیر ہو گیا ہے، یہ خیال ابتک اسی عہد تاریک کے مذاہب کا چلا آرہا ہے کہ خدا طاعت و عبادت سے خوش ہوتا ہے اور نظام کائنات کی رفتار کو جب چاہے بدل سکتا ہے، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کا بلند ترین مذہب بھی عبادت و قربانی کے وجوب اور معجزہ و کرامات کے صدور و امکانِ صدور کے عقیدہ سے خالی نہیں ہے

قرونِ مظلمہ میں جب ذہن انسانی نے علوم و فنون کی بنیاد نہ ڈالی تھی، مذہب بالکل سادہ حیثیت رکھتا تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ انتہائی عقیدت و رسوخ کے ساتھ ہر ان ہونی بات کو ہونی اور ہر محال کو ممکن سمجھ کر خواب کی سی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن جب رفتہ رفتہ لاکھوں سال تک گرم و سرد، نشیب و فراز، کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اس نے سوسائٹی کے اصول بنائے، بُرے بھلے میں حد فاصل قایم کی اور ابتدائی علوم و فنون کی طرح ڈالی تو اس ذہنی تغیر کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے معتقدات مذہبی کو بھی منظم کیا اور کوشش کی کہ مذہبی ادارے بھی ذہنی اداروں کے دوش بدوش چلتے رہیں، لیکن افسوس ہے کہ اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی

چاہئے تو یہ تھا کہ جوں جوں انسان کو عقل آتی جاتی وہ مذہب کے ان تمام معتقدات کو جو صرف

اس کے جہل و جذبۂ خوف و استعجاب سے پیدا ہوئے تھے ترک کرتا جاتا، لیکن جو عقیدہ لاکھوں کروڑوں سال سے نسلاً بعد نسلٍ خون میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا اس کا دور کرنا واقعی بہت مشکل تھا، اس لئے اس نے بجائے اس کے کہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر کس کر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا حکم لگاتا، خود عقل کو کھینچ تان کر مذہب پر منطبق کرنے لگا، اور یہی وہ سب سے بڑی غلطی تھی جس نے مذہب کی بنیادیں متزلزل کر دیں، کیونکہ کاروبارِ عقل کا تعلق صرف تجربات انسانی سے ہے اور اس لئے اس کی کوئی حد متعین نہیں ہو سکتی، ہو سکتا ہے کہ وہی چیز جسے آج عقل انسانی پتھر کہتی ہے کل ہیرا کہنے لگے، وہی تاویل جو آج اس کے نزدیک یقینی ہو کل متزلزل ہو جائے۔ بنابراں اگر مذہب کے متعلق بھی تاویلات عقلی کا سلسلہ برابر جاری رہا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس کے حدود کبھی متعین نہ ہو سکیں گے اور ایک نہ ایک دن اس قلادہ کو گردن سے اُتار پھینکنا ہی پڑے گا

مذہب کی بنیاد یا بیک گرونڈ صرف کورانہ تقلید ہے اور اس میں استعمال عقل کی مطلق گنجایش نہیں سمجھ کی بحث آئی اور مذہب رخصت ہوا اس لئے کسی مذہب والے کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس کا مذہب ہمیشہ اور ہر زمانہ میں عقل کا ساتھ دینے کے لئے طیار ہے، گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ اس کے مذہب کے اُصول و عقاید ابھی متعین ہی نہیں ہوئے

پھر چونکہ عقل کی کرشمہ آرائیاں اور اسی کے ساتھ الحاد زائیاں اسوقت زیادہ تر مغرب ہی میں دیکھی جاتی ہیں اس لئے سب سے زیادہ اہل کلیسا ہی کو اس کی فکر پڑی ہے کہ وہ اپنی الہامی کتابوں کے الہامی معتقدات و تعلیمات کو علم کے حملے سے بچائیں اور اس کے تتبع میں ایشیائی مذاہب والوں کی طرف سے بھی یہ حرکات مذبوحی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتی ہیں۔ کچھ زمانہ سے مغرب میں عقل و مذہب کی جنگ بہت شدید ہو گئی ہے، یہاں تک کہ امریکہ میں تو بعض جماعتیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جو مسیح کے وجود کی بھی قایل نہیں ہیں اور بائبل کی تعلیم کو دماغی نشو ونما کے منافی ظاہر کر کے مدارس کے نصاب سے اس کو بالکل خارج کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ پھر چونکہ اس دورِ آزادی میں اہل کلیسا یہ تو کر نہیں سکتے کہ بزورِ شمشیر اس تحریک کو دبا سکیں اس لئے وہ عقل کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل ہی سے کام لینے لگے ہیں، یعنی بائبل کی جن تعلیمات کو لغو و مہمل قرار دیا جاتا ہے وہ انھیں علمی حقایق کی صورت سے پیش کرنا چاہتے ہیں، درانحالیکہ مذہب کا کام نہ علمی گتھیاں سلجھانا ہے اور نہ فنی نظریئے پیش کرنا

توریت کے بتائے ہوئے بہت سے عقاید ایسے ہیں جو مذاہب مابعد میں بھی پائے جاتے ہیں، اسلئے "اسفارِ موسیٰ" کی تعلیمات پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کا تعلق کسی ایک مذہب سے نہیں بلکہ متعدد

مذاہب سے ہو جاتا ہے اور اس طرح بہ حیثیت مجموعی یہ بحث ایک عام مذہبی و علمی تصادم کی بحث ہو جاتی ہے جس پر تمام اہل مذاہب کو غور کرنا چاہیئے

کیا اسفارِ موسیٰ الہامی تھے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسفار کے مصنف حضرت موسیٰ ہی تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات انھوں نے کہاں حاصل کیں۔

اہل مذاہب کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ الہام خداوندی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ ہم کن باتوں کو الہامی کہہ سکتے ہیں اور کن کو نہیں۔

فرض کیجئے کہ آج ایک شخص یہ دعوے کرے کہ نظریۂ ارتقا اس پر الہام ہوا ہے تو کیا ہم اسکو یقین کرلیں گے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نظریہ ڈارون نے پیش کیا تھا اور اس مدعی الہام کو اس کا علم یقیناً ڈارون ہی کی تصانیف سے ہوا ہوگا۔ یا فرض کیجئے خود ڈارون یہ کہے کہ نظریۂ ارتقا کا علم اس کو خدا کی طرف سے ہوا ہے تو کیا ہم اس کو صحیح سمجھیں گے جبکہ لامارک بہت پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا تھا۔ الغرض الہام کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسی بات سے متعلق ہو جس کا علم لوگوں کو پہلے حاصل نہ تھا۔ ورنہ اس کو کوئی شخص الہام تسلیم نہ کرے گا۔

اب حضرت موسیٰ کے بتائے ہوئے اساسی اعتقاداتِ تخلیق عالم کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بجنسہٖ یہی خیال مصری کاہنوں کا بھی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ (۱) خدا نے اصل مادہ کو ہیولیٰ کی صورت میں پیدا کیا (۲) خدا نے اس مادہ کو ایک مخصوص ہیئت میں تبدیل کیا (۳) خدا نے لفظ "کُن" کہکر پیدا کیا اور (۴) آفتاب کی تخلیق سے پہلے خدا نے روشنی پیدا کی۔

پھر چونکہ حضرت موسیٰ فرعون کی لڑکی کے متبنّیٰ تھے اور ایک شاہزادہ کے سے حقوق و مناصب انھیں حاصل تھے اس لئے ظاہر ہے کہ مصری روایات، مصری عقاید مذہبی اور مصری ادبیات و فلسفہ سے وہ بخوبی واقف رہے ہوں گے اور جسوقت انھوں نے اصلاح قوم کا کام شروع کیا تو بادنیٰ تغیر یہی عقاید بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دئے۔ پھر اگر یہ عقاید واقعی الہامی ہوں بھی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ان کا الہام حضرت موسیٰ پر نہ ہوا تھا بلکہ مصری کاہنوں یا ان سے بھی قبل اُن لوگوں پر ہوا تھا جنھوں نے سب سے پہلے ان عقاید کو پیش کیا۔ اب آیئے تخلیق کائنات کے عقیدہ پر علمی نقطۂ نظر سے بھی غور کریں کہ اس میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔

مسئلۂ تخلیق عالم اسفارِ موسیٰ میں بتایا گیا ہے کہ "سب سے پہلے خدا نے آسمان و زمین پیدا کئے"۔ "پیدا کرنے" کا مفہوم کیا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے "آسمان و زمین"

کو کسی خاص مادہ سے بنایا کیونکہ عدمِ محض سے کسی شے کا وجود میں آنا ممکن نہیں، پھر اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کہاں سے آیا، اور اگر وہ خود کسی اور مادہ سے پیدا ہوا تو اس مادہ کا وجود کیونکر ممکن ہوا الغرض آخر میں آپ کو کوئی چیز علت العلل یا علتِ اولیٰ کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے گی جو ازلی و ابدی ہے اگر یہ کہا جائے کہ علت العلل صرف خدا کی ذات ہے تو بہ لحاظِ قوت ہونے کے تو ہم اس کو صحیح مانتے ہیں لیکن مادی اشیاء کے وجود کے لئے پہلے کسی مادہ کی تخلیق ضروری قرار پائے گی اور اس طرح خدا اور مادہ دونوں کو قدیم ماننا پڑے گا جو اہل مذاہب کے عقیدہ کے منافی ہے۔

اب دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے تعیین وقت ضروری ہوگی، یعنی کوئی زمانہ ایسا ضرور ماننا پڑے گا جب کائنات کا وجود نہ رہا ہوگا اور پھر اس کے بعد یہ سب کچھ ظاہر ہوا ہوگا۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وجود کائنات سے قبل خدا کیا کرتا تھا۔ کوئی چیز موجود نہ تھی کہ وہ اس کا خیال کرتا ہوگا، کوئی واقعہ ظاہر نہ ہوا تھا کہ وہ اس کا تصور کرتا ہوگا، پھر کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک غیر محدود فراستِ مطلق ایک غیر محدود عدمیت کی حالت میں پائی جائے۔

خدا اپنی تمام صفات کے ساتھ ازلی و ابدی مانا جاتا ہے اس لئے اس کی صفتِ تخلیق بھی قدیم ہے اور چونکہ تخلیق بغیر مخلوقات کے متعین نہیں ہو سکتی اس لئے خالق و مخلوق دونوں کو قدیم ماننا پڑے گا جو مذاہب عالم کے عقیدہ کے بالکل خلاف ہے۔

الغرض اسفارِ موسیٰ میں تخلیق عالم کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ وہی ہے جو بابل کی مٹی کی تختیوں پر، مصر کی قدیم یادگاروں پر اور ہندوستان کے پرانے مندروں میں منقوش تھی اور اس سے زیادہ اسوقت کچھ کہا بھی نہ جا سکتا تھا، کیونکہ ذہن انسانی اس سے زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت ہی نہ رکھتا تھا، اب رہا ایسی باتوں کو الہامی قرار دینا، سو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ باتیں جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکیں ان کو قابل قبول بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے انھیں یہ یقین دلایا جائے کہ تم بیوقوف ہو تمھاری عقل محدود ہے اور تم بہت سی باتیں نہیں سمجھ سکتے اور پھر اس کے بعد ان باتوں کو خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے، چنانچہ دنیائے مذاہب میں مولویوں، پنڈتوں، راہبوں، موبدوں پیروں، فقیروں کے اقتدار و تسلط کا سبب صرف یہی تھا اور ہے کہ وہ مذہبی عقاید و تعلیمات کو منجانب اللہ بتاتے ہیں اور جب کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، تو اس کی عقل کو ناقص بتاتے ہیں، اپنے آپ کو فرستادۂ خدا ظاہر کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ خدا کے عذاب سے بھی ڈراتے جاتے ہیں۔ درانحالیکہ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ جن باتوں کو ملہمات ربانی کہا جاتا ہے وہ صحیح ہیں یا نہیں اگر ہیں تو یہ ضرور نہیں کہ

ہر سچی بات الہام ہی کے ذریعہ سے معلوم ہو اور عقل انسانی اس کو نہ معلوم کر سکے اور اگر غلط ہیں تو ان کو الہام و وحی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہو سکتا۔

حیرت ہے کہ تعلیمات خداوندی صرف انھیں لوگوں کے لئے ہوں جو بیوقوف ولایعقل ہیں یا جو اپنے آپ کو احمق سمجھتے ہیں، اور عقل سے کام لینے والوں کا حصہ ان میں سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ رکھا جائے۔ الغرض مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مذہبی عقاید کی بنیاد انسان کے صرف وہ گزشتہ تاثرات ہیں جو عہد وحشت میں اس پر طاری ہوئے تھے، اور وہی عقاید بہ ادنیٰ تغیر رفتہ رفتہ تمام ممالک و اقوام میں پھیل گئے اور ان کی اشاعت کرنے والی جماعتوں نے جنھیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس الہام و وحی کے خیال کو بدستور قایم رہنے دیا کیونکہ ان کے منصب دینی کی حفاظت اسی صورت سے ممکن تھی، چنانچہ تخلیق کائنات کے مسئلہ کو بھی یہودیوں نے الہام خداوندی ہی بتایا اور "اسفار خمسہ" کو جن کا تعلق نہ حقیقتاً موسیٰ سے تھا نہ الہام خداوندی سے (بلکہ مصریوں کے قدیم روایات مذہبی سے) خدا سے منسوب کر کے ان کو سماوی حیثیت دیدی۔

تخلیق عالم کے سلسلہ میں دوسری بات "اسفارِ موسیٰ" میں یہ درج ہے کہ "خدا نے روشنی پیدا کی اور تاریکی سے اُسے جدا کیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی و روشنی دو مادی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے مخلوط تھیں اور پھر خدا نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ حالانکہ تاریکی نام صرف فقدان روشنی کا ہے، جس طرح برودت فقدان حرارت کا اور نورِ مطلق یا حرارتِ مطلق کا کوئی ایسا تصور جو تاریکی یا برودت کے خیال سے جدا ہو، ممکن نہیں، ہم کو ان کیفیات کے صرف مدارج کا علم حاصل ہوتا ہے نہ کہ علی الاطلاق فی نفسہٖ ان چیزوں کا۔ فرض کیجئے کہ ہم کسی پہاڑی کی چوٹی پر چلے جائیں اور وہاں پارہ صفر سے بھی ۲۰ درجے نیچے ہو تو اس کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ ہم نے برودتِ مطلق کا علم حاصل کر لیا کیونکہ ان مقامات کے لحاظ سے جہاں پارہ ۴۰ درجے صفر سے نیچے ہے یہ حالت زیادہ گرم کہلائے گی۔ الغرض روشنی اور تاریکی مادی چیزیں نہیں ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علحدہ کیا جا سکے اور اس لئے "اسفار خمسہ" کے اس بیان کو الہامی قرار دینا درست نہیں، کیونکہ اگر ہر صحیح بات کا الہامی ہونا ضروری نہیں لیکن ہر الہامی بات کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک جو کچھ بیان ہوا (یعنی آسمان و زمین کا پیدا کیا جانا اور نور و تاریکی کا ایک دوسرے سے علحدہ ہونا) پیر کے دن کی باتیں تھیں، اب منگل کو کیا ہوا اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آسمان کی حقیقت

"اسفارِ موسیٰ" میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد "خدا نے کہا کہ پانیوں (سمندروں) کے درمیان فلک پیدا ہو جائے اور ہر ایک پانی کو دوسرے پانی سے علحدہ کر دے

چنانچہ فلک پیدا ہوگیا اور ایک پانی دوسرے پانی سے علٰحدہ ہوگیا"

"فلک" سے کیا مراد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد فضائے بسیط ہے، لیکن یہ بات بالکل ناقابل قبول ہے کہ فضائے بسیط "پانیوں" میں تقسیم پیدا کردے، یعنی پانی کا ایک حصہ فضا کے اوپر رہے اور دوسرا اس کے نیچے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ آسمان یا فلک ایک ٹھوس چیز ہے جس پر خدا متمکن ہے اور پانی کا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اسی لئے جب امساک باراں ہوتا تھا تو لوگ دعائیں مانگتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ خدا اس فرشتہ کو جس کے سپرد پانی کی نگرانی ہے حکم دیگا اور وہ آسمان سے مینھ برسا دے گا۔ چنانچہ طوفان نوح کا آنا بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "آسمانی کھڑکیاں کھولدی گئیں اور دُنیا ڈوب گئی"

آسمان کو ٹھوس چیز سمجھنے کا ثبوت توریت کی اور متعدد آیتوں سے بھی ملتا ہے مثلاً موسیٰ نے جب یعقوبؑ کا خواب بیان کیا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔ "اس نے خواب دیکھا کہ ایک سیڑھی قایم ہے جسکا نچلا حصہ زمین پر ہے اور سرا آسمان تک پہونچا ہوا ہے اور فرشتے اس پر چڑھ اُتر رہے ہیں"

اسی طرح برج بابل کے متعلق تحریر ہے کہ جس وقت لوگ اس کی تعمیر میں مصروف تھے، خدا اُترا اور اس نے ان لوگوں کی ایک زبان کو مختلف زبانوں میں تبدیل کردیا، تاکہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے اور برج تعمیر نہ ہوسکے۔

الغرض توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ کے زمانہ میں آسمان کو چھت کی طرح ٹھوس اور مادی چیز سمجھا جاتا تھا اور یہی عقیدہ متبعین مسیحؑ کا بھی تھا چنانچہ عیسیٰؑ کا آسمان پر خدا کے پاس چلا جانا اسی بنا پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

اب علوم جدیدہ نے آسمان وزمین کی حقیقت کو جس وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا علم سب کو ہے اور غالباً کوئی متنفس ایسا نہیں جو آسمان کو ٹھوس چیز سمجھتا ہو۔ دوربینوں نے کائنات کی غیر متناہی فضاء بسیط کو ثوابت وسیار سے معمور ہونا ثابت کردیا ہے اور علم الجو نے یہ امر بپایۂ تحقیق تک پہونچا دیا ہے کہ چند میل سے زیادہ کوئی شخص اوپر جا نہیں سکتا کیونکہ وہاں تنفس کے لئے آکسیجن موجود نہیں ہے اور اتنی سخت سردی پائی جاتی ہے کہ انسان وہاں پہونچتے ہی یخ بستہ ہوجائے اس لئے ظاہر ہے کہ اسوقت اسفار موسیٰ یا دوسری مذہبی کتابوں کے ایسے بیانات جن سے آسمان کا ٹھوس چیز ہونا ظاہر ہوتا ہے، کیونکر قابل قبول ہوسکتے ہیں اور ان کو الہامی ظاہر کرکے ہم

"کتب مقدسہ" کی کیا حرمت و عزت قایم کر سکتے ہیں

سمندروں سے زمین کا ظہور اس کے بعد اسفار موسیٰ میں درج ہے کہ خدا نے پانی کو سمیٹنا شروع کیا تاکہ زمین ظاہر ہو، چنانچہ پانی سمٹنا شروع ہوا، زمین ظاہر ہوئی اور نباتات اُگ کر پھول، پتی اور پھل لے آئے، اور یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ (یہ واضح رہے کہ ابھی تک آفتاب کی تخلیق نہیں ہوئی تھی)

پھر اس زمانہ میں جبکہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ زمین گول ہے، آفتاب کے گرد طواف کرتی ہے، اس میں کشش ثقل کا قانون جاری و ساری ہے، کوئی ذیحیات بغیر آفتاب کی حرارت کے نہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے کیونکر پانی کے سمٹنے اور تخلیق آفتاب سے قبل ہی نباتات پیدا ہونے پر یقین لایا جا سکتا ہے۔

اس "ایک دن" کی تاویل اہل مذاہب کی طرف سے یہ کیجاتی ہے کہ اس سے مراد ۲۴ گھنٹے نہیں ہیں بلکہ ایک طویل زمانہ و مدت مقصود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تخلیق نباتات کے لاکھوں کروروں سال بعد جانور پیدا کئے گئے (کیونکہ اسفارِ موسیٰ میں پانچویں دن جانوروں کا پیدا کیا جانا ظاہر کیا ہے) اور اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب جانوروں کا وجود ظہور میں نہ آیا تھا تو نباتات پیدا کرنے کی غرض کیا تھی

جدید علم طبقات الارض کی رُو سے زمین کے پانچ دور تسلیم کئے گئے ہیں اور ہر دور کروروں سال کا مانا گیا ہے، پہلے دور میں Algae[1] اور Vertebrates[2] کی پیدائش ہوئی دوسرے دور میں مچھلیاں پیدا ہوئیں اور وہ درخت جو پھل پھول نہیں لاتے تھے۔ تیسرے دور میں صنوبر کے جنگل اور رینگنے والے جانور پیدا ہوئے، چوتھے دور میں پھل پھول لانے والے درخت اور دودھ پلانے والے جانور پیدا ہوئے اور پانچویں دور میں انسان

اول تو اس جدید تحقیق کو غلط قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ وہم و قیاس کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اکتشافات علمی و جستجوئے آثار کا نتیجہ ہے، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سب ظن و قیاس ہے تو بھی اسفارِ موسیٰ کے بیان سے زیادہ دلنشین ہے، کیونکہ وہ اُصول قدرت اور ہمارے موجودہ

---

[1] آبی پودھے جن کے جڑ نہیں ہوتی اور صرف پانی اور ہوا سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں

[2] اس سے مراد بغیر سر کے وہ حشرات ہیں جو ریڑھ کی گڑیاں تو رکھتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہیں ہوتیں

تجربات کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے اور یہ ٹھیک نوامیس فطرت کے مطابق ہے

قدرت کے نظام میں "بیکار و غیر مفید" چیز کوئی نہیں پائی جاتی، یعنی جب تک اس کا مصرف نہ پیدا ہو، وجود میں نہیں آتی، اس لئے اسفارِ موسیٰ کے بیان کے مطابق سب سے پہلے نباتات کا پیدا کیا جانا بغیر اس کے کہ اس کا کوئی مصرف موجود ہو، کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا

قدرت نے نباتات و حیوانات کی پیدائش میں ہمیشہ توازن قایم رکھا ہے اور دونوں کی تخلیق اپنے ساتھ ہی ساتھ کی ہے، پھر جوں جوں ایک کے حال میں تغیر پیدا ہوتا گیا ویسے ہی دوسرے میں تبدیلی ہوتی گئی، اس لئے یہ کہنا کہ پہلے نباتات پیدا کئے گئے اور اس کے لاکھوں کروڑوں سال بعد حیوانات وجود میں آئے، بالکل اصول قدرت کے منافی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے عرصہ تک نباتات کا بیکار پڑا رہنا فطرت نے کیوں گوارا کیا

آفتاب و ماہتاب کی تخلیق اسفارِ موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آفرینش کے چوتھے دن "خدا نے دو روشنیاں پیدا کیں ایک بڑی روشنی دن پر حکمرانی کرنے کیلئے دوسری ضعیف روشنی رات پر حکمرانی کے لئے اور اسی کے ساتھ اس نے ستارے بھی پیدا کئے"

اس بیان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ آفتاب کے حجم سے یقیناً بالکل آگاہ نہ تھے؟ آپ ایک دائرہ پانچ انچ قطر کا بنائیے اور اس کے پہلو میں سوئی کی نوک چبھو دیجئے پھر اس سوراخ اور دائرہ میں جو نسبت ہوگی وہی نسبت تقریباً زمین و آفتاب میں ہے۔ یقیناً وہ اس سے بالکل بے خبر تھے کہ آفتاب کا قطر ۸ لاکھ ۶۰ ہزار میل کا ہے اور اس کے چاروں طرف پانچ ہزار میل کا موٹا آتشیں غلاف چڑھا ہوا ہے جس میں ہر وقت سو میل فی سکنڈ کے حساب سے آتشیں ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور جس کے سامنے دوزخ کی گرمی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہر لمحہ آفتاب سے اتنی ہی حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے جتنی گیارہ ارب ٹن کوئلہ کو مشتعل کرنے کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے بھی واقف نہ تھے کہ زمین کا حجم آفتاب کے مقابلہ میں ۱/۱۰۰۰۰۰۰ سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی اگر آفتاب کے دس کروڑ ٹکڑے کئے جائیں تو زمین کا حجم اس ایک ٹکڑے کے برابر ہوگا۔ وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ نظام شمسی میں اور کتنے سیارے شامل ہیں جو اسی آفتاب کے جدا شدہ اجزا ہیں۔ وہ ان حقایق سے بھی بے خبر تھے کہ سیارۂ مشتری کا قطر ۸۵۰۰۰ میل کا ہے اور اقمار چہارگانہ کے ساتھ وہ اپنے طور پر ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گردش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سیارۂ زحل کے حلقوں اور اس کے آٹھ چاندوں سے بھی آگاہ نہ تھے اور ان کو کوئی علم اس بات کا نہ تھا کہ نظام شمسی کے تمام سیارے جن میں اکثر زمین کے وجود

سے بہت زمانہ قبل پائے جاتے تھے آفتاب ہی کے اجزا ہیں اور وجودِ آفتاب سے قبل ان کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔

وہ سمجھتے تھے کہ آفتاب کا قطر تین چار فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور چاند کا قطر اس کا نصف ہے اور زمین کے مقابلہ میں یہ دونوں بہت حقیر ہیں اس زمانہ کے الہامی لٹریچر میں اور بھی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ فلکیات سے یہ لوگ کس قدر بیگانہ تھے، چنانچہ کتاب یوشع میں ایک جگہ لکھا ہے کہ آفتاب دن بھر ٹھہرا رہا تاکہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیں" مذہب اسلام میں بھی ایکبار آفتاب کے پلٹ آنے کا ذکر بطور معجزہ کے پایا جاتا ہے، حالانکہ اس کا غیر ممکن ہونا ظاہر ہے

حضرت موسیٰؑ کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے صرف ۱۵۰۰ سال پہلے کا ہے لیکن حیرت ہے کہ انھیں فلکیات کا علم اتنا بھی حاصل نہ تھا جتنا چینیوں کو عیسےٰ سے ڈھائی ہزار برس قبل حاصل تھا۔ چین کی تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عطارد، مریخ، مشتری و زحل کا اجتماع ہوا تو وہاں کے بادشاہ چوہیو نے اسے ایک نئے عہد کا آغاز قرار دیا۔ اور مسٹر بیلی نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ان سیاروں کا اجتماع یقیناً مسیح سے ۲۴۴۹ سال قبل ہوا تھا۔

قدیم چینی نہ صرف سیاروں کی گردش سے واقف تھے بلکہ سورج گرہن کا زمانہ بھی متعین کر دیتے تھے۔ چنانچہ شاہ چوکانگ کے زمانہ میں دربار کے دو نجومی (ہو اور ہی) صرف اس لئے قتل کر دئے گئے کہ انھوں نے اس سورج گرہن کا زمانہ نہیں بتایا جو ۲۱۶۹ قبل مسیح میں پڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی دربار کے نجومیوں کا فرض تھا کہ وہ کسوف و خسوف کے اوقات متعین کرتے رہیں۔ الغرض اسفارِ موسیٰ میں تخلیق کائنات اور نظام عالم کا جو تخیل پیش کیا گیا ہے وہ حد درجہ طفلانہ ہے اور اہلِ کلیسا نے ہمیشہ بزورِ مشت ان عقاید کو رائج کرنا چاہا، چنانچہ اب سے ایک صدی قبل مشہور ماہر طبیعیات مسٹر بفوں کو فرانس کے کلیسا نے مجبور کیا کہ وہ اپنے نظریوں کی غلطی کا اعتراف کرے کیونکہ وہ موسیٰ کے بتائے ہوئے بیان آفرینش کے خلاف تھے۔

اسفارِ موسیٰ میں ستاروں کی تخلیق کا حال صرف ان پانچ لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ "خدا نے ستارے بھی بنائے" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ عالم سیارگان کی وسعت اور ان کے نظامِ گردش کی پیچیدگی سے قطعاً آگاہ نہ تھے۔ اور ان کو کوئی علم حاصل نہ تھا کہ:۔

۱۔ سب سے قریب واقع ہونے والا ستارہ بھی ہم سے ۲۱ ارب میل دور واقع ہے اور وہ بجائے خود ایک آفتاب ہے جو اپنی ذاتی روشنی سے منور ہے۔

۲۔ اس کے بعد کا ستارہ ۳،۷ ارب میل کی دوری پر ہے۔
۳۔ وہ ستارہ جسے سیریس کہتے ہیں ایک آفتاب ہے جو ہمارے آفتاب سے ۲۶۸۸ گنا زیادہ بڑا ہے، اس کا نظام شمسی ہمارے نظام شمسی سے بہت زیادہ وسیع ہے اور ۸۲ ارب میل دور واقع ہے۔
۴۔ قطب شمالی سے ۲۹۲ ارب میل دور واقع ہے۔
۵۔ ستارۂ کپیلا کی روشنی کو ہم تک پہونچنے میں ۴۲ سال درکار ہوتے ہیں۔
۶۔ بعض ستارے فضا میں اتنی دور واقع ہیں کہ ان کی روشنی ۵۰ لاکھ سال سے پہلے ہم تک نہیں پہونچ سکتی۔

اگر کہا جائے کہ پیغمبروں اور کتب الہامی کا مقصد فلکیات کی تعلیم دینا نہ تھا کہ وہ ان مباحث میں پڑتیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرے سے ان باتوں کے ذکر ہی کی کیا ضرورت تھی اور اگر ذکر کیا تھا تو پھر اس کو بالکل صحیح و درست ہونا چاہئے تھا۔

وحوش و طیور اور انسان کی تخلیق کہا جاتا ہے کہ پانچویں دن (جمعہ کو) خدا نے حکم دیا کہ "پانی سے ذی حیات متحرک جانور پیدا ہوں اور طیور، جو فضا میں اُڑتے پھریں"، چنانچہ خدا نے پانی سے وھیل مچھلی اور دیگر متحرک جانور پیدا کئے اور اسی طرح چڑیاں پیدا کیں۔ چھٹے دن اس نے مویشی اور حشرات الارض پیدا کئے اور ساتویں دن انسان کو اپنی شکل میں پیدا کیا۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے آبی جانور اور طیور پیدا کئے، اس کے بعد خشکی کے جانوروں کی تخلیق کی اور پھر انسان کی۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ "دن" سے ۲۴ گھنٹے کا دن مراد نہیں ہے بلکہ ایک طویل مدت مقصود ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر واقعی مقصود زمانہ ممتد ظاہر کرنا تھا تو اس کے لئے دن کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا جو انسانی گفتگو میں نہایت محدود و مختصر زمانہ کیلئے بولا جاتا ہے۔ جس طرح دن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح کوئی اور ایسا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا جس سے طویل زمانہ ظاہر ہوتا، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اہل مذاہب کی اس تاویل کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی پیدائش ارتقائی صورت سے ہوئی تھی یا دفعتاً، یعنی مخلوقات نے تدریجاً آہستہ آہستہ تغیرات قبول کر کے یہ صورت اختیار کی تھی یا ان کی پیدائش اس طرح ہوئی تھی جیسے اچانک کوئی چیز ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر صورت تدریجی ارتقاء کی تسلیم کی جائے جیسا کہ اہل سائنس کا خیال ہے تو پھر اس کے لئے کوئی خاص اصول متعین کرنا پڑے گا، حیات و بقاء حیات کا کوئی نظریہ تسلیم کرنا ہوگا اور اس لحاظ سے اسفارِ موسیٰ کا یہ بیان آفرینش بہت ناقص قرار پاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں، اور اگر یہ سب کچھ دفعتاً، اچانک ظہور میں آگیا اور آسکتا تھا تو پھر اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ خدا آج یہ چیز پیدا کرتا اور دوسرے دن وہ چیز، یہاں تک کہ پورے چھ دن (یا چھ جُگ) اس میں صرف ہو جاتے، وہ دفعتاً تمام مخلوقات کو معہ ان کے تمام مختلف انواع و اجناس کے دفعتاً بھی پیدا کر سکتا تھا اور یہی کرنا چاہئے تھا۔

اب انسان کی تخلیق کے متعلق اس بیان پر غور کیجئے کہ "اس نے انسان کو اپنی شکل میں پیدا کیا" یعنی شکل کا یہ تشابہ کوئی مادی حیثیت رکھتا تھا یا غیر مادی۔ اسفار موسیٰ کے اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشابہ مادی تھا کیونکہ خدا کا جو تصور ان میں پیش کیا گیا ہے، وہ یکسر مادی ہے۔ مثلاً یہ کہ "خدا ٹھنڈے وقت باغ میں ٹہلتا تھا"۔ "آدم و حوا اس کی آواز سنتے تھے"۔ "موسیٰ اس سے ہمکلام ہوتے تھے" وغیرہ وغیرہ۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کا خدا ہاتھ پاؤں، کان، زبان وغیرہ سب کچھ رکھتا تھا اور ان سے وہی کام لیتا تھا جو انسان لیتا ہے، یعنی وہ چلتا پھرتا تھا، بولتا تھا، سنتا تھا، غصہ ہوتا تھا، پچھتاتا تھا، انتقام لیتا تھا، نفرت کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

تصورِ خدا کی اس لغویت کو دیکھ کر بعض اہل مذاہب نے "شکل کے تشابہ" کو اخلاقی معنی میں لیا ہے یعنی "خدا کا انسان کو اپنی شکل میں پیدا کرنا" یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ خدا کے اخلاقی ہیولیٰ کی صورت سے پاک و مقدس پیدا کیا گیا۔

لیکن یہ تاویل اس سے بھی زیادہ رکیک ہے کیونکہ اول تو تقدس کا تعلق صرف انسان کے افعال و کردار سے ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ علحدہ پیدا کر کے کسی سے وابستہ کر دیجائے اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تردید خود "آدم و حوا" کے اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ انھوں نے جنت میں گناہ کیا اور وہاں سے نکالے گئے، اگر انسان کی تخلیق مقدس و معصوم ہوتی تو وہ معصیت کا مرتکب کیوں ہوتا اگر یہ کہا جائے کہ یہ تشابہ، ذہنی یعنی متعلق بہ عقل و فراست تھا تو اسکی تردید انسان کی ان حماقتوں سے ہوتی ہے جو اس سے روز سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ بہر حال یہ سب تاویلات ناممکن ہیں ورنہ اسفار موسیٰ کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا یہ تشابہ خدا سے بالکل مادی و جسمانی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کی لغویت ظاہر ہے۔

اب تخلیق انسان کے متعلق غور کیجئے کہ وہ کیونکر عمل میں آئی۔ آیا وہ تدریجی ارتقاء و بقاء اصلح کے قانون کے ماتحت عمل میں آئی یا اس طرح کہ پہلے ایک پتلا بنایا جس کی ہڈیاں، اعصاب، رگیں، دل و دماغ جگر، پھیپھڑا، معدہ وغیرہ سب مٹی کے تھے اور پھر اس پتلے میں روح پھونک دی گئی تو موجودہ صورت

گوشت، پوست، خون وغیرہ کی پیدا ہوگئی۔

جس وقت ہم حیات حیوانی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے آہستہ آہستہ انسانی صورت اختیار کی ہے۔ سب سے ابتدائی حالت کے جاندار کا نام اہل سائنس نے مونر (Moner) رکھا ہے، یعنی ایک ایسی ذی حیات مخلوق جس میں کوئی عضو نہ پایا جاتا تھا۔ وہ ایک لیسدار جیسی سی مخلوق تھی جو نہ ہاتھ پاؤں رکھتی تھی، نہ معدہ، نہ اس کے منہ تھا نہ کوئی اور عضو، وہ اپنے ماحول سے غذا حاصل کرتی تھی اور ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اگر ہم اس نظریہ کو صحیح مان لیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس لیسدار جیسی مخلوق میں آہستہ آہستہ اعضاء کی تشکیل شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ عضلات، اعصاب، گوشت و استخوان وغیرہ بنکر انسان وجود میں آیا۔

اگر اس نظریہ ارتقاء کو آپ اپنے دماغ سے نکالدیں تو تاریخ حیوانی کے تمام واقعات ایکدوسرے سے غیر مربوط ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری صورت تخلیق انسانی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (باقی)

(نوٹ) آئندہ ماہ اسی سلسلہ میں آدمؑ و حواؑ کی پیدائش، باغ عدن سے ان کا نکالا جانا، طوفان نوحؑ، برج بابل، معجزات حضرت موسیٰؑ اور دیگر مذہبی معتقدات سے بحث کی جائے گی

ایک راہبہ کے خطوطِ محبت

یہ خطوط ایک پرتگالی راہبہ میرین کے ہیں جسے مارشل شمیل کے تغافل نے بہت دل شکستہ کر دیا
تھا۔ مارشل شمیل ۱۶۶۳ء میں کپتان کی حیثیت سے افواجِ فرانس کے ساتھ پرتگال گیا اور وہیں
اس نے میرین کے معصوم دل کو دامِ محبت میں گرفتار کر لیا۔ شمیل کے حالات نہایت تفصیل سے
ملتے ہیں لیکن بدنصیب میرین کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پرتگال کے ایک متوسط الحال
خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اس نے عمر کا ابتدائی حصہ ایک عیسائی خانقاہ میں بسر کیا اسی خانقاہ میں
یہ دردِ محبت اس نے مول لیا اور شاید اسی خانقاہ میں اسکا انتقال ہوا۔
شمیل ۱۶۷۰ء کے قریب فرانس آیا اور یہاں کی دلفریبیوں میں محو ہو کر بہت جلد میرین کو بھول
گیا۔ اس نے ولیم پرنس آف آرنج کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا اور عظیم الشان فوجی خدمات کے صلہ
میں شمیل کو ۱۷۰۳ء میں مارشل اور ۱۷۰۵ء میں Knight of the Order
۱۷۱۵ء میں ۷۹ سال اس عالمِ رنگ و بو میں بسر کرنے کے بعد شمیل نے پیرس میں انتقال کیا۔
خیال ہوتا ہے کہ شمیل نہایت خوبصورت رہا ہوگا لیکن سینٹ سائمن کی یادگار مطبوعہ ۱۷۸۹ء
کے مندرجۂ ذیل الفاظ اس خیال کی تردید کرتے ہیں "شمیل کریہہ منظر فربہ اندام اور سخت غبی تھا۔
اس کو دیکھ کر یا اس کی گفتگو سن کر یہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ Love Letters of
a Portuguese nun کی عالی دماغ مصنفہ کو اس کی کیا ادا پسند آگئی۔"
ظاہر ہے کہ ایسے غیر شاعر انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ان خطوط کو (جو دل شکستہ
میرین نے اسے پرتگال اور فرانس بھیجے تھے) محفوظ رکھتا مگر بھلا ہو اس کی خود نمائی کا جس نے اسے
یہ جواہر پارے مختلف دوستوں کو دکھانے پر آمادہ کیا اور بالآخر یہ جواہر منثور اس کے ایک ادیب دوست
سیلین مصنف (False clelia) کی وساطت سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔
اس میں شبہ نہیں کہ پرتگالی راہبہ کے خطوط میں تکرارِ مضامین اور انتشارِ خیال موجود ہے مگر

دل کی بستی لٹ جانے کے بعد ان باتوں کا ہوش رہتا کسے ہے؟ ایک مشہور فرانسیسی ادیب نے کیا خوب بات کہی ہے کہ ان خطوط کی اصلیت ہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بقول (Dorat) ان خطوط میں عورت کے دلی جذبات جس طرح پیش کئے گئے ہیں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔

یورپ کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں ان خطوط کا ترجمہ موجود نہ ہو اور آج میں نگار کی وساطت سے ان کو اُردو داں اصحاب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

طالب صفوی

مکتوب اول

تو کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو جاؤ اور میں اس حال میں کہ تم سے محبت کرنے کی مدعی ہوں، تمھارے لئے تکلیف کا باعث بنوں؟ آہ، میری شکایت تو سوائے محبت کے اور کچھ نہ تھی مگر جس محبت کو تم محبت نہ سمجھو وہ محبت ہو کیونکر سکتی ہے؟ لیکن میں اظہار شکایت کے بعد منفعل کیوں ہوں؟ اگر میں شکایت نہ کرتی تو تمھیں یہ شبہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مجھے تمھارے تغافل کی کوئی پروا نہیں ہے۔

میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے دل سے صرف اس لئے خفا ہوں کہ وہ اپنی تمام کیفیات چشم و زبان کے ذریعے سے ظاہر ہی نہیں کر سکتا اور تمھاری یہ کیفیت ہے کہ ذرا ذرا سی بات مجھ سے چھپاتے ہو۔ جب میری آنکھوں سے محبت کی نرمی ظاہر ہوتی ہے تو دل کے جوش و خروش کو عدم ترجمانی کی شکایت ہوتی ہے اور جب دل کا جوش و خروش آنکھوں سے جھلکنے لگتا ہے تو محبت کی لطافت شکوہ سنج ہوتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ چشم و زبان کے بینا اور گویا قاصد بھی میرے جذبات بے پایاں کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے اور تمھارا یہ حال ہے کہ مجھے غیر سمجھ کر معمولی معمولی باتیں بھی مجھ سے چھپاتے ہو آخر تم یہ کیوں کرتے ہو؟ کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ تمھارے عدم اعتماد کی وجہ سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے؟ لیکن مجھے اتنی کرید کیوں ہے میں تمھارے دل کی گہرائیوں کا حال کیوں دریافت کرنا چاہتی ہوں جہاں تغافل و بے مہری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید تمھارا کھنچا کھنچا رہنا بھی لطف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ تم یہ نہیں چاہتے کہ زیادہ ربط ضبط میں مجھے رفتہ رفتہ تمھاری بے مہری کا حال معلوم ہو جائے۔

تم نے شروع میں اپنی سنگ دلی کا اظہار کیوں نہ کیا تاکہ میں اپنے دل کو بھی تمھارے دل کی طرح

بنانے کی کوشش کرتی ؟ مگر تم تو برابر محبت کا اظہار کرتے رہے اور جب تم نے دیکھ لیا کہ میرا تن کا دل دامِ محبت سے نہیں نکل سکتا بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ نکلنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تو تم کھل کھیلے اور میری محبت کا جواب تغافل سے دینے لگے۔

مجھے کل اس بات کا احساس ہوا کہ تم نہایت جلد باز ہو لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ تم اظہار غیظ و غضب کے علاوہ اظہارِ محبت میں کبھی بھی عجلت سے کام نہ لوگے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کل ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر چلا جانے والا عجلت پسند انسان اسی مجنونانہ عجلت سے واپس نہ آئے گا لیکن پورا ایک دن گزر گیا اور مجھ سے بے سبب روٹھنے والا شخص اب تک مجھے منانے نہیں آیا۔ ظالم محبت نے تیرا کیا قصور کیا ہے جو تو اسے اپنے گوشۂ قلب میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ؟

لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اسی سزا کی مستحق تھی۔ جب میرا دل تمہارا ہو چکا تو اسے تمہاری مرضی کے خلاف اظہارِ تمنا کا کیا حق تھا ؟ ہاں ہاں مجھے اعتراف ہے کہ قصور میرا تھا اور تمہیں سزا دینے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ کیوں یاد ہے تمہیں وہ دن جب میں نے کہا تھا کہ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں اور تم نے میرے اس ارادے کی پرزور تائید کی تھی ؟ کیا سچ مچ تمہارا ابھی یہی منشا تھا خیر اپنا ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا تم دراصل یہ سمجھتے تھے کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی ہوں ؟ میں تمہاری سرد مہری اور بے وفائی کو نظر انداز کر سکتی ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ تم مجھے بے وفا سمجھو میری محبت اتنی پاکیزہ ہے اور میرا معیارِ عشق اتنا بلند کہ مجھے تمہاری خوشی اور خفگی کی بھی پروا نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنی محبت کی نظر میں سبک سر نہ ہوں اور تم کو بدگمانی کا موقع نہ دوں مگر تم مجھ سے بدگمان ہو کیونکر سکتے ہو ؟ کیا میری رفتار گفتار اور کردار سے میری اُلفت کا اظہار نہیں ہوتا ؟

اکثر ایسا ہوا ہے کہ تم آئے اور میں نے اپنے چہرے سے صرف اس لئے قلبی جذبات مسرت کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ تمہاری آنکھیں اسوقت مجھے ضبط کا حکم دے رہی تھیں۔ اگر تم نے میری اس عظیم الشان قربانی کی قدر نہیں کی تو تم نے نہ صرف مجھ پر بلکہ اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے۔

میرا عشق اتنا بے لوث ہے کہ میں یہ دعا بھی نہیں مانگتی کہ تم مجھے مجھ سے زیادہ چاہنے لگو کیونکہ اس صورت میں تمہیں عشق کے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا اور محبوبیت کے ناز و انداز ختم ہو جائیں گے تمہارا خیال تھا کہ تمہارے عشق نے میرے جذبات اُلفت کو بیدار کیا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے سوز و گداز نے تمہارے دل میں عشق کی آگ روشن کی مگر خدا کے لئے اس اعترافِ اُلفت و اظہارِ عجز پر مغرور ہو کر اور زیادہ سنگدل نہ ہو جانا۔ آؤ اور مجھے منا کر یہ بات ثابت کر دو کہ میں نے

سب کچھ کھونے کے بعد بھی کچھ بھی نہیں کھویا۔

مکتوب دوم

اسے حسد نہ سمجھنا حقیقت یہ ہے کہ کل ہم جس عورت سے ملے تھے وہ نہایت بدصورت تھی اور اس کا انداز رقص نہایت مکروہ تھا۔ خدا جانے (Count de Cugne) نے اس کی اتنی تعریف کیوں کی اور نہ معلوم تم سے اتنی دیر اس کے پاس بیٹھا کیونکر گیا؟ چہرے سے تو بالکل بے کیف معلوم ہوتی تھی مگر تم کہتے ہو کہ اس نے نہایت پرلطف گفتگو کی۔ آخر وہ "پرلطف" گفتگو تھی کیا؟ کیا آپ کی کسی فرانسیسی محبوبہ کا ذکر خیر ہو رہا تھا یا پھر خود بدولت نے خود ان بی صاحبہ کو پسند فرما لیا تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ محبت کے ذکر کے علاوہ اتنی دیر تک کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

مجھ سے بھی کل آپ کے نو وارد فرانسیسیوں نے کچھ دیر تک "پرلطف گفتگو" کی لیکن قسم لے لو جو کوئی لفظ توجہ سے سنا ہو بلکہ سچ پوچھو تو انھیں کی بک بک جھک جھک کی وجہ سے کل ساری رات سر میں درد رہا۔ میں خود بے غیرت بنکر اپنے درد سر کا ذکر نہ کرتی تو شاید تمھیں خبر بھی نہ ہوتی کیونکہ تم تو غالباً انھیں بی صاحبہ کی مزاج پرسی میں مصروف ہو گئے جن کے ساتھ کل شب کو محو رقص تھے۔ خدا جانے تمھیں اس کم بخت کی کیا ادا پسند ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟ کیا وہ تمھیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہے؟ ناممکن ہے کہ وہ یا کوئی اور تمھیں مجھ سے زیادہ چاہ سکے۔

تمھیں یاد ہوگا پہلی ملاقات کے بعد میں نے ہی ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی تھی تم جانتے ہو کہ محبت کے کھیل میں میں سب کچھ تم پر نثار کر چکی ہوں اگر اس فرانسیسی عورت نے مجھ سے زیادہ ایثار کیا ہو تو خود میں کہوں گی کہ تم مجھے چھوڑ کر اس کے ہو جاؤ۔ مجھے تمھاری خوشی اپنی مسرت سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ بلکہ میری تو یہ رائے ہے کہ تم اس کو میرا یہ خط دکھا دو اور اس سے کہو کہ میرا تن من مجھ پر فدا ہے۔ میرا خاندان نہایت معزز ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ایسی بدصورت بھی نہیں ہوں اس لئے اگر تم اسے میرا خط دکھاؤ گے تو اس پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت حسد سے اندھی ہو رہی ہوں، میں معترف ہوں کہ کل شب کے طرز عمل سے میں تمھیں نہایت بے وفا سمجھنے لگی ہوں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں تمھیں تم ہو۔ مجھے لیڈی فریڈو سے نفرت ہے کہ اس نے کل تمھیں کیوں بلایا مجھے لیڈی کیسٹرو سے بغض ہے

کیونکہ اسی کی شادی میں تم نے اس فرانسیسی بڑیل کے ساتھ رقص کیا تھا میں موجدہ رقص سے متنفر ہوں میں کائنات سے تنگ ہوں میں خود اپنی ذات سے بیزار ہوں لیکن میرے جذبات نفرت کی یہ مجال نہیں ہے کہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکیں۔ تم کچھ بھی کیوں نہ کرو میں تم سے متنفر نہیں ہو سکتی۔ اگر میں تمہارا سر خدانکردہ اس فرانسیسی عورت کے قدموں پر دیکھوں جب بھی مجھ کو تم میں کچھ ایسی خوبیاں نظر آئیں گی جو بس تمھیں میں نظر آسکتی ہیں۔

میرا دل تمہاری تعریف سُنکر خوش ہوتا ہے لیکن تعریف کرنے والوں سے میں جلتی ہوں میرے سامنے کوئی شخص تمہاری تعریف کرے اور مجھے یقین ہوجائے کہ تم اس معرف سے بہ نسبت میرے زیادہ خوش ہو تو دل چاہتا ہے کہ تعریف کرنے والے کا منہ نوچ لوں مگر اس کے باوجود میں یہ چاہتی ہوں کہ اور لوگ بھی تمہارے ان اوصاف کی تعریف کریں جن کی میں دل دادہ ہوں۔ مجھے اس فرانسیسی قطامہ سے شدید نفرت ہے لیکن اگر مجھے یقین ہوجائے کہ وہ تم کو مجھ سے زیادہ خوش رکھ سکتی ہے تو میں خود تمکو اس سے ملنے پر آمادہ کرنے کے لئے طیار ہوں۔ محبت کتنے متضاد جذبات کی حامل ہوتی ہے!

اگر تم کو بھی مجھ سے محبت ہوتی تو خیر میری تو زندگی سنور جاتی مگر تم کبھی وہ روحانی لطف حاصل ہوتا جو اس تغافل اور سرد مہری میں ممکن نہیں۔

باور کرو کہ تم کو میرے برابر کوئی چاہ نہیں سکتا ہے اور اس لئے تم صرف میرے ساتھ رہکر خوش رہ سکتے ہو۔ اگر تم کو کسی اور عورت سے محبت ہوجائے تو مجھے رشک نہیں ہوگا بلکہ تم پر بے انتہا رحم آئیگا اس لئے کہ نہ میرے سوا کوئی اور تمہاری پُر معنی نظروں کا مطلب سمجھ سکتا ہے اور نہ میرے علاوہ کوئی اور تمہاری ناز برداری کر سکتا ہے۔

ہمیں محبت کرکے خوش رہ سکتے ہیں اور ہمیں جانتے ہیں کہ محبت کے آئین و آداب کیا ہیں۔

یقین کرو اگر خدانکردہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بجائے کسی اور سے محبت ہوتی تو اب تک کبھی کے گھٹ گھٹ کے مر چکے ہوتے!۔

مکتوب سوم

آخر تم کب تک نزتن واپس نہیں آؤگے؟ کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ تمھیں گئے ہوئے پورے دو دن ہوگئے اور مجھے دو پہاڑ سی راتیں تمہارے ہجر میں بسر کرنا پڑیں؟

تمھارا مقصد صرف یہ تھا کہ میرا تن تمھارے ہجر میں جاں بلب ہو جائے۔ اگر تم میری موت کے خواہاں ہو تو عجب نہیں میں خود بھی اپنی جان سے بیزار ہو جاؤں میں کبھی نہ تم سے مطمئن ہو سکی ہوں اور نہ اپنی ذات سے تم جب خلاف معمول افسردہ ہوتے ہو تو مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے اُلجھتے ہو لیکن جب تم ضرورت سے زیادہ خندہ پیشانی سے کام لیتے ہو تو مجھے یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ خوشی کسی اور وجہ سے تو نہیں ہے۔

میں جانتی ہوں کہ تم قصبے سے دو قدم کے فاصلے پر ہو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے رکے ہوئے ہو مجھے تسلیم ہے کہ اگر تم یہاں ہوتے جب بھی میں اپنے بھائی کی علالت کی وجہ سے تم سے نہیں مل سکتی تھی لیکن اس دل کو کیا کروں کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمھارے کیمپ میں حوا کی کوئی بیٹی موجود نہیں ہے اور مجھے رقابت کا کوئی اندیشہ نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ میرا بدگمان دل تمھاری ہر محبوب شے کو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان میری نظر میں رقیب بنا دیتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ مصنوعی جنگ کا مظاہرہ تمھارے پتھر دل کو محبت کی لطافتوں سے بے نیاز نہ کردے۔ کہیں تم اس۔ لئے تو اس مظاہرے میں شریک نہیں ہوئے ہو کہ تم اپنے دل کو میری مفارقت کا عادی بنانا چاہتے تھے؟ اگر یہ بات ہے تو یقین مانو کہ مجھے نازنینان فرنگ سے کہیں زیادہ ان کلموہی توپوں سے رشک ہے۔

میں یہ نہیں چاہتی کہ تم ہر وقت میرے پہلو سے لگے بیٹھے رہو میرا یہ منشا نہیں کہ تم میرے لئے اپنی نوکری چھوڑ دو میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم میری وجہ سے میدان جنگ کا منہ دیکھنا چھوڑ دو میں جانتی ہوں کہ تم مرد بچے ہو اور تمھارا کام میدان جدال و قتال میں سرخرو رہنا ہے مجھے تمھاری شہرت اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے لیکن میری یہ تمنا ضرور ہے کہ میری ہی طرح تم کو بھی ہجر کی تلخی محسوس ہو۔

کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھ کو تمھارے رنج سے خوشی ہوگی۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم کو میرے فراق سے تکلیف ہوگی تو میں خود تم کو سمجھا بجھا کر اس عارضی فراق کی اہمیت کم کر دوں گی۔

پھر آخر میری آرزو کیا ہے؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتی ہوں! شاید میری تمنا یہ ہے کہ جتنا میں تمکو چاہتی ہوں اتنا ہی تم مجھکو چاہنے لگو مگر یہ تمنا پوری ہو کیونکر سکتی ہے؟

میرے منتشر خیالات سے پراگندہ دماغ نہ ہونا اس لئے کہ یہ تمھارے ہی ہجر کا نتیجہ ہیں۔ اگر جنون تمھاری محبت کا دوسرا نام ہے تو میں اس فرزانگی سے باز آئی جس سے جذبۂ محبت میں کوئی کمی واقع ہو۔

تم یقیناً عقلمند ہو اور میں بھی اغلباً بیوقوف نہیں ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتی ہوں کہ عقل ہمارے دلوں پر حکومت کرے ہمارے دل عقل و خرد سے بیگانہ محبت کے محکوم بن سکتے ہیں اور بس۔ اچھا

سچ کہنا اس عارضی فراق کا تم پر بھی کچھ اثر ہوا؟ آخر کہاں تک نہ اثر ہوگا تم یقیناً اتنے بیوفا نہیں ہو۔ تم نے سامان سربب دیکھ کر سرد آہیں بھری ہوں گی کیونکہ یہی کم بخت جنگ تو اس فراق کا باعث تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم واپس آؤ گے تو لوگ کہیں گے کہ اس سفر میں تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہے۔ اب رہی میری حالت سو اگر میرا بھائی بیمار نہ ہوتا اور لوگ میری بہکی بہکی باتوں کو بھائی کی محبت پر محمول نہ کرتے تو شاید اب تک رازِ عشق افشا ہو گیا ہوتا۔

میرا چہرہ اس تین دن کی مفارقت میں اتر گیا ہے مگر مجھے امید ہے کہ یہ پژمردگی تمھاری نظر میں حسن و شباب کی تازگی سے کہیں زیادہ محبوب ہوگی۔

اور اچھا جو خدانکردہ مجھے تم سے چھ مہینے علٰحدہ رہنا ہو تو میرا کیا حال ہو؟ میں بتاؤں؟ مجھ پر ذرا بھی اثر نہ ہو! اس لئے کہ اس طویل مدت کے اختتام سے پہلے ہی میں مر چکی ہوں گی۔

سنو! سنو! گلی میں کچھ شور ہو رہا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ تمھاری آمد کا شور و غل ہے۔ ہائے اللہ کیا کروں! اگر یہ تمھاری آمد کی دھوم دھام ہے اور میں اپنے بھائی کی علالت کی وجہ سے تم کو نہ دیکھ سکی تو فرطِ شوق سے جاں بلب ہو جاؤں گی اور اگر تمھارے علاوہ کوئی اور آرہا ہے تو افراطِ یاس و حرماں سے جاں بر نہ ہو سکوں گی!

مکتوبِ چہارم

تو کیا تم ہمیشہ بے مہری سے کام لو گے؟ کیا تمھارے پتھر دل کو محبت کی لطافت بھی موم نہیں بنا سکتی؟ تمھارے تغافل آمیز جمود کو تمھاری بے حسی کو تمھاری بے پروائی کو کیونکر دور کیا جائے؟ کیا میں سچ مچ تم کو چھوڑ کر کسی اور سے محبت کرنے لگوں؟ لیکن میرا دل اس بات کو قبول کیسے کر سکتا ہے؟ کل شب کو میں نے دیدہ و دانستہ ڈیوک آلمیڈا کی معیت قبول کی میں عمداً کھانے کی میز پر اس کے پاس بیٹھی میں نے جان بوجھکر تمھارے جلانے کے لئے اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کیں مگر تم پر کوئی اثر نہ ہوا!

کہیں اس کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ تم کو در اصل میری رتی برابر بھی پروا نہیں ہے کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے؟ میں صرف اس خیال سے کانپ اٹھتی ہوں کہ تم مجھے ایک مرد سے مصروف راز و نیاز دیکھ کر بھی متاثر نہیں ہوتے! ہاں ہاں تمھیں یقیناً مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں عشق کے کیف و کم سے اتنی اچھی طرح واقف ہوں کہ ہر اس جذبہ کے متعلق جو میرے

جذبات سے مختلف ہو کہہ سکتی ہوں کہ اس جذبے کو جذباتِ محبت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔

بعض اوقات سچ مچ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی اور سے محبت کرنے لگوں، مگر تمہارے سوا دل لینے والا ہے کون؟ کل شب کو تمہارے برتاؤ نے میری نظر میں تمہاری خوبیوں کو کم کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود تم میں لاکھوں ایسی خوبیاں دکھائی دیتی تھیں جو بس تمہیں میں نظر آسکتی ہیں۔ اور تو اور تمہارے تغافل پر بھی پیار آرہا تھا۔ کیا میرے غصے کا دوسرا نام عجزِ محبت تو نہیں؟

مجھے اس وقت بھی یہی فکر ہے کہ کسی طرح اپنے دل کو یہ سمجھاؤں کہ کل شب کو تمہاری بے پروائی ہی قرینِ مصلحت تھی اور سچ پوچھو تو تھا بھی یہی۔ میرا بھائی تمہاری ہر نقل و حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اگر تم ڈیوک آلمیڈا سے رقابت کا اظہار کرتے تو یقیناً افشائے رازِ عشق کا خدشہ تھا۔ مگر سنو تو کیا تم اظہارِ رشک و رقابت کا کام زبان کے بجائے آنکھوں سے نہیں لے سکتے تھے؟ ممکن ہے کہ ڈیوک آلمیڈا کو اس خاموش پیغام کا احساس نہ ہوتا مگر میں تو سمجھ جاتی۔ میں نے دیدہ و دانستہ کئی مرتبہ تمہیں آنکھ ملا کر دیکھا مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری آنکھوں سے محبت ٹپک رہی تھی مگر کیا وہ اظہارِ محبت کا وقت تھا؟ مجھے ایک غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ کر تمہاری آنکھوں سے رشک و رقابت غیظ و غضب کی آگ برسنا چاہئے تھی۔ تم کو میری ہر بات کی تردید کرنا چاہئے تھی تم کو معمولی معمولی باتوں پر مجھ سے لڑنا چاہئے تھا تم کو میرے سامنے میرے جلانے کیلئے کسی حسین عورت سے پیار محبت کی باتیں کرنا چاہئے تھیں غرض کسی نہ کسی طرح اظہارِ رشک و غم کرنا چاہئے تھا۔ مگر تم نے کیا کیا؟ میرے اس ہاتھ کو جو تھوڑی دیر پہلے تمہارے رقیب کے ہاتھ میں تھا محبت سے پکڑ لیا اور یوں مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی! تمہاری بے حسی دیکھ کر تو مجھے یہ خیال آنے لگا تھا کہ کہیں تھوڑی دیر بعد تم مجھے ڈیوک آلمیڈا کی منظورِ نظر بن جانے پر مبارکباد نہ دو۔ اے ظالم، کہیں رسمِ الفت کو یوں نبھایا جاتا ہے؟ — تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ محبت کہتے کسے ہیں اور مصائبِ عشق میں کیا لطف پنہاں ہوتا ہے؟ تمہیں اس کا احساس ہی نہیں ہے کہ وہ شکاری جس کے ہاتھ میں تغافل کا حربہ ہوتا ہے زخمی صید سے زیادہ مجروح ہوتا ہے اس لئے کہ اس کا دل محبت کی عظیم ترین نعمت سے محروم ہوتا ہے — مجھے اپنی وارفتگی اتنی عزیز ہے کہ میں یہ منظور کر سکتی ہوں کہ تمہیں پھر کبھی نہ دیکھوں مگر یہ منظور نہیں کر سکتی کہ تم آؤ اور میں اپنے والہانہ جذبات کا اظہار نہ کر سکوں — کبھی میری وارفتگی سے بھی سبق لو کبھی حزم و احتیاط بے مہری و تغافل کو چھوڑ کر عشق کی دیوانی دنیا کی بھی سیر کرو اسوقت تمہیں معلوم ہو گا کہ تم اب تک کتنی بڑی نعمت سے محروم تھے۔

(باقی)

طالب صفنوی

مسائلِ زر جدید روشنی میں[1]

زر کی ماہیت

(۱)

آپ ہر روز روپیہ اور زر دیکھتے اور استعمال کرتے ہوں گے۔ لیکن کیا کبھی آپ نے خیال کیا کہ اس زر سے کتنے مسایل متعلق ہیں اور اس کی کمی بیشی سے دنیا میں کیسے کیسے سیاسی و اقتصادی انقلابات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ آپ نے اُردو شاعری میں حسب ذیل قسم کے اشعار تو اکثر مطالعہ فرمائے ہوں گے ؎

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے   پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

لیکن آپ نے زر کے مفہوم۔ زر کی ماہیت۔ زر کے مصرف۔ تعدادِ زر کے نظریئے۔ زر کی بہم رسانی اور مطالبہ کے عدم توازن کے ہولناک نتائج۔ زر کی تعداد اور بہم رسانی کو ایک ضابطہ میں رکھنے کے طریق اور معیارِ زر وغیرہ کے متعلق بہت کم سُنا ہوگا۔ اس لئے آیئے ہم آج کی صحبت میں انہی مسائل کا بتفصیل تجزیہ و مطالعہ کریں ـــ آپ میں سے جو اقتصادیات کے طالبعلم ہیں اُن کے لئے بھی میری

---

[1] میں اس مضمون کے لئے اپنے محترم اُستاد پروفیسر اندر موہن کپور بی اے آنرز ایم ایس سی (اکونامکس) لندن۔ آف پنجاب یونیورسٹی کا ممنون منت ہوں۔ خیالات اُنہی کے ہیں لیکن طرز بیان میرا ہے۔ بعض مقامات پر میں نے اُن سے اختلاف بھی روا رکھا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے ذیل کے مصنفین کی گرانقدر کتب سے بہت استفادہ کیا ہے :۔

ٹاؤزگ[1] ۔ مل[2] ۔ سڈوِک[3] ۔ کینن[4] ۔ جیونز[5] ۔ کینز[6] ۔ مارشل[7] ای تھامس[8] ۔ فوسٹر اینڈ کیچنگ[9] ۔ روبرٹسن[10] ہنہ فلائٹ[11] ۔ کیسل[12] ۔ اینڈرسن[13] ۔

باتیں اکثر و بیشتر نئی ہوں گی کیونکہ کالجوں میں بالعموم قبل از جنگ واقعات کی تعلیم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اور جو اصحاب معاشیات سے بیگانہ ہیں اُن کے لئے تو بہر حال یہ سب مباحث نئے ہوں گے اور شاید اُن کو شروع شروع میں یہ مضمون غیر دلچسپ بھی محسوس ہو لیکن دلچسپی پیدا کر لینا آپ کے اختیار میں ہے صرف غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد آپ کو ان مسائل میں اتنی دلچسپی پیدا ہو جائے کہ ایک نہایت دلآویز، حیرت خیز رومان کی طرح یہ بھی آپ کی نیند حرام کر دے۔

قبل از جنگ مصنفین کے خیالات

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ زر ہے کیا؟ بہت ممکن ہے کہ آپ میں سے اکثر کہہ دیں کہ وہی جس شئے کے ذریعہ سے ہم روز اشیاء خریدتے اور بیچتے ہیں۔لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ یہی جواب قبل از جنگ کے مصنفین نے اکثر جگہ اپنی کتابوں میں دُہرایا ہے اور اس کا ثبوت ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔

فی الحال ہم دیکھتے ہیں کہ زر کی ماہیت کے متعلق قبل از جنگ اور مابعد جنگ مصنفین کے خیالات میں کیا تغیر رونما ہوا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح آہستہ آہستہ پیشرو مصنفین کے خیالات کی تغلیط ہوئی ہے اور کس طرح اب بھی جس نتیجہ پر بعض ماہرین پہونچے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

قبل از جنگ معاشیین میں سے مل۔ ٹاؤزگ۔ جیون۔ کنن اور سڈوگ مشہور ہیں جن کے خیالات زر کی ماہیت کے متعلق درج ذیل ہیں:۔

(۱) زر انتقال مال کے لئے ایک آلہ ہے۔ (مل)

(۲) مبادلہ اشیاء کو معرض عمل میں لانے کے لئے زر ایک ذریعہ ہے۔ (ٹاؤزگ)

(۳) زر کو ہم ایک چلتی پھرتی چیز کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی رائج الوقت چیز ہے جس کو مبادلہ کیلئے منتخب کر لیا گیا ہے۔ (جیون)

(۴) اپنی سادہ شکل میں زر ایک ٹھوس ذریعۂ مبادلہ ہے۔ (کینن)

(۵) میرا خیال ہے کہ بہت سے مقاصد کے لئے بیگ ہاٹ کی طرح ہمیں زر کا مفہوم صرّاف کے "زر رائج" تک محدود رکھنا چاہئے اور اس کے معنی "عام ذریعہ مبادلہ" ہی لینے چاہئیں (سڈوگ)

مابعد جنگ مصنفین کی تحریرات

مابعد جنگ مصنفین کے نزدیک زر بعض ذریعۂ مبادلہ نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے جو ذیل کی تحریرات سے واضح ہے:۔

(۱) جس چیز کو ہم وقتی طور پر بطور ذریعہ مبادلہ استعمال کرتے ہیں اُسے ہم زر کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ وہ قوت خرید کا خزینہ ہے۔لیکن اگر زر کا یہی مفہوم ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ براہ راست مبادلے

زمانہ سے ہم تا حال ہمیں گزر چکے ہیں۔ زر حقیقی کا اطلاق صرف ایسے "زر پر ہو سکتا ہے جو "حساب و کتاب کے زر" کا کام دے یعنی جس کے ذریعہ سے قرضوں، قیمتوں اور عام قوتِ خرید کا اظہار کیا جائے۔ زر وہ ہے جس کی ادائیگی سے معاہداتِ قرض اور معاہداتِ قیمت پورے کئے جائیں اور جس کی شکل میں عام قوتِ خرید جمع کی جائے۔" (کینز)

(۲) "۔ ۔ ۔ ۔ زر، مترادف ہے 'زرِ رائج' کے اور اس لئے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت کسی اشیاء اور خدمات کے خریدنے اور تجارتی معاہدات کے پورا کرنے کے لئے بطور ایک ذریعہ کے مروّج ہیں۔" (مارشل)

(۳) زر ایک شے ہے جو بتراضیٔ عوام بطور ایک پیمانۂ قدر Standard of Value اور دوسری اشیاء کے درمیان "ذریعہ مبادلہ" قرار دے دیا گیا ہے۔ (ای۔ تھامس)

(۴) "زر سے مراد معاشین کسی ایسی شے کو لیتے ہیں جو

(ا) اشیاء اور خدمات کے مبادلہ میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے۔

(ب) اس ارادہ سے باقاعدہ طور پر قبول کرلی جاتی ہے کہ دوسروں کا مطالبہ پورا کرنے میں استعمال کی جاسکے گی۔

(ج) رسمی طور پر اُس کی ماہیت یا تعداد بغیر کسی تفتیش و تحقیقات کے منظور کرلی جاتی ہے۔

(د) دینے والے کی ساکھ پر بغیر کسی حوالہ کے وصول کرلی جاتی ہے ان تمام باتوں پر حاوی ہونے والی شے کو ہم زر کہتے ہیں۔" (فوسٹر اینڈ کیچنگ)

(۵) "کوئی چیز جو معاہدات کی تکمیل اور قرضوں کی ادائی کے لئے بالعموم قبول کرلی جاتی ہے اُس کو زر کہتے ہیں۔ (لہ فلڈٹ)

(۶) ہم اصطلاح "زر" کسی ایسی شے کے لئے استعمال کریں گے جو مال و متاع کی قیمت کے بدلہ میں یا کسی اور تجارتی معاہدہ کی تکمیل کے لئے قبول کرلی جائے۔" (رابرٹسن)

زر کی تعریف منطقی اُصول سے مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ زر قبل از جنگ محض ایک ذریعہ مبادلہ متصور ہوتا تھا۔ لیکن مابعد جنگ معاشین نے زر کو علاوہ ایک ذریعہ مبادلہ کے معیارِ قدر اور پیمانۂ قیمت بھی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ تمام توضیحات منطق کے "اُصول" پر پوری نہیں اُترتیں۔ کیونکہ علمِ منطق کی رو سے تعریف یا توضیح کے لئے جنس و فصل کی تعیین

ضروری ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "انسان ایک معاشری حیوان ہے" اب اس میں فصل کیا ہے؟ یعنی وہ چیز کیا ہے جو انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے؟ اس کا معاشری ہونا ہے۔ اسی طرح انسان کی جنس کیا ہے؟ یہ کہ وہ حیوان ہے۔ اگر اسی اصل کو مدنظر رکھ کر مندرجہ بالا توضیحات کو پرکھا جائے تو زر کی گزشتہ توضیحات منطقی اصول پر پوری نہیں اترتیں۔

اکثر مصنفین نے زر کی تعریف اُس کے (Functions) یا مصرف کے ذریعہ سے کی ہے درانحالیکہ کسی چیز کا فایدہ یا استعمال اُس کی تعریف نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ کرسی وہ ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ تو یہ کرسی کی قاطع اور یقینی تعریف نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن پر بیٹھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جب یہ مصنفین کہتے ہیں کہ زر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے مبادلہ اشیاء سرانجام پاتا ہے۔ تو اول یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "وہ چیز" کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ مبادلہ تو اور ذرائع سے سرانجام پا سکتا ہے۔ تو کیا وہ سب زر ہیں؟ مثلاً مبادلت تو چک یا ہنڈی کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے تو کیا چک یا ہنڈی زر ہیں؟

بدیہی طور پر نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو خود محتاج ہیں کہ اُن کو روپیہ یا زر کی شکل میں ظاہر کیا جائے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ یہ چک اتنے روپیہ یا پونڈ کا ہے اسی طرح یہ ہنڈی اتنی قیمت کی ہے۔ پھر جب بھی دو چیزوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے گا تو اُن میں سے ایک ضرور ذریعۂ مبادلہ قرار پائے گی کیونکہ ایک چیز دیکر دوسری لی گئی۔ یعنی ایک شے ذریعہ بنی دوسری کے حصول کا۔ تو کیا اس طرح ہر ہر چیز زر ہے؟ اگر یہ بات نہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو زر کو اُس کی ہم شکل چیزوں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے؟

اب اگر غور کیا جائے تو زر انسان کی تین ابتدائی حاجتوں (کپڑا۔ روٹی۔ مکان) کو براہ راست پورا نہیں کر سکتا۔ مثلاً ہم زر کو نگل کر اپنی بھوک نہیں مٹا سکتے۔ یا ہم زر کو بطور ملبوسات استعمال نہیں کر سکتے جو چیز ہم کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم زر کے ذریعہ سے ان احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے اشیائے ضروری خرید سکتے ہیں پس اس سے ثابت ہوا کہ زر ایک (Instrumental Good) یا آلۂ متاع ہے۔ یہ تو ہوا زر کا منطقی Genus یا جنس۔ اب سوال یہ ہے کہ زر کا Differencia یعنی فصل کیا ہے؟ یعنی وہ کیا کام ہے جو زر کرتا ہے لیکن ہنڈیاں۔ چک اور دیگر تمسکات قرض نہیں کر سکتے؟

زر کا منفرد کام اگر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زر کا اولین مصرف دوسری تمام چیزوں کی قیمت

معلوم کرنا یا اُن کی قدر (Value) کا اندازہ لگانا ہے اور یہ کام ایسا ہے جو تمسکات اور ہنڈیاں وغیرہ نہیں کر سکتیں کیونکہ یہ کاغذات تو خود محتاج ہیں کہ ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے۔ دوسرے جب ہم دو چیزوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اُس میں سے ایک صرف دوسری شے کی ہی قیمت معلوم کر سکتی ہے لیکن زر ایسی شے ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ تمام دیگر اشیار کی قیمت کا تعین کر سکتی ہے۔ پس پیمائش قدر (Measurement of Value) زر کا اصلی کام ہے۔ ذریعہ مبادلہ ہونا ثانوی امر ہے کیونکہ کوئی چیز مبادلت کا ذریعہ نہیں بن سکتی جب تک اُس کی قیمت کسی معیار پر معلوم نہ کی جائے اور یہ "معیارِ قدر" زر ہی ہے۔

زر اپنا یہ سب سے اہم کام اُس وقت بھی انجام دیتا ہے جب کوئی مبادلت نہ ہو رہی ہو مثلاً فرض کیجئے میرے پاس ایک زمین ہے۔ آج کل اُس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے لیکن دس برس کے بعد بوجہ ملکی خوشحالی اور عام ترقی کے اُس کی قیمت دو ہزار روپیہ ہو جاتی ہے۔ اب مجھے حق پہونچتا ہے کہ میں اپنے رجسٹر میں زمین کی قیمت دو ہزار روپیہ درج کر لوں۔ یہاں کوئی مبادلت یا خرید و فروخت نہیں ہوئی۔ پھر بھی زر نے اپنا سب سے اہم کام یعنی "پیمائش قدر" انجام دیا ہے۔ اگر زر نہ ہوتا تو قیمت کا تعین کیسے ہوتا؟

اسی طرح جب ہم کسی باغ یا عمارت کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں تو ہم کوئی "تبادلہ اشیا" نہیں کرتے۔ پھر بھی زر اپنا سب سے اہم فریضہ انجام دیتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باغ یا عمارت کی قیمت دس لاکھ روپیہ ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر اگر ہم زر کی منطقیانہ تعریف کرنا چاہیں تو ہم کہیں گے "زر وہ آلاتی متاع ہے جس کے ذریعہ سے تمام دیگر معاشی اموال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے"۔

زر کو ذریعہ مبادلہ قرار دینے سے اُلجھن میں اس کا منکر نہیں ہوں کہ زر "ذریعہ مبادلہ" ہے یقیناً زر سے مبادلت آسان ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے زر کا اولین فریضہ اور صرف اولی قرار دینا اور اسی کو لیکر زر کی توضیح و تجدید کرنا کئی علمی اُلجھنوں کا باعث ہوا ہے۔ مثلاً جو لوگ زر کے ذریعہ مبادلہ ہونے پر بہت مُصر ہیں وہ "زر" اور "کاغذات قرض" کو مترادف قرار دیتے ہیں اور اُن میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ اُن کا خیال ہے کہ چونکہ ہنڈیاں۔ چیک اور تمسکات بھی ذریعہ مبادلہ ہیں اور ان کی تعداد میں فرق آجانے سے اشیا کی قیمتوں پر وہی اثر پڑتا ہے جو زر کی تعداد میں فرق آجانے سے پڑتا ہے اس لئے بنیادی طور پر زر اور کاغذات قرض ایک ہی شے

ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کاغذاتِ قرض صرف اُسی وقت اپنا کام سرانجام دیتے ہیں جب اُن کی قیمت زر کی صورت میں متعین کر لی جاتی ہیں۔ آپ چیک دیکر ایک شے خرید سکتے ہیں لیکن چیک کو ذریعہ مبادلہ بنانے سے قبل زر اپنا اصلی کام کر چکا ہوتا ہے یعنی مشتری و بایع نے اُس شے کی قیمت کا اندازہ بصورتِ زر کر کے آپس میں سمجھوتا کر لیا ہوتا ہے۔

پس یہ اُلجھن دور ہو سکتی ہے اگر ہم زر کو ایک "ذریعہ پیمایش قیمت" قرار دیکر اُسے تمسکات اور ہنڈیوں وغیرہ سے ممیز کر لیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کاغذاتِ قرض کی تعداد یا مطالبہ میں کمی یا بیشی واقع ہونے سے عام اشیاء کی قیمتوں پر وہی اثر پڑے گا جو زر کی تعداد یا مطالبہ میں کمی یا بیشی ہونے سے پڑتا ہے۔ مثلاً جس طرح اگر زر کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو اُس کی وقعت کم ہو جاتی ہے اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر کاغذات قرض کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اُن کی وقعت کم ہو جائے گی اور عام اشیاء کا نرخ چڑھ جائیگا لیکن کاغذاتِ قرض بہر حال زر کے بدل ہیں اور بدل اصل نہیں ہو سکتا پس اس لحاظ سے اِن دونوں میں تمیز کرنا ضروری ہے جو اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب ہم زر کا اولین فریضہ اور ممیز نشان "معیار قدر" قرار دیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زر کی صحیح ماہیت نہ سمجھنے کی وجہ سے معاشین "زر" یعنی Money اور "زر رائج" یعنی Currency میں کوئی فرق نہیں کر سکتے قبل از جنگ مصنفین نے تو اِن الفاظ کو مترادف سمجھ کر استعمال کیا ہے لیکن مابعد جنگ مصنفین نے "زر" کو "زر رائج" سے ذرا زیادہ وسیع معنوں میں لیا ہے مثلاً اُن کا خیال ہے کہ "زر رائج" سے مراد صرف نوٹ۔ چیک اور ہنڈیاں ہیں کیونکہ یہ ایک محدود حلقہ میں (صرف ملکی حدود میں) مروج ہو سکتی ہیں لیکن "زر" جس سے وہ مخصوص سکہ کے معنی لیتے ہیں وسیع حلقہ میں "رواں" ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تمیز چنداں صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ تمسکات۔ ہنڈیاں، اور دیگر کاغذاتِ قرض بھی اب بین الاقوامی طور پر منظور کر لئے جاتے ہیں نیز حلقہ اثر کی تحدید کسی محققانہ تجزیہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ پس جو چیز بھی رواں ہوگی وہ کرنسی یا زر رائج کہلائے گی اور صرف وہ "آلاتی متاع" جو اشیاء کی قیمتوں کا معیار ہے زر کہلائے گا۔

زر کا مصرف قبل از جنگ زر اور مالیات کی کتابوں میں ایک معتدبہ حصہ کتاب کا زر کے مصرف کے بیان کے لئے وقف کیا جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ زر کی اصل ماہیت واضح ہو چکی ہے، اسلئے اس موضوع پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ مثلاً کینن۔ کینز۔ فوسٹر اینڈ کیچنگ۔ رابرٹسن اور لیہ فلاٹ وغیرہ

ایسے جدید ماہرین مالیات نے اپنی تصنیفات میں زر کے مصرف پر کوئی باب نہیں لکھا۔ دراں حالیکہ قدیم ماہرین معاشیات کی کتابوں میں صفحوں کے صفحے اس موضوع پر موجود ہیں مختصر طور پر زر کے بیان کردہ کام مندرجۂ ذیل ہیں:-

۱- زر معیارِ قدر یا پیمانۂ قیمت ہے۔

۲- زر مبادلت کو آسان کرتا ہے۔

۳- زر مقروضات کی آخری ادائگی کا ذریعہ ہے

۴- زر قوتِ خرید کے انتقال میں کام آتا ہے

۵- زر خزینۃ القدر ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ زر ذریعہ مبادلہ اس لئے بنتا ہے کہ وہ معیار قدر ہے یہی حال نمبر ۲-۳ و ۴ کا ہے۔ نمبر ۵ بالکل فضول ہے کیونکہ زر خزینۃ القدر نہیں ہو سکتا۔ قدر تو دو چیزوں کے درمیان ایک نسبت کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ نسبت یا رشتہ کو کسی شے میں خزانہ کے طور پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ پس زر کا اصلی کام صرف پیمایشِ قدر ہے اور باقی تمام مصرف اسی کی شاخیں ہیں۔

اچھے زر کی مبینہ خصوصیات اُنیسویں صدی کے معاشیین نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ عمدہ زر کے خواص کیا ہونے چاہئیں اور وہ کونسی دھات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں مثلاً اُن کے خیال میں اچھے زر کی خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں:-

۱- عام مقبولیت - اُن کے خیال میں زر کی "ذاتی قدر" (Intrinsic Value) بھی ہونی چاہئیے تاکہ لوگ اُس کو بخوشی اپنی چیز کے مبادلہ میں قبول کر لیں کیونکہ سونے اور چاندی میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود ہے اس لئے وہ زمانۂ قدیم سے بطور زر مستعمل ہوتے رہے ہیں۔

۲- ثباتِ قدر - یعنی زر کی قدر جلد جلد بڑھتی گھٹتی نہیں رہنی چاہئیے ورنہ صرافہ میں اضطراب پھیل جائیگا اور لوگ قیاسات کے مذموم مشغلہ میں مصروف ہو جائیں گے۔

۳- نقل پذیری - یعنی زر ایسا ہونا چاہئیے کہ اُسے جہاں چاہیں بہ آسانی لیجا سکیں اس کے لئے زر کی جسامت اور وزن کے مقابلہ میں قدر زیادہ ہونی چاہئیے ورنہ جسیم اور وزنی شے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا نہایت دشوار ہوگا۔

۴- بے زوالی - یعنی زر کی قیمت میں بوجہ موسم یا تبدیلی مکان وغیرہ کوئی فرق نہیں آنا چاہئیے۔ اسلئے زر ایک موزوں دھات ہے۔

۵۔ یک جنسی ۔۔ یعنی اس کی اصل یا ذاتی صفت ہمیشہ یکساں ہو مثلاً سونا خواہ وہ کسی کان کا ہو صاف کرنے کے بعد ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے سکہ بنانے کے لئے موزوں دھات ہے۔ لیکن چمڑہ اور لکڑی وغیرہ کی سینکڑوں اقسام ہو سکتی ہیں اس لئے وہ زر کے لئے مناسب نہیں۔

۶۔ سہم پذیری ۔۔ یعنی اگر ہم زر کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے کر دیں تو اُن سب کی قیمت بڑے ٹکڑے کے مساوی ہو مثلاً اگر ایک تولہ سونا ہو تو اُس کی قیمت پینتیس روپیہ ہے اور اگر اُس کو کاٹ کر نصف کر دیں تو ہر ٹکڑہ کی قیمت ساڑھے سترہ روپیہ ہوگی۔ لیکن ہیرے جواہرات میں یہ بات نہیں ہے۔ اگر اُنکی تسہیم کی جائے تو قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ پس زر کے لئے عمدہ دھات میں سہیم پذیری کی صفت ہونا ضروری ہے۔

۷۔ شناخت پذیری ۔۔ زر ایسا ہونا چاہئے کہ وہ فوراً دوسری اشیاء سے ممتاز ہو جائے اور کھوٹے کھرے کا پتہ لگ جائے۔

۸۔ ڈھلنے کی صفت ۔۔ یعنی اُس کو سکّہ کے لئے موزوں طریق سے ڈھالا جا سکے۔ اور قطع و برید سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس پر نقش و نگار ڈالے جا سکیں اور تصدیق کے لئے شاہی مہر وغیرہ ثبت کی جا سکے۔

کیا زر خزینۃ القدر ہے

اب اگر غور کیا جائے تو متذکرہ بالا جملہ صفات اُنیسویں صدی کے اس غلط نظریہ پر مبنی ہیں کہ زر کے لئے باطنی قدر کا رکھنا ضروری ہے اور یہ خیال محض اس لئے پیدا ہوا کہ پُرانے معاشیین زر کی صحیح تعریف و تحدید سے ناواقف تھے۔

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ زر کا اہم ترین فریضہ پیمایش قدر ہے اور ظاہر ہے کہ پیمایش کیلئے کسی قیمتی پیمانے کا ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً جب ہم کپڑا ناپتے ہیں تو گز کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سونے یا چاندی کا ہو بلکہ لوہے یا کپڑے کے بنے ہوئے گز سے بھی کام ہو جاتا ہے۔ پس اسی طرح زر کے لئے جو محض ایک پیمانہ ہے قیمتی ہونا ضروری نہیں۔

قدیم معاشیین نے اس سلسلہ میں اکثر (Intrinsic Value) اور باطنی قدر کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو میرے خیال میں حد درجہ گمراہ کن اور غلط ہیں "قدر" کوئی ٹھوس شے نہیں جو کسی چیز میں مجتمع کی جا سکے "قدر" تو محض ایک نسبت ہے جو دو اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اُسے ایک واحد شے میں کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ زر خزینۃ القدر ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یونیورسٹی کی سند علم کا خزینہ ہے گز میں کپڑا مجتمع ہے اور تھرمامیٹر حرارت کا خزینہ ہے۔ زر تو صرف قدر کی پیمائش کرتا ہے اور جس طرح ایک تھرمامیٹر حرارت نہیں ہو سکتا اور ایک یونیورسٹی کی سند علم نہیں ہو سکتی اسی طرح یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ زر وہ قدر ہو جائے جس کی وہ تعیین کرتا ہے۔

پس جو لوگ زر کے لئے ذاتی قدر کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں اُن کو در اصل قدر کے صحیح مفہوم کا علم ہی نہیں۔

کیا زر کے لئے جسمانی شکل میں ہونا ضروری ہے

قدیم مصنفین دو غلط فہمیوں میں مبتلا تھے، اول زر ذریعہ مبادلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسے کوئی ٹھوس شے ہونا چاہئے در اصل یہی دو غلط فہمیاں ہیں جن کی بنا پر معاشیین کا خیال ہے کہ زر کی ساخت کے لئے دھات قیمتی ہونی چاہئے۔

اول کی نسبت ہم قبل ازیں دیکھ چکے ہیں کہ زر ذریعۂ مبادلہ نہیں بلکہ معیارِ قدر ہے اور معیار کے لئے کسی قیمتی شے کا ہونا ضروری نہیں۔ دوسری بات کے متعلق اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات زر اپنی ٹھوس شکل میں موجود نہیں بھی ہوتا تو بھی لوگ اُسے حساب کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں مثلاً برطانوی ہند کے تجارتی ادارے اپنا حساب کتاب بالعموم گنّی کی شکل میں رکھتے ہیں درانحالیکہ گنّی کوئی ٹھوس شکل میں سکّہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح آجکل گلڈن اور کراؤن کوئی سکّے نہیں ڈھالے جاتے لیکن وہ قدر و قیمت کی پیمایش کے لئے بطور ایک ذریعہ استعمال ہوتے ہیں جنگ کے بعد جرمنی عرصہ تک اپنا کاروبار طلائی مارک کی شکل میں کرتا رہا درانحالیکہ اس سکّہ کا کوئی جسمانی وجود نہیں تھا[1] ازمنہ وسطیٰ میں جب زر حقیقی میں ثباتِ قدر کا جزو مفقود تھا۔ تو برّ اعظم کے تجار اپنا حساب کتاب سکڈی میں رکھا کرتے تھے جو بصورت سکّہ موجود نہیں تھا[2]۔

ان سب حوالوں سے ثابت ہے کہ زر کے لئے ٹھوس جسمانی صورت کا ہونا ضروری نہیں۔ ہمیں صرف ایک آلہ پیمایش کی ضرورت ہے۔ جس کو قانون اور رائے عامہ کے لحاظ سے مقبولیت عام میسر ہو۔

زر کا کام حساب کتاب کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے

مندرجۂ بالا خیال کو دُنیا آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ مثلاً آج کل متمدن شہروں میں کاروبار بالعموم بنکوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور زر اپنی جسمانی شکل میں بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص چھ سو روپیہ ماہوار لیتا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ یہ روپیہ ماہ بماہ اسے ٹھوس شکل میں ادا کیا جائے بلکہ اکثر مقامات پر چک بھی نہیں دیا جاتا بلکہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ

---

[1] (Scuddi) ۔ [2] سالیمن اُصول معاشیات صفحہ ۴۵۱

بنک سے اپنی تنخواہ وصول کرلیتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ شخص اپنا تمام روپیہ فوراً بنک سے نکلوالے بلکہ جس جس شخص کو اُسے دینا ہوتا ہے اُس کو وہ مطلوبہ رقم کا چیک دیدیتا ہے اسکے بعد یہ بھی ضروری نہیں کہ چیک دہندگان فوراً یہ روپیہ بنک سے نکلوالیں بلکہ وہ اُسے اپنے حساب میں منتقل کروا سکتے ہیں اور اسی طرح تمام کاروبار محض حساب کتاب اور کھاتہ کے ذریعہ سے سرانجام پاتا ہے اور ٹھوس سکوں یا کاغذاتِ زر کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ اب اگر اسی طریق کو وسیع بنالیا جائے تو ٹھوس زر یا کاغذاتِ زر کی کبھی ضرورت نہ پڑے۔

موجودہ رجحان

آجکل بھی جہاں کاروبار اور ادائی اکثر بنکوں وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اگر تمام زر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا جائے یا اُسے فرشتے آسمان پر اُٹھا کر لے جائیں اور لوگوں کو اس کا قطعاً علم نہ ہو تو یقین جانیئے کہ دنیا میں اس سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ لوگ اپنا کاروبار بدستور کرتے رہیں گے۔ تجارت اُسی طرح ہوگی۔ حساب کتاب اُس زر کی شکل میں رکھا جائے گا جو کبھی اس دنیا میں موجود تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہونا محال نہیں ہے بلکہ آجکل بھی ایسا ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کرنسی نوٹ ہر روز استعمال کرتے ہیں حالانکہ خود اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بلکہ ہم اُسے صرف اس یقین پر قبول کرلیتے ہیں کہ اُس کے بدلہ میں گورنمنٹ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمارے مطالبہ پر چاندی کے سکے ادا کرے گی۔ دوسرے معنوں میں ہمارا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس نوٹ کی پشت پر خزانہ عامرہ میں اُس کی قیمت کے سکے موجود ہیں۔ درانحالیکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثر اوقات وہ سکے موجود نہیں ہوتے بلکہ گورنمنٹ بغیر کسی ریزرو کے بھی نوٹ جاری کرسکتی ہے۔ اسی طرح میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب ہم بنکوں کے ذریعہ سے کاروبار کرتے ہیں تو ہم ٹھوس زر استعمال نہیں کرتے۔

ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ زر کا ٹھوس ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ قیاسی و فرضی بھی ہوسکتا ہے۔ ضرورت صرف اعتبار یا اعتماد کی ہے۔ اگر ہماری سوسائٹی میں اعتبار و اعتماد اسقدر ترقی کرجائے کہ لوگ آپس میں مبادلہ کا اندازہ کسی فرضی معیارِ قدر سے کرلیا کریں تو تمام اُس روپیہ اور اُس کے ساتھ کی مشکلات کی بچت ہوسکتی ہے جو آجکل اس دُنیا میں بے اعتباری اور بداعتمادی کی وجہ سے مروج ہے۔ مشہور ماہر مالیات (Keynes) کینز نے سچ کہا ہے کہ:۔

Gold is a relic of barbaric times and a symbol of misfortune.

یعنی سونا محض جہالت کے زمانہ کی ایک یادگار اور بداعتمادی کا ایک نشان ہے۔

آخر ہم مبادلہ کے لئے سونے یا چاندی کی ضرورت کیوں محسوس کرتے ہیں اگر آپ غور کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کاروبار کے وقت ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اور ہمیں خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ہم گھاٹے میں نہ رہیں۔

پھر سونے کا استعمال محض مرکنٹائلوں[1] کے زمانہ کی یادگار ہے جو اُسے ترقی و خوشحالی کا ایک ممتاز نشان تصور کرتے تھے اور اپنی تجارت کا توازن ہمیشہ موافق رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ برآمد زیادہ رہے اور اُس کے بدلہ میں بیرونی ممالک سونے کی ترسیل کریں اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ زر محض ایک آلۂ قدر ہے۔ اُسکی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ بذاتہٖ باعث خوشحالی نہیں بلکہ باعث خوشحالی وہ اموال و خدمات ہیں جو زر کے بدلہ میں خریدی جا سکتی ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ آجکل پھر زر کے لئے قیمتی دھاتوں کا استعمال کیوں ہوتا ہے تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ محض بے اعتباری اور بداعتمادی اور "زر" کے اصل کام اور اُس کی ماہیت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ میں نے اوپر ایک صورت بیان کی ہے جس سے میرے خیال میں بداعتمادی اور بے اعتباری دور ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس درجۂ تہذیب کو پہونچ سکتے ہیں؟

زر کی اہمیت زر کی ماہیت کا فیصلہ کرنے کے بعد ہم ایک[2] اور اہم نتیجہ پر پہونچتے ہیں قبل از جنگ مصنفین زر کی اہمیت کو صرف "قدر اور مبادلہ" کے باب تک محدود رکھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ زر صرف مبادلہ[3] کی مشکلات کا حل کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ مثلاً مبادلہ کی ایک دقت یہ تھی کہ بہت ممکن ہے ضروریات کی مطابقت نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جوتا لینا چاہے اور اُس کے پاس گھی ہو لیکن اُسے کوئی ایسا آدمی نہ ملے جو گھی لینے کے لئے تیار ہو اور جوتا بھی مہیا کر سکے۔ پھر مبادلہ میں معیار نرخ کوئی نہیں تھا۔ بلکہ اس کا فیصلہ کرنا مبادلہ خواہوں کی قوتِ مبادلہ[4] پر منحصر تھا۔ تیسرے مبادلہ میں اشیاء کی تسہیم نہیں ہو سکتی تھی۔ مثلاً اگر کسی کے پاس بھینس ہو اور وہ چند نارنگیاں لینا چاہے تو بھینس والے کے لئے اپنی شئے کے ٹکڑے کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اب زر کی موجودگی میں یہ مشکل بھی دور ہو گئی ہے کیونکہ روپیہ یا پاؤنڈ کے کئی حصے ہیں اور اب کم قیمت کی

۱؎ مرکنٹلزم یا تجارتیت اُنیسویں صدی کا ایک اعتقاد تھا کہ ہمیں اپنی برآمد درآمد سے زیادہ رکھنی چاہئے تاکہ زائد مخارج کے لئے ادائگی سونے کی صورت میں ہو اور ملک کی خوشحالی بڑھے اسکو وہ "موافق توازنِ تجارت" کا نام دیتے تھے۔

اشیا ربھی خریدی جا سکتی ہیں تو قبل از جنگ مصنفین زر کی اہمیت کو صرف مبادلہ کی پیچیدگیوں کی حد تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن اب چونکہ زر کی ماہیت اور اُس کے مصرف کے متعلق خیالات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہو چکا ہے اس لئے زر کی اہمیت محض "مبادلۂ قدر" کے باب سے گزر کر معاشیات کے جملہ ابواب تک پھیل چکی ہے۔ اب زر استعمال دولت کے لئے بھی اہم سمجھا جاتا ہے پیدائش دولت کے لئے بھی تقسیم دولت کے لئے بھی اور مالیات عامہ کے لئے بھی۔ "استعمال دولت" کے لئے اُس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو مختلف اشیا ر پر اپنے اخراجات کی تقسیم میں مدد دیتا ہے۔ "پیدائش دولت" یا دولت آفرینی میں اُس کے ذریعہ سے پونجی اور سرمایہ بنانا ممکن ہو گیا ہے۔ تقسیم دولت میں معاوضہ کے لئے اُس کی موجودگی اشد ضروری ہے اور مالیاتِ عامہ میں محصول بندی اور بجٹ وغیرہ کا وجود اُس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

الغرض یہ صرف زر کی صحیح ماہیت کے سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ اُس کی اہمیت معاشیات کے تمام حصول میں تسلیم کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ زر کا حصول ہی ہمارا اصل مقصود ہونا چاہئے اور ہماری خوشحالی زر کی اُس تعداد پر مبنی ہوگی جو ہمارے پاس کسی وقت موجود ہو۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں زر صرف معیار قدر ہے۔ اُس کی اپنی قیمت کچھ نہیں۔ وہ تو صرف ایک ذریعہ ہے دیگر اموال و خدمات کی خرید کا اور جس طرح ایک تھرمامیٹر خود حرارت نہیں ہو جاتا اسی طرح یہ زر بھی خود قدر نہیں ہے۔

شبلی (بی۔کام)

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول ۲ اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو سامنے لگے ہوئے ہیں (۱۹۲۲ء) ستمبر ۴ر۔ (۱۹۲۳ء) مئی ۴ر۔ (۱۹۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۶ء) جنوری۔ جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۲۷ء) اپریل۔ مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۱ء) جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر۔ فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ (۱۹۳۴ء) فروری جولائی و اکتوبر ۶ر فی پرچہ۔ (۱۹۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) عہ ۸ر　　منیجر نگار

مکتوبات نیاز

محبت پناہا،

گرامی نامہ ملا، میں خوش ہوا کہ آپ اس باب میں میرے ہمنوا ہیں۔ بیشک تفصیل کی ضرورت ہے، لیکن ابھی نہیں، وقت آنے دیجئے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ

ترانہ کہ نہ گنجد بہ ساز می خواہم

یہی وہ چیز ہے جو سیاسیات میں "اشتراکیت" کہلاتی ہے اور مذہبیات میں "ترکِ سوم" والی "وحدانیت" اگر اللہ کا وجود ہے تو لاکھ انکار کیجئے وہ موجود ہی رہیگا، انسان کچھ کرے لیکن خدا کی خدائی اس کی سمجھ میں کبھی نہ آسکے گی۔ پھر خالق و مخلوق کے اس تعلق کو کہ وہ انکار سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ اقرار پر مجبور نہیں، مٹا دیجئے تو دنیا رہنے کے قابل نہ رہے۔ اللہ اللہ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ "تصدیق بالجنان" از بس ضروری ہے کہ رندی نام بدتمیزی کا نہیں بلکہ انتہائی خوش سلیقگی کا ہے۔

مذہب کی دُنیا میں بداخلاق کی گنجائش ہو تو ہو، لیکن یہاں سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے۔

تو بدیں رنگ چہ کردی کہ در دل خانہ آئی

کہتے ہیں کہ تصوف بھی رندی ہی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن میں اسے صرف شاعری کہتا ہوں اور شاعری بھی مولانا ناسخ رحمۃ اللہ علیہ کی۔ کیونکہ صوفی کہتا ہے کرتا نہیں اور خرابات میں عمل کے سوا سب حرف باطل ہے

غالب کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہوگا، لیکن پھر سناتا ہوں، کہتا ہے:۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یہ وہ شرارتیں ہیں جن پر خدا کو بھی پیار آجاتا ہے، لیکن "اہل تقشف" اتنی تفریح بھی جائز نہیں سمجھتے اسکے نزدیک گویا کائنات نام ہے قدرت کی "شکنِ پیشانی" کا۔

قبلہ،

دُنیا میں ہر چیز کے کچھ آداب مقرر ہیں، یہاں تک کہ دشمنی کرنے کے لئے بھی خاص تہذیب کی ضرورت ہے۔ آپ میرے دوست نہیں بن سکتے، نہ بنیئے، "عداوت ہی سہی" لیکن خدارا پہلے یہ تو سمجھ لیجئے کہ اس کے آداب کیا ہیں۔

دشمن سے انتقام لینے کا ایک عام طریقہ مقرر ہے کہ اس کے اخلاق کو مکروہ ثابت کیا جائے لیکن اگر اسی سلسلہ میں ہم خود اپنی بداخلاقیوں کو بے پردہ کر دیں تو دُنیا کیا کہے گی؟

اس لئے قبل اس کے کہ آپ دوسرا قدم اُٹھائیں غور فرما لیجئے کہ آپ نے اپنے "خصم" کو رسوا کرنے کے لئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کہیں اسی قسم کا تو نہیں۔ دوسرے کو غیر سنجیدہ ثابت کرنے کے لئے اپنی سنجیدگی کھو بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

یہیں لکھنؤ سے ایک رسالہ حال ہی میں شایع ہوا تھا۔ اس کے موجد و مخترع کو آپ بھی جانتے ہیں، وہی "سیماہم فی وجوہہم"۔ اس کی اشاعت کا مقصد صرف مجھ کو "ذلیل" کرنا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی پرچہ میں ایک مستقل مضمون میرے متعلق تھا۔ اس میں تھا تو وہی میرے کفر و الحاد کا رونا لیکن تھوڑی سی جدت کے ساتھ یعنی یہ کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے مقصود صرف "کاروبار کی رونق" ہے، گویا خدا سے انحراف کرنا بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے فلاح انسانی متعلق ہو سکتی ہے! بعض احباب نے اصرار کیا کہ میں جواب دوں لیکن چونکہ "خزف ریزہ" کی اوقات اتنی ہی ہے کہ انسان اس کو ٹھکراتا ہوا خاموش گزر جائے، اس لئے میں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ میں جواب دیتا تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی اور ہزاروں آدمیوں کے کانوں تک اس کا نام پہونچ جاتا۔ وہ مجھے چھیڑ کر یہ کاروباری فایدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پس اس صورت میں آدابِ دشمنی کا اقتضا یہی تھا کہ میں خاموش رہوں، چنانچہ میں خاموش رہا اور وہ دو تین نمبروں سے زیادہ چل بھی نہ سکا۔

آپ نے جو مناظرہ یا مکابرہ شروع کیا ہے اسے میں اس لحاظ سے بالکل نادرست قرار دیتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ "دشمن" کو اہمیت دے رہے ہیں — نہ وہ اس قابل کہ آپ اس سے مخاطب ہوں اور نہ یہ مسئلہ ایسا ضروری کہ آپ کا قیمتی وقت اس میں ضایع ہو۔ علاوہ اس کے معاف فرمایئے جو "اندازِ گفتگو" آپ نے اختیار فرمایا ہے وہ بھی آپ کے شایانِ شان نہیں۔ خس و خاشاک کے ساتھ موتیوں کو بہ جاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

جانِ نیاز،

جس کے خیال سے روح "اہتزاز" میں آجائے، اس کی تحریر دیکھ کر کیا کیفیت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ، میرے بس کی بات ہی نہیں، آپ کا کیا ذکر ہے۔

دُنیا کی اور بہت سی نعمتوں کی طرح، جن کو دینا اور فوراً چھین لینا قدرت کا معمولی مشغلہ ہے، آپ کو بھی میں ہاتھ سے کھو چکا تھا اور عرصہ ہوا آنسو خشک کر کے بیٹھ رہا تھا۔ لیکن اب کہ آپ کی تحریر نے پورے پچیس سال پہلے کی دنیا میرے سامنے پیش کر دی ہے۔ خدارا، آپ ہی بتائیے کہ زمانہ کے اس تفاوت کو کیونکر مٹا دوں۔

وہ آپ کے نرم و نازک ہاتھ اور وہ میرے دل کی مسلسل دھڑکن۔ وہ آپ کا معطر رومال اور وہ میرے گرم گرم آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب! — یہ آپ نے کیا کیا — اُف،

برقِ یمانی بجست بادِ بہاری بخاست
طاقتِ مجنوں برفت، خیمۂ لیلیٰ کجاست

خدا کے لئے آیئے یا مجھے بلایئے۔ "ہاتھوں میں اگر دم نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"۔

کرم گسترا،

گرامی نامہ ملا۔ معاف فرمایئے جواب غیر معمولی تعویق سے جا رہا ہے۔ سبب نہ پوچھئے، یونہی کچھ بیہودہ سی اُلجھنیں تھیں۔

بیشک اُردو فارسی دونوں میں "بات کرنے" کو "پھول جھڑنے" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ فارسی میں اس کے علاوہ کوئی اور تعبیر نظر نہیں آتی۔ سعدی کا شعر ملاحظہ ہو:-

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

علاوہ اس کے فارسی کا یہ مشہور فقرہ آپ نے سُنا ہوگا "خوش گفتی، دُر سفتی" الغرض "بات" کے لئے "گل افشانی" اور "گوہر افشانی" دونوں استعمال کئے جاتے ہیں۔ آپ اُردو میں بلا تکلف اس خیال کو ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا تعلق محاورہ سے نہیں بلکہ استعارہ سے ہے — امسال متبحر دار جلنگ جانے کا ارادہ ہے یا پھر بمقدارِ علم زیادہ سے زیادہ "شملہ"

محترم۔

اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اُردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کروں گا، کیونکہ فارسی ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے عربی جاننے پر۔

آپ کے اس ذوق سے میں بے خبر نہ تھا، لیکن وہ شغف کی حیثیت اختیار کرے گا اس سے یقیناً بے خبر تھا۔ آپ کا وجدانِ صحیح خود بہتر رہنما ہے، مجھ سے یا کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ آپ نے دریافت کیا ہے اس لئے عرض کروں گا کہ آپ فی الحال سوائے غالب کے کسی اور طرف توجہ نہ فرمائیے۔

جس نُدرت و شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوائے غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ "فارسیت" کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے۔ نزاکتِ خیال اس میں شک نہیں بیدل کا حصہ ہے، لیکن اس میں یہ لطفِ زبان کہاں؟

جب تک آپ جوان ہیں "خراباتِ غالب" نہ چھوڑیئے، انحطاط عمر میں البتہ "مصحفِ بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

میری نہ کہیئے، یہاں ہر بات اُلٹی ہے۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا، اب زمانۂ انحطاط میں غالب پر سر دھنتا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا۔

عزیز گرامی۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مجھے ان کا خیال نہیں، ہاں، یہ ضرور ہے کہ نمود و نمائش سے گھبراتا ہوں اور قصد و ارادہ کے ساتھ کسی کو یاد کرنا محبت کے منافی سمجھتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب میں نماز کا عادی تھا اس وقت بھی اکثر تنہا پڑھتا تھا، کیونکہ اس صورت میں "یا لجہر" کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ پھر اب کہ ان تمام مراسم ظاہری سے گزر چکا ہوں، اور "بتوں کی یاد" ہی نے "خدا کی یاد" ترک کرائی ہے، کیونکر اس اُصول کو ترک کر سکتا ہوں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ جان لینے والے اور جان دینے والے میں بہت فرق ہے، وہ، اس کا محتاج ہے اور یہ کسی کا نہیں۔ "تقاضائے محبت" کا بار بار ذکر ممکن ہے اس لحاظ سے ضروری ہو کہ اس سے

”برشِ تیغ جفا“ کی دھاک بیٹھتی ہے۔ لیکن وہ جو اُسے ”دریائے بیتابی“ کی صرف ایک ”موجِ خوں“ سمجھتے ہیں، ان کو اس طرح مرعوب کرنا ممکن نہیں۔

اول تو میں ان سے خفا نہیں، اور ہوں بھی تو کس گھمنڈ پر؟ ۔ ایاز ہوں اور اپنی قدر پہچانتا ہوں۔ میں اگر جان دیتا ہوں تو صرف اس لئے کہ مجھے جان دینا آتا ہے، نہ اس لئے کہ واقعی کوئی جان لینے والا بھی ہے

آپ بھی کس کی باتوں میں آگئے؟ اُن سے کہئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں خود کہیں، آپ کو کیا خبر، میں جانتا ہوں کہ اس غم کی تہ میں کتنے قہقہے چھپے ہوئے ہیں، اور ”عدم یاد آوری“ کی یہ شکایت صرف اسلئے ہے کہ میں اُنکے بھول جانے کی عادت کو نہ بھول جاؤں ۔

گرامی عزیز ۔　کل شام کو آپ کا لفافہ ملا۔ آج صبح کو دنیا جشنِ تاجپوشی کی مسرتوں میں غرق ہے میں فراق سے ہمکلام ہوں ۔ اس سے زیادہ اشتراکیت پسندی اور کیا ہو گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے داد چاہتا ہوں، آپ ۔ سے نہیں۔

آپ کا خط پڑھکر مجھے اپنی کامیابی پر بہت مسرت ہوئی۔ کامیابی یہ نہیں کہ آپ نے انتقاد کو پسند کیا بلکہ صرف یہ کہ اسے پڑھکر آپ کی ”رگِ انتقاد بھی جنبش میں آگئی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ شاعر ہونے سے زیادہ نقاد بننے کی کتنی زبردست صلاحیت آپ میں موجود ہے، کیونکہ تخیل کی وہ ”Intensity“ جو آپ میں فطرتاً پائی جاتی ہے اس کی متحمل شاعری ہو ہی نہیں سکتی اور بیان کے لئے وہ کچھ اور وسعت چاہتی ہے۔ پھر شاعری کے بعد ”بیان کی وسعت“ کے معنے سوائے ”انتقاد“ کے اور کچھ نہیں ہوتے۔ آپ اگر شاعری کبھی کبھی کریں اور یہ ”حرکت“ اکثر تو خدا جانے آپ کیا قیامت ڈھائیں۔

آپ نے مومن میں بعض چیزوں کی کمی بتائی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ پھر مطالعہ فرمایئے اس میں وہ سب کچھ ہے جو آپ کہتے ہیں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ کچھ ہے جسے ”شعر مطلق“ Absolute Poetry کہتے ہیں ـــ ”حسنِ مطلق“ کہیں ہے یا نہیں اس کو آپ جانتے ہوں گے مجھے علم نہیں ـــ لیکن مومن کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نے کن حدود کے اندر رہکر شاعری کی ہے ـــ وہ حدود جو خود اس نے متعین کئے ہیں، وہ نہیں جو ہم چاہتے ہیں ـــ یقیناً اس کی شاعری وہ نہیں ہے جسے ہم ”ہم آہنگ لانہایت“ In tune with the infinite کہہ سکیں۔ لیکن اس کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ باوصف شدید ہونے کے اس میں وہ چیز بھی پائی جاتی ہے جسے آپ شیو کا

رقص موت (The Death dance of Shiva) کہتے ہیں۔
میں مومن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس نے خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھا تھا، اور شاید اس کی یہی مبارک غلطی تھی جس نے اسے "شاعر" بنا دیا، ورنہ وہ صرف "عاشق" بنکر رہجاتا اور بجائے اس کے کہ ہم اس سے دوسروں کی داستان سنتے، خود اس کی داستان دوسروں سے سننا پڑتی۔

شاعر کی خوبی اس کا "Genume" ہونا ہے، بڑا (Great) ہونے کے بعد وہ شاعر نہیں رہتا، دیوتا ہو جاتا ہے۔ بہرحال میرے آپ کے نقطۂ نظر میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اور یہ قایم رہنا چاہئے۔۔۔ "من و تو" ایک ہو جانے کا جامد (Dull) فلسفہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔

آپ نے اپنی تحریر میں اور بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جن کو پڑھکر بے اختیار ہو ہو گیا، لیکن خط اور مضمون کے فرق کو باقی رکھنا ہے اس لئے ضبط سے کام لیتا ہوں اور آپ کی تحریر کو Stimulus کی حیثیت سے محفوظ رکھتا ہوں تاکہ آپ سے اجازت لیکر کسی وقت اس کو شایع کر دوں اور اسی کے ساتھ جو کچھ مجھے کہنا ہے۔ دل کھولکر کہہ لوں۔

آپ نے جو غزلیں اس دوران میں کہی ہیں وہ مجھے بھیجدیجئے۔ یہ "کیوں بھیجوں" کا معاملہ نہیں ہے بلکہ استحقاق و مطالبہ کی بحث ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسوقت تک کوئی غزل کہتے نہ بھیجئے جبتک میں نہ اسنے دیکھ لوں۔ یہ میرا دہ جذبۂ رقابت تو خیر ہے جسے ہمیشہ نہیں تو اکثر پورا ہی کرنا پڑے گا۔

آپ کے ایک ایک شعر پر گھنٹوں آپ سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے، سیکڑوں سوال دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ حوصلے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب

نگاہش با من و من با نگاہش ماجرا کر دم

کی فرصت میسر آئے

فی الحال چند باتیں سن لیجئے:-

(۱) حسن کی بے رنگی عام ہو جانے کے بعد "ربط نہاں" کی امید کیونکر قایم ہو سکتی ہے دوسرے مصرعہ کے لئے پہلا مصرعہ بالکل مومن کے رنگ کا ہونا چاہئے تھا خواہ اس میں "حرامزادہ رقیب" ہی کا ذکر کیوں نہ ہوتا۔

(۲) حدِ عدم سے کیا مراد ہے اور فسانۂ درد کا حدِ عدم سے بڑھ جانا کس توجیہ پر مبنی ہے؟ شاعرانہ نہ سہی، آلہانہ سہی!

(۳) اگر ہجر میں جینا حرام نہ ہوتا تو کیا "دوزخ و جنت" اور "ہستی و موت" پر آپ گفتگو کے اہل ہوجاتے حالانکہ سچ پوچھئے تو جینا حرام ہونے کے بعد ہی ان چیزوں پر اچھی گفتگو کرسکتے ہیں۔

(۴) آزادی کا مقابل لفظ جبر نہیں ہے، قید ہے لیکن فقرہ یوں ہوجائے گا "خرق قید و آزادی" اور دو (قاف) کے اجتماع سے "تنافر اصوات" پیدا ہوتا ہے اس لئے بجائے جبر کے (بند) کہنے میں کیا حرج ہے۔

واضح رہے کہ یہ صرف آپ کو چھیڑنے کے لئے لکھ رہا ہوں، یعنی اگر اس کے جواب میں چار صفحہ سے کم کا خط آیا تو میں خوش نہ ہوں گا۔

بہ تعمیل ارشاد مسوری پرچہ بھیجا گیا ہے۔ مکتوبات پر آپ جو کچھ لکھیں گے وہ میری ملکیت ہوگی نہ کہ نگار کی اس لئے جلدی کی ضرورت نہیں، جب اطمینان ہو لکھئے گا اور کبھی نہ ہو تو کبھی نہیں۔

نیاز

"قفس و آشیاں" کا موضوع

اُردو شاعری کا نہایت پسندیدہ موضوع سمجھا جاتا ہے اور بڑے سے لیکر چھوٹے تک ہر شاعر نے اپنی بساط بھر اس میں زور طبیعت صرف کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر اساتذۂ قدیم و جدید کے جتنے اچھے اشعار مل سکیں یکجا فراہم ہوجائیں، چنانچہ میں تمام قارئین "نگار" سے (خواہ وہ صرف سخن سنج ہوں یا شاعر و سخن سنج دونوں) درخواست کرتا ہوں کہ وہ جستجو کرکے بہترین اشعار میرے پاس بھیجدیں۔ میں خود اس کی ابتدا

فراق گورکھپوری

کے اس شعر سے کرتا ہوں:۔

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا		وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

جو مجھے بہت پسند ہے۔

نیاز

باب المراسلة والمناظره

ادب نواز مدیر نگار! تسلیم عرض کرتی ہوں اور ایک خط بعنوان (نفیس حجابی کا خط) بغرض اشاعت بھیجتی ہوں اپنے رسالہ میں شایع فرمائیے اور ممنون اشاعت کیجئے۔ عرصہ گزرا پردہ آنہ کی قلمی اعانت کیا کرتی تھی۔ زمانہ کے ہاتھوں وہ جل بجھا۔ تو پیام آمید سے پیام وسلام شروع ہی ہوا تھا کہ زندگی بدل گئی وہ کوچہ جو میرے لئے خوب تھا افسوس چھوٹ گیا چند سال سے گھر کے دھندوں میں ایسی پڑی کہ قلم وسے ادب کے طبل وعلم (قلم دوات) کو خیرباد کہہ کر اب سفرۂ طعام پر قہت ذائقہ کی خاطر توا خنمع ڈوئی ہانڈی سے کر رہی ہوں ورنہ جب لکھتی تھی تو واقعی لکھتی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کو مجھ پر ناز تھا تو مجھ کو بھی اپنے اوپر ناز تھا۔ اب نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں نہ ناز رہا نہ ان کی باتیں بچوں کی چل پوں سے کہاں فرصت کہ کچھ لکھوں اور کچھ کہوں۔ صحن خانہ تو دور رہا اب تو عرصۂ خیال بھی مجھ پر تنگ ہے۔ مگر فطرت کو کیا کروں جس نے ادبی ناسور پیدا کر دیا ہے ہر چند اس کا منہ میرے افکار بند کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی راہ سے تراوش ہو ہی جاتی ہے چنانچہ اسکے ثبوت میں یہ مرسلہ خط بھی ایک نئی مراسلت کی بسم اللہ ہے جس میں خیال محض سے دور لیکن واقعیت کی تاثیر واثر ضرور ہے۔ اگر پسند خاطر ہوا اور انتخاب میں آئے تو کبھی کوئی ادبی مضمون اور کبھی کوئی خط آپ کے رسالہ کے لئے بھیجدیا کروں گی۔ جب سے خطبۂ نکاح نے شوہر کا حکم سنایا اپنا بوریا بستر سنبھالا۔ دلی چھوڑی مشرقی دیار کی راہ لی۔ ادبی صحبتیں جاتی رہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ زمرۂ شعرا سے نہیں ہوں مگر پھر بھی دلی چھوڑنی پڑی اور لکھنؤ میں موت کے خیر مقدم کے لئے مقیم ہو گئی۔ نظام قدرت تو یہ ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں ڈوبتا ہے مگر میرا آفتاب حیات مغرب سے طلوع ہوا اور مشرق میں غروب ہونے کی ٹھہرائی یہ قیامت کے آثار نہیں تو اور کیا ہے۔ ہائے کیا زمانہ تھا جب دلی میں ادبی رشد وہدایت کی خیرات ملتی تھی بٹتی رشد وہدایت جاتے ہوئے ادبی خیرات بھی ساتھ لیتے گئے۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ وہ دل ہے

لکھنؤ میں بیاہ کر آئی۔ میخانۂ دنیا کو بزم جمشید سمجھی اور حضرت ریاض کے دم سے جرعہ کشی کرتی رہی شرر کی ادبی چنگاریوں نے بھی مجھے گرمایا۔ جب کبھی جالب مرحوم نظر آجاتے۔ دلی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہائے نہ اب ریاض ہی رہے کہ تشنگی دور ہو۔ نہ شرر کی ادبی علم نصیب۔ جالب بھی سدھارے تو جلب منفعت کہاں سے ہو۔ دل تو اسی وقت بجھ گیا تھا جب عروس حیلہ کے ہاتھوں بھری محفل سے نکالی گئی تھی اور اب دماغ بھی افسردہ ہے کہ یہ لوگ بھی نہیں رہے جو لکھنؤ میں مجھے بیاہ کر لائے۔ ہائے ان میں سے کوئی شاہد تھا تو کوئی وکیل۔ کوئی قاضی تھا تو کوئی ضامن۔ ایک جا تا دو جاتے۔ سب کے سب چلے گئے۔ راتوں کو روتی ہوں میں مروں گی تو مجھے کون رو دے گا۔ مرنے کا غم نہیں غم اس کا ہے کہ عزاداری کے ثواب سے مرکر بھی محروم رہوں گی معاف کیجئے گا جو نہ لکھنا تھا وہ لکھ گئی اپنی ناسوری ترادش کا ثبوت دینا تھا۔ پھر کیسے نہ لکھتی۔ آپ نے سب کچھ پڑھ لیا۔ ایک بات میری اور سنئے جس نمبر میں آپ اس خط کو جگہ دیں۔ مجھے اس نمبر کو بھیجکر سرفراز کریں تاکہ اپنی اُن مقامی بہنوں میں آپ کے رسالہ کو ترویج دوں جو مجھ سے اُنس رکھتی اور مجھ ہیچمداں کی قدر کرتی ہیں۔ پہلے نام لکھا کرتی تھی اب اس کا بھی پردہ کیا کروں، یگانوں کو چھوڑ بیگانوں میں آئی پردہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ حتیٰ کہ نام پر بھی رسم و رواج کا پردہ ڈالنا پڑا۔

والدہ قاضی قیصر الاسلام عرف پیارے میاں دہلوی ثم لکھنوی مقیم حال مرزاپور

(نگار) آپ کا وہ خط (جس کا عنوان "نفیس بھابھی" کا خط ہے) شایع کرنے سے معذور ہوں، لیکن جو تحریر آپ نے میرے نام بھیجی ہے اس کو شایع کئے دیتا ہوں، لیکن بہت ڈرتے ڈرتے، کیونکہ جب آپ کی قلمی اعانت سے پروانہ جل بجھا اور پیام امید ختم ہو گیا تو کیا عجب ہے کہ نگار بھی "نقش و نگار طاق نسیاں" بن جائے۔

آپ اس میں شک نہیں خط اچھا لکھ لیتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے لکھنؤ آنے کے بعد ریاض و شرر تو خیر کیا لیکن ناسخ کا رنگ آپ نے ضرور قبول کیا کہ بیجا تصنع و آورد کی جھلک آپ کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ آپ کا دوسرا خط جو "نفیس بھابھی" کی طرف سے آپ نے لکھا ہے اس میں تو آپ نے تکلف کی حد کر دی ہے۔ نصف خط تو آپ نے اپنی مرغی کے بیان میں ختم کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ خوب ہے لیکن چونکہ کسی پولٹری فارم کی خدمت نگار کے سپرد نہیں ہے اس لئے اس کی اشاعت کا موقعہ نہ تھا، اس کے بعد کا حصہ وہ ہے جس میں آپ نے آج کل کی گانے والیوں کے نام گنائے ہیں اور اس سے مقصود

غالباً آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کے پاس ان سب کے ریکارڈ موجود ہیں۔ سو یہ بھی کوئی بات ایسی نہیں جس کا جاننا قارئین نگار کے لئے ضروری ہو۔

تیسرے حصہ میں شوہر کی بے پروائی اور اپنی خدمت کا ذکر کرتے ہوئے جو لطیفہ "درد" اٹھنے کا آپ نے بیان کیا ہے وہ اس درجہ ذوقِ سلیم سے گرا ہوا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے آپ کے قلم سے نکلا کیونکر۔ آخر میں آپ نے اپنی "اماں" کی علالت کی ناگہاں خبر سنکر جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر بے محل، اتنا پراز تکلف و تصنع ہے کہ غم والم کا کوئی شائبہ اس سے ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آئینہ کے سامنے بال سنوار رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میں رو رہا ہوں۔

ہمیشہ یاد رکھئے کہ خط و کتابت میں اصل چیز بیساختہ پن ہے، علی الخصوص عورتوں کے خط کی تمام خوبی تو اسی میں ہے کہ جو کچھ وہ بولتی ہیں وہی لکھتی بھی ہیں

پھر اگر آپ اپنے گھر میں بھی روزانہ اسی زبان میں باتیں کرتی ہیں جیسی ان خطوں میں پائی جاتی ہے تو یقیناً آپ کے شوہر کو آپ سے بیزار ہو جانا چاہئے، کیونکہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ مرد ہر وقت محسوس کرتا رہے کہ بیوی اسٹیج پر کھڑی ہوئی ایکٹ کر رہی ہے اور بیوی یہ سمجھے کہ شوہر کوئی تماشائی ہے جس کو بہر حال اپنے ٹکٹ کے دام وصول کرنا ہی ہیں۔

شوق سے لکھئے، نگار کے صفحات حاضر ہیں، لیکن اگر آپ عورت ہیں تو عورت ہی رہ کر لکھئے اور اگر مرد ہیں تو پہلے پوری طرح عورت بن جائیے اور پھر اس طرف توجہ فرمائیے۔

نگار کا وہ پرچہ جس میں آپ کا یہ خط شایع ہو رہا ہے ضرور آپ کی خدمت میں پہونچے گا۔ اب آپ کو اختیار ہے خواہ اپنے "مقامی بہنوں" میں اس کی "ترویج" کریں یا تذلیل۔

کرم فرمائے بندہ سلام مسنون۔ مجھے حسب ذیل امور میں جناب کے قیمتی اور قابل قدر مشورہ کی اشد ضرورت ہے امید کہ جناب والا اپنے زریں مشورہ اور قابل صد احترام رائے سے آگاہ فرما کر تسکین بخشیں گے، اول یہ کہ میں ایک شریف خاتون ہوں اور میری عمر اگر میری یاد غلطی پر نہیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ۲۸ سال کی ہے میری شادی کو تقریباً گیارہ سال کا عرصہ گزر لیکن میری بدبختی کہ باوجود اپنی تمام امکانی کوششوں کے تعلقات زن و شو کی خوشگواری میں ناکام رہی دوسرے یہ کہ مجھ غم نصیب کے ایک بیوہ ماں اور ایک یتیم بھائی ہے کوئی مربی و سرپرست نہیں رہا۔ اسلامی ہمدردی کا فقدان ہے۔ ادھر میں قانون

خلع بھی نہیں ہے جس کی رو سے کوئی شریف خاتون حق شوہری سے عہدہ برآ ہو سکے ایسی صورت میں عاجز آکر یہ طے کیا ہے کہ تثلیث کی قایل ہو کر دین مسیحی اختیار کر لوں اور ہمیشہ کے لئے ایسے تغافل شعار، بدکردار شوہر سے نجات حاصل کروں جس نے تاحیات میری ساری زندگی اپنے تغافل کا شکار بنائے رکھنے کی قسم کھا رکھی ہے تیسرے یہ کہ دین مسیحی کے قبول کے بعد مجھ پر میرے شوہر کا کوئی حق شرعاً و قانوناً تو دریگا۔

چہارم یہ کہ میں نے افواہاً سنا ہے کہ اہل مسیح بھی اہل کتاب ہیں بعد تسلیم مسیحیت بھی قید نکاح سے آزادی نہ حاصل کر سکوں گی اور میرے موجودہ اور برائے نام شوہر کا حق ویسا ہی قایم رہیگا جیسا کہ اسوقت ہے آپ شناور بحر شرع ہیں اور غالباً ایک بڑی حد تک مجھ ستم زدہ کے سامنے قانون داں بھی برائے خدا میری قابل رحم حالت پر ترس کھاتے ہوئے اپنے بیش بہا مشورہ سے مطلع فرما کر میرے قلب مضطر کی طمانیت کا باعث ہوجئے۔ مگر یہ کہ اگر دین مسیحی اختیار کرنے کے بعد پھر مسلمان ہو جاؤں تو کوئی بازپرس تو نہ ہوگی مختصر و مفصل کیفیت سے اطلاع دیجئے یا جو صورت آپ مناسب سمجھئے اپنی رائے عالی سے مطلع فرمایئے۔

(نگار) یہ خط ہے ایک خاتون کا جو یہیں اودھ کے ایک قصبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جواب تو جو کچھ مجھے دینا تھا، ان کو دے چکا ہوں، لیکن نگار میں اس کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ لوگ عبرت حاصل کریں، اور سوچیں کہ ہمارے نظام معاشرت کی بہت سی وہ خرابیاں جو مذہب و قانون مذہب کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں، کیونکر دور ہو سکتی ہیں۔

اسلام میں خلع کے لئے عورت بالکل ویسی ہی آزاد ہے، جیسے مرد طلاق کے لئے۔ یعنی جس طرح مرد ناگزیر اسباب کی بنا پر عورت کو چھوڑ سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ تعلقات ناخوشگوار ہو جانے پر مرد سے آزادی حاصل کرے۔ لیکن ہندوستان میں اس سے فایدہ صرف مردوں نے اٹھایا اور عورتیں محروم رہیں۔ اس کا بڑا سبب ہندو معاشرت اور ہندو رسم و رواج سے متاثر ہونا ہے جس نے نہ صرف مسئلہ طلاق بلکہ اصل رشتہ ازدواج کو بھی بالکل غیر اسلامی بنا دیا ہے۔

عرب میں نہ کوئی شادی بلا امتزاج طرفین ہوتی تھی اور نہ طلاق و خلع میں کوئی دشواری۔ اسلام نے بالکل نفسیاتی اصول کو سامنے رکھکر ازدواج پر طلاق وغیرہ کے قواعد مرتب کئے تھے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں نکاح ہی بالکل تعلیم اسلام کے منافی ہوتا ہے، طلاق و خلع کا کیا ذکر ہے۔

ہندوستان کی عورت کی نصف تباہیوں کا باعث یہی مجبوری ہے، جس کا اثر ہماری نسل پر بہت خراب پڑ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ قانون خلع جلد از جلد یہاں نافذ کیا جائے اور مردوں کے ان سیاہ کارانہ مظالم کا سدباب کیا جائے، جن کی سزا انھیں عاقبت میں ملیگی یا نہ ملیگی لیکن یہاں تو انھوں نے عورت کو عذاب جہنم سے زیادہ سخت تکلیف و مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک فسانہ "بعد المشرقین" اسی حالت کو سامنے رکھ کر لکھا تھا جس میں ایک تعلیم یافتہ عورت نے اپنے تنگ خیال قدامت پرست مولانا قسم کے شوہر سے اسی طرح نجات حاصل کی تھی کہ وہ عیسائی ہو گئی۔ اب یہ خط دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں نے مسلمان عورت کی موجودہ ذہنیت کا غلط اندازہ نہیں کیا تھا اور جس چیز کو میں فسانہ سمجھتا تھا وہ اب واقعہ کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔

باب الاستفسار

(جناب سید عبدالغنی صاحب منشی فاضل۔ الہ آباد)

براہ کرم حسب ذیل فارسی و اُردو محاورات کی تشریح فرماکر ممنون کیجئے۔
طرفہ۔ طرفۃ العین۔ زلفِ چلیپا۔ جھک جھک بک بک۔ جلاب (بمعنی مسہل) شُقّہ (بمعنی رقعہ) چار ابرو کا صفایا۔ نالیہ مُو۔ اور یہ بھی لکھئے کہ معما و چیستان میں کیا فرق ہے۔ اور فارسی میں بہترین معما اور چیستاں کس نے لکھی ہیں۔ دو چار مثالیں بھی درج فرمایئے۔ اور فارسی کے طنزیات (Satire) پر بھی روشنی ڈالئے۔

(نگار) (۱) طُرفہ (بضم طا) عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں:۔ دلخوش کُن قول عجیب، بات۔ تحفہ۔ ریزہ۔ فارسی والے اسے بوالعجبی کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں اور "طفل خوش آیندہ" [illegible] چنانچہ طُرفگی بمعنی بازیگری اہل فارس نے بکثرت استعمال کیا ہے۔

(۲) طُرفۃ العین (بضم طا) غلط ہے، اسے طَرفۃ العین (بفتح طا پڑھئے) اس کے معنے مشہور ہیں (پلک جھپکانا)

"زلفِ چلیپا" چلیپا کے معنے ہیں "کج و محرف" اسی لئے خطِ منحنی کو بھی خطِ چلیپا کہتے ہیں۔ زلفِ چلیپا وہ زلف ہے جو بل کھائی ہوئی ہو، چلیپا مفرس ہے صلیب کا۔

(۳) میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل عربی ہے۔ عربی میں دو لفظ ہیں زقزق بقبق۔ زقزق کہتے ہیں چڑیا کے چہچہانے کو اور بقبق ایسی آواز کو کہتے ہیں جیسے پرنالہ سے پانی کسی سخت چیز پر گرے۔ الغرض دونوں میں مفہوم شور و ہنگامہ کا پایا جاتا ہے۔ فارسی میں اسے جق جق کہتے ہیں۔

(۴) جُلاب، عربی لفظ ہے جسے انگریزی میں julep کہتے ہیں۔ مشہور مسہل دوا ہے۔

(۵) شُقہ، فارسی میں تو مستعمل نہیں اُردو میں فرمان شاہی کے معنی میں آتا ہے نیز اس رقعہ کے مفہوم میں جو بادشاہ یا کسی امیر کبیر کی طرف سے کم رتبہ امیر کو لکھا جائے۔ عَلَم میں جو کپڑا باندھا جاتا ہے اسے بھی شقہ کہتے ہیں۔

عربی میں شقہ (بہ کسرِ شین) کسی چیز کے ٹکڑے یا نصف حصہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُردو والوں نے اسی کو شقہ کر لیا۔

(۶) چار ابرو سے "بھویں اور مونچھ" مراد ہے۔ فارسی میں سبزہ آغاز معشوق کو بھی چار ابرو اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی مونچھیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ملا طاہر غنی کا شعر ہے:-

عشق افزوں میشود چوں حسن می گردد زیاد
تا تو چار ابرو شدی چشمم ز شوقت گشت چار

صوفیہ کی ایک جماعت ہے جو ابرو اور داڑھی مونچھ سب صاف رکھتے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "چار ابرو کا صفایا" کرا دیتے ہیں۔

(۷) غالیہ مُو۔ غالیہ ایک خوشبودار مسالہ ہے جو بالوں میں ملا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالیہ مُو کی ترکیب میں، لفظ غالیہ "قیمتی" کے معنے میں آیا ہے۔

معما اور چیستاں فارسی کے صنایع بدایع میں داخل ہیں۔ معما میں کسی شخص یا چیز کا نام ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے جاننے کے لئے اس سے زیادہ کاوش کی ضرورت ہے جو آجکل X Word Puzzle میں صرف کی جاتی ہے۔

میں چند مثالیں پیش کر کے بتاؤں گا کہ یہ کام کتنی دیدہ ریزی اور دماغ پاشی کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی شعراء کو بڑی فرصت حاصل تھی اور ان کی غیر معمولی ذہانت نے صنایع و بدایع کے سلسلہ میں فارسی شاعری میں خدا جانے کتنی دلچسپیاں پیدا کر دی تھیں۔

شرف الدین علی یزدی، معما نگاری میں ید طولیٰ رکھتا تھا، ملاحظہ فرمایئے کہ لفظ جمال کو کسقدر لطیف معما کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

گر رود آبِ عرب در آبِ ہند   نام یارم آں زماں پیدا شود

یعنی میرے دوست کا نام اسوقت ظاہر ہو سکتا ہے جب "آبِ عرب" "آبِ ہند" میں داخل ہو۔ بظاہر یہ بالکل مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ آبِ عرب کا آبِ ہند میں داخل ہونا کیا معنی اور اس سے لفظ جمال پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے؟ لیکن اگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ عربی زبان میں پانی کو ماء کہتے ہیں اور ہندی زبان میں جل تو یہ دشواری آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جل کے درمیان ما داخل کرنے سے لفظ جمال پیدا ہو جاتا ہے۔

لفظ بہمن کا معما ملاحظہ ہو:۔

دوشینہ شرف نامِ شریفت تو بیاں کرد　　بہرمن دل سوختہ بود آنچہ عیاں کرد

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے یعنی (بہرمن دل سوختہ) سے یہ لفظ پیدا کیا ہے۔ لفظ "بہرمن" کا دل یا درمیانی حرف (رے) ہے اس کو سوخت کر دیجئے تو بہمن رہجاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دقیق و نازک معمہ لفظ حسین کا ہے:۔

نے سحر چوں گشت نالاں راز او گردد نہاں　　وقت نازک بود در وے سر بے حد شد عیاں

اس میں دونوں مصرعوں سے لفظ حسین پیدا ہوتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں "نے سحر چوں گشت" سے مراد یہ ہے کہ نے سحر کو اُلٹ دو اور ایسا کرنے سے "رحسین" بنجاتا ہے جس میں (رے) زاید ہے۔ اب پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کو اس طرح پڑھئے:۔ "را۔ زاو گردد نہاں" یعنی (رے) کو اس سے علحدہ کر دیجئے۔

اب دوسرے مصرعہ کو لیجئے۔ "وقت نازک" کو عربی میں "حین" کہتے ہیں اس میں "سر بے حد" یعنی سر کا آخری لفظ نکال کر حین میں ملا دیجئے، حسین ہو جائے گا۔

اب میں امتحاناً چند مثالیں معمے کی یہاں درج کرتا ہوں اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ اُن سے کیا لفظ بنانا مقصود ہے۔ اگر کوئی صاحب نہ سمجھ سکیں تو مجھ سے پوچھ لیں:۔

۱۔ (فرید)۔ اول فصلِ بہار ست بیا کا خرِ روز　　خوش بود دامن باغے و رخ دلدارے

۲۔ (یوسف)۔ خالہا داری تو وگرد دبزیر لب عیاں　　از شرف خبر صورت بیدل ناندآں زماں

۳۔ (ہاشم)۔ دوشینہ لبم چو در تر نامت می سفت　　چشم تو چہا کرد لب یارم گفت

۴۔ (ناصر)۔ سرِ صوفی ببُر در آتش انداز　　مبادا راز رنداں را بگوید،

۵۔ (علی)۔ تا عقیق یمنی دید لب لعل ترا　　قاف تا قاف دہ قیمتش و مشتری ست

چیستاں وہی ہے جسے ہندی میں پہیلی کہتے ہیں۔ صراحت کی ضرورت نہیں۔ فارسی میں اس کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے اور بہت پُرلطف ہے اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

چار حرف ست نام مطلوبے　　کہ تمنائے اہلِ عالم گشت

ہست چار و چناں عجب کہ ازو　　یک اگر بفگنی بماند ہشت

یعنی وہ چار حرفی لفظ ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس چار میں سے اگر ایک نکال لو تو آٹھ باقی رہتے ہیں۔ اس کا جواب "بہشت" ہے۔ کہ اگر اس کا پہلا حرف نکال دیجئے تو بھی ہشت رہجاتا ہے جیسے

معنے آٹھ ہیں)۔

رنگش چو رنگِ زعفراں　　بریاں چو جانِ عاشقاں
پا دارد و پر ہم بداں　　جانانِ من گو چیست آں

یعنی ایک بھُنی ہوئی زرد رنگ کی چیز ہے جو پا بھی رکھتی ہے اور پر بھی۔ اس کا جواب پاپر (پاپڑ) ہے

دو مرغاں از مرغزارے کرد پرواز　　بہ قصد سیر دو شاں آہنگ کردم
یکے را پا بُریدم گشت بے سر　　یکے را سر بُریدم لنگ کردم

ان دونوں جانوروں کے نام ہیں۔ بٹیرا اور کلنگ۔ اگر بٹیرا کا پاؤں (یعنی الف) کاٹ دیں گے تو بٹیر ہو جائے گا اور کلنگ کا سر (یعنی کاف) علیٰحدہ کر دیں گے تو لنگ رہ جائے گا۔

نوعی نے شمع کی مدح میں قصیدہ کا قصیدہ چیستاں کے انداز میں لکھا ہے اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چیست آں جوہر ہدایت فن　　آسماں مولد و زمیں مسکن،
شوخ، آئینہ روے، روشن دل　　رند، ژولیدہ موے، تر دامن
سوزنش در جراحت رشتہ،　　رشتہ اش در سیاست سوزن
گردنش تا بفرق سیمابی،　　سیم ساق است پاے تا گردن
چوں عروسانِ ہند در دم رقص　　از خم گیسوش چکد روغن،
نوزد باد لالہ حمراست　　بوزد ہست غنچۂ سوسن،
جامہ اش گاہ سبز و گاہ سپید　　چہرہ اش روز تیرہ شب روشن
گیسوش نور یافت چوں مریم　　ابروش چوں ہلال چشمک زن
ماہتابے ست بر درفش کیاں　　آفتابے ست سبز پیراہن
گاہے از دانہاے اشکِ نیاز　　سُبحہ آویختہ ست در گردن

ہجو و طنزیات کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی کسی وقت لکھ چکا ہوں۔ فارسی میں یہ صنف ادب بہت متنوع اور وسیع ہے جس میں خدا سے لیکر بے جان چیزوں تک کسی کو بغیر ہجو و طعن کے نہیں چھوڑا خیام کا ایک طنز دیکھئے جو بظاہر طنز نہیں معلوم ہوتا لیکن ہے فی الحقیقت یہی:۔

من مے خورم و ہر کہ چو من اہل بود　　مے خوردنِ من نبزد او سہل بود

گرمے نخورم علم خدا جہل بود — مے خوردن من حق بازل می‌دانست

اسی طرح کی ایک مشہور رباعی او ہے جس کا آخری مصرعہ ہے :-

خرّم بہ ہنر مگر تو مستی ربی

سرزمین ہند کی ہجو ملاحظہ کیجئے :-

ہیچو ہندار داشتی دوزخ چرا ہم ساختی — از بہشت جاوداں ما را بہ ہند انداختی

مولانا شہاب الدین کسی طبیب سے برہم ہوگئے تو اس کی مٹی یوں پلید کی : —

ملک الموت از اصیل طبیب — می بنالید بدرگاہ خدائے
کہ جہاں را زخلق خالی کرد — اندریں دور گشتہ سر و پائے
یا ازیں شغل دور کن اورا — یا مرا خدمت دگر عطا فرمائے

یعنی فرشتۂ موت نے خدا سے شکایت کی کہ اگر فلاں طبیب کو پیدا کیا تھا تو میری کیا ضرورت تھی۔

عُرفی نے گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے :-

درویش بے عصاش نگیرد زمن بمفت — طرار مفلسش نستاند زمن بقرض
گر صیحۂ زند بجوانی ستائمش — ور نقطۂ رود کنمش نام سطح ارض
ہمیزی زنم بوے از صبح تا بہ شام — تا نیم گام میرود آنہم بپائے عرض
ہستم بر و سوار و بہ معنی پیادہ ام — گامے بطول می‌نزدم اکنوں زنم بعرض

یعنی گھوڑے کے ضعف و ناکارہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ وہ فقیر جو عصا کا محتاج ہے وہ بھی اسے مفت نہ لے اور مفلس چور سے اگر کہوں کہ قرض لیلو تو وہ بھی منظور نہ کرے۔ اگر عذاب بیماری کی وجہ سے کوئی کراہ یا چیخ بھی اس کے منہ سے نکلے تو میں اس کے جوش جوانی کی تعریف کروں اور اگر بقدر ایک نقطہ کے وہ حرکت کرے تو میں یہ سمجھوں کہ گویا اس نے کرۂ زمین کا طواف کر لیا۔ صبح سے شام تک اگر مہمیز لگاتا رہوں تو مشکل سے نصف قدم اٹھائے اور وہ بھی طول میں نہیں عرض میں۔ اس پر سوار کیا ہوں، پیدل چل رہا ہوں اور وہ بھی اس شان سے کہ پہلے آگے قدم اٹھاتا تھا اور اب وہ چپ راست پڑتے ہیں

مولانا جامی نہایت لطیف انداز میں دولتمندوں کی کج خلقی و دنائت کے مقابلہ میں ایک درویش کے استغنا کا حال بیان کرتے ہیں :-

بدرویش گفت آں تونگر، چرا — بہ پیشم پس از دیرہا آمدی
بگفتا "چرا نامدی" پیش ما — بسے خوشترست از "چرا آمدی"

ایک دولتمند نے کسی درویش سے پوچھا کہ اتنے زمانہ تک کہاں رہے اور میرے پاس کیوں نہیں آئے، اس نے کہا کہ "کیوں نہیں آئے" سننا مجھے "کیوں آئے" سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے حاضر نہیں ہوا،

خیام، حور و قصور کے عقیدہ پر طعن کرتا ہے:۔

گوئی بہ بہشت حور عین خواہد بود	وانجا مے ناب وانگبیں خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست	چوں عاقبت کار ہمیں خواہد بود

شاعروں نے بخیلوں کی طعن آمیز ہجو عجیب عجیب انداز سے کی ہے۔ کمال الدین اسماعیل لکھتا ہے:۔

بدہن نانِ خواجہ چوں بُردم	خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر	کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

میں نے روٹی کا ٹکڑا منھ میں رکھا ہی تھا کہ خواجہ چلا اٹھا کہ "آہ میں مرا" میں نے کہا کہ لے میں تو یہ لقمہ نگل گیا، اب تو چاہے مرے یا جئے۔

خیام کا خطاب خدا سے ملاحظہ ہو:۔

زاہد بہ کرم ترا چو ما نشناسد	بیگانہ ترا چو آشنا نشناسد
گفتی کہ گنہ کنی بدوزخ برست	آنرا بکے گو کہ ترا نشناسد

فخر الدین رازی خدا سے یوں خطاب کرتے ہیں:۔

در رہگزرم ہزار جا دام نہی	گوئی کُشمت اگر دراں گام نہی
یک ذرہ زمیں ز دامِ تو خالی نیست	گیری و کُشی و عاصیم نام نہی،

یعنی راستے میں ہزاروں جگہ تو نے جال بچھا دیا ہے اور پھر کہتا یہ ہے کہ اس میں قدم رکھا تو مار ڈالونگا پھر تو خود ہی جال میں گرفتار کرتا ہے اور ہلاک کرتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ تو گنہگار ہے!

مطبوعات موصولہ

خلافت وامامت تین حصے امامیہ مشن لکھنؤ کی یہ ۳۴۳ ویں تبلیغی خدمت ہے جو تین حصوں میں پیش کی گئی ہے۔ ان میں وہ تمام مضامین یکجا کر دئے گئے ہیں جو نگار میں اسوقت تک شایع ہوئے ہیں، یعنی ہر تام کے اُس مضمون سے لیکر (جو مارچ ۳۵ء میں شایع ہوا تھا) آزاد خیال شیعہ کے مضمون تک (جو جنوری ۳۶ء میں شایع ہوا ہے) تمام مقالات ان حصوں میں پائے جاتے ہیں۔

اخیر میں مولانا سید علی نقی صاحب کا بھی ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے میرے ان چند سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو "آزاد خیال شیعہ" نے غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دئے تھے۔ یعنی قیام امامت کی ضرورت - صرف اہلبیت میں اس سلسلے کے قایم رہنے کا سبب - انبیاء و ائمہ کا مستقبل کے حالات سے باخبر رہنے کا ثبوت - بارہ اماموں پر امامت کا حصر - اور امام موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہہ

مولانا موصوف نے ان تمام مسایل کو جو بسیط گفتگو چاہتے تھے صرف دس بارہ صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس سے مدعا غالباً ایک سطحی تکملۂ بحث سے زیادہ نہیں ہے۔

مولانا نے ابتدائی دو صفحات میں میرے متعلق اظہار حیرت و استعجاب کیا ہے کہ وہ "شخص جو مذہب کی ضرورت کا قایل نہ ہو اور ملائکہ و جنت و نار سب کا منکر ہو وہ مسئلۂ امامت کے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کرے" اور ساتھ ہی ساتھ کنایتاً اس کو میری "شعبدہ بازی" اور "امبید کارانہ چال" ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔

میرے سوالات کے جواب میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر اظہار خیال کے لئے تو میں اسوقت آمادہ نہیں ہوں کیونکہ اس کا تعلق اصل بحث امامت و خلافت سے ہے اور مجھے جو کچھ کہنا ہے اسی وقت کہوں گا جب میرے کہنے کا وقت آئے گا، لیکن مولانا کو زیادہ عرصہ تک حیرت و استعجاب میں مبتلا رہنے

کی زحمت سے بچانے کے لئے اسقدر نشر و عرض کروں گا کہ کیا میرا مذہب سے بے تعلق ہونا مجھے سب سے زیادہ اس کا مستحق نہیں ٹھہراتا کہ میں شخص ثالث کی حیثیت سے ایک بے لاگ تحقیق اس مسئلہ میں چاہوں اور کیا مولانا کو کبھی ان مستشرقین مغرب پر بھی تعجب ہوا ہے جنھوں نے متعدد مسایل اسلامی کی تحقیق میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے اس جذبۂ تحقیق کا محرک صرف یہ امر ہے کہ شیعہ سنی کی باہمی نزاع کو میں اسلام کی پیشانی کا نہایت بدنما داغ سمجھتا ہوں اور چونکہ اس کا تعلق صرف مسئلۂ امامت و خلافت سے ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس بحث میں کوئی پہلو ایسا پیدا ہوجائے جو دونوں کے لئے مشترک طور پر قابل قبول ہو اور جس پر اتفاق کرکے یہ ہمیشہ کے لئے اس نزاع کو ختم کردیں ۔ ہرچند بظاہر اس کی کوئی امید نہیں تاہم میری کوشش یہی ہے جو اگر کامیاب نہ ہوئی تو بھی کم از کم مجھے ضرور اس منزل تک پہونچا دیگی جہاں سے "نفس مطمئنہ" کے حدود شروع ہوتے ہیں۔

اب رہا مولانا کا میری اس سعی کو "شعبدہ بازی" قرار دینا، سو اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ

گفتہ بودی ہمہ زرق اند و فریب اند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست !

زندگی مجموعہ ہے ملا رموزی کے چند فکاہی مقالات کا جسے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد نے چھاپا اور غالباً شایع بھی کیا ہے۔ ملا رموزی ہندوستان کے مزاحیہ نگاروں میں سے ہیں اور چونکہ ان کا مزاح، عام ذہن انسانی کی ظاہری سطح سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے ان لوگوں میں انھوں نے کافی شہرت حاصل کرلی جو صرف اس لئے ہنسنا چاہتے ہیں کہ ہنسی فی الجملہ اچھی چیز ہے — یعنی اگر پھکڑ پن ہے تو واہ واہ ! -

مزاح نگاری بہت کمیاب چیز ہے اور اسی کے ساتھ حد درجہ نازک۔ کمیاب اس لئے کہ فطرت خود چاہے کتنی ہی کھلنڈری ہو، لیکن انسان کو وہ کھلنڈرا دیکھنا پسند نہیں کرتی اور نازک اس لئے کہ مردی و نامردی میں تو خیر ایک قدم کا فاصلہ بتایا جاتا ہے لیکن مزاح اور پھکڑپن میں شاید ایک انچ کا بھی فاصلہ نہیں ہے مزاحیہ لٹریچر صرف "انتقادیات" سے متعلق ہوتا ہے اور "انتقاد" کے لئے ضرورت ہے کہ انسان بہت متنوع ذوق رکھتا ہو اور اس کا مطالعہ وسیع ہو اس لئے صحیح معنے میں مزاحیہ نگاری کے مستحق وہی ہے جو کسی فن کے "متخصص" (Specialism) میں ہو یا نہ ہو لیکن ذوق رکھتا ہو

تمام علوم فنون کا، اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ بھی ہونی چاہئے کہ خود اس کی ذات سے کوئی تعلق نہ پیدا ہونے پائے۔ ملارموزی کے فکاہیات اہل نظر کے نزدیک ہمیشہ تیسرے درجہ کا مزاح سمجھے گئے کیونکہ نہ ان کے یہاں وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ذوق کا تنوع پایا جاتا ہے اور نہ وہ ذاتیات سے بلند ہوکر کچھ لکھ سکتے ہیں۔

ان کے مزاح کی ابتدا ہوئی تھی صرف اس انتقاد سے کہ مکتب کے مُلّا عربی و فارسی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیسی نامانوس زبان میں کیا کرتے ہیں لیکن کچھ زمانہ بعد جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس سے سیر ہو چکے ہیں، تو اپنے واقعات زندگی و تجربات سفر کو ایک دوسرے رنگ میں اسی طرح پیش کرنا شروع کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا ذکر صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خود ان کے ذکر پر منتہی ہوتا ہے اور وہ ہر ذکر میں اپنے آپ کو اس طرح اُبھار کر سامنے لانا چاہتے ہیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں خود بھی اس کا یقین ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو دوسرا ان کی اہمیت کو نظر انداز کر جائے گا۔ ملارموزی کی اس ذہنیت نے ان کے مضامین میں ایک ایسا ناگوار مصنوعی مزاح (Forced Humour) پیدا کر دیا ہے جو اول تو بلند ذوق رکھنے والوں کو سرے سے اپیل ہی نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہو بھی تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ اس امر کا ثبوت کہ ملارموزی کسقدر اپنے حدود سے آگے بڑھکر اپنے "ذوقِ ادب" کو پیش کرنا چاہتے ہیں، ان کی موجودہ غزل نگاری سے بھی ملتا ہے۔ کہ باوجود ہزار اغلاط ہونے کے وہ اپنی غزل کو غزل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں اور محض اس لئے کہ بعض معمولی رسایل اسے شایع کر دیتے ہیں ان میں شاعر ہونے کا بھی غلط پندار پیدا ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملارموزی ذہین آدمی ہیں اور ان میں یہ صلاحیت تھی کہ درجۂ اول کا نہ سہی تو کم از کم درجۂ دوم کا فکاہی لٹریچر پیش کر سکتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کا بھوپالی "ماحول" ان کی اس فطری ودیعت کو صحیح راہ پر لگانے میں کامیاب نہ ہوا اور وہ اُس سطح سے آگے نہ بڑھ سکے جو عوام کے خوش کرنے کے لئے تو موزوں تھی لیکن خواص سے خراجِ تحسین حاصل نہ کر سکتی تھی۔

ملارموزی نے ایک اور غلطی بھی کی، وہ یہ کہ سیاسی و اخلاقی مسایل کو بھی انھوں نے اپنی ظرافت کے حدود میں شامل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فطری قدامت پرستی (Conservatism) جو "ننھے کی ماں"، کے ذکر میں چھپی رہتی تھی، فاش ہو گئی اور ان کے مزاح میں ایک عجیب قسم کا روڑھاپن پیدا ہو کر رہ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ملارموزی فطرتاً مزاح نگاری کے ذوق سے بیگانہ نہ تھے، لیکن افسوس ہے

کہ ان کا یہ ذوق "ناتراشیدگی" کی حالت سے آگے نہ بڑھ سکا جس کا سب سے بڑا سبب ان کی ضیاء الملک فاضل الٰہیات اور ام۔ آر۔ اے۔ اس (لندن) والی اوچھی ذہنیت ہے۔ حالانکہ "نکاہیات" سے انھیں کیا واسطہ؟

افسوس ہے کہ اعظم اسٹیم پریس نے ان مضامین کو اسوقت شایع کیا جب انکی مانگ ملک میں باقی نہیں رہی اور ملا رموزی کا مزاح ایک "بوسیدہ" چیز قرار پاچکا۔ تاہم اس لحاظ سے کہ ذکاہی لٹریچر پر بُرا بھلا جو کچھ مواد اُردو میں ملسکتا ہے اسے ضایع نہ ہوتا چاہئے، اس مجموعہ کی اشاعت بے محل بھی نہیں ہے۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۱۳ صفحات پر مشتمل ہے اور دو روپیہ میں اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

آفتاب رسالت منظوم سیرت رسول ہے راؤ بہادر حاجی محمد عبدالحمید خانصاحب منظر کی لکھی ہوئی نثر میں سیرۃ نبوی لکھنا تو فیشن ہو ہی گیا تھا اب نظم میں بھی یہ وبا پھیلنے لگی ہے میں اس کو وبا کہتا ہوں کیونکہ سب سے زیادہ مشکل کام کو سب سے زیادہ آسان سمجھ لینے کے معنی یہی ہوتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی سیرت سب سے بڑی متانت وسنجیدگی چاہتی ہے اور اس کو منظوم کرنے کے معنے ... استہزا ... نگاہ سے پیش کر رہے ہیں جہاں معنی سے زیادہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

راؤ بہادر صاحب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ سیرۃ کی کتابیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے انھیں بڑی جستجو تھی کہ کوئی صحیح کتاب اس موضوع پر مل جائے تاکہ وہ اسی کو سامنے رکھکر واقعات نظم کریں اور آخر کار "قرعۂ فال" مولانا اشرف علی صاحب کی تصنیف "نشر الطیب" کے نام نکلا۔

"نشر الطیب" کا انتخاب انھوں نے کیوں کیا؟ اس پر رائے زنی کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں لیکن خود "نشر الطیب" کی حقیقت کیا ہے، اس پر غور کرنے کی دعوت ضرور راؤ بہادر صاحب نے دی ہے۔

سیرۃ نبوی ہمیشہ دو حصوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک وہ جس میں آپ کے واقعات زندگی محض واقعات ہونے کے لحاظ سے معرض بحث میں آتے ہیں، دوسرا وہ جو صرف خوش اعتقادی سے تعلق رکھتا ہے اور عوام کی طرح راؤ بہادر صاحب نے بھی شاید یہی سمجھا کہ سیرۃ کی سب سے بہتر کتاب وہی ہے جس میں سب سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام لیا گیا ہو۔ ہر چند اس قسم کی روایات سے اور کتابیں بھی بھری پڑی ہیں لیکن روایات کی صحت کی ... وہ کوئی بڑا آدمی ڈھونڈھنا چاہتے تھے اور آخر کار

مولانا اشرف علی صاحب کی ذات میں وہ بڑا آدمی انھیں مل ہی گیا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ راؤ بہادر صاحب نے تمام واقعات نشر الطیب سے لئے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جس حد تک صرف سیرۃ نگاری کا تعلق ہے اس کتاب پر نقد کرنا گویا نشر الطیب پر نقد کرنا ہے اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "نشر الطیب" حد درجہ معیار سے گری ہوئی چیز ہے۔

مجھے کس قدر حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ اس میں بھی تخلیق نورِ محمدی کی وہی روایت پائی جاتی ہے جو عام طور سے معمولی میلاد ناموں میں نظر آتی ہے اور شق صدر کو بھی واقعی عمل جراحی قرار دیکر سینہ چاک کرکے دل نکالنے اور اسے پاک صاف کرکے پھر سینہ کے اندر رکھدینے کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔

اسی طرح آپ کی پشت پر مُہر نبوت کا پایا جانا، آپ کے جسم کا بے سایہ ہونا، چاند کے دو ٹکڑے کردینا آپ کی بددعا سے سراقہ کے گھوڑے کا زمین میں دھنس جانا، ایک چھوٹے ظرف آب سے لشکر کو سیراب کرنا، لعاب دہن لگاکر قلیل شوربہ اور آٹے سے ہزاروں آدمیوں کی گرسنگی رفع کردینا، مسجد نبوی کے ستون کا گریہ وزاری کرنا وغیرہ وغیرہ تمام وہی واقعات اس میں بھی پائے جاتے ہیں جو صرف خوش اعتقادی وصنم پرستانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔

کاش راؤ بہادر صاحب ان باتوں کو نثر ہی میں رہنے دیتے اور منظوم کرکے ان کی مزید اشاعت کا باعث نہ بنتے۔

نظم ہونے کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اغلاط واسقام سے پاک نہیں ہے۔ کتابت وطباعت بیشک اچھی ہے اور کاغذ بھی نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ جو صاحب اس کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ سکرٹری صاحب بزم ادب باغپت (میرٹھ) سے ۸ر علاوہ محصول بھیجکر طلب کرلیں۔

داستان پیر لوئی کی مشہور عام کتاب افروڈائٹ کا اُردو ترجمہ ہے۔ فرانسیسی ادب لطیف میں اس کتاب کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یونانی مجسموں میں زہرہ کے مجسمہ کو، کیونکہ پیر لوئی سے زیادہ آزاد و بیباک ہوکر کسی نے جذبات جنسی کا اظہار کیا اور نہ اس سے زیادہ نازک ولطیف تخیل کسی نے صرف کی۔

اس کتاب میں لوئی نے قدیم اسکندریہ کی شہوانی تصویر کھینچی ہے اور ایک کسبی کا کیرکٹر اسقدر عریانی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ ٹانک دوا کوئی اور میسر آسکے، لیکن افسوس ہے کہ ترجمہ اس مرتبہ کا نہیں ہے اور علاوہ غیر شگفتہ ہونے کے غیر متوازن بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرنا معمولی کام نہ تھا اور فاضل مترجم کو جن کا نام ظاہر

نہیں کیا گیا یقیناً بڑی دقتوں سے واسطہ پڑا ہوگا، اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ بعض بعض جگہ وہ غیر معمولی طور پر کامیاب نظر آتے ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی اس میں نہ صرف نظر ثانی بلکہ یکسر تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ پیر لوئی کی اس کتاب میں اور یہ کتاب کیا ہر زبان کی ادب عالی میں انداز بیان بہت نازک و پیچیدہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن ایک مترجم کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی خصوصیات قایم رکھتے ہوئے ان کا ترجمہ کرے اور اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں تبدیل کر دے لیکن فاضل مترجم نے اصل کتاب کی ترکیبات نحوی کو علی حالہا قایم رکھنے کی کوشش میں سادگی و شگفتگی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ترجمہ اُلجھ کر رہ گیا۔

میں یہاں چند مثالیں دیکر اپنے مدعا کو واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کتاب کا پہلا جملہ ملاحظہ ہو:

> "سینے کے بل لیٹ کر، کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے، رخسار پر ہاتھ رکھے وہ ایک لمبے سنہری پن سے کتانِ سبز کے تکیہ پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کر رہی تھی۔ دوپہر کے دو گھنٹہ بعد جب وہ جاگی ہے تو کثرتِ خواب کی وجہ سے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کرتی تھی اور اسی لئے بےکیفانہ سوقت تک وہ تنہا اپنے بے ترتیب بستر پر لیٹی رہی تھی، اس طرح کہ اسکے جسم کا ایک حصہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے ڈھنپا تھا"

جن الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے انکا استعمال صحیح نہیں کیا گیا اور علاوہ اس کے پورا جملہ الجھا ہوا ہے اس کو یوں لکھنا چاہئے تھا۔

> "کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے، رخسار پر ہاتھ رکھے، سینے کے بل لیٹی ہوئی وہ ایک لمبی سنہری پن سے کتانِ سبز کے غلاف پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے حاشیہ بنا رہی تھی۔
> دوپہر کے دو گھنٹہ بعد جب وہ جاگی تو دیر تک سوتے رہنے کی وجہ سے جسم میں گرانی سی محسوس کر رہی تھی اس لئے اپنے بے ترتیب بستر پر اسی طرح تنہا لیٹی رہی، اس حال میں کہ اس کے جسم کا ایک حصہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے چھپا ہوا تھا۔"

اس کے بعد کا جملہ ملاحظہ ہو:-

> "اس کے بال گھنے تھے بال، سمور کی طرح نرم، پر پروانہ سے طویل تر ملایم اور بے حصر تھے۔"

اس جملہ میں "پر پروانہ سے طویل تر" کا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ لفظ ملایم حذف کر دینا چاہئے تھا کیونکہ نرمی کا بیان پہلے ہو چکا ہے اسی طرح بے حصر غلط بھی ہے اور غیر فصیح بھی۔ ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

" اس کے بال گھنے تھے اور چمکدار، سمور کی طرح نرم تھے اور بیشمار ۔ اسی کے ساتھ وہ طویل بھی تھے ۔ شہپر سے زیادہ طویل ۔"

اسی صفحہ کی آخری سطریں ملاحظہ فرمائیے :۔

" یہی بال پھیلتے ہوئے اس کے عریاں بدن کے نیچے ہوتے ہوئے زانوؤں کے پاس جمع ہو گئے تھے، گھنے، گھنگریالے، چمکدار، اس پشمینۂ گراں ارز کو دیکھ کر ان بالوں کی وجہ سے جن میں گندم کی سرخی اور چمکدار دھات کی تابانی موجود تھی اور جو اسوقت اس کم عمر نازنین کو اپنی آغوش میں لئے تھے، سکندریہ کی کسبیاں اسے زرینہ کہکر بلاتی تھیں ۔"

کسقدر اُلجھی ہوئی عبادت ہے، اس کو یوں لکھنا چاہئے تھا :۔

" یہی منتشر بال، اس کے عریاں جسم کو چھوتے ہوئے زانو تک پہونچ گئے تھے ۔ اور انھیں گھنے، گھنگریالے، چمکدار، قیمتی بالوں کی وجہ سے جن میں گیہوں کی سی سرخی اور دھات کی سی تابانی پائی جاتی تھی اسکندریہ کی کسبیاں اسے زرینہ کہکر پکارا کرتی تھیں ۔"

اُردو میں تنہا لفظ گندم بغیر کسی ترکیب کے کبھی استعمال نہیں کیا جاتا ۔ پشمینۂ گراں ارز کا مفہوم صرف لفظ " قیمتی " سے پورا ہو سکتا تھا ۔

اور ایک جملہ دیکھئے :۔

" اس مکان میں مہتابی تھی، ایک سلکِ ستون، ایک رومین آئینہ، غالیچے، سنئے تکیے، اور ہند دکنیز ۔"

سلکِ ستون سے کیا مراد ہے ۔ بالکل سمجھ میں نہیں آتا ۔ اس جملہ کو یوں لکھتے تو مناسب تھا :۔

" اس مکان میں ایک مہتابی تھی ستونوں کی ایک قطار پر قایم، ایک آئینہ تھا دھات کا بنا ہوا، چند قالین تھے اور چند نئے تکئے اور اسی کے ساتھ ایک ہندو کنیز بھی تھی ۔

الفاظ و محاورات کے غلط استعمال کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

(۱) " تاکہ اس شہر کی عورتیں وہ خون بھی دیکھ سکیں جو اس کی نوکِ پا تک بہ آیا تھا "

" نوکِ پا " غلط ترکیب ہے ۔ اخیری فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا :۔

" جو اس کے پنجے یا پاؤں کے انگوٹھے تک بہ آیا تھا "

(۲) " یہی وجہ ہے کہ دیر تک اس کے گاہک اس قسم کے لوگ رہے "

دیر تک کا استعمال بالکل غلط ہو اسکی جگہ " ایک زمانہ تک " ہونا چاہئے ۔

(۳) کئی بار ایسا ہوا کہ قافلہ سالاروں نے اپنی چیزوں کو اونے پونے بیچ ڈالا ہے تاکہ اس کی لذتِ التفات خرید سکیں"

"بیچ ڈالا" کے بعد لفظ (ہے) کا استعمال یہاں درست نہیں،

(۴) "ان کے بغیر ایک لمحہ کے لئے رہ بھی نہ سکتی تھی"

لفظ "بھی" بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ یوں لکھنا چاہیئے تھا: "ان کے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رہ سکتی تھی"۔

(۵) "ریگ زار کے اس پرے رہتے ہیں"۔

لفظ پرے کے ساتھ اس یا اُس کا استعمال صحیح نہیں۔ صرف پرے کافی تھا۔

مترجم نے "کبھی کبھا" کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے، حالانکہ یہ حد درجہ عامیانہ لفظ ہے اور کوئی لکھا پڑھا آدمی اسے نہیں بولتا۔

الغرض یہ ترجمہ اسی قسم کی اُلجھنوں اور غلطیوں سے بھرا پڑا ہے اور کسقدر تکلیف ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ جس آئینہ میں سوائے جوہر آئینہ کے اور کچھ نظر نہ آنا چاہیئے تھا، اس میں ہر جگہ چھائیاں ہی چھائیاں نظر آتی ہیں۔

میں اس کتاب کے ناشر کو مشورہ دوں گا کہ وہ دوسرا اڈیشن اس وقت تک شایع نہ کریں جب تک اس کے یہ تمام نقایص دور نہ کر دئے جائیں۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ہاشمی بک ڈپو لاہور۔

نورس جناب افسر میرٹھی کے چند ادبی و انتقادی مضامین کا مجموعہ ہے، افسر صاحب کے طرزِ نگارش کی خصوصیت اس کی سادگی و پرکاری ہے جو ان کے مضامین میں پائی جاتی ہے خواہ وہ منظوم ہوں یا منثور۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اسی خصوصیت کی حامل ہے اور نہ صرف بچوں بلکہ بالغ نظروں کیلئے بھی کافی دلکش چیز ہے اس میں بعض انتقادی مضامین اُردو شاعری اور اُردو زبان کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اصولاً صحیح لکھا ہے، لیکن چونکہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط (بلکہ ڈرپوک) واقع ہوئے ہیں، اس لئے انھوں نے کہیں جارحانہ پہلو اختیار نہیں کیا اور اس سے ان کے انتقادات کمزور سے ہوگئے ہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات، تقطیع چھوٹی، جلد خوبصورت، قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ:—

بھارگو ابک ڈپو امین آباد لکھنؤ

داغ یہ کتاب نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے سوانح حیات و انتقادِ کلام پر مشتمل ہے اور کافی دلچسپ ہے۔ داغ اپنے زمانہ کے ایک بلند پایہ اُستاد مانے جاتے ہیں اُن کی سب سے

بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پیچیدہ ترکیبوں اور غیر مانوس و مشکل الفاظ کو اپنے کلام میں قطعاً آنے نہیں دیا دور از فہم تشبیہوں اور مبالغہ آمیز استعاروں سے اپنے اشعار کو بالکل پاک رکھا۔

اُن کی زبان میں فصاحت اور بیان میں سادگی کے ساتھ شوخی بھی پائی جاتی ہے، زبان کی اسی خوبی کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے ورنہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کے کلام میں حقیقت و متانت بہت کم ہے نہ اُس میں میر جیسا درد و اثر ہے نہ غالب جیسی معنی آفرینی اور نازک خیالی مگر زبان کی جو خدمت انھوں نے کی ہے وہ بڑی حد تک قابل قدر ہے روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال، لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دلنشینی یہ وہ چیزیں ہیں جو داغ کا خاص طرز کہلاتی ہیں۔ اس تصنیف میں داغ کی انھیں تمام خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور ان کے واقعات زندگی بھی حصر کر لئے گئے ہیں۔

ضخامت ۲۰۸ صفحات، تقطیع چھوٹی، جلد خوبصورت، قیمت ۸؍ ، ملنے کا پتہ:- غلام دستگیر تاجر کتب چارکمان حیدرآباد، دکن۔

تاجدار کعبہ یہ امامیہ مشن کا بیالیسواں تبلیغی رسالہ ہے اس میں حضرت علیؑ کے متعلق چند دلچسپ مضامین جمع کر دئے گئے ہیں جن کا تعلق محض خوش اعتقادی سے ہے۔

قیمت ۱؍ ، ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ۔

افسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کے دو مقالے ہیں جو ایوان اشاعت گورکھپور نے اس نام سے شایع کئے ہیں۔ پہلے مقالہ کا عنوان "افسانہ اور اس کی غایت" ہے۔ دوسرے کا "اُردو فسانہ" چونکہ حضرت مجنوں خود نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اور اسی کے ساتھ بہت ذہین بھی ہیں اور وسیع المطالعہ بھی، اس لئے ان کے یہ دونوں مقالے "کار آگہانہ" حیثیت رکھتے ہیں اور کافی معلومات کے حامل ہیں۔

پہلے مقالہ میں فسانہ کی حقیقت، اس کے اجزاء ترکیبی اور خصوصیات خاصہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مغربی فسانہ نگاری پر نہایت دلچسپ انتقاد کیا ہے اور دوسرے مقالہ میں اُردو کی منظوم و منثور فسانہ نویسی پر شروع سے اسوقت تک تبصرہ کرکے بہت مفید معلومات یکجا کر دی ہیں۔ علاوہ محصول اسکی قیمت ۱۲؍ ہے جو حجم کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو لیکن مغز کے لحاظ سے نامناسب نہیں ہے۔

ظل ہما ترجمہ ہے طہران کے مشہور مصنف و افسانہ نویس میر محمد حجازی کے ایک ناول "ہما" کا جسے مولوی سید اطہر حسین صاحب جعفری نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

چونکہ فاضل مترجم عرصہ تک طہران میں رہ چکے ہیں اور وہیں ان کے فارسی ذوق کی تکمیل ہوئی ہے

اس لئے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے بہتر اس ناول کا سمجھنے والا کون ہو سکتا تھا، موصوف نے پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی ہونے کے ساتھ ہی بامحاورہ بھی ہو اور وہ اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اس فسانہ میں مصنف نے فطرت انسانی کے بعض نہایت نازک و لطیف پہلوؤں سے بحث کی ہے اور معاملات حُسن و عشق کو ایک بلند آئیڈیل کی صورت دیکر نہایت مرتفع معیار ناول نویسی کا پیش کیا ہے۔

ضرورت ہے کہ غیر زبانوں سے اسی قسم کے پاکیزہ و لطیف افسانے انتخاب کر کے اُردو میں منتقل کئے جائیں، ہمیں امید ہے کہ جناب سید اطہر حسین صاحب آیندہ بھی فارسی ادب کے ایسے ہی منتخبات اہل ملک کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ جو حضرات ایرانی لٹریچر اور وہاں کے طرز انشا، و انداز جذبات نگاری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی و افادہ سے خالی نہیں۔

اس فسانۂ جمیل کی قیمت صرف دس آنہ ہے اور مکتبۂ ملیہ لکھنؤ سے ملسکتا ہے۔

لیونارد و گر ٹرود — اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں پیستالوزی بڑا زبردست ماہر تعلیم گزرا ہے جسنے اپنی ساری عمر اسی عملی تجربہ میں صرف کردی کہ گھریلو زندگی کو کیونکر مفید و خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت، امور خانہ داری اور گھریلو مشاغل کی اصلاح کا بڑا ماہر تھا اور اسنے ایک نہایت ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھی تھی، لیکن چونکہ وہ بہت خشک تھی اس لئے ایک شخص ابو اکینگ نے اس سے اخذ و استفادہ کر کے ایک کتاب فسانہ کے طرز پر لکھی تاکہ لوگ اس سے دلچسپی لے سکیں۔

اسی کتاب کا ترجمہ جناب غلام حسن صاحب بی۔ اس۔ سی استاد ٹرینگ اسکول گلبرگہ (دکن) نے اُردو میں کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ملک کی ہر خاتون کے مطالعہ میں آئے اور لڑکیوں کو بھی پڑھائی جائے تاکہ ابتدا ہی سے ان میں فرض شناسی کی عادت مرتسم ہو جائے۔ اس کی طباعت و کتابت میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، فاضل مترجم سے خط و کتابت کر کے معلوم کی جائے۔

مشہد اعظم — اخبار سرفراز لکھنؤ ہر سال عشرۂ محرم میں ایک خاص نمبر واقعۂ کربلا اور اسوۂ حسینی کے متعلق شایع کرتا ہے۔ امسال منجملہ دیگر مضامین کے ایک مضمون مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کا بھی تھا اور دوسرا مولانا شاد عظیمی صاحب حیدر آبادی کا۔ امامیہ مشن لکھنؤ نے ان دونوں مقالوں کو علحدہ ایک رسالہ کی صورت میں شایع کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے شیعی نقطۂ نظر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کی قیمت علاوہ محصول ۱؍ مقرر کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک انگریزی مقالہ Husain in the plain of Karbala سید خورشید حسین صاحب نقوی کا شایع کیا گیا ہے اور دوسرا ہندی میں۔ ان کی قیمت علی الترتیب ۱۲؍ اور ۳؍ ہیں۔

سلاطین وقائدین اسلام مولانا یوسف احمد بغدادی نے ایک رسالہ عربی زبان میں اس موضوع پر لکھا تھا، اسی کو اب اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس میں تمام موجودہ اسلامی حکومتوں کے جغرافی وتاریخی حالات، معہ رقبہ ومردم شماری اور نظام حکومت کے یکجا کردئے گئے ہیں اور امراء وسلاطین کی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس رسالہ میں تمام حالات مستند ذرایع سے حاصل کرکے درج کئے گئے ہیں اور زبان و بیان دونوں بہت سلیس وشگفتہ ہیں۔ کتابت وطباعت بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ جو حضرات موجودہ اسلامی دنیا کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:- جناب یوسف احمد بغدادی۔ کشمیر مینشن۔ ۵ ولیسلی اسٹریٹ کلکتہ ہے۔

آیات وجدانی مجموعہ ہے جناب یگانہ چنگیزی کے اُردو فارسی کلام کا جو دوبارہ "باضافۂ افکار جدید" شایع کیا گیا ہے، ابتدا میں یگانہ صاحب نے خود اپنے حالات بھی قلمبند کردئے ہیں جن کی انتہا اسی ذہنیت پر ہوتی ہے جس کا نام انھوں نے "غالب شکنی" رکھا ہے۔

اس مجموعہ کا انتساب انھوں نے اپنے جد اعلیٰ (انھیں کے الفاظ میں) "حضرت چنگیز خاں اعظم قہراللہ" سے کیا ہے۔ جناب یگانہ نہایت خوش گو وخوش فکر شاعر ہیں اور اگر ان کا جذبۂ خود پرستی جایز حدود سے آگے بڑھکر غیر معمولی خشونت میں تبدیل نہ ہوجاتا تو شاید وہ زبان کی بہتر خدمت انجام دے سکتے۔ اس کی قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ:- میرزا آغا جان چنگیزی لکھنوی، جھوائی ٹولہ۔ لکھنؤ۔

منتخب دیوان غالب مع شرح دیوان غالب کا انتخاب جامعۂ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کورس میں شامل ہے اور یہ شرح اسی انتخاب سے متعلق ہے۔

شرح بری نہیں ہے اور تمام ان شرحوں کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے جو اسوقت بازار میں پائی جاتی ہیں جابجا تقابلاً دوسرے شعراء کا کلام بھی پیش کیا گیا ہے اور مولانا طباطبائی و ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی تشریحات کو بھی نقل کردیا ہے۔ اس کے مولف جناب نوراللہ محمد نوری ہیں اور ناشر غلام دستگیر تاجر کتب چارکمان حیدرآباد دکن۔ قیمت درج نہیں۔

سیر کشمیر مولوی محمد عبدالمجید صاحب بی، اے گورکھپوری نے اپنی سیاحت کشمیر کے حالات اس

کتاب میں قلمبند کئے ہیں، جو کافی دلچسپ ہیں، لیکن اس کا مفید حصہ وہ ہے جو تاریخ کشمیر سے متعلق ہے اور اس سے مفید تر وہ جس میں وہاں کے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بیداری اور شیخ محمد عبداللہ صاحب کے انقلاب انگیز مساعی کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ سفرنامہ قاضی محمد مسعود علی صاحب قاضی پورہ خورد گورکھپور سے بارہ آنہ میں مل سکتا ہے۔

امراض خبیثہ یہ کتاب جناب پنڈت کاشی رام صاحب کی ہے جو لکھنؤ کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں اسوقت تک آپ متعدد مفید کتابیں اس طریق علاج پر شایع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب صرف امراض خبیثہ (یعنی آتشک سوزاک، امراض مثانہ و امراض بول) کے لئے مخصوص ہے اور اسمیں شک نہیں کہ قابل مصنف نے نہایت کاوش و محنت سے اس کو مرتب کیا ہے۔ اور ان امراض کی تمام نوعیتوں پر تفصیلی بحث کر کے ان کے ازالہ کی وہ تدبیریں بتائی ہیں جو ہومیوپیتھی طریق علاج کی رو سے مشہور ڈاکٹروں اور خود ان کے تجربہ میں آچکی ہیں۔

کتاب کافی ضخیم ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے بھی بہت پسندیدہ ہے قیمت ۸؍ ہے اور ملنے کا پتہ :- بھارت ہومیو فارمیسی چورا ہا قیصر باغ، لکھنؤ

انکشاف موسیقی جناب چاند صاحب دہلوی کی تالیف ہے جو اسوقت کے اچھے ماہرین موسیقی میں شمار کئے جاتے ہیں، اس کتاب میں سروں، سرتیوں، آروہی امروہی اور مورچھنوں وغیرہ پر بحث کر کے بعض ان اعتراضوں کا بھی جواب دیا گیا ہے جو ہندوستان کی کلاسکل موسیقی پر کئے جاتے ہیں۔ گویوں میں یہ عیب بتایا جاتا ہے کہ وہ خاص خاص چیزیں کسی کو نہیں بتاتے لیکن چاند خانصاحب نے نہایت دریا دلی سے ان تمام پوشیدہ رازوں کو ظاہر کر دیا ہے جو ان کے خاندان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آرہے تھے۔۔ امید ہے کہ یہ کتاب ماہرین موسیقی کے لئے بہت دلچسپی کی چیز ثابت ہوگی۔ قیمت ۱۰؍ ہے اور ملنے کا پتہ: موسیقی بک ڈپو ۳۰۱ سوئی والان دہلی۔

تعلیم ستار ہندی حامد حسین خاں صاحب لکھنؤ کے نہایت مشہور ستار بجانے والے ہیں اور یہاں کے میوزک کالج میں پروفیسر بھی ہیں۔ آپ کو منجانب فطرت کی طرف سے موسیقی کا اتنا صحیح و پاکیزہ ذوق ملا ہے کہ گانے کے علاوہ تمام سازوں کو نہایت تکمیل کے ساتھ بجا سکتے ہیں۔ لیکن ستار آپ کا خاص فن ہے جو اُستاد تراب خانصاحب سے آپ نے حاصل کیا ہے۔

اس وقت تک ستار پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن پروفیسر حامد حسین خاں کی یہ کتاب ان سب سے علیحدہ ہے کیونکہ اس میں ٹھاٹوں کی تقسیم، سوت و مینڈ لینے کے طریقوں اور بول نکالنے کی ترکیبوں

کو بالکل نئے انداز میں بتایا گیا ہے - یہ کتاب لکھنؤ میوزک کالج کے کورس میں بھی داخل ہے اور عہ میں پروفیسر صاحب سے ملسکتی ہے -

پیلی یاس اور میلی ساند ترجمہ ہے ماترلنک کی ایک حزنیہ تمثیل کا - جناب تمنائی نے ترجمہ میں اس کا لحاظ تو ضرور رکھا ہے کہ میترلنک کے خیالات بدستور قایم رہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ اُردو زبان کی خصوصیات کو مجروح کئے بغیر اس میں کامیاب نہیں ہوئے -

اس میں شک نہیں کہ میترلنک نہایت نازک خیال ڈرامہ نگار تھا اور کسی دوسری زبان میں اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا کرنا آسان نہیں تاہم ترجمہ میں ترقی کی گنجایش باقی ہے - امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا اور غلط محاورات اور اُلجھے ہوئے اندازِ بیان کے بجائے زیادہ صحیح زبان اور زیادہ شگفتہ طرزِ ادا اختیار کیا جائے گا - یہ کتاب پنجاب بکڈپو نے شایع کی ہے اور ۱۲ر اسکی قیمت ہے -

طلسمات مجموعہ ہے جناب پروفیسر سید عابد علی صاحب ام - اے کے چند افسانوں کا جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں - مجھے اول اول اس مجموعہ کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس تسمیہ کی کیا وجہ ہے، لیکن جب فسانوں کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس سے بہتر اس مجموعہ کا نام کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، کیونکہ اس کے مطالعہ کے وقت واقعتاً ایک شخص اپنے آپ کو "طلسمات" ہی کی سیر کرتا ہوا محسوس کرتا ہے - لیکن یہ طلسمات، "ہوشربا اور نورافشاں" کے نہیں ہیں بلکہ اسی متمدن دنیا اور اسی عالم اسباب سے متعلق ہیں — عابد صاحب کا طرزِ انشا بہت اچھوتا ہے اور رنگینیٔ خیال و ندرتِ بیان کے لحاظ سے اس کی پاکیزگی بعض جگہ تو "سحرِ حلال" کیا "سحرِ غیرِ حلال" تک پہونچ جاتی ہے - جس زمانہ میں عابد صاحب دنیائے صحافت سے تعلق رکھتے تھے اسوقت کبھی کبھی ان کی تحریروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں انھیں بہت امکانات ترقی پاتا تھا - اب ایک زمانہ کے بعد جو یہ مجموعہ نظر آیا تو مجھے بہت مسرت ہوئی، کیونکہ عابد صاحب نے میری توقعات سے زیادہ ترقی کی اور اپنا ایک خاص رنگ پیدا کر کے اپنے آپ کو مقلدین سے علحدہ کر کے موجدین میں شامل کر لیا - بعض فسانوں کے پلاٹ میں البتہ کہیں کہیں ہلکی سی جھلک "غیر فطری" ہونے کی پائی جاتی ہے لیکن وہ افسانہ نگار جنکی ادبیات کی بنیاد "تخییل" پر قایم ہوتی ہے، ہمیشہ اس باب میں معذور سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ اس نوع کے مکمل نقایص کی تلافی اپنی انشا سے کر دیتے ہیں اور ذہن انسانی کو اس کا موقعہ نہیں دیتے کہ خیال کی پیدا کی ہوئی لذتوں سے قطع نظر کر کے وہ آرٹ کی اُلجھنوں میں گرفتار ہو -

یہ مجموعہ مجلد شایع ہوا ہے اور نہایت پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ - ہاشمی بک ڈپو ریلوے روڈ لاہور سے خط و کتابت کی جائے -

دو خدا

ہر عشق کے سجدے کا مسجود بنایا تھا   میں نے تجھے اے پیارے! معبود بنایا تھا
نذرانۂ دل دیکر لو تجھ سے لگائی تھی   ظلمات بھری دنیا پر نور بسائی تھی
تھی میری تمنا یہ ہو راہنما کوئی   بن جائے کسی صورت "ہم جنس" خدا کوئی
"ہم جنس" خدا ہوگا تو مجھ سے وہ بولے گا   مرجھائے ہوئے دل کی ہر گرہ کو کھولیگا!
کس شوق سے چوموں گا میں پائے حسیں اُسکا   کس شوق سے دیکھوں گا میں نورِ جبیں اُس کا
دل ہوگا صنم خانہ وہ اُس کا صنم ہوگا   حال آئیگا مستی میں، ہر عیش بہم ہوگا
بر آئی تھی یہ حسرت صد حسن تبسم سے   چمکی تھی مری قسمت صدِ حسن تجسس سے
تم مجھ کو ملے، مل کر تکمیل محبت کی   معراج ہوئی میرے ہر ذوقِ عبادت کی
یزداں کے مگر شاید کانٹا سا چبھا دل میں   یہ ہوک اُٹھی دل میں، یہ رنج ہوا دل میں
انساں کی پرستش ہو یوں میری خدائی میں   فرق اس سے نہ آئیگا کیا میری بڑائی میں
اس خام خیالی نے نقشہ ہی بدل ڈالا   مالی کے تخیل نے اک پھول مسل ڈالا
بے رحمیِ یزداں نے چھینا ہے صنم میرا   اب عرش کو ڈھائے گا ہنگامۂ غم میرا
میں اُس کے فرشتوں کو سب حال سناؤنگا   روپ اُسکی حقیقت کا جو ہے وہ دکھاؤنگا
پھر نوحہ محبت کا اک ایسا بناؤں گا   جس نوحے میں میں دل کی قندیل جلاؤنگا
اک آگ لگا دوں گا تاروں کی فضاؤں میں   اِس شعر کو گاؤں گا پر سوز نواؤں میں

اک ایسا خدا ہے جو دُکھ درد مٹاتا ہے
اک ایسا خدا ہے جو ہنستوں کو رُلاتا ہے

عدم

تلافیٔ مافات

خاتونِ دلربا، مری بانوئے دلنواز!
ناہیدِ ناز اور یوں آلودۂ نیاز

یہ مست مست نرگسِ حیراں مرے لئے
یہ جھکی جھکی زلفِ پریشاں مرے لئے

یہ پھیکا پھیکا رنگ طبیعت مرے بغیر
یہ کھوئی کھوئی سعیِ محبت مرے بغیر

یہ ساری ساری رات کا رونا مرے لئے
یہ سیلِ غم میں دل کا ڈبونا مرے لئے

اشکوں سے بھیگے بھیگے یہ رخسارِ نرم نرم
آنکھیں یہ ڈبڈبائی ہوئی جسم گرم گرم

آہیں یہ سرد سرد، یہ لب خشک خشک سے
سانسیں بسی ہوئی یہ محبت کے مشک سے

بیخوابیوں سے شب کی پپوٹوں پہ یہ ورم
دل میں خراش، روح میں حرماں، جگر میں غم

آنکھوں میں اشتیاق کی یہ لالہ کاریاں
یہ اچٹی اچٹی نیند کی گلرنگ دھاریاں

یہ صاف صاف چہرے میں زردی خیال کی
ہر رنگ میں جھلک سی دلِ پائمال کی،

میں آگیا ہوں سوگ بس اب ختم کیجئے
یہ ہچکیوں پہ ہچکیاں اب تو نہ لیجئے

فطرت واسطی

شرارت

ترنم ریزیاں ہوتی ہیں جب بربط کے تاروں سے
تکلم ریز جب ہوتی ہے موسیقی اشاروں سے

سکوتِ شب میں جب نغموں سے دنیا جھوم جاتی ہے
تمنا درد کی آغوش میں جب مسکراتی ہے

جبینِ ماہ سے جب نور چھنتا ہے فضاؤں میں
تجلی رنگ بھر دیتی ہے دنیا کی ہواؤں میں

سرورِ زندگی جب مایلِ پرواز ہوتا ہے
نشاط و رنگ میں باہم نیاز و ناز ہوتا ہے

تمنائے دلِ ناشاد جب بیتاب ہوتی ہے
حیا تقدیس کے پردوں میں محوِ خواب ہوتی ہے

نکل آتے ہیں جب تارے جہاں کی پاسبانی کو
دیا جاتا ہے درسِ زندگی جب زندگانی کو

الوہیت کے جلووں سے جہاں معمور ہوتا ہے
ہجومِ کیف سے سارا زمانہ چور ہوتا ہے

فضا معمور ہو جاتی ہے آتشناک جلووں سے
تڑپ جاتی ہیں جب روحیں کسی شاعر کے نغموں سے

سمجھ لیتا ہوں تو اسوقت بھی محوِ "شرارت" ہے
ترے لب پر تبسم ہے اترے جلوؤں کو فرصت ہے

شمیم نعمانی نیازی

ہندوستان سے

نیک و بد میں جب نہیں رہتا ہے فرق و امتیاز
خود بخود ہوتا ہے انساں پر درِ تنظیم باز
حد سے بڑھ جاتی ہیں جب حرص و ہوس کی تو خیاں
نفس خود کرتا ہے جلبِ منفعت۔ دفعِ زیاں
ذرہ ذرہ ہے یہاں کا مائل تغئیر حال،
کارفرما ہے ہر اک شے میں یہ فعل و انفعال
رات کی تاریکیوں میں جب نہیں آتا نظر
صبح کی تابندگی لاتی ہے پیغامِ سحر
تخم سے پیدا شجر ہوتے ہیں۔ اُنسے پھول پھل
خاک میں ملنا ہے ان کا گویا اک "ردِ عمل"
ایک حالت پر نہیں قایم غرض یہ کائنات
صبح ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اب آتی ہے رات

مقتضاء وقت تھا اے مادرِ ہندوستان
تو نے جب پیدا کئے تھے "بھیم و ارجن" سے جواں
تھا "کنہیا جی" کی تعلیمات کا یہ مدعا
آشنا حق و صداقت سے ہو ہر نا آشنا
"شانتی" کے ابر چھا جائیں فضائے ہند پر
"پریم" کی برسیں گھٹائیں خاکنائے ہند پر

جب مسلمانوں نے رکھا تیری سرحد پر قدم
"میری ماتا" ہو چکا تھا سرنگوں تیرا علم
خانہ جنگی ہر طرف تھی، ہر طرف جنگ و فساد
بھائی کو بہنوں سے نفرت باپ بیٹوں میں عناد
ایسی ہی کچھ خوبیوں نے گھیر رکھا تھا تجھے
ہو چکے تھے جمع کل سامان ذلت کے ترے
وہ علمبردار فطرت جس کا مسلم نام ہے
پیرو حق کی حمایت جس کا پہلا کام ہے
دیکھ کر یہ خونچکاں ہنگامۂ جور و جفا
ابرِ رحمت بن کے "بھارت ورش" تجھ پر چھا گیا
پھول جو اس نے چنے تھے اپنے دامن کیلئے
تجھ کو اپنا جان کر تجھ پر نچھاور کر دئے

کوروں کا۔ پانڈوں کا۔ وہ زمانہ بھی گیا
چندر بنسی سلطنت کا بھی نہیں اب کچھ پتا

بدھ مت کا دھرم جاری راج بھی باقی نہیں / شوکت اسلام کو بھی کھا گئی تیری زمین
ہاں مگر کچھ نام لیوا ان کے باقی تھے تو اب / وہ بھی باہم لڑ جھگڑ کر ختم ہونے کو ہیں سب
یہ فسادی آڑ میں مذہب کی کرتے ہیں فساد / اور بتلاتے ہیں اس کو کفر و ایماں کا تضاد
ان کو مذہب سے ہے مطلب ورنہ ملت سے ہے کام / ہیں حقیقت میں یہ اپنی خود نمائی کے غلام
مذہب و ملت کی اصل روح سے بیگانہ ہیں / انکی جتنی خواہشیں ہیں ساری مجنونانہ ہیں
کوئی مذہب یہ نہیں کہتا کہ آپس میں لڑو / کوئی مذہب یہ نہیں کہتا۔ ہلاکت میں پڑو

مادر ہندوستاں۔ ایسا کوئی افسوں بتا / جس سے پیدا ہو نہ باہم بھائیوں میں تفرقہ
ہندو بیٹا ہے ترا۔ مسلم ترا فرزند ہے / وہ ترا نور نظر۔ یہ بھی ترا دلبند ہے
اک اگر بلوان ہے۔ تو دوسرا بھی ہے جری / اس سے بازو کو ہے شکتی تیرے۔ اُس سے دل قوی
پھر یہ آخر کس لئے رکھتے ہیں آپس میں عناد / ایک ماں کے "لال" اور فطرت میں اُنکے یہ تضاد!!
کاش یہ آپس میں لڑنا اور جھگڑنا چھوڑ دیں / آدمی پیدا ہوئے ہیں۔ آدمی بن کر رہیں

ناطق ماہوی

محبت

محبت حسن کے مدہوش کن جلووں کا صدقہ ہو // محبت فطرتِ عریاں پہ اک ہلکا سا پردہ ہو
بھڑک اٹھے تو اک شعلہ جو سورج کو بھی گرما دے // ٹھہر جائے تو اوجِ زیست پر روشن ستارہ ہو
کبھی ساحل کی خاموشی کبھی موجوں کی بیتابی // کبھی اک اشک خونیں ہو کبھی شبنم کا قطرہ ہو

کبھی ظلمت شکن ہوتی ہے برقِ آشیاں بنکر
پتہ دیتی ہے منزل کا شریکِ کارواں بنکر

سکوتِ نغمہ بن جانا حجابِ ساز ہو جانا // خود اپنی زندگی کا اک مکمل راز ہو جانا
بنانا اور سننا چند لامحدود افسانے // پہنچنا انتہا تک اور پھر آغاز ہو جانا
بھلا دینا وفورِ جوش میں دل کی صداؤں کو // کسی نا آشنا نغمہ کا ہم آواز ہو جانا
کہیں اک شمع کی صورت کہیں پروانہ کی فطرت // کہیں اک سوزِ پنہاں کہیں اک ساز ہو جانا

یہ معنی ہیں محبت کے محبت اسکو کہتے ہیں
بالفاظِ دگر منشارِ فطرت اسکو کہتے ہیں

ٹھہرتی ہے دلوں میں کاروانِ آرزو بنکر // گزرتی ہے نگاہوں سے شعاعِ جستجو بنکر
بشر کی زندگی سے انتقام ہوش لیتی ہے // شراب و ساقی و پیمانہ و جام و سبو بنکر
حسینوں کے لبوں پر مسکراہٹ بنکے آتی ہے // چھپا لیتی ہے پھولوں کو حجابِ رنگ و بو بنکر

محبت درحقیقت وسعتِ صد لامکاں دارد
محبت درمیانِ خود زمین و آسماں دارد

خیال بدایونی

غزل

جنوں نے کچھ اضافہ کر دیا وحشت کے سامانیں — نظر آنے لگا صحرا مجھے چاکِ گریباں میں،
خزاں کی فصل کانٹوں کی طرح دل میں کھٹکتی ہے — بتاؤں کیا کہ اب گلشن میں ہوں یا بیاباں میں،
خدا جانے دلِ دیوانۂ وحشی پہ کیسا گزری — بگولے آج اپنا سر پٹکتے ہیں بیاباں میں،
تبسم سنو فگن رنگیں سا لبوں پر وقتِ گلچینی، — چمن پھولا ہوا ہے تازہ یہ صحنِ گلستاں میں
خدا کی شان، نظارے نے یکسو کر دیا مجھ کو — دو عالم اب نظر آنے لگے ہیں روئے جاناں میں
سرِ محشر مجھے اب کوئی پہچانے گا کیا کیفی! — کہ میں ڈوبا ہوا ہوں سر سے پا تک بحرِ عصیاں میں

کیفی چریاکوٹی

غزل

وہ سامنے ہے اور نظر سے چھپا دیا — اے عشق بے حجاب مجھے کیا دکھا دیا
کچھ شوخیاں تغافلِ پنہاں میں تھیں جنھیں — ہنگامہ زارِ حشرِ تمنا بنا دیا،
وہ شانِ خامشی کہ بہاریں ہیں منتظر — وہ رنگِ گفتگو کہ گلستاں کھلا دیا
اے شوخیِ نگاہ کرم مدتوں کے بعد — خوابِ گرانِ غم سے مجھے کیوں جگا دیا
بڑھتا ہی جا رہا ہے جمالِ نظر فریب — حسنِ نظر کو حسنِ خود آرا بنا دیا
اک برقِ بیقرار تھی تمکینِ حسن بھی، — جس وقت عشق کو غمِ صبر آزما دیا
ساقی تجھے بھی یاد ہیں وہ تشنہ کامیاں — جن کو حریفِ ساغر و مینا بنا دیا
معلوم کچھ مجھی کو ہیں اُن کی روانیاں — جن قطرہ ہائے اشک کو دریا بنا دیا
دم لے رہی تھیں حسن کی جب سحر کاریاں — اُن وقفہ ہائے کفر کو ایماں بنا دیا
رات اب حریفِ صبحِ قیامت ہی کیوں نہ ہو — جو کچھ بھی ہو اس آنکھ کو اب تو جگا دیا،
پھر دیکھنا کہ آنکھ لڑی کس سے عشق کی — گر حسن نے حجابِ تغافل اُٹھا دیا،
معلوم ہے حقیقتِ غمہائے روزگار — دنیا کو تیرے درد نے دنیا بنا دیا
اب میں ہوں اور لطف و کرم کے تکلفات — یہ کیوں حجابِ رنجشِ بیجا اُٹھا دیا
بیتاب شام سے تھا مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

فراق گورکھپوری

غزل

جو ہر گل پہ جان دے ہو نہ قتیل رنگ و بو
پی کے شراب، آتشیں توڑ نہ پیکر سبو
تار رباب شوق کو چھیڑ دے اس ادا سے تو
ہر رگ و پے میں دوڑ جائے برق شباب کا لہو
عشق کے ساز سوز پر حسن کے راگ گائے جا
دشت میں لالہ زار ہیں، خانہ بخانہ، کو بکو
مست گھٹاؤں کی طرح شانوں پہ بال چھوڑ کر
عشق کو دے پیام شوق اے مری جانِ آرزو
برق نظر کا واسطہ لوٹ لے مایۂ سکوں
میری نگہ میں ڈالکر اپنی نگاہ فتنہ جو
کاوشِ خستہ حال کو زندگی بہار دے
جنت آب و رنگ میں لے میرے سرورِ رنگ و بو

کاوش حیدرآبادی

غزل

چاہتا ہوں جسکو دل سے، اس سے کتراتا ہوں میں
دل مجھے تڑپا رہا ہے، دل کو تڑپاتا ہوں میں
چھین لے آکر جو مجھ سے لذتِ امید و بیم
ایسی توبہ کے تصور سے بھی گھبراتا ہوں میں
جس جگہ سے لوٹنا پڑتا ہے اُلٹے پاؤں روز
کیا کشش ہے بے ارادہ پھر وہیں جاتا ہوں میں
آپ میں آتا نہیں پاتا نہیں جب تک اُسے
اور جب پاتا ہوں اسکو آپ کھو جاتا ہوں میں
بتکدے سے کعبے تک لائی مجھے وارفتگی
دیکھئے گھر سے خدا کے اب کہاں جاتا ہوں میں
پوچھتا ہے جب کوئی مجھ سے مرے انجام کو
بھر کر آنسو آنکھ میں، خاموش ہو جاتا ہوں میں

عقیل جعفری

گذشتہ ماہ کے پرچے میں صفحہ ۷۷ پر اعتراف شکست میں جناب تمکین سرمست کا نام سہواً چھوٹ گیا۔ ناظرین صحت کرلیں۔
منیجر نگار لکھنؤ

خمریات

مے پینے سے تسکین سی ہو جاتی ہے
واعظ کو یہ وہم، گر ہی آتی ہے
کہتا ہے کہ انجام ہے دوزخ اسکا
دوزخ تو مرے جام میں لہراتی ہے

اے شیخ ہوں سرشار جوانی کی طرح
دل مست ہے موجوں کی روانی کی طرح
جس آگ سے رندوں کو ڈراتا ہے تو
اُس آگ کو پی لیتا ہوں پانی کی طرح

پیتا ہوں شراب، زخم دل سیتا ہوں
واعظ شان انداز سے میں جیتا ہوں
تو آگ جہنم کی جسے کہتا ہے
میں جام میں بھر بھر کے اسے پیتا ہوں

نبی احمد بریلوی

مجموعۂ استفسار و جواب

کا

تیسرا حصہ

جولائی میں شائع ہو جائیگا

اس کی ضخامت بھی تقریباً ۵۰۰ صفحات ہوگی اور قیمت خریداران نگار سے عاؔ اور غیر خریداران سے ۳ؔ علاوہ محصول تینوں جلدیں ایک ساتھ خریدنے پر محصول دفتر ادا کریگا خواہ صاحب فرمائش خریدار نگار ہو یا غیر

حصہ اول کی قیمت خریدار نگار سے عاؔ غیر خریدار سے ۳ؔ علاوہ محصول
" دوم " " " " " " "

مینجر نگار

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (۱)

یا شہوانیات

اس کتاب میں صنفی تعلق کی تمام مخفی اور پیچیدہ قسموں کے علاوہ صنفی تاریخ اور نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیا گیا ہے مختلف تعبیر کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نماشی دنیا میں کب سے کس کس طرح رائج ہوئی اور پیچیدہ مذاہب عالم نے اسکو روا رکھا یا کتنی معنی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم۔

مجموعہ استفسار و جواب دو جلد

ان دونوں جلدوں میں نگار کے متعدد نمبروں سے کرکے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو حیثیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سائکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- ادنین کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات لئے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ زبان کا اپنے چٹخارہ اور الفاظ کے [illegible]

[illegible]

فراست الید

مولانا نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت و ذہن و مال، صورت و صحت و بیماری [illegible]

[illegible]

مذاکرات نیاز

یہ حضرت نیاز کی ڈائری ہے جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کرکے پھر ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ نگار [illegible] اس کتاب پر ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول



جملہ اقسام کی یونانی مرکبات
صحیح اور پورے اوزان
سے تیار شدہ حاصل کرنا
چاہتے ہیں تو
فہرست دواخانہ
مفت طلب فرماویں

دماغی اور اعصابی کمزوری

کے لئے "شاہی" لاجواب اور دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔
خون کی کمی دافع کرنے اور خون کی افزائش کے لئے "شاہی" کو دنیا کی تمام ادویات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ افزائش خون کے تمام اجزا اس میں موجود ہیں۔
دمہ، کھانسی اور سل و دق کے لئے نہایت مفید ہے۔
عورتوں کے جملہ امراض ہسٹریا (اختناق الرحم)، لیکوریا (سیلان الرحم)، عام جسمانی کمزوری کے دور کرنے میں "شاہی" بے حد مفید ثابت ہوئی ہے۔
مزید معلومات کے لئے مفت رنگین رسالہ مفت طلب کریں